# مومن نمبر
(جدید)

# نگار پاکستان

مرتبہ

## نیاز فتحپوری

سالانہ چندہ:۔ دس روپے — قیمت فی کاپی:۔ چار روپے

نگار پاکستان — ۳۲، گارڈن مارکیٹ، کراچی ۳

(پرنٹر پبلشر عارف نیازی نے انٹرنیشنل پریس کراچی سے چھپوا کر ادارۂ ادب عالیہ، کراچی سے شائع کیا)

# فہرست

| ۳۴واں سال | فہرست مضامین | مومن نمبر |
|---|---|---|

# ملاحظات

## نقشِ ثانی

سنہ ۱۹۲۷ء کی بات ہے کہ میں بھوپال چھوڑ کر لکھنؤ آتا ہوں اور نگار کو بھی اپنے ساتھ یہیں لے آتا ہوں۔ اُس وقت نگار اپنی عمر کے چھٹے سال میں تھا اور اب ۴۳ ویں سال میں ہے۔

میں بھوپال چھوڑ کر لکھنؤ کیوں آیا؟ یہ داستان ذرا مختلف ہے جس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں، بہرحال میں لکھنؤ آگیا اور خدا کا شکر ہے کہ اس طرح نقل مکانی کے سلسلہ میں جو دشواریاں عموماً پیش آتی ہیں۔ ان سے میں بالکل دوچار نہیں ہوا امین آباد میں ایک وسیع مکان کرایہ پر مل گیا۔ نگار کا ذاتی پریس قائم ہو گیا اور میں اطمینان سے اپنے کاموں میں لگ گیا۔

لکھنؤ کی فضا بھوپال سے بہت مختلف تھی، وصل بلگرامی مرحوم بھی میرے ہی مکان کے ایک حصّہ میں رہتے تھے جہاں لکھنؤ و بیرونِ لکھنؤ کے اکثر اکابر شعراء کی آمد و رفت رہتی تھی اور شعر و سخن کی بڑی دلچسپ صحبتیں ہوا کرتی تھیں، جناب ریاض خیر آبادی مرحوم بھی دونوں یہاں قیام کرتے اور ان کے لطائف سننے کے لئے اہلِ ذوق صبح و شام طرور یہاں آجاتے۔ ایک دن دورانِ گفتگو میں کسی صاحب نے مومنؔ کا ذکر چھیڑ دیا اور یہ موضوعِ سخن تادیر زیرِ بحث رہا۔ میں نے اس میں زیادہ تر تماشائی کی حیثیت سے حصّہ لیا اور نہایت تحمل کے ساتھ وہ باتیں بھی سنتا رہا جو مومنؔ کی مخالفت میں کہی جا رہی تھیں —— آخر میں مجھ سے بھی پوچھا گیا تو میں نے کہا کہ:-

"میں مومنؔ کو بڑا کامیاب غزل گو شاعر سمجھتا ہوں۔ بشرطیکہ غزل میں فلسفہ، تصوف و مذہب کو شامل نہ کیا جائے اور اسے صرف جیتی جاگتی اور چلتی پھرتی جوان، قابلِ شوخ، چنچل حسین عورتوں کے ساتھ محبت کرنے تک محدود کر دیا جائے۔"

میرے اس جواب پر "تغزّل" کے افادی و غیر افادی ہونے کی بحث چھڑ گئی جس سے مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ لیکن اسی وقت میں نے ارادہ کر لیا کہ نگار کا ایک خاص نمبر محض مومنؔ کے لئے مخصوص ہونا چاہیئے اور میں نے اس کی تیاری شروع کر دی۔ یہ ہے روئیداد مومن نمبر کی اشاعت کی جو اوّل اوّل ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ دنیائے ادب و فضلائے شعر و سخن میں یہ بالکل پہلی آواز تھی جس نے لوگوں کو مومنؔ کی طرف متوجہ کیا اور اہلِ قلم نے متعدد مضامین اس موضوع پر لکھنا شروع کئے۔

اس کے بعد مومن نمبر دوبارہ شائع کیا گیا، لیکن بغیر کسی مزید اضافے کے، اور وہ بھی ختم ہو گیا۔ لیکن اہلِ ذوق کا مطالبہ بدستور باقی رہا اور آخر کار اب تیسری بار اسے شائع کیا جا رہا ہے لیکن اتنے جدید مضامین کے ساتھ کہ اس کی ضخامت اب ۲۱۲ صفحات ہو گئی ہے (حالانکہ پہلے اس کا حجم صرف ۱۱۲ صفحات کا تھا) اور اگر اسے "جدید مومن نمبر" کہا جائے تو ایسا کہنا میری رائے میں غلط نہ ہوگا۔

نیاز

# کلام مومن پر ایک طائرانہ نگاہ

(نیاز فتحپوری)

اگر میرے سامنے اردو کے تمام شعراء متقدمین و متاخرین کا کلام رکھ کر (بہ استثنائے میر) مجھ کو صرف ایک دیوان حاصل کرنے کی اجازت دی جائے تو میں بلا تامل کہہ دوں گا کہ "مجھے کلیات مومن دے دو اور باقی سب اٹھا لے جاؤ" ایک سننے والے کے دل میں قدرتاً اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ میں ایسا کیوں کہوں گا اور اس ترجیح کا سبب کیا ہو سکتا ہے؟ اس مقالہ میں اسی سوال کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے جس سے زیادہ تر مقصود مومن کی شاعرانہ قیمت کا اندازہ کرنا ہے۔

اگر یہ صحیح ہے کہ دنیا میں حقیقتیں نہیں بدل سکتیں، تو پھر ذوقِ انسانی کے اختلافات سوائے تعبیرات کے کسی اور چیز سے متعلق ہو ہی نہیں سکتے۔ شاعری حقیقت نہیں ہے، بلکہ حقیقتوں کا اظہار ہے۔ صداقت نہیں ہے بلکہ صداقتوں کی تعبیر ہے۔ خود کوئی کیفیت نہیں ہے بلکہ کیفیت کا ایک بیان ہے اور تعبیر و بیان کا اختلاف فطرت انسانی ہے۔

انسان کی قوت شعور بہ حیثیت ایک فطری قوت ہونے کے سب میں مشترک ہے لیکن بہ لحاظ کیفیات احساس و نقوش تاثر وہ ایک دوسرے سے مختلف ہو سکتی ہے۔ انسان کا دماغ اپنی ساخت کے لحاظ سے مختلف زوایا رکھتا ہے اور انھیں زوایا کے لحاظ سے اس کے خطوطِ نظر میں انحراف پیدا ہوتا ہے اور یہی وہ نظام فطرت ہے جس نے امیال و عواطف، کیفیات و جذبات، خواہشات و داعیات میں تمائز پیدا کر کے ایک ہی جنس کے مختلف افراد میں خطوط تفریق و امتیاز کھینچ دئے اور کسی کو مومن بنا دیا، کسی کو غالب، کسی کو میر کر دیا اور کسی کو سودا۔

سورج وہی ایک چیز ہے اور اس کا طلوع و غروب وہی ایک منظر، لیکن ایک دل میں وہ مسرت و نشاط اور دوسرے دل میں ہیبت و جبروت، وہ اس کو دیکھ کر گنگنانے لگتا ہے اور یہ معبود سمجھ کر سجدے میں گر پڑتا ہے۔ پھر نہ ہر شاعر گبر ہے اور نہ ہر گبر شاعر حالانکہ اس کی شاعری اور اس کی پرستش دونوں کا سرچشمہ وہی ایک آفتاب ہے۔ موسم برشگال کا وہی ایک پپیہا ہے جو کسی دل شاد کام کے لئے شیریں پیام مسرخوشی ہے اور کسی جگہ طعن جدائی پر کوئی بردگن یہ کہنے پر مجبور ہو جاتی ہے کہ "ڈار و نکی سکھ مر دا دیا" اسی خیال کو اور زیادہ وسیع کیجئے اور داد دیجئے اس کی جس نے اس تمام طوفان کو سمیٹ کر صرف اس ایک فقرہ میں بھر دیا کہ:-

"حسنک واحد و عبارا تنا شتیٰ"

پھر جن اصول کے تحت جذبات و کیفیات میں اختلاف پیدا ہوتا ہے، انھیں اصول کے زیر اثر ان کے سمجھنے میں بھی اختلاف پیدا ہونا ضروری ہے اور اسی بناء پر نہ میں اپنی پسندیدگی پر آپ کو مجبور کر سکتا ہوں اور نہ آپ مجھ سے اپنی عدم پسندیدگی کو بجبر تسلیم

کرسکتے ہیں اور سب سے پہلے یہی دشواری ایک نقاد کے سامنے آتی ہے جو بسا اوقات اسے سیدھے راستے سے ہٹا دیتی ہے لیکن جن لوگوں نے ان دشواریوں کو محسوس کرکے اصول تنقید منضبط کئے ہیں وہ بہت محفوظ ہیں اگر ان پر عمل کیا جائے اور حقیقت یہ ہے کہ ان پر عمل کئے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔ کسی خیال پر تنقید کرنے کے لئے سب سے پہلے اصولِ فطرت پر نظر ڈالنا چاہئے اور یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ خیال کس حد تک درمیانی منازل طے کرتا ہوا فطرت کے ساتھ ساتھ چلا ہے اور اگر کوئی شخص اس طرح فیصلہ کرنے پر قادر ہو تو پھر دوسرا اصول یہ ہے کہ اس کو صرف اپنی ہی رائے پر اعتماد کرنا چاہئے اور سمجھ لینا چاہئے کہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہی صحیح ہے اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ ہیچ ہے۔ چنانچہ اسی اصول کے مطابق میں مومن کے کلام پر ایک سرسری نظر ڈالوں گا (سرسری، اس لئے کہ غائر تنقید کا ایک بسیط مضمون آپ کو اسی اشاعت میں کسی اور جگہ نظر آئے گا)

تمہید میں اس قدر عرض کرنا ضروری اسی لئے خیال کیا کہ بعد کو یہ سوال نہ پیدا ہو کہ مومن کے متعلق اظہارِ خیال کن اصول پر کیا گیا ہے۔

ہر چند یہ بالکل صحیح ہے کہ شاعر پیدا ہوتا ہے اور یہ بھی غلط نہیں کہ اس کی اس وہبی قوت کا نشو و نما ماحول سے بڑی حد تک متاثر ہوتا ہے اگر ابن المعتز شاہی خاندان سے نہ ہوتا تو بقول ابن رشیق یہ شعر بھی نہ کہہ سکتا ؎

فانظر الیہ کزورق من فضۃ قد اثقلتہ حمولۃ من عنبر

ہلال کو دیکھ کر "عنبر کے بار سے دبی ہوئی چاندی کی کشتی" کی طرف خیال منتقل ہونا اسی وقت ممکن ہے جب کسی نے ان چیزوں کو دیکھا ہو، جاہلیت عرب کے شعراء کا فطرت پرست ہونا اسی بناء پر تھا کہ سوائے مناظرِ قدرت کے کوئی اور چیز ان کے سامنے نہ تھی۔ لیکن کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک شاعر اپنے ذوقِ فطری کے خلاف کسی اور ماحول میں پہنچ جاتا ہے اور ایسی صورت میں اس پر گرد و پیش کی چیزوں کا بہت کم یا بالکل کوئی اثر نہیں ہوتا۔

مومن کا ماحول بھی وہی تھا جو غالب و ذوق کا تھا۔ سلطنت مغلیہ کا آخری چراغ، ستارۂ سحری کی طرح جھلملا رہا تھا اور شعراء عصر اسی کو غنیمت جان کر حریصانہ انداز کے ساتھ اس سے مستفید ہونے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے اس میں شک نہیں کہ انحطاط و زوال کے عام سوگوار مناظر کا اقتضاء یہی تھا کہ اس وقت کی شاعری بالکل متشائم (Pessimist) ہوتی لیکن ہمیں اس تلخ حقیقت کا اظہار کرنا پڑے گا کہ سوائے بہادر شاہ ظفر کے جو براہِ راست انقلاب کا شکار تھے اور جو پوری طرح زوالِ حکومت کا درد اپنے دل میں لئے ہوئے تھے کوئی ایک شاعر بھی اس وقت ایسا نہ تھا جو تاریخ اسلام ہند کے اس حد درجہ دردناک منظر سے متاثر ہوا ہو۔ ذوق کو ظفر کے استاد ہونے کا فخر حاصل تھا، اور وہ بالکل خلافِ ضمیر ظفر کو "شہنشاہ عالم و عالمیاں" کہہ کہہ کر اس مفلس و بے دست و پا بادشاہ کو لوٹنا چاہتا تھا۔ غالب بھی حسرت اپنے ساتھ لے گئے کہ وہ کیوں نہ ذوق کی جگہ ہوئے اور ہر چند انھوں نے اپنی خلش کو چھپانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے غالب کا یہ کہنا کہ۔

استاد شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں۔

ایک ایسی تعریض اپنے اندر پنہاں رکھتا ہے کہ اس سے زیادہ اظہارِ رشک کی شدید مثال مشکل سے کوئی اور مل سکتی ہے۔ میرے ایک فاضل دوست کا خیال تھا کہ غالب کی یہ غزل جس کا ایک بہت مشہور شعر یہ ہے :۔

وہ بادۂ شبینہ کی سرمستیاں کہاں اٹھئے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

زوالِ سلطنتِ مغلیہ کا مرثیہ ہے، لیکن یہ تاویل بالکل ایسی ہی ہے جیسے شراب کو آبِ کوثر قرار دینا۔ الغرض اس وقت کے شعراء سب کے سب اس احساس سے بالکل بیگانہ تھے، ورنہ "حماسیات" کا ایسا بے نظیر دفتر مرتب ہو جاتا کہ یا تو آج اقبال کے پیدا ہونے کی ضرورت نہ ہوتی یا ہوتی تو موجودہ سطح سے بہت زیادہ بلند و ارفع ۔ مومن بھی اس ذمی سے مستثنیٰ نہیں سمجھے جا سکتے، لیکن اسی کے ساتھ ان پر اس قدر بے غیرتی کا بھی الزام عاید نہیں ہو سکتا، کیونکہ انھوں نے نہ کبھی بادشاہ کی تعریف میں قصیدہ لکھا اور نہ کبھی امیر کو سراہا جس کی ایک وجہ تو ان کی غیور و خود دار فطرت تھی اور دوسرا سبب یہ تھا کہ وہ سمجھتے تھے ایسے وقت میں بادشاہ کی تعریف کرنا حقیقتاً زخم پر نمک چھڑکنا ہے، بلکہ زیادہ گہری نظر سے ان کے کلام کو دیکھا جائے گا، تو یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ اس وقت سیاسیات سے نابلد نہ تھے اور قومی خود داری کا جذبہ اُن میں اس قدر موجود تھا کہ جہاد پر انہوں نے ایک مثنوی ہی سپردِ قلم کر دی اور دیوان میں بھی بعض اشعار ایسے پائے جاتے ہیں جن کا روئے سخن فرنگیوں کی طرف ہے۔ بہرحال پہلی چیز جو مومن کو اپنے عہد کے دوسرے شعراء سے ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ ان کے کلام سے کسی جگہ خوئے گدایانہ کا اظہار نہیں ہوتا۔

غالب کا رشک کہیے یا خود داری اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ وہ " اپنے کافر کو خدا کو بھی نہ سونپ سکے " لیکن صاحب کے کفِ دست پر چکنی ڈلی دیکھ کر خوشامد و تملق پر مجبور ہو ہی گئے اور اسی کے ساتھ جب تنخواہ ملنے میں دیر ہوئی تو اپنے فاقوں تک کا ذکر کرنے سے احتراز نہ کیا ذوقؔ کا تو خیر ذکر ہی کیا کہ وہ اس باب میں غالب سے بھی فروتر تھے۔

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ خلاف فطرت ماحول کا اثر بہت کم یا بالکل نہیں ہوتا، وہ مومن پر منطبق ہوتا ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے شاہانہ دربار تک رسائی اور وہاں مدح سرائی کو اچھا نہیں سمجھا، لیکن ماحول کا جس قدر حصہ اُن کے احساس صحیح کو متاثر کر سکتا ہے اس سے متاثر ہوئے اور ان کا اظہار بھی انہوں نے کیا، لیکن اسی کے ساتھ یہ امر ضرور تعجب انگیز ہے کہ ایک شخص مثنوی جہاد تو لکھ سکتا ہو لیکن کوئی شہر آشوب نہ لکھے، حالانکہ معاملات حسن و عشق میں وہ بڑے بڑے ماتم خیز اشعار لکھنے کا اہل ہو۔

دوسری خصوصیت جو مومن کو اپنے دیگر ہمعصر شعراء سے ممتاز کرتی ہے، یہ ہے کہ رنگ تغزل میں ان کا کلام اس عنصر تغزل نما چیز سے بالکل پاک ہے جس کو تصوف یا عشق حقیقی سے موسوم کیا جاتا ہے، وہ خود بھی کہتے ہیں کہ :-

مومن بہشت و عشق حقیقی تمہیں نصیب ۔۔۔ ہم کو تو رنج ہو جو غمِ جاوداں نہ ہو

بظاہر یہ بات بہت ہلکی نظر آتی ہے کہ ایک شخص کا کلام تصوف کی چاشنی سے خالی نظر آئے، لیکن اگر ایک نقادِ غزل کو غزل ہی کے نقطۂ نظر سے دیکھے گا تو وہ یوں بھی تصوف کے کلام کو خارج کر دے گا، کیونکہ غزل کے اندر ایسی باتوں کا اظہار جو تغزل سے علیحدہ ہوں میرے نزدیک کوئی محمود بات نہیں ہے۔

تصوف کے حدود وہاں شروع ہوتے ہیں جہاں عقل کی پرواز ختم ہوتی ہے اور وہ فضا جو ماوراء سرحدِ عقل و شعور ہے اس کے وسعت کی کوئی انتہا نہیں، یہاں تک کہ مجانین و مجاذیب کی بے معنی باتیں وہاں کوئی نہ کوئی مفہوم اختیار کر لیتی ہیں، اس لئے میرے نزدیک تغزل میں تصوف کو شامل کر لینا، ایک غزل گو شاعر کا کمال نہیں بلکہ اس کا عجز ہے۔ مومن نے اسی دنیا کا عشق کیا اور اس میں جتنے تجربات تلخ و شیریں ہو سکتے ہیں وہ سب انھوں نے حاصل کئے، وہی ہجر و وصال کی مادی کیفیات، وہی شکوہ و شکایات وہی رقیب کا کھٹکا، وہی التجائیں، وہی تدبیریں الغرض تمام وہ جذبات جو عشاقِ محبت سے تعلق رکھتے ہیں سب مومن کے ہاں پائے جاتے ہیں، یہاں تک کہ اگر ہم مومن کے معشوق کا کیریکٹر اُن کے کلام سے متعین کریں تو کہہ سکتے ہیں کہ بازاری جنس سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا، لیکن باینہمہ مومن کا کمالِ شاعری دیکھئے کہ اگر ایک طرف وہ پستی سے اس قدر قریب ہے کہ ادنیٰ سی لغزش

بھی اسے گرا کر جرأت [illegible] انشاء کی صف میں [illegible] سکتی ہے، تو دوسری طرف بلندی کا یہ عالم ہے کہ غالب [illegible] پرواز بھی اس کی فضا تک نہیں پہونچتی [illegible] یہ سب انھیں [illegible] اندر جن کو حدود تغزل کہا جاتا ہے۔

دنیا [illegible] کتاب کے متعلق [illegible] وہ اخلاق پر اچھا اثر ڈالتی ہے یا بُرا، لایعنی سی بات ہے۔ [illegible] تنقید ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ وہ اچھی [illegible] ہے یا بری اسی لئے [illegible] انشاء، کے متعلق یہ گفتگو کرنا کہ ان کی شاعری اخلاق کو خراب کرنے والی ہے، میرے نزدیک درست نہیں، لیکن حقیقتاً فن کے لحاظ سے بھی ان کا کلام محل نظر ہے اور سخافت سے بھی احتراز نہیں کیا گیا، برخلاف مومن کے انھوں نے نہایت عریاں طور پر معاملات حسن و عشق کا اظہار کیا، لیکن اسی کے ساتھ یہ کسی جگہ فن مجروح ہوا اور نہ دنائت پیدا ہوئی ان کے ہاں ذلیل سے ذلیل جذبہ بھی نہایت بلند طریق پر ظاہر کیا، مومن کا محبوب بھی جرأت و انشار کی طرح بازاری ہی ہے۔

. . . لیکن فرق یہ ہے کہ جرأت و انشا کا عشق بھی بازاری ہے، اور مومن بہت بلندی سے دیکھتے ہیں اور اسی بلند فضا تک محبوب کو بھی لیجانا چاہتے ہیں۔ جرأت و انشا، اگر اپنی تمناؤں میں کامیاب نہیں ہوتے تو وہ ترک محبت کے لئے بھی آمادہ ہو جاتے ہیں، لیکن مومن کی پاکیزگی ذوق کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنی امید کو بھی اس عالم آب و گل سے جدا قرار دیکر ایک غیر فانی چیز بنا دیتا ہے یہاں تک کہ اس کی محبت کی فضا محبوب و جلوۂ محبوب سے بھی بے نیاز ہو جاتی ہے، چنانچہ کہتا ہے۔

قطع امید سے سر کاٹنے کو کیا نسبت مجھ میں وہ دم ہے ابھی جو ترے خنجر میں نہیں

میں نہیں سمجھتا کہ تمنا کو اس سے زیادہ رفیع و جلیل بنایا جا سکتا ہے۔

مومن کا عشق باوجود مادی ہونے کے اس درجہ ابناگی رکھتا ہے کہ وہ اپنی ہر ناکامی کا شکار خود ہی بننا پسند کرتے ہیں اور محبوب سے کوئی مطالبہ ایسا نہیں کرتے جو شان عاشقی و محبوبی کے خلاف ہو۔ زمان ہجراں میں عاشقوں یا شاعروں کا واویلا خاص چیز ہے، لیکن مومن کا ذوق اس باب میں یہ ہے۔

تا نہ پڑے خلل کہیں آپ کے خواب ناز میں ہم نہیں چاہتے کمی اپنی شب دراز میں

پھر وہ اسی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ بعض اوقات وہ اس سے بھی زیادہ قیامت ہو جاتے ہیں اور اپنی تمام تکالیف کو اس قدر صبر و ضبط کے ساتھ برداشت کرنا چاہتے ہیں کہ اس کا بیان بھی تیر و پیکاں سے کم نہیں ہوتا۔ ملاحظہ ہو یہ شعر۔

جانے دے چارہ گر شب ہجراں میں مبتلا وہ کیوں شریک ہو مرے حال تباہ میں

میرے خیال میں مومن ہی ایک ایسا شاعر ہے جو نفسیاتی رموز کو سمجھ کر شاعری کرتا ہے اور ایسی معنوی نزاکتیں پیدا کرتا ہے کہ غور سے تجزیہ کرنے کے بعد ان کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً اس کا ایک شعر ہے۔

دن رات فکر جور میں رہوں رنج اٹھانا کب تلک میں بھی ذرا آرام لوں تم بھی ذرا آرام لو

بظاہر کس قدر سادہ شعر ہے "محبوب سے کہہ رہا ہے کہ مجھ کو ستانے کی فکر میں رات دن الجھے رہنا بیکار، پریشان ہونا ہے، دیکھو دیر کے لئے اس خیال کو ترک کر کے سکون حاصل کرو" اس حد تک تو ہر شاعر کہہ سکتا تھا، لیکن یہ ٹکڑا کہ "میں بھی ذرا آرام لوں" صرف مومن ہی کے دماغ میں آسکتا تھا۔ اس فقرہ سے مومن نے اپنی نفسیات دانی کو بدرجۂ کمال ظاہر کیا ہے قابل غور امر ہے کہ مومن نے یہ کیوں کہا "میں بھی ذرا آرام لوں" ایک کھلی ہوئی وجہ تو یہ ہے کہ اس طرح وہ محبوب پر ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ "اب بھی مجھے کافی ایذا پہونچ چکی ہے اور اس لئے مزید فکر جور بیکار ہے" لیکن اس سے زیادہ گہری بات ایک اور ہے۔ فطرت انسانی ہے کہ جب کسی کے فایدہ کی بات بتائی جاتی ہے تو وہ غور کرتا ہے کہ کیوں ایسا مشورہ دیا گیا اور اس

گو کیا غرض تھی کہ وہ میرے فایدہ کی بات بتاتا۔ اس لئے گمان بد کی بنا [illegible] مشورہ قبول نہیں کیا جاتا، لیکن اگر ساتھ ہی ساتھ مشورہ دینے والا یہ بھی لکھدے کہ اس میں تھوڑا سا فایدہ میرا بھی [illegible] غور و تامل کی گنجائش باقی نہیں رہتی اور اس کو بالکل موافق فطرت سمجھ کر مان لیا جاتا ہے۔ مومن کا یہ کہنا کہ "میں بھی ذرا آرام لوں" بالکل اسی قبیل سے ہے۔

مومن نے رقیب کا ذکر کثرت سے کیا ہے اور موجودہ زمانہ میں اس کو معیوب سمجھا جاتا ہے، کیونکہ اس سے محبوب کی سیرت پر اچھی روشنی نہیں پڑتی لیکن اول تو مومن کے عہد میں اس قسم کے مضامین معیوب نہیں سمجھے جاتے تھے اور اگر ہوتے بھی تو میں نہیں کہہ سکتا کہ اگر اس قسم کے مضامین کوئی شخص مومن کی طرح لکھ سکے تو کیونکر ان کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔ جراُت و انشاء کے ہاں رقیب و دشمن کے متعلق جس قسم کے خیالات کا اظہار کیا گیا ہے وہ یقیناً دائرۂ تہذیب سے خارج ہے، لیکن مومن تو ان کا بھی ذکر صرف اپنا ہی دل خون کرنے کی حد تک کرتا ہے اور کسی جگہ حدود عاشقی سے متجاوز نہیں ہوتا۔ مثلاً :-

ذکرِ اشک غیر میں رنگینیاں  بوئے خوں آئی تری گفتار سے

---

ہے نگاہ لطف دشمن پر تو بندہ جائے ہے  یہ ستم اے بے مروت کس سے دیکھا جائے ہے

عرفی کا نہایت معرکتہ الآرا شعر ہے :-

ہمرہ غیری و می گوئی بیا عرفی تو ہم  لطف فرمودی برو کاین پائے رفتار نیست

اس میں شک نہیں کہ اسلوب بیان اور ندرت ادا کے لحاظ سے نہایت عجیب و غریب شعر ہے اور مشکل سے اس مضمون میں کسی ترقی کی گنجائش نکل سکتی ہے۔ خاص کر یہ ٹکڑا "کاین پائے رفتار نیست" عجیب لطف دے رہا ہے۔ لیکن جب مومن اسی مضمون کو پیش کرتے ہیں تو عرفی کے شعر کا یہی ٹکڑا بالکل بے معنی نظر آنے لگتا ہے۔ مومن کا ارتقاء ملاحظہ ہو :-

غیر کے ہمراہ وہ آتا ہے، میں حیران ہوں،  کس کے استقبال کو جی تن سے میرا جائے ہے

وہاں محبوب کو غیر کے ہمراہ دیکھ کر عرفی کے قدم نہیں اٹھتے اور جھنجھلا کر کہہ دیتا ہے کہ تشریف لیجایئے میں ساتھ نہیں دے سکتا۔ یہاں مومن کی جان ہی اس منظر کو دیکھ کر نکلی جا رہی ہے جس کو وہ استقبال سے تعبیر کرتا ہے۔ لیکن استقبال کس کا؟ یہ خود اس کی سمجھ میں نہیں آتا۔

مومن، عدد کی کامیابی سے آگاہ ہو چکے ہیں، لیکن باوجود اس کے احترام محبت ملاحظہ کیجیے،

جان نہ کھا وصل عدو سچ ہی سہی پر کیا کروں  جب گلہ کرتا ہوں ہمدم وہ قسم کھا جائے ہے

ان کے دیوان میں کثرت سے ایسے شعر ملیں گے جن میں عدو کی کامیابی اور اپنی حرمان نصیبی کا ذکر کیا گیا ہے لیکن ہر جگہ ایک نئی کیفیت کے ساتھ اور عشق کی پوری نیاز آگینیوں کو لئے ہوئے یہاں تک کہ ایک جگہ وہ یہ بھی کہہ گزرتا ہے :-

لے شب وصل غیر بھی کاٹی  تو مجھے آزمائے گا کب تک

میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس سے زیادہ پُر درد طریقہ فرادانی جذبات کے اظہار کا اور کیا ہو سکتا ہے۔ محبوب کی ستم رانیوں سے بیزار ہو کر ترک الفت کا خیال کبھی ان کے دل میں آتا ہی نہیں اور اگر آتا بھی ہے تو اس طرح کہ اظہار

میں صد ہزار لوتیق الفت پنہاں رہتی ہے لکھتے ہیں:۔

ہم بھی کچھ خوش نہیں وفا کرکے　　　تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

دنیائے شاعری مشکل سے ایسے ایجاز سدید، بیان جزیل اور عبارت انیق کی مثال پیش کرسکتی ہے۔
مومن اسلوب ادا اور قدرت بیان کا بادشاہ ہے وہ معمولی سی معمولی بات کا اظہار کرتا ہے تو بھی اس لطف کے ساتھ کہ اس میں جدت پیدا ہوجاتی ہے اور ذہن سامع بے اختیار اس سے لطف اُٹھاتا ہے، پھر وہ اسی سلسلہ میں جب انہونی کو ہونی اور ہونی کو انہونی ثابت کرجاتا ہے تو عجیب سماں پیدا ہوجاتا ہے۔
شبِ فراق کی انتہائی تکلیف سے مرجانا یا مرنے کی آرزو کرنا بالکل قدرتی خواہش ہے اور اگر کوئی شاعر اس کے خلاف جائے گا تو یقیناً فطری ادعا کے خلاف کرے گا، لیکن ملاحظہ ہو مومن کس حسن کے ساتھ اس کی توجیہ کرتا ہے۔

شبِ فراق میں بھی زندگی پہ مرتا ہوں　　　کہ گو خوشی نہیں ملنے کی پر ملال تو ہے

مومن کی ایک اور خصوصیت جو بہت کم کسی اور کے ہاں پائی جاتی ہے، یہ ہے کہ کہیں کہیں وہ ایسے مخفی لیکن نہایت پرکیف مفہوم کے نشانات چھوڑ جاتا ہے کہ ہر شخص کی نگاہ وہاں تک نہیں پہونچ سکتی پھر کہیں یہ خصوصیت وہ ترکیب الفاظ سے پیدا کرتا ہے۔ مثلاً:۔

کثرتِ سجدہ سے وہ نقشِ قدم　　　کہیں پامالِ سر نہ ہوجائے

---

تھا بلا [illegible] غم سکونِ جاں کے لئے　　　سخن بہانہ ہوا مرگِ ناگہاں کے لئے

---

پامال اک نظر میں قرار و ثبات ہے　　　اس کا نہ دیکھنا نگہِ التفات ہے

---

[illegible] دیکھوں　　　معلوم ہے یارو مجھے جو رنگ مرا ہے

اور کہیں بالکل سادگی سے مثلاً:

وہ آئے ہیں پشیماں لاش پر اب　　　تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

پہلے مصرعہ میں [illegible] لفظ اب سے نتیجہ کا بے معنی ہونا ظاہر کیا ہے اور دوسرے [illegible] خیال ظاہر کیا ہے [illegible] عمر بھر زندہ ہوتا اور تیری پریشانی سے فائدہ اٹھاتا، کیونکہ اس کے بعد [illegible] تو میری محبت کی قدر کرتا لیکن [illegible] اور لطیف مفہوم مومن نے پوشیدہ رکھا ہے۔ کہتا ہے "تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے" کیوں زندگی کی خواہش کی جاتی ہے، اس لئے کہ میری لاش پر وہ پشیمان آیا ہے۔ اور یہ منظر ایسا ہے کہ مجھ کو اس پر اپنی جان نثار کردینی چاہیئے۔ مومن زندگی اس لئے نہیں چاہتا کہ وہ اس سے زندگی کا لطف اٹھائے بلکہ محض اس لئے کہ محبوب کی اس ادائے انفعال پر اس کو نثار کردے۔
مومن کا ایک مخصوص انداز بیان جو غالب کے ہاں کمتر اور دوسرے شعراء کے ہاں بالکل نہیں پایا جاتا، کسی واقعہ کے بیان میں درمیانی کڑیوں کو چھوڑ جانا ہے۔ وہ تمام حالات یا واقعات کو سلسلہ کے ساتھ نہیں بیان کرتا بلکہ کوئی کوئی

بات لے کر انہیں منسلک کر دیتے ہیں اور درمیانی کڑیوں کو ملانے کی خدمت ذہن سامع کے سپرد کر دیتے ہیں پھر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ سننے والا نہایت آسانی کے ساتھ اس خلا کو پُر کر کے مفہوم تک پہونچ جاتا ہے، جیسے :-

جیب درست لائق لطف و کرم نہیں　　ناصح کی دوستی بھی عداوت سے کم نہیں

مدعا یہ ہے کہ ناصح کہتا ہے اپنی جیب و گریبان کی حالت درست کر لوں لیکن اس کی دوستی بھی عداوت ہے کیونکہ اگر اس کے کہنے پر عمل کر کے چاک جیب و داماں میں رفو کر لوں گا تو پھر محبوب کے لطف و کرم کا اہل کیونکہ اپنے آپ کو ثابت کر سکوں گا اس شعر میں یہ ٹکڑا کہ "ناصح ایسا کہتا ہے" بالکل محذوف ہے ۔ اسی زمین کا دوسرا شعر ہے :-

بے جرم پائمال عدو کو کیا کیا　　مجھ کو خیال بھی تری سر کی قسم نہیں

اس شعر میں اور زیادہ محذوفات ہیں اور ایک پوری داستان بیان کی ہے ۔ مومن محبوب کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں، نیاز عشق کو پیش کر رہے ہیں، محبوب جس نے عدو کو بے جرم پامال کر دیا ہے، مومن کی طرف مایل تو ہے لیکن اس خیال سے کہ مومن کو عدو کی بے جرم پامالی کا حال معلوم ہو گیا ہے کچھ رک رک کر مل رہا ہے اس خیال سے کہ مومن اس واقعہ کے علم کے بعد ممکن ہے التفات کی قدر نہ کرے یا بدظن ہو جائے ۔ مومن محبوب کی اس کیفیت کا اندازہ کر کے یہ خیال اس کے دل سے نکال لیتے ہیں ۔ اور یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اگر میرے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا تو مجھے کوئی پروانہ ہو گی تم التفات کرو خواہ اس کا نتیجہ وہی کیوں نہ ہو جو عدو کو بے جرم پامالی کی صورت میں برداشت کرنا پڑا ۔

دکھاتے آئینہ ہو اور مجھ میں جان نہیں　　کہو گے پھر بھی کہ میں تجھ سے بدگمان نہیں

اس شعر کا سمجھنا اس علم پر موقوف ہے کہ جب کسی کو سکتہ ہو جاتا ہے یا کسی کی موت کے متعلق پورا یقین کرنا ہوتا ہے تو اس کے چہرہ کے قریب آئینہ لے جاتے ہیں کہ اگر ذرا بھی سانس ہو گی تو آئینہ پر نم پیدا ہو جائے گا اور اس طرح حال معلوم ہو جائے گا کہ واقعی مر گیا ہے یا نہیں کبھی خلا پورا کرنے کے لئے بہت زیادہ غور کامل اور فکر عمیق کی ضرورت ہوتی ہے مثلاً :-

کیا رم نہ کرو گے اگر ابرام نہ ہو گا　　الزام سے حاصل بجز الزام نہ ہو گا

---

عدو اس اوج پر شاکی ہے شاید غصہ آجائے　　ملا دے خاک میں یہ تو بھی شکر آسماں کیجیے

---

کیا گلے ہوتے گر اوروں پر بھی رحم آجاتا　　شکر صد شکر کہ میرا سا ترا دل نہ ہوا

---

کس دن تھی اس کے دل میں محبت جواب نہیں　　سچ ہے کہ تو عدو سے خفا بے سبب ہوا

---

تھی کمین غارت لب س دہن ہنگام خواب　　شب کی بیداری سحر کا خواب رہزن ہو گیا

---

قلق کشتہ سخت جانی ہے پھر　　امید اجل آفریں ہو چکی

مومن کبھی کسی بات کو معمولی طریقہ پر ادا نہیں کرتے اور اپنے مدعا کو ایک خاص پر لطف پیچ سے ظاہر کرتے ہیں

اوراس خصوصیت سے ان کا سارا دیوان بھرپڑا ہے ۔ مثلاً انہیں یہ کہنا تھا کہ ناصح کی نصیحت بالکل بے اثر چیز ہے ، اس کو اس طرح بیان کیا :۔

بات ناصح سے کرتے ڈرتا ہوں    کہ فغاں بے اثر نہ ہو جائے

مومن کا محبوب بھی انہیں کی طرح ہے کہ جب وہ مومن کو تڑپتے ہوئے دیکھ کر طعن کرنا چاہتا ہے تو غیر کے صبر و سکون کا ذکر کرتا ہے ، شعر ملاحظہ ہو :۔

صبح سے تعریف ہے صبر و سکونِ غیر کی    کس نے شب مجھ کو تڑپتے پیشِ درد کہلا دیا

مومن کو یہ کہنا مقصود ہے کہ محبوب ان کا ذکر کرنا ہی نہیں چاہتا خواہ وہ بُرائی سے کیوں نہ ہو اُس کے اظہار کے لئے تلاش مضمون ملاحظہ ہو :۔

ذکر کر بیٹھے بُرائی ہی سے شاید میرا    اب وہ اغیار کی صحبت سے حذر کرتے ہیں

اب ایک جگہ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ شب فرقت میں خود اپنے آپ کو ہلاک کر دوں گا لیکن ملاحظہ ہو اس پامال مضمون کو کس رعنائی کے ساتھ بیان کیا ہے :۔

دشنہ چھین لے گا کیا ہمنشیں شب فرقت    آپ جب نہیں اپنے کون میری جان اپنا

اسی زمین کا ایک شعر ہے جس میں یہ ظاہر کیا ہے کہ ہم نے اس کوچہ میں اتنا زمانہ صرف کر دیا کہ شہر کی حالت بالکل بدل گئی :۔

بعد مدت اس کو برسوں پھرے تنگ آ کر    جائے جائے پھرتے ہیں پوچھتے مکاں اپنا

مدعا یہ کہنا ہے کہ ہماری ہر تحریر وہ دشمن کو دکھلا دیتا ہے ، اس کو اس طرح ظاہر کیا :۔

رازِ نہاں زبانِ اغیار تک نہ پہونچا    کیا ایک بھی ہمارا خط یار تک نہ پہونچا

یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ غیر کی تپشِ دل صحیح نہیں ہے بلکہ وہ صرف اس کی نمائش کرتا ہے اس کو یوں لکھتے ہیں :۔

ملنے نہ ملنے منع پتشہائے دل کروں    میں غیر تو نہیں کہ تماشائے دل کروں

مومن اپنے محبوب سے صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اغیار سے سرگوشیاں نہ کیجئے اس کو اس طرح ادا کرتے ہیں :۔

غیر سے سرگوشیاں کر لیجئے پھر ہم بھی کچھ    آرزو ہائے دلِ رشک آشنا کہنے کو ہیں

مدعا یہ کہنا ہے کہ تمہاری خود بینی جتنی بڑھتی جاتی ہے اس سے زیادہ میری وارفتگی میں اضافہ ہو جاتا ہے ۔ اسی کیلئے مومن نے جو قیامت خیز اندازِ بیان اختیار کیا ہے ، ملاحظہ ہو :۔

خود بینی و بیخودی میں ہے فرق    میں تم سے زیادہ کم نما ہوں

محبوب کی بے التفاتی یا دشمنی عاشق کی موت ہوتی ہے ، لیکن مومن اس کو اپنی زندگی کا سبب بتاتے ہیں ، توجیہ ملاحظہ ہو

ہیں آرزو سے مرگ کی بے التفاتیاں    جینا مرا محال تو دشمن اگر نہ ہو

مومن کے ذہن ہی میں یہ بات نہیں آسکتی کہ سوائے کاشانۂ محبوب کے کعبہ کوئی اور ہو سکتا ہے ، اندازِ بیان ملاحظہ ہو :۔

مومن سوئے شرق اس بت کافر کا تو گھر ہے    ہم سجدہ کدھر کرتے ہیں اور کعبہ کدھر ہے

گریباں کے چاک کی وسعت کو ظاہر کرنا تھا تو اس کے لئے یہ انداز بیان اختیار کیا :۔

دستِ جنوں کے جائے صدقے کہ جس سے    پھیلائے پاؤں ہم نے گریباں کے چاک میں

الغرض مومن کا یہ اندازِ بیان ان کے کلیات میں ہر جگہ نظر آتا ہے اور کوئی غزل اس رنگ سے خالی نہیں ہے۔ مومن فارسی ترکیبیں استعمال کرنے میں بھی خاص ملکہ رکھتے تھے اور اس باب میں جو چیز انھیں غالب سے ممتاز کرتی ہے، وہ ترکیبوں کی نزاکت ہے نہ کہ ان کا اغلاق۔ غالب کی فارسی ترکیبوں میں اشکال لفظی کے ساتھ اوقات معنی پیدا ہوتی ہے، برخلاف مومن کے کہ ان کے ہاں ترکیبوں کی لطافت کے ساتھ مفہوم وسیع ہو جاتا ہے ــــ اس میں شک نہیں کہ مومن و غالب دونوں نے فارسی ترکیبوں کے استعمال میں عرفی و بیدل کا تتبع کیا اور بہت سی ترکیبیں وہی یا اسی نوع کی اختیار کیں جو عرفی و بیدل کے یہاں پائی جاتی ہیں لیکن یہ بھی یقینی ہے کہ اس باب میں مومن کو نہ صرف اولیت بلکہ افضلیت حاصل ہے اور غالب کے نقوش نقش ثانی کا حکم رکھتے ہیں گو "بہتر ز اول" نہ ہوں۔ ہر چند غالب کے اردو کلام کا بڑا حصہ محض انہیں ثقیل ترکیبوں کی وجہ سے حذف ہو چکا ہے، لیکن موجودہ نسخہ میں بھی جا بجا ان کی مثالیں نظر آتی ہیں۔ مومن کے ہاں یہ ترکیبیں ان کے کلام میں اس قدر حسن و لطافت کے ساتھ ملی ہوئی ہیں کہ نہ خود غالب کی طرح مومن کو ان کے حذف کرنے کی ضرورت پڑی اور نہ دنیا نے ان کے قبول کرنے سے انکار کیا۔ ہر چند غالب کے اس شعر سے کہ :-

طرز بیدل میں ریختہ لکھنا  اسد اللہ خاں قیامت ہے

یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ غالب نے بیدل کو سامنے رکھ کر فارسی ترکیبیں استعمال کیں، لیکن یہ بھی یقینی ہے کہ اس کی تحریک پیدا ہوئی مومن کے کلام کو دیکھ کر۔ پھر چونکہ غالب اپنی فطرت کی بنا پر یہ نہ چاہتے تھے کہ لوگ مومن کا متبع سمجھیں اس لئے انھوں نے اس میں بہت زیادہ گہرا رنگ پیدا کرنا چاہا اور اس طرح کلام مومن سے امتیاز پیدا کرنے کی کوشش میں اول اول ان کے قلم سے اس قسم کے اشعار نکلے جو باوجود ثقل تراکیب کے کوئی ندرت مفہوم نہ رکھتے تھے مثلاً :-

جراحت تحفہ الماس ارمغاں داغ جگر ہدیہ  مبارکباد اسد غمخوار جان دردمند آیا

---

جز قیس کوئی اور نہ آیا بروئے کار  صحرا مگر بتنگیِ چشم حسود تھا

---

دھمکی میں مر گیا جو نہ باب نبرد تھا  عشق نبرد پیشہ طلبگار مرد تھا

---

شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا  تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا
بہ فیض بیدلی نومیدی جاوید آساں ہے  کشائش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا
ہوائے سیر گل آئینہ بے مہریِ قاتل  کہ انداز بخوں غلطیدن بسمل پسند آیا

---

شب خمار شوق ساقی رستخیز اندازہ تھا  تا محیط بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا
یک قدم وحشت سے درس دفتر امکاں کھلا  جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا
مانع وحشت خرامیہائے لیلےٰ کون ہے  خانۂ مجنوں صحرا گرد بے دروازہ تھا

لیکن جب انھوں نے محسوس کیا کہ یہ انداز شاعری نہ محمود ہے اور نہ مقبول تو مجبوراً انھیں پھر مومن ہی کی

سطح پر آنا پڑا اور اس میں شک نہیں کہ غالب اس میں بہت کامیاب ہوئے ذیل کے اشعار کو اگر آپ مومن کے اشعار میں ملا دیجئے تو امتیاز دشوار ہو جائے گا۔

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا، نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا
نوازشہائے بیجا دیکھتا ہوں، شکایتہائے رنگیں کا گلا کیا
نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں، تغافل ہائے تمکیں آزما کیا
دماغِ عطرِ پیراہن نہیں ہے غمِ آوارگیہائے صبا کیا
یہ قاتل وعدۂ صبر آزما کیوں یہ کافر فتنۂ طاقت ربا کیا

مومن کے ہاں قسم اول کا اطلاق بمفہوم بالکل ترکیب تقریباً مفقود ہے، ان کے ہاں بالکل عرفی کی سی شگفتگی پائی جاتی ہے اور کہیں کہیں وہ عرفی سے پورا استفادہ بھی کرتے ہیں۔ عرفی کے قصیدہ کا ایک شعر ہے:

دراں دیار بہ سودا رود دلم کہ دہند جوے ملال بہ عمر ابد بہ بسیاری

مومن لکھتے ہیں:۔

اہلِ بازارِ محبت کا بھی کیا سودا ہے عشرتِ عمر ابد قیمتِ غم دیتے ہیں

ذیل کی چند مثالوں سے مومن کی فارسی ترکیبوں کا صحیح رنگ معلوم ہو جائے گا۔

دیتے تکلیفِ شبِ ہجر میں آہ اپنے پاس نقدِ جاں پیشکشِ مرگ کے قابل نہ ہوا

---

یہ عذرِ امتحانِ جذبِ دل کیسا نکل آیا میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

---

مرشکِ اعتراضِ عجز نے الماس ریزی کی جگر صد پارہ ہے اندیشۂ خوں گشتہ طاقت کا

---

گر وہاں بھی یہ خموشی اثرِ افغاں ہوگا حشر میں کون مرے حال کا پرساں ہوگا

---

لگی نہیں ہے یہ چپ لذتِ ستم سے کہیں حریفِ کشمکشِ نالہ و فغاں نہ ہوا

---

گیا مجھ میں دم بھی لینے کی طاقت نہیں رہی کیوں شورِ نالہ ہائے جرا بار کم ہوا

---

پہونچے وہ لگ تربہ کو مجھے، شکوۂ بختِ نارسا نہ رہا

---

کیوں جورِ متصل سے ترے خوگر کھنچ گئے　　میں کیا حریف کشمکشِ دمبدم نہ تھا

---

شعلۂ دل کو نازِ تابش ہے　　اپنا جلوہ ذرا دکھا دینا

---

بیکاری امید سے فرصت ہے رات دن　　وہ کاروبارِ حسرت و حرماں نہیں رہا

---

صبر بعد آسائش اس تعلق پہ مشکل تھا　　عیش جاوداں نکلا رنج جاوداں اپنا
شعلۂ آہِ فلک رتبہ کا اعجاز تو دیکھ　　. . . . . . . . . .
اظہارِ شوق شکوہ اثر اس سے تھا عبث　　. . . . . . . . . .
یہ تشنہ کامی نگہِ گرم دیکھنا　　. . . . . . . . . .
ہوش ہیں آؤ مجھ میں جان نہیں　　غفلتِ جرأت آزما کب تک
جرم معلوم ہے زلیخا کا　　طعنۂ دستِ نارسا کب تک

---

غیر سے سرگوشیاں کر لیجیے پھر ہم بھی کچھ　　آرزو ہائے دل درد آشنا کہنے کو ہیں
چشمک مری وحشت پہ ہے کیا حضرتِ ناصح　　طرز نگہِ چشم فسوں ساز تو دیکھو
ارباب ہوس ہار کے بھی جان پہ کھیلے　　کم طالعی عاشق جانباز تو دیکھو
جنت میں بھی مومن نہ ملا ہائے بتوں سے　　جورِ اجل تفرقہ پرواز تو دیکھو

ان اشعار میں، اندیشۂ خوں گشتہ، آشوب گاہِ حشر غم، گرمیِ شوقِ ثنا، خموشیِ اثر فغاں، نازِ تابش، جورِ متصل، غفلت جرأت آزما، حریف کشمکش دمبدم، شوقِ شکوہ اثر کی ترکیبیں کس قدر پاکیزہ اور رنگِ تغزل میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ بعض بعض جگہ ثقیل و نامانوس ترکیبیں بھی نظر آتی ہیں لیکن کم۔

محبت میں انسان پر دو کیفیتیں طاری ہوتی ہیں، ایک وہ جس کا تعلق اس خیال سے ہوتا ہے کہ مستحقِ الفت ہم ہیں اور اس کیفیت کے تحت جو جذبات پیدا ہوتے ہیں ان میں نیازِ عشق سے زیادہ پندارِ عشق پایا جاتا ہے جس کا نتیجہ ہوتا ہے کہ شکوہ و شکایت، طنز و طعن، جلی کٹی، کی کیفیت زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے، دوسری حالت وہ ہے جب الفت میں ارتقا پیدا ہوتا ہے اور "مادی احساسات" ضعیف ہو کر ایک خاص انداز کی والہانہ شیفتگی، بے غرضانہ فتادگی، خود فراموشانہ رفتگی پیدا ہو جاتی ہے اور پھر اس وقت محبت، خیال، شوق، آرزو، بیان، غرض ہر چیز میں ایک قسم کی سادگی پائی جانے لگتی ہے اور اس میں کلام نہیں کہ بلند معیار کی غزل اسی کیفیت کا نتیجہ ہوا کرتی ہے۔

مومن کی شاعری کا عنصرِ غالب وہ ہے جو قسم اول کی کیفیت سے متعلق ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کی عاشقانہ زندگی کا اکثر حصہ اسی عہدِ پندار سے وابستہ رہا ہے، لیکن تجسس و تفحص سے معلوم ہوتا ہے کہ کبھی کبھی ان پر دوسری قسم کی بھی کیفیت طاری ہوئی تھی اور اس کیفیت کے تحت جو کچھ انھوں نے لکھا ہے وہ ایسا ہی ہے جیسا اسے ہونا چاہیے اور اس

کو پڑھنے کے بعد ہم اس فضا میں پہونچ جاتے ہیں جہاں سے میر درد کی شاعری کے حدود شروع ہوتے ہیں۔ غالباً ناموزوں نہ ہوگا اگر مثالاً چند اشعار یہاں درج کئے جائیں:۔

چھوڑا تھا، دل نہ تھا یہ موئے پر خلل گیا　　جب ٹھیس سانس کی لگی دم ہی نکل گیا
اس کوچہ کی ہوا تھی کہ میری ہی آہ تھی　　کوئی تو دل کی آگ پہ پنکھا سا جھل گیا

---

دیدۂ حیران نے تماشا کیا　　دیر تلک وہ مجھے دیکھا کیا

---

وہ حال زار ہے مرا کہ گاہ غیر سے بھی　　تمہارے سامنے یہ ماجرا بیاں نہ ہوا

---

کچھ قیس اور میں ہی نہیں سب کے سب ہوئے　　اچھا تو درد عشق کا بیمار کم ہوا

---

صبر نہیں شام فراق آپکو　　جس سے کہ بیزار تھے تم سو گیا

---

سحر تک شام سے تجھ بن یہی حالت رکھی دل نے　　نہ مجھکو چین دیتا تھا نہ آپ آرام لیتا تھا
نہ مانوں گا نصیحت پر نہ سنتا میں تو کیا کرتا　　کہ ہر ہر بات میں ناصح تمہارا نام لیتا تھا

---

روز کہتا تھا کہیں مرتا نہیں ہم مر گئے　　اب تو خوش ہو بے وفا تیرا ہی لے کہنا کیا

---

چارہ گر زنداں میں اس کے آستاں سے لیگئے　　ایک بھی میری نہ مانی لاکھ سر پٹکا کیا،

---

کیا خجل ہوں اب علاج بیقراری کیا کروں　　دھر دیا ہاتھ اس نے دل پر تو بھی دل دھڑکا کیا

---

سینہ پہ ہاتھ دھرتے ہی کچھ دم پہ بن گئی　　لو جان کا عذاب ہوا دل کا تھامنا

---

بے سیر دشت و بادیہ لگتا نہیں ہے جی　　اور اس خراب گھر میں کہ ویراں نہیں رہا

---

نارسائی سے دم رکے تو رکے　　میں کسی سے خفا نہیں ہوتا
تم مرے پاس ہوتے ہو گویا　　جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
چارۂ دل سوائے صبر نہیں　　سو تمہارے سوا نہیں ہوتا

شب اب جو ہیں زلیس پہ جبیں وقفِ آرام ہم — صبح تک رو یا کیۓ لے لیکے تیرا نام ہم
ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم — پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

---

کس کی خبر آنے کی ہے کس لئے ہے یہ بیتابی — کس لئے ہم ہیں ہردم پھرتے، آتے ہیں اور جاتے ہیں

---

دمبدم رونا ہمیں چاروں طرف تکنا ہمیں — یا کہیں عاشق ہوئے یا ہو گیا سودا ہمیں

---

جانے دے چارہ گر شبِ ہجراں میں مت بلا — وہ کیوں شریک ہو مرے حالِ تباہ میں

---

نہ پوچھو کچھ مرا احوال میری جاں مجھ سے — یہ دیکھ لو کہ مجھے طاقتِ بیاں نہیں

---

کہاں ہے تابِ نازِ برق اے کاش — جلا دے آتشِ گل آشیاں کو

---

اے ناصحو آ ہی گیا وہ فتنۂ ایام لو — ہم کو تو کہتے تھے بھلا اب تم تو دل کو تھام لو

---

صبحِ عشرت ہے وہ نہ شامِ وصال — ہائے کیا ہو گیا زمانے کو

---

آتی ہے بوئے داغِ شبِ تارِ ہجر میں — سینہ بھی چاک ہو نہ گیا ہو قبا کے ساتھ

---

سامنے سے جب وہ شوخ دلربا آ جائے ہے — تھامتا ہوں پر یہ دل ہاتھوں سے نکلا جائے ہے

---

حالِ دل کیونکر کہوں میں کس سے بولا جائے ہے — سر اٹھے بالیں سے کیا کچھ جی ہی بیٹھا جائے ہے

---

بخت بدنے یہ ڈرایا کہ کانپ اٹھتا ہوں — تو کبھی لطف کی باتیں بھی اگر کرتا ہے

---

دیوار کے گرپڑتے ہی تھمنے لگے طوفاں — اب بیٹھ کے کونے میں بھی رویا نہ کریں گے

---

اب یہ صورت ہے کہ اے پردہ نشیں — تجھ سے احباب چھپاتے ہیں مجھے

---

ہم بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے　　تم نے اچھا کیا ، نباہ نہ کی

---

بقدر جوش تڑپنے کو تھا دلے بسمل　　وہ بیقرار ہوئے آگیا قرار مجھے

انتخاب بالا پر سرسری نگاہ سے بھی یہ بات معلوم ہو سکتی ہے کہ مومن کے ان اشعار میں جن جذبات کا اظہار کیا گیا ہے وہ اُن سے بہت مختلف ہیں جو ان کے دوسرے اشعار میں پائے جاتے ہیں۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ مومن کا اصلی رنگ یہ نہیں ہے لیکن اس میں بھی شک نہیں ہو سکتا کہ اگر ان کی محبت ذرا اور بلند ہو جاتی تو پھر آج یہ جستجو نہ ہوتی کہ اردو شاعری میں دوسرا میرؔ کون ہو سکتا ہے۔

مومن کا کلیات مطالعہ کرنے کے بعد ایک شخص اس نتیجہ پر پہنچنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ اُن کی محبت کا ہدف اگر شاہدان بازاری کا طبقہ نہ تھا تو اس کا استعمال ضرور یہاں ہو سکتا تھا اور ایک عام کیفیت جو کلام مومن کے مطالعہ کے بعد انسان پر طاری ہو سکتی ہے اس کا تعلق کچھ اس قسم کے جذبات سے ہے۔ یہاں تک کہ اگر واقعی کوئی شخص اس کوچہ سے نابلد ہو تو بھی اس کے اندر اس قسم کی تحریک پیدا ہو سکتی ہے اور اگر نابلد نہ ہو تو پھر وہ اپنی کیفیات کے اندر جس قدر لطف کلام مومن سے پیدا کر سکتا ہے، اس کی کوئی حدو پایاں نہیں ہے۔

مومن کے ہاں تشبیہات تقریباً مفقود ہیں، استعارات ہیں لیکن زیادہ نہیں کنایہ کی افراط ہے اور پوری تکمیل کے ساتھ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ جو کیفیات تشبیہات کے ذریعہ سے پیدا کی جا سکتی ہیں ان کا بھی فقدان ہے۔ مثلاً محبوب کی آواز کی تعریف ایک جگہ انھوں نے اس طرح کی ہے :۔

دشنام یار طبع حزیں پر گراں نہیں　　اے ہمنفس نزاکت آواز دیکھنا

اس شعر میں کوئی تشبیہ و استعارہ نہیں ہے، لیکن نزاکتِ آواز کا بیان جس انداز سے کیا گیا ہے اس میں وہی بلکہ اس سے زیادہ اثر موجود ہے جو ایک تشبیہ کے ذریعہ سے پیدا کیا جا سکتا ہے۔ دوسری جگہ اس سے بلند ہو کر انھوں نے تشبیہ بھی دی ہے لیکن وہ تشبیہ بھی کیفیاتی ہے۔

شعلہ سا چمک جائے ہے آواز تو دیکھو

الغرض مومن نے اپنے سارے کلیات میں سوائے حکایات حسن و عشق کے اور کسی چیز سے سروکار نہیں رکھا اور اس سلسلے میں جتنے پہلو گفتگو کے نکل سکتے ہیں یا جس قدر تلخ و شیریں تجربات حاصل ہو سکتے ہیں وہ سب کے سب کسی نہ کسی صورت سے ان کے کلام میں پائے جاتے ہیں اور ان کا یہ رنگ تغزل اس قدر گہرا تھا کہ قصاید تک اسی کیفیت سے لبریز ہیں کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ اشعار کسی قصیدہ کے ہیں :۔

تم اور حسرتِ ناز آہ کیا علاج کروں　　میں نیم جاں نہ رہا امتحاں کے قابل

چلا ہی جاتا ہوں میں گو چلا نہیں جاتا　　غضب ہے شوق رسائی و دوری منزل

خدا سے ڈر بہت بیدرد ہے یہ کیا انصاف　　کہ تو جفا سے نہ ہو اور وفا سے ہوں میں خجل

وہ تند خو کہ اگر جور سے پشیماں ہو　　تو پھر عذر کرے ناز ہائے تاب گسل

---

بدگمانی نے دعا سے بھی رکھا محروم آہ　　راز دل غیر سے کس طرح میں کرتا اظہار
دھوم ہے تابش خورشید قیامت کی مگر　　مجھ سے اللہ نہ پوچھے گا عذاب شب تار
غیر کو بام پہ آ جلوہ دکھایا تم نے　　یہ نہ دیکھا کہ پڑا ہے کوئی زیر دیوار
بسکہ رسوائی و اندیشۂ بدنامی سے　　کیا کروں کر نہ سکا وحشتِ دل کا اظہار
شاد شاد آئے عیادت کو دم آخر تم　　ایسے بیدرد پہ کرتا ہے کوئی جان نثار
نیک نامی نہ ہی مجھ کو ہے تم سے سروکار　　چھوڑ دوں آج دغا گر ہو وفا سے بیزار
وہ جلے محفل دشمن میں جو ہو شمع لقا　　مجھ کو چھیڑا نہ کرو تم سے کہا ہے سو بار
آپ دیکھا، نہ سنا اور سے، پر جھوٹ نہیں　　تیری آنکھیں کہے دیتی ہیں نہ کرنا انکار

---

جوش وحشت ہے پہ ناصح نہ پنہانا زنجیر　　دیکھو دیوانہ نہ ہو، میں نہیں پابند رسوم
نوجواں جب کوئی جاتا ہے جہاں سے ناشاد　　تازہ ہوتا ہے تجھے داغ امید مرحوم
کر دیا خواہشِ بیداد نے احوال تباہ　　تو تو ظالم نہیں زنہار یہ میں ہوں مظلوم
جب منایا مجھے اس نے وہی الفت وہی جل　　یہ غلط ہے کہ اعادہ نہیں بہرِ معدوم

اسی کے ساتھ جب شوکت الفاظ اور رفعتِ خیال کی طرف توجہ کرتے ہیں تو بہتر ہے بہتر قصیدہ گو شعراء کے صف میں بھی ممتاز نظر آتے ہیں ثبوت میں وہ قصیدہ ملاحظہ کیجئے جو اس مطلع سے شروع ہوتا ہے:-

صبح ہوئی تو کیا ہوا ہے وہی تیرہ اختری　　کثرت دود سے سیہ شعلۂ شمع خاوری

مومن کی مثنویاں خاص چیز ہیں اور ان میں انھوں نے اپنی جولانی فکر کی پوری آزادیاں دکھائی ہیں ان کا ذکر کسی تفصیل کے ساتھ بیان کرنا غیر ضروری سمجھتا ہوں، کیونکہ وہ یوں بھی ہر دیکھنے والے سے اپنی داد طلب کر لیتی ہیں۔

ان کی کلیات میں علاوہ غزل، قصیدہ، مثنوی کے تضمین، ترجیع بند، تخمیس، قطعات، رباعیات، تاریخیں اور معمے بھی نظر آتے ہیں اور سخت سے سخت نقاد بھی ان کو کسی جگہ سے گرا ہوا ثابت نہیں کر سکتا۔

پھر چونکہ مومن کے ہاں ہر رنگ کا کلام اور تمام اصناف سخن میں سے ہر صنف تکمیل کے ساتھ موجود ہے اسی لئے میں لے مضمون کی ابتدا میں جو عرض کیا تھا، اسی کا اعادہ میں اخیر مضمون میں بھی کروں گا کہ "اگر میرے سامنے تمام شعراء کا کلام رکھ کر صرف ایک کے انتخاب کی اجازت دی جائے تو بلا تامل کلیات مومن اٹھا لوں گا۔"

# حکیم مومن خاں اور انکی شاعری

(سید امتیاز احمد)

## سوانح حیات

کافر باشم اگر بمرگ مومن　　چوں کعبہ سیہ پوش نباشم تا عمر　　(غالب)

ابھی ہندوستان کی نگاہوں نے ۵۷ء کا محشر زا ہنگامہ نہیں دیکھا تھا۔ مرحوم ظفر، بھارت ورش کا شہنشاہ اور اقلیم سخن کا تاجدار جلوہ آرائے سریر سلطنت تھا۔ مومن، ذوق، غالب، ممنون، آزردہ، رخشاں، شیفتہ، صہبائی، علوی کی آتش بیانیاں گرمی محفل کا باعث تھیں اور یہی وہ لوگ تھے جن کی ذات " باو در محفل شاں مشک فشاں از دم شاں" سے عبارت تھی شمع بجھنے سے پہلے بھڑکتی ہے، دلی کی یہ بہار بھی شمع سحر کا آخری شعلہ تھا۔ اس بزم سخن میں مومن کی شمع حیات سب سے پہلے گل ہوئی جس کا ماتم ایک سوگوار نے مندرجہ عنوان شعر میں کیا ہے۔

حکیم مومن خاں مومن ۱۲۱۵ھ مطابق ۱۸۰۰ء میں دہلی کے محلہ کوچہ چیلان میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام حکیم غلام نبی خاں اور دادا کا حکیم نامدار خاں تھا۔ حکیم نامدار خاں اور حکیم کامدار خاں دو بھائی شاہ عالم کے عہد حکومت میں کشمیر سے آکر دلی میں سکونت پذیر ہوئے اور شاہی طبیبوں میں داخل ہوئے۔ شاہی خدمات کے صلہ میں موضع بلاہہ وغیرہ پرگنہ نارنول میں بصورت جاگیر عطا ہوئے۔ جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے ججھر کی ریاست نواب فیض طلب خاں کو عطا کی تو پرگنہ نارنول اس میں شامل تھا۔ نواب نے اس جاگیر کے عوض میں حکیم نامدار خاں کے ورثاء کو ہزار روپیہ سالانہ پنشن مقرر کردی جس میں حکیم مومن خاں بھی شامل تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے بھی مومن کے خاندان کے چار طبیبوں کو سو روپیہ ماہوار پنشن ملتی تھی جس میں سے ایک چوتھائی ان کے والد کو ملتا تھا اور اُن کے بعد مومن خاں کو کچھ ملتا رہا۔

مومن خاں کے والد حکیم غلام نبی خاں کو حضرت شاہ عبدالعزیز قدس سرہ العزیز سے بہت ارادت تھی۔ مومن خاں جب پیدا ہوئے تو حکیم غلام نبی خاں نے شاہ صاحب کو تکلیف دی اور اسی قدسی صفت نے نومولود کے کانوں میں اذان دی شاہ صاحب ہی نے اس مولود مسعود کا نام مومن خاں تجویز فرمایا۔ گھر والوں نے اس نام کو ناپسند کیا اور حبیب اللہ نام رکھنا چاہا لیکن شاہ صاحب ہی کے

---

۱۔ اس مضمون کی تیاری میں - آبحیات از محمد حسین آزاد۔ گل رعنا از سید عبدالحی۔ شعر الہند جلد دو حصہ عبدالسلام ندوی۔ بہارستان سخن سید امداد امام اثر۔ سخن شعرا از عبدالغفور نساخ۔ بزم سخن علی خاں۔ طرز عشق و طور کلیم نورالحسن۔ قصاید مومن مرتبہ ضیاء احمد ایم۔ اے۔ گلشن بیخار شیفتہ العلم۔ زمانہ اور نگار کی پرانی جلدوں سے امداد لی گئی ہے۔ (History of U. L. by R. Saxena)

٭ مہینے اور تاریخ کا پتہ نہ چل سکا

نام سے مشہور ہوئے ۔ بعض تذکرہ نویسوں کے تجاہل کے باوجود اس نام سے ان کی شہرت دنیائے اردو میں قایم ہوئی ۔

مومن کی ابتدائی تعلیم و تربیت گھر پر ہوئی ۔ جب ذرا ہوش سنبھالا تو شفیق باپ نے شاہ عبدالقادر کی خدمت میں پہنچایا ۔ حافظہ اس بلا کا پایا تھا کہ شاہ صاحب کی زبان مبارک سے نکلا ہوا لفظ بمشکل بھولتا تھا ۔ بار ہا ایسا ہوا ہے کہ اس ذہین لڑکے نے حضرت شاہ عبدالعزیز کا وعظ ایک بار سن کر لفظ بلفظ دہرا دیا ۔ غرض مومن نے درسیات کی تکمیل ایسے گھرانے میں کی جو ایک مدت تک دلی میں اپنے علم و فضل کی بنا پر مشہور رہا ۔ مومن نے اس گھرانے کے احسان کو کبھی فراموش نہیں کیا شاہ عبدالعزیز قدس سرہ العزیز کے وصال پر وہ بے بدل تاریخ لکھی ہے کہ حق تو یہ ہے کہ حق شاگردی ادا کر دیا ۔ شعر یہ ہے ۔

دست بیداد اجل سے بے سر و پا ہو گئے　　　فقر و دیں فضل و ہنر لطف و کرم علم و عمل

درسیات کو ختم کرنے کے بعد اپنے والد حکیم غلام نبی خاں اور اپنے دونوں چچا حکیم غلام حیدر خاں اور حکیم غلام حسن خاں سے طب کی کتابیں پڑھیں اور اپنے آبائی مطب میں نسخہ نویسی کرتے رہے ۔ مگر اس کا کیا علاج کہ " ہر کہ در کان نمک رفت نمک شد " حکیم مومن خاں کی شخصیت بھی مومن شاعر کی شخصیت میں جذب ہو کر رہ گئی ۔ مومن نے طب پڑھی طبابت کی مگر وہیں تک جہاں تک ان کے عاشقانہ انداز طبیعت کا تقاضا تھا ۔ مومن کے یہاں طب نے دراصل شاعری کا جامہ پہن لیا ہے ، مثنوی قول غمیں میں حکیم مومن شاعر کے لباس میں یوں جلوہ گر ہوتے ہیں ۔

میں نے اس نبض پہ جو ہاتھ دھرا　　　ہاتھ سے میرے مرا دل ہی چلا

---

اس کو جوں ہاتھ لگایا میں نے　　　دل سے بس ہاتھ اٹھایا میں نے

---

آفتِ تازہ جو جان پر آئی　　　یہ غزل اپنی زبان پر آئی

---

کیا لگا دست دل آرام سے ہاتھ　　　دل گیا ہاتھ سے اور کام سے ہاتھ
کس کے ہاتھوں سے لگا تھا کہ جدا　　　نہیں ہوتا دل ناکام سے ہاتھ
ہاتھ دیتے تو ہوا ب ہاتھ میں ، پر　　　کان پر رکھے گا پھر نام سے ہاتھ
کیا کہوں آہ بقولِ مومن　　　دل گیا ہاتھ سے اور کام سے ہاتھ

ادب اردو اس غزل کے لئے مومن کی طبابت کی زیر بار احسان ہے ۔ اس غزل کی سرگزشت شیفتہ کی زبان سے سنئے ۔ گلشن بیخار میں صاحب معروف بہ صاحب جی کے تذکرہ میں فرماتے ہیں کہ " نام امۃ الفاطمہ بیگم معروف بہ صاحب جی بتقریب مداوا با مومن خاں کارش افتادہ چند کار بادرو دوا بود مثنوی قول غمیں کہ از خان معزے الیہ است شرح نسخہ نام جس و جمال بہماں موزوں قد است "

مومن کی بے چین طبیعت کب تک طب کی گرویدہ رہتی وہ نجوم کی طرف مائل ہوئی اسے بھی ماہرین فن سے حاصل کیا اول میں بھی دستگاہ بہم پہونچائی آب حیات میں بعض واقعات بھی درج کیے گئے ہیں ۔ جن سے مومن کے احکام نجوم کی صحت پر روشنی پڑتی ہے ۔

مومن کی اختر شناسی بھی ان کی عاشقانہ طبیعت کے لئے ایک تازیانہ ثابت ہوئی۔ دنیا میں کم لوگ ہوں گے جو آئندہ کی باتیں جاننے کے خواہاں نہ ہوں خصوصاً صنف لطیف۔ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ مومن خاں ابتدائے شباب میں زندہ دل، یار باش، آزاد مشرب، رنگین طبع، وارفتہ مزاج آدمی تھے۔ طبابت اور اختر شناسی نے ان کے لئے اور بھی سہولتیں پیدا کر دی تھیں۔ چنانچہ نجوم سے مومن وہی کام لیتے ہیں جو ایک عاشق کو لینا چاہیئے۔ ایک بار اختر شناس آتش فراق سے جل رہا تھا، کچھ دل میں آیا زائچہ اٹھایا دیکھا تو ستارے مہربان تھے۔ امید وصل سے دل کو تسکین دی اور جوش میں اپنے مطلوب کو جا کر یوں مطلع کیا:

کہاں ہے بدر سیما وہ ترحم — کہ ہوں میں راز دانِ سیر انجم

نہیں کیا تم نے احکام آزمائے — انھیں باتوں نے تو یہ دن دکھائے

یہ سب کچھ سچ پر ابھی کہیں گے — کہ جیتے ہیں تو اک دن مل رہیں گے

سلیماں ہمدم بلقیس ہوگا — قران زہرہ و برجیس ہوگا

ابھی سے گر جفا کم ہو تو اچھا — زیادہ ربط باہم ہو تو اچھا

نہیں تو ہوگی اس کی شرمساری — کسے منظور ہے خجلت تمہاری

لیکن آسمان ہمیشہ مہربان نہیں رہتا، چنانچہ مومن بھی راز دان انجم ہونے کی حیثیت سے خود اپنی روشنی طبع کا رونا روتا ہے وہی اختر شناسی جو فراق میں وصل یار کا مژدہ سنا سکتی ہے کبھی بدنصیب منجم عاشق کو اس کی سوختہ اختری کی تلخ حقیقت سے مطلع کر کے ہمیشہ کے لئے قبل از وقت برباد کر سکتی ہے اور ایسی صورت میں یہی آرزو کی جاتی ہے کہ اگر ازل سے سوختہ اختری ہی ہماری قسمت میں تھی تو کاش ہمیں اختر شناس نہ بنایا ہوتا۔ مومن اپنی اس تیرہ اختری کو ظاہر کرنے کے لئے کتنا لطیف اور پاکیزہ اسلوب بیان اختیار کرتا ہے۔

ان نصیبوں پر کیا اختر شناس — آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا

اختر شناس عالم کے تغیرات کو ستاروں سے منسوب کرتا ہے مگر ایک شاعر جو منجم بھی ہو ان تاروں کے دام میں عرصہ تک گرفتار نہیں رہ سکتا۔ مومن پر ایک دور وہ بھی گزرا جب نجوم غالب تھا جب وہ حوادث عالم کو سیر انجم کا نتیجہ سمجھتے تھے مگر چونکہ فطرت کی طرف سے ایک شاعرانہ دل و دماغ لے کر آئے تھے اس لئے بہت جلد ان پر منکشف ہو گیا کہ پس پردہ کوئی اور قوت ہے جو ستاروں پر حکمرانی کرتی ہے۔ کوئی پردہ نشین اور ہے جو کواکب کے اثرات کو بدل سکتا ہے
مومن خاں جب تک نجوم کے زیر اثر رہے تو اپنی طبیعت کے زور سے زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکے کہ:

ان نصیبوں پر کیا اختر شناس — آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا

شعر میں علو تخیل اور تاثیر کی کمی نہیں لیکن اس دور کا شعر بھی دیکھئے جب منجم شاعر کی شاعرانہ قوتیں نجومی طاقتوں پر غالب آجاتی ہیں اُس وقت یہی شاعر آسمان کی طرف نظر اٹھاتا ہے اور حیران ہو کر پکار اٹھتا ہے کہ :۔

دن بھی دراز رات بھی کیوں ہے فراق یار میں ۔۔۔ کاہے سے فرق آگیا گردشِ روزگار میں

اب دونوں شعروں کا خود موازنہ کیجئے اور دیکھئے کہ ایک بلند خیال ناظم منجم اور ایک شاعر منجم کا زاویۂ نگاہ کہاں جاکر بدلتا ہے نجوم اور رمل حکیم مومن کی بیقرار طبیعت کو زیادہ دنوں تک سکون نہ دے سکے ۔ مومن نے شطرنج سے دل بہلانا چاہا اور اس میں بھی وہ کمال پیدا کیا کہ دلی ایسے شہر میں ان کا شمار مشہور شاطروں میں ہونے لگا ۔ کرامت علی خاں سے قرابت قریبہ تھی جو وہاں کے مشہور ترین شاطر تھے ۔ لیکن مومن کی بچلی طبیعت شطرنج ، نجوم رمل طبابت سے بہل نہیں سکتی تھی صرف ایک شاعری تھی جو البتہ اسے سکون دے سکتی اور اس منزل پر پہونچ کر ان کی طبیعت کو قرار آتا تھا ، شاعری سے خان موصوف کو طبعی مناسبت تھی ۔ ابتدا میں شاہ نصیر مرحوم کو اپنا کلام دکھایا مگر چند روز کے بعد ان سے اصلاح لینا چھوڑ دی اور پھر کسی کو استاد نہیں بنایا ، مگر پھر بھی مومن کا کلام شاہ نصیر کے رنگ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا ۔ لکھنؤ اور دہلی کے کسی دو شاعر کا رنگ ، اگر کچھ مل سکتا ہے تو وہ شیخ ناسخ اور شاہ نصیر ہیں ۔ مومن ۔ ذوق ۔ غالب تینوں نے ملکر ناسخ کا تتبع کرنا چاہا اور آخر میں ہر ایک نے اپنی شاعری کا رنگ بدل کر اعتراف عجز کیا ۔ ناسخ کا تتبع اور شاہ نصیر کی چند روزہ شاگردی بیکار نہیں گئی اور بعض غزلوں کو بے تاثیر اور بے مزہ کر کے رہی ۔ سچ تو یہ ہے کہ غالب اور مومن کی بعض غزلوں کی بے تاثیری اور پیچیدگی اسی تتبع ناسخ کا نتیجہ ہے ۔ تنقید کلام مومن کے ضمن میں ناسخ اور نصیر کے کلام نے مومن پر جو اثر کیا ہے اس پر مفصل بحث انشاء اللہ کی جائے گی ۔

مومن کے مشہور تلامذہ میں شیفتہ ۔ تسکین ۔ نسیم ۔ قلق ۔ برق اور وحشت ہیں ہر ایک کا نمونہ کلام تلامذہ مومن کے زیر عنوان نظر آئے گا ۔

## وضع ولباس

ان کی وضع وصورت کا نقشہ تذکرہ نویسوں نے یوں لکھا ہے " رنگین طبع ۔ رنگین مزاج ۔ خوش وضع ۔ خوش لباس ۔ کشیدہ قامت ۔ سبزہ رنگ ۔ سر پر لمبے لمبے گھونگر والے بال جن میں ہر وقت انگلیوں سے کنگھی کیا کرتے تھے ۔ ململ کا انگرکھا ڈھیلے ڈھیلے پائنچے اس میں لال نیفہ بھی ہوتا تھا "

" صاحب آب حیات کا بیان ہے کہ میں نے انہیں نواب علی خاں اور مرزا خدا بخش قیصر کے مشاعروں میں غزل پڑھتے ہوئے سنا تھا ۔ ایسی درد ناک آواز سے دلپذیر ترنم کے ساتھ پڑھتے تھے کہ مشاعرہ وجد کرتا تھا ۔ اللہ اللہ اب تک وہ عالم آنکھوں کے سامنے ہے ۔ باتیں کہانیاں ہوگئیں "

مومن رنگین طبع رنگین مزاج تھے اور ضرور تھے ابتدا میں ان کی عاشقانہ طبیعت نے ان کی شاعری کو چمکایا مگر شاعر کی نظر بہت جلد اس زندگی کے اسرار تک پہونچ جاتی ہے مومن کی شاعرانہ افتاد طبیعت پر یہ طرز زندگی بھی بار گزرا اور انھوں نے شاہ سید احمد سے جوانی ہی میں بیعت کرلی اور آخر وقت تک اپنے عہد کو نبھایا ۔ مومن کی شاعری پر شاہ سید احمد کی تعلیمات کا اثر بھی نمایاں ہے ، ایک غزل کے مقطع میں فرماتے ہیں :۔

شوق بزم احمد و ذوق شہادت ہے مجھے ۔۔۔ جلد مومن لے پہونچ اس مہدی دوراں تلک

طبیعت خود دار اور غیور واقع ہوئی تھی کسی دوست کا ادنیٰ احسان بھی گوارا نہ کرتے تھے ۔ دلی انہیں عزیز تھی ۔ اور وہیں قانع زندگی بسر کرتے رہے " راجہ کپور تھلہ نے انہیں ساڑھے تین سو روپیہ مشاہرہ مقرر کر کے بلایا اور ہزار روپیہ خرچ سفر بھیجا ۔

یہ آمادہ بھی ہوئے مگر جب معلوم ہوا کہ وہاں ایک گویئے کی بھی یہی تنخواہ ہے تو کہا جہاں میری اور ایک گویے کی تنخواہ ایک ہو میں وہاں نہیں جاتا اسی طرح ۱۸۴۲ء میں دہلی کالج کی پروفیسری کے لئے بلائے گئے لیکن وہ بھی منظور نہ کی۔

نواب وزیرالدولہ بہادر فرمانروائے ٹونک نے جو مومن کے پیر بھائی بھی تھے انہیں بلانا چاہا لیکن مومن نے نہ آنے کی معذرت میں ایک قصیدہ لکھ کر بھیجدیا جس کا مطلع ہے:-

یاد ایام عشرت فانی — نہ وہ ہم ہیں نہ وہ تن آسانی

اعتذار:- پر کروں کیا کہ بن نہیں آتی — ورنہ میں اور تیری مہمانی

ہے ابھی آرزوے وصل صنم — ہے ابھی حسرتِ ہوس رانی

چار پانچ بار دلی چھوڑ کر سہارنپور۔ بدایوں۔ رامپور۔ سہسوان۔ جہانگیر آباد گئے لیکن دلی کی کشش ہمیشہ وہیں کھینچ لائی۔ رامپور میں رہتے تھے مگر دلی کی یاد دل سے جاتی نہ تھی۔

دلی سے رامپور میں لایا جنونِ عشق — ویرانہ چھوڑ آئے ہیں ویرانہ تر میں ہم

دوسری بار سہسوان گئے وہاں فرماتے ہیں:-

چھوڑ دلی کو سہسواں آیا — ہرزہ گردی میں مبتلا ہوں میں

بدایوں میں بھی دلی کا خیال نہیں جاتا:-

بدایوں میں مجھے جوش جنوں لایا ہے دلی سے — یہ کیونکر چارۂ پند خردمندان ہوش آیا

خودداری اور غیرت کا یہ عالم تھا کہ طب رمل نجوم اور شاعری کو کبھی معاش کا ذریعہ نہیں بنایا اور نہ کبھی صلے کی امید میں کسی رئیس کی شان میں قصیدہ لکھا۔ نو قصیدوں میں دو مدحیہ قصیدے ہیں ایک تو اعتذار میں لکھا گیا۔ دوسرے کی شان نزول یہ ہے کہ "(ایک دن) راجہ اجیت سنگھ برادر راجہ کرم سنگھ رئیس پٹیالہ جو دہلی میں رہتے تھے اور ان کی سخاوتیں شہر میں مشہور تھیں۔ وہ ایک دن مصاحبوں کے ساتھ سرراہ اپنے کوٹھے پر بیٹھے تھے۔ خاں صاحب کا ادھر سے گزر ہوا۔ لوگوں نے کہا مومن خاں شاعر یہی ہیں۔ راجہ صاحب نے آدمی بھیج کر بلوایا۔ عزت و تعظیم سے بٹھایا کچھ نجوم کچھ شعر و سخن کی باتیں کیں اور حکم دیا کہ ہتھنی کس کر لاؤ ہتھنی حاضر ہوئی وہ خاں صاحب کو عنایت کی" شکریہ میں وہ مشہور قصیدہ مومن نے لکھا جس کا مطلع ہے:-

صبح ہوئی تو کیا ہوا ہے وہی تیرہ اختری — کثرت دود سے سیہ شعلۂ شمع خاوری

آب حیات کی عبارت ہے کہ "سوا اس قصیدہ کے اور کوئی مدح کسی دنیادار کے صلہ و انعام کی توقع پر نہیں لکھی، (اب، مک، نہ معلوم ہوسکا کہ اس قصیدہ کے پیش کرنے سے مومن کی کیا توقعات وابستہ تھیں۔ ظاہر ہے کہ یہ قصیدہ اعتراف احسان اور شکریہ میں لکھا گیا نہ کہ کسی انعام اور صلے کی توقع پر۔ مسٹر رام بابو سکسینہ کا صحیح خیال ہے کہ راجہ کا ہاتھی پیش کرنا ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کہ راجہ صاحب، مومن کی خدمت میں ہاتھی پیش کرنے کا شرف حاصل کرنا چاہتے تھے۔

ان کی تیزی ذہن اور ذکاوت طبع کی تعریف نہیں ہوسکتی وہ خود بھی ذہانت میں دو شخصوں کے سوا کسی ہمعصر کو تسلیم نہ کرتے تھے ایک مولوی اسمٰعیل صاحب اور دوسرے خواجہ محمد نصیر صاحب جو اُن کے خسر اور خواجہ میر درد کے نواسے تھے۔"

مولوی اسمٰعیل شہید، مومن خاں کے پیر بھائی تھے خواجہ محمد نصیر ان کے خسر تھے اور رنج تخلص فرماتے تھے۔ صاحب آبحیات کو معلوم تھا کہ مومن، شاہ سید احمد بریلوی کے مرید تھے معلوم نہیں کیا سمجھ کر خواجہ محمد نصیر کا مرید لکھدیا۔ رنج کے تذکرے میں حکا

طورِ کلیم نے لکھا ہے "میر محمد نصیر محمدی خلف میر کلو نبیرہ و سجادہ نشین میر درد علیہ الرحمۃ۔ مومن خاں بادے نسبت خویشی و دامادی داشت۔" رنج کا ایک شعر ہے :-

دل یہ جس کے لئے پہلو میں تپاں رہتا ہے　　یوں سنا ہے کہ اسے بھی خفقاں رہتا ہے　　(رنج)

مومن خاں نے نہ تمام عمر کسی دنیادار کی مدح کی نہ کسی کی ہجو میں اپنی زبان آلودہ کی خود فرماتے ہیں :-

ہجو گوئی نہیں ہمارا کام　　ایسی باتوں سے خامشی بہتر

آزاد نے اس بات پر بہت زور دیا ہے کہ مومن اپنے معاصرین میں کسی کو کم خیال میں لاتے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ہم دیکھتے ہیں کہ مومن کی خودستائی کی بھی عادت نہیں تھی جو عموماً شعراء کا شعار ہے ملاحظہ ہو مومن کو اپنی تعریف کرتے ہوئے روحی تکلیف ہوتی ہے۔

لاف زنی بس مدیح زمانہ کیا کروں　　اس غم تازہ سے نہیں مجھ کو امید جاں بری

حکیم مومن خاں کی شادی جیسا آگے بیان ہو چکا ہے خواجہ محمد نصیر صاحب رنج کی صاحبزادی سے ہوئی تھی ایک لڑکی ۱۲۵۹ھ میں پیدا ہوئی جس کی تاریخ ولادت ہے :-

نال کٹنے کے ساتھ ہاتف نے　　کہی تاریخ دخترِ مومن

لیکن صرف چار برس کی عمر پائی۔ تاریخ وفات ملاحظہ ہو :-

خاک، بر فرق دولتِ دنیا　　من فشاندم خزانہ بر سرِ خاک

آبِ حیات میں آزاد نے مومن خاں کے ایک صاحبزادے کا ذکر کیا ہے جن کا نام احمد نصیر خاں ہے۔

ہندوستان کے شعراء اس بارے میں بہت خوش قسمت تھے کہ ان میں سے اکثر دراز عمر ہوئے۔ کیٹس اور طرفہ کی طرح کوئی مشہور شاعر نوجوان نہیں مرا یا مارا گیا مومن نے صرف ۵۱ برس کی زندگی پائی کوٹھے سے گرنا موت کا باعث ہوا جس کی تاریخ شاعر نے خود کہی۔ دست و بازو بشکست اور حکم لگایا کہ پانچ دن یا پانچ مہینے یا پانچ برس میں مرجاؤں گا۔ وہی ہوا کہ پانچ مہینے کے بعد ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۱ء میں اس دنیا کو خیرباد کہا اور جہان آباد کی ایک شاگرد نے تاریخ وفات ماتم مومن خاں سے نکالی۔ دلی دروازے کے باہر میدھیوں کی جانب غرب حضرت شاہ عبدالعزیز علیہ الرحمۃ کے مقبرے کے پاس سپرد خاک کئے گئے۔ ۱۲۶۸ھ

مومن خاں کی تصنیفات میں اردو کلیات کے علاوہ ایک انشائے فارسی ہے جنھیں حکیم احسن اللہ خاں، مرحوم نے مرتب کیا یہ کتابیں ۱۸۵۷ء سے قبل مطبع سلطانی میں چھاپی گئی تھیں۔ مومن کے فارسی کلام کے متعلق سید عبدالحی مولف تذکرہ گل رعنا کی رائے ہے کہ "کلام فارسی ابھی اپنے رنگ میں لاجواب ہے اور جو دلفریبیاں مومن خاں کے اردو کلام کے ساتھ مخصوص ہیں وہ اس میں بھی بدرجہ اتم موجود ہیں۔" اردو کلیات، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے جمع کیا تھا۔ پھر میر عبدالرحمٰن آہی خلف میر حسن تسکین (خاں صاحب کے فرزند نسبتی) نے از سرِ نو مرتب کیا جو کئی بار چھپ چکا ہے۔

## تمہید و تنقید

یونان کے فیلسوف زینو نے دو معمے عالموں کے لئے پیش کئے تھے۔ فرض کرو کہ ایک کچھوا ایک خرگوش سے کچھ پہلے چل چکا ہے پھر بعد کو خرگوش چلتا ہے جب تک خرگوش اس جگہ پہونچے گا جہاں اس کے

---

لہ صاحب آبحیات نے نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے ایک سچے خواب کا تذکرہ کیا ہے جس میں مومن خاں مغفور کا قرآن ایک تحریر کا ذکر ہے جس میں مومن جنتی لکھا ہوا تھا۔

چلتے وقت کچھوا پہونچ چکا تھا، کچھوا کچھ آگے بڑھ جائے گا، اسی طرح جب خرگوش دوسری منزل طے کریگا کچھوا کچھ آگے بڑھ جائے گا۔ اسی طرح ایک لامتناہی سلسلہ قایم ہو جائے گا پھر خرگوش کچھوے کو پیچھے کیسے چھوڑ سکتا ہے۔

دوسرا معمہ یہ تھا کہ ہر ایک متحرک چیز جس لکیر پر چلے گی وہ ہر وقت اس لکیر کے کسی نقطے پر موجود ہوگی پھر وہ چلتی کب ہے۔ ہر مسئلہ کے غور کرنے میں یہ دقت درپیش ہوتی ہے کہ اگر وقت کبھی ٹھہرتا نہیں تو (مثلاً) بارہ کب بجتے ہیں۔ اگر کوئی تعمیر سو برس میں رفتہ رفتہ گرجاتی ہے تو وہ ہر لحظہ میں کچھ نہ کچھ مسمار ہوتی رہتی ہے پھر وہ کھڑی اور قایم کب رہتی ہے[1]۔

لیکن ان معقول اور صحیح منطقی اعتراضات کے باوجود خرگوش اس مسابقت میں کچھوے سے آگے نکل جاتا ہے۔ متحرک چیز ایک لکیر کے کسی نقطہ پر موجود ہوتے ہوئے بھی چلتی رہتی ہے۔ بارہ بجتے ہیں اور ضرور بجتے ہیں۔ گرنے والی عمارت قایم بھی رہتی ہے۔

پھر بھی ان معموں نے اس حقیقت کو مبرہن کر دیا کہ اعداد واقعات کو صحیح طور سے بیان کرنے میں قاصر ہیں۔ (حالانکہ فی زمانا جس مسئلے کو واقعات اور اعداد کی امداد سے ثابت کر دیا جائے اس کی صداقت سے انکار کرنا علمی کفر سے کم نہ ہوگا) اور معقولات کی تشریح حقایق نقص سے خالی نہیں۔ زینو نے یہ معمے پیش کر کے ثابت کر دیا کہ معقولات اور حقایق میں ضد ہے اور دونوں ایک دوسرے سے منطبق نہیں ہو سکتے کیونکہ عقل جب حرکت کو سمجھنے کی کوشش کرے گی تو اسے ساکن کر کے پس جب وہ حرکت پر کوئی حکم لگائے گی تو وہ حکم دراصل حرکت سے متعلق نہ ہوگا بلکہ سکون پر، نتیجہ یہ ہوا کہ ریاضی نے معمۂ عالم کو حل کر کے محل امتداد بنا دیا ہے۔ عقل سے معرفت اشیاء ناممکن ہے حقایق اشیاء عقل و منطق کی پرواز سے ماورا ہیں۔

یہ تمہید صرف اس غرض سے اٹھائی گئی تھی کہ پرستاران خرد، جو مشرقی شاعری کو اکثر غیر فطری اور مبالغہ آمیز کہکر عموماً نظر انداز کر دیتے ہیں انھیں معلوم ہو جائے کہ بیان اشیا کبھی فطری ہو ہی نہیں سکتا کسی پیش نظر شے کا جو خاکہ ہم پیش کرتے ہیں وہ حقیقت سے شاید اتنا ہی بعید ہوتا ہے جتنا مشرق ۔ مغرب سے کیونکہ کسی شے کا بیان ہم ہمیشہ اپنے نقطۂ نظر سے کریں گے جس کا کسی دوسرے شخص سے متحد ہونا اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے جس پتّی کو ہم سبز کہتے ہیں دوسرا بھی اسے سبز ہی کہتا ہے لیکن صرف اس وجہ سے کہ دنیا کی زبانیں ناقص ہیں اور اس منظر کے اظہار کے لئے کوئی دوسرا لفظ ان کے پاس نہیں ہے ورنہ ظاہر ہے کہ شخص غیر کا زاویۂ نگاہ اور ہمارا زاویۂ نگاہ اس وقت تک ایک نہیں ہو سکتا جب تک وہ ہمارے ہی جسم میں حلول نہ کر جائے۔ یہ محقق ہے کہ رنگ اپنے وجود کے لئے انعکاس نور کا محتاج ہے جس کے ہر مختلف زاویہ پر رنگ بدلتا جائے گا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صدق، دروغ، غلو، مبالغہ کیا چیز ہے۔ حالت تو یہ ہے کہ ہم دسترخوان پر بیٹھے ہوئے ہیں ایک صاحب نے شکایت کی کہ گوشت میں نمک تیز ہے، دوسرے نے کہدیا مجھے کم معلوم ہوتا ہے۔ تیسرا کہتا ہے نہیں ٹھیک تو ہے۔ ظاہر ہے کہ اس موقع پر ایک شخص دوسرے کی تکذیب نہیں کرتا حالانکہ ایک کا بیان دوسرے کی ضد ہے۔ ہر شخص اپنی جگہ پر سچ کہتا ہے اس مثال سے یہ معلوم ہوا کہ صحت بیان اس وقت ہوگی جب ایک شخص محسوس کرے کہ اس کا کوئی دوسرا معیار مقرر نہیں ہو سکتا۔ اسی سلسلہ میں اس حقیقت پر بھی نظر رکھنا چاہیئے کہ صحت بیانی اور صدق بیانی میں فرق ہے۔ مثال بالا میں ہر شخص نے جو محسوس کیا کہ اگر اسے صحیح لفظوں میں بیان کیا ہے تو وہ بیان صحیح ہے اور ہر شخص کا بیان

---

[1] اس عبارت کے لئے میں اپنے دوست رگھوپت سہائے کے مضمون نغمہ حقیقت کا رہین منت ہوں جو رسالۂ سہیل علیگڈھ میں شایع ہوا ہے۔ اس مضمون میں موصوف کے ایک مسودے سے بھی امداد لی گئی ۔۱۲

اپنی جگہ پر صحیح ہے مگر سب کا بیان بیک وقت سچ نہیں ہو سکتا کہنے کا حاصل یہ ہے کہ اردو شاعری کو مبالغہ آمیز کہکر جو ٹال دیا جاتا ہے وہ درحقیقت کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اگر ایک شاعر کی حس بڑھی ہوئی ہے اور اس کا بیان ہمارے محسوسات کی رو سے مبالغہ آمیز معلوم ہوتا ہے تو یہ ضروری نہیں کہ وہ مبالغہ آمیز ہی ہو۔ مثلاً مومن کہتا ہے۔ تیرے دل تفتہ کی تربت پہ عدو جھوٹا ہے۔ گل نہ نہوں گے شرر آتش سوزاں ہوں گے ۔۔ پہلی نظر میں یہ شعر صاف مبالغہ معلوم ہوتا ہے اور ہے مگر اس کا کیا علاج کہ مومن کسی طور پر یہ محسوس ہی نہیں کر سکتا کہ تیرے دل تفتہ کی تربت پر گل ہوں گے اگر ہوں گے تو شرر آتش سوزاں ہی ہوں گے۔ اس بڑھی ہوئی حس کے سامنے مبالغہ آمیز کہنے والوں اور عدو کے بیان کی کیا وقعت باقی رہ سکتی ہے۔ انداز بیان نے اس غیر فطری بیان میں بھی تاثیر پیدا کردی۔ اور اگر اس میں کامیابی ہوگئی تو شاعر کا مقصود حاصل۔ پھر بیان کا فطری یا غیر فطری ہونا دونوں برابر۔

حقایق اشیاء کی معرفت میں معقولات کی بے بسی آپ دیکھ چکے اب دیکھنا یہ ہے کہ اس میدان میں شاعری کہاں تک کامیاب ہوتی ہے، سطور ذیل میں یہی بحث ہوگی اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جائے گی کہ مومن بحیثیت شاعر دنیائے شاعری میں کہاں تک کامیاب یا ناکامیاب رہے۔

ہندوؤں نے تو شاعر کا مرتبہ فلسفی سے اونچا مانا ہے یعنی انھوں نے محسوسات کو معقولات پر ترجیح دی ہے۔ شاعری لے ہنٹ ( *Hunt - Leigh* ) کی تعریف کے بموجب، صداقت، حسن و قوت کے جذبہ کا اظہار ہے جسے شاعر اپنی تخیل کی امداد سے دائرہ حس میں لے آتا ہے اور کثرت فی الوحدت کے اصول سے زبان کو اپنا ہم آہنگ کرتا ہے۔

شاعری صرف ایک جذبہ ہے۔ کیونکہ وہ عمیق ترین تاثرات کی جستجو کرتی ہے اور یہی جذبہ کا کام ہے، تاثرات کا غلام ہونا دراصل جذبہ ہے۔

شاعری جذبہ صداقت ہے کیونکہ صداقت کے بغیر تاثرات یا تو پُر فریب ہیں یا ناقص۔

شاعری جذبہ حسن ہے کیونکہ اس کا فعل یہ ہے کہ مسرت سے اس میں چار چاند لگائے اور حُسن ہی مسرت کا بہترین مظہر ہے۔

شاعری جذبۂ قوت ہے کیونکہ قوت دراصل تاثرات کی کامیابی کا نام ہے خواہ وہ خود شاعر پر اس کے حسب خواہش طاری ہو یا شعر سننے اور پڑھنے والوں پر۔

شاعری کی دنیا وہاں سے شروع ہوتی ہے جہاں اہل فن اور اہل علم کی پرواز اپنی سرعت رفتار کے کرشمے دکھا کر رک جاتی ہے گلشن میں ایک پھول کا نام باغبان گلاب رکھ لیتا ہے ماہر نباتات کسی خاندان کی شاخ بتائے گا لیکن جب اسی پھول کو ایک شاعر دیکھتا ہے تو بے اختیار ہوکر کہہ اٹھتا ہے کہ :۔

اے گل بتو خورسندم تو بوئے کسے داری

وہ ہمیں یکایک ایک دوسرے عالم میں پہونچا دیتا ہے۔ ماہر نباتات کا نظریہ ممکن ہے آیندہ چلکر غلط ثابت ہو جائے اور گلاب کا پھول نباتات کے کسی دوسرے خاندان کی شاخ ہے، اس پر اجماع ہو جائے۔ گلاب کے بجائے روز یا ورد کہنا شروع کر دیا جائے لیکن اس میں کوئی تغیر نہ پیدا ہوگا۔ پھول کا نام بدلا جا سکتا ہے، لیکن شاعر کا قول ہمیشہ اپنی جگہ پر قایم رہے گا وہ صدق و دروغ کی رسائی سے برے ہے۔ گلاب کا پھول نباتات کی کسی شاخ سے ہو۔ شاعر کا قول ہمیشہ اس پر صادق آئے گا۔

شاعری ایک تخیلی جذبہ ہے۔ محسوسات کی دنیا شاعر کی جولانگاہ ہے۔ شعر شعور کا تابع ہے دراصل حسیات اور شعور ہی پر شعر کی عمارت قایم ہے یہ وہ عالم ہے جہاں پر معقولات کے پر جلتے ہیں اور صدق و دروغ کی تفریق جہاں بیکار ہو جاتی ہے، یہاں

دیکھنا ہے کہ مومن نے حسیات و شعور سے اپنے اشعار میں کیا کام لیا ہے۔

ایسی لذت خلش دل میں کہاں ہوتی ہے  رہ گیا سینے میں اُس کا کوئی پیکاں ہوگا

شاعر دل میں قیامت کی خلش محسوس کرتا ہے، شعور کہتا ہے کہ تیر یار کے سوا کسی اور کا یہ کام نہیں، ڈرتا ہوں کہ کہیں یہ اعتراض نہ کر دیا جائے کہ دل پر تیر تو مارا نہیں جاتا دل میں پیکاں کیونکر رہ جائے گا، لہٰذا بیان غیر فطری ہے مگر اب شاید اردو شاعری کے ایسے معترضین رہ نہیں گئے ہیں جو اردو شاعری کے رمزی ( Symbolistic ، اور کنائی ( Allegorical ) پہلو کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

کچھ قفس میں ان دنوں لگتا ہے جی  آشیاں اپنا ہوا برباد کیا

قفس میں دل کا بہل جانا آشیاں کے برباد ہونے کی علامت ہے ممکن ہے یہ نفسیاتی حقیقت بھی ہو، جس کے معلوم ہونے کا واحد ذریعہ گزشتہ تجربات ہوتے ہیں۔ لیکن نفسیاتی حقیقت کی اصلیت اتنی ہے کہ اس کی صحت کا سارا دار و مدار تجربات کی صحت پر مبنی ہے اگر تجربہ غلط ہے اور اس کی غلطی معلوم نہ ہوئی تو جو نتیجہ اس سے نکالا جائے گا وہ غلط ہوگا۔ دنیا اسی مشکل میں آج کل گرفتار ہے روزانہ نفسیات کے نظریئے بدلتے رہتے ہیں۔ اس دنیا میں شعور اور صرف شعور ایک ایسی چیز ہے جس پر اعتبار کیا جا سکتا ہے۔

ہو نہ بیتاب ادا تمہاری آج  کچھ تو کہتی ہے بیقراری آج

کائنات میں ایک حقیر سے حقیر شئے کی جنبش سے ہلچل پڑ جاتی ہے آپ نہیں خیال کر سکتے کہ ہماری ایک سانس سے فضائے عالم میں کتنا تموج پیدا ہو جاتا ہے۔ تمام کائنات کے ہر ذرے سے متاثر ہوتے ہیں اور ہر لمحہ انہیں متاثر کرتے رہتے ہیں۔ یہ فعل و انفعال کسر و انکسار اثر و تاثر ہر شئے پر ہر لحظہ اپنا کام کیا کرتے ہیں۔ شعر کی توجیہہ فلسفیانہ کیجئے عالمانہ کیجئے شاعر کو اس سے غرض نہیں اس کے شعور نے جو اسے بتایا وہ کہہ گیا۔ توجیہہ گو فلسفیانہ ہو مگر غلطی ہو سکتی ہے۔ شعر اگر تابع شعور ہے تو اس میں یہ احتمال پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہاں صرف میری بیقراری اس کی ضامن ہے کہ تمہاری ادا بے تاب ہے یہ بیان حق تو یہ ہے کہ نظریۂ فعل و انفعال و اثر و تاثر کی حد سے باہر ہے۔ بیقرار دل محسوس کر رہا ہے کہ تمہاری ادا بیتاب ہے کوئی لاکھ کہے کہ فلاں نظریہ علمی اس کے خلاف ہے۔ حسیات اور نظریۂ علمی کی تائید و تردید سے بے نیاز ہے۔

ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے  صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں

مختص شعر میں شاعر کا یہ کلیہ کہ میرا ہمیشہ ایک نہ ایک بلا میں گرفتار رہنا ضروری ہے اور جس کا ذکر وہ نہایت حسن کے ساتھ چھوڑ گیا ہے۔ گزشتہ تجربات پر مبنی نہیں ہے۔ شاعر کا نظریہ منطق استقرائی کا گراں بار احسان نہیں۔ تجربات کی بنا پر منطق استقرائی سے کام لے کر جو نتیجہ نکالا جائے گا اس میں ہمیشہ احتمال کا پہلو باقی رہے گا۔ یہ صرف شعور Instinct ہے جو شک کے حدود سے باہر ہے جو تائید و تردید سے مستغنی ہے۔

داغ دل نکلیں گے تربت سے مری جوں لالہ  یہ وہ اخگر نہیں جو خاک میں پنہاں ہوں گے

بڑھی ہوئی حس کا لازمی نتیجہ ہے کہ بیان ( Prophetic view ) ملہمانہ انداز اختیار کر لے۔ لے ہینٹ نے شاعری کی جو تعریف کی ہے (کہ شاعری صداقت و حسن و قوت کے جذبہ کا اظہار ہے جو تخیل اور تصور کی امداد سے اپنے معتقدات شعری کو محسوس کر دکھاتی ہے) اس کی رو سے مومن اردو زبان میں غالباً سب سے زیادہ کامیاب شاعر ہیں۔ اسی کے ساتھ ملٹن کی رائے بھی ذہن نشین کر لیجئے کہ "شعر کی خوبی یہ ہے کہ سادہ ہو جوش سے بھرا ہوا ہو اور اصلیت پر مبنی ہو" بہتر ہوتا اگر

جوش سے بھرا ہونے کے بجائے "پُرتاثیر" کہدیا جاتا - پرتاثیر زیادہ جامع لفظ ہے - صاحب مراۃ الشعر کا خیال ہے کہ اس سے زیادہ کیا کہا جا سکتا ہے کہ "اچھا شعر حسن خیال - حسن الفاظ - حسن ادا کا مجموعہ ہے" - مومن کے یہاں ہزاروں جواہر پارے ایسے پائے جاتے ہیں جن میں یہ خوبیاں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں - چند مثالیں ملاحظہ ہوں :-

دیدۂ حیراں نے تماشا کیا　　دیر تلک وہ مجھے دیکھا کیا

اس شعر کو لے ہینٹ کے معیار سے دیکھئے کہ صداقت و حسن و قوت کے جذبے کا اظہار کس حُسن کے ساتھ کیا گیا ہے - عمیق ترین تاثرات قوت کا دوسرا نام ہے - صداقت تاثرات اور احساس کی قوت کا نتیجہ ہے اور خود صداقت حُسن کے سوا کوئی دوسری چیز نہیں، یہ تینوں جذبے جو بظاہر مختلف مگر حقیقتاً ایک ہیں، اس شعر میں بھی اسی طرح بیک وقت متحد اور مختلف پائے جاتے ہیں - یہ صرف شعر کی دنیا ہے جہاں اجتماع بلکہ اتصال ضدین ممکن ہے اور یہی جگہ ہے جہاں مومن شعرائے عالم کی صف میں ممتاز نظر آتا ہے - یہ بحث آپ کو انشاء اللہ آیندہ صفحات میں ملے گی - فی الحال مومن کے کلام سے لطف اندوز ہوجیئے یہاں نظریہ اثر و تاثر دیکھئے - تجلّی یار نے دیدۂ مشتاق کو کثرت انوار سے دیدۂ حیراں بنایا اور دوست کو دیدہ حیراں کے انداز حیرانی نے محو حیرت کیا یہی وہ جگہ ہے جہاں حبیب و محبوب طالب و مطلوب میں امتیاز باقی نہیں رہتا یہیں وحدت فی الکثرت کے جلوے نظر آتے ہیں - اس شعر میں اگر ایک طرف صداقت حُسن و قوت کا جذبہ موجود ہے تو دوسری طرف حسن ادا اور اسلوب بیان کی بھی بہترین مثال ہو سکتا ہے -

آپ کی کون سی بڑھی عزت　　میں اگر بزم میں ذلیل ہوا

میرا ذلیل ہونا آپ کی عزت کو بڑھا نہیں سکا یہ عالمگیر صداقت ہے جس کے تسلیم کرنے میں کم لوگوں کو تامل ہوگا کہ کسے نہیں معلوم کہ میری ذات کا اثر اس ذات پر بھی پڑے گا جس سے مجھے دور کا بھی تعلق ہے - ذرہ کو اگر آفتاب سے نسبت ہے تو ذرہ کا ہر حسن و قبیح بجائے اس کے کہ وہ ذرے کی ذات کے لئے باعث فخر و ذلت ہو آفتاب سے بھی متعلق ہوگا - اس عالمگیر صداقت کو ایک فلسفی بھی خشک طریقے سے بیان کردے گا - ایک ادیب ممکن ہے اپنے زور بیان سے اس میں دلچسپی پیدا کر سکے مگر یہ صرف شاعر کا قلم ہے جو صرف ایک عالمگیر صداقت بیان کرتا ہے مگر اسی کے ساتھ اپنا دل بھی نکال کر رکھ دیتا ہے - کولرج کا قول ہے کہ جذبات نہایت صفائی سے ادا ہوجائے سمجھ لو کہ وہ سطحی نہیں ہے " مومن کا یہ سادہ مگر عمیق شعر ایک معنوی مجسمہ ہے جو حسن ادا حسن خیال حسن الفاظ سے یکسر تیار کیا گیا ہے -

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا　　جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

ڈبلیو - بی - ایٹس ( W. B. Yeats ) شاعری کی تعریف کرتا ہے کہ " وہ مجاز و حقیقت کی تزویج ہے " - اس شعر کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ کونین کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے ہے ایک طرف اگر عارف سمجھتا ہے کہ ترک ماسوا کے بعد جلوہ حسن ازل نصیب ہوتا ہے تو دوسری طرف میں دیکھتا ہوں کہ مومن بھی منصور کے ساتھ انا الحق کہنے میں ہم آواز ہے - جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا اس وقت تم گویا میرے پاس ہوتے ہو - لیکن مشکل یہ ہے کہ جب دوسرا نہ ہوگا تو سوائے 'میں' کے کوئی دوسری ذات میرے پاس موجود نہ ہوگی کوئی دوسری ذات دوسری نہ ہوتے ہوئے اسی وقت میرے پاس ہو سکتی ہے جب وہ بھی 'میں' ہو جائے یہاں لفظ گویا نے 'تم' کو 'میں' میں جذب کر رکھا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ مجاز میں تمہارے خیال کا فایدہ اٹھایا جا سکتا ہے - بہرحال یہ شعر شاعری کے ہر معیار پر پورا اترتا ہے اور دنیا کے بڑے سے بڑے شاعر کے لئے مایۂ ناز ہو سکتا ہے :-

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے　　ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

سادگی کی تصریح کرتے ہوئے مولانا حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں لکھا ہے کہ "سادگی سے صرف لفظوں ہی کی سادگی مراد نہیں ہے بلکہ خیالات بھی ایسے نازک اور دقیق نہ ہونے چاہئیں جن کے سمجھنے کی عام ذہنوں میں گنجائش نہ ہو۔ محسوسات کے شارع عام پر چلنا۔ بے تکلفی کے سیدھے راستے سے اِدھر اُدھر نہ ہونا اور فکر کو جولانیوں سے باز رکھنا اسی کا نام سادگی ہے" لیکن یہ واضح رہے کہ سادگی ایک اچھے شعر کے لئے زیادہ سے زیادہ زیور کا کام دے سکتی ہے۔ وہ شعر کا حسن بڑھا سکتی ہے۔ مگر اپنی جگہ پر چنداں قابل اعتنا نہیں۔ معنی سے بے نیاز شعر کے لئے سادگی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ محض سادگی اردو کے دوسرے نمبر کے شعراء میں بالافراط نظر آتی ہے لیکن جو سادگی حسن ہے وہ یہاں صرف دردؔ، میرؔ، مومنؔ اور کبھی کبھی غالبؔ کے یہاں نظر آتی ہے۔ مومنؔ اپنے علوئے تخیل اور نزاکت تخیل کے سبب سے طبقۂ عوام میں مقبول نہیں جس کا اصل سبب بقول صاحب تذکرۂ گلِ رعنا یہ ہے کہ "مومنؔ کو حالی جیسا نقاد نہیں ملا۔" اسی شعر کو لے لیجیے۔ شاعری کی وہ کون سی خوبی ہے جو اپنے پورے آب و تاب کے ساتھ اس میں جلوہ گر نہیں۔ انہیں چند سادہ الفاظ میں معانی کا ایک دریا ہے کہ موجیں لے رہا ہے۔

ہوگئی دو روز کی الفت میں کیا حالت ابھی مومنؔ وحشی کو دیکھا اس طرف سے جائے تھا

اچھے شعر کی خوبیاں اچھے اشعار دیکھ کر متعین کی گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ شاعری منطق نہیں جس میں استقراء سے کام لیا جائے۔ صرف ذوقِ سلیم شعر کا لطف لے سکتا ہے۔ اسی شعر کو لے لیجیے۔ نہ تخیل کی نزاکت ہے نہ خیال کی ندرت ہے نہ اسلوب بیان میں کوئی جدت ہے مگر انہیں الفاظ میں ایسی تاثیر ہے جو ارباب ذوق کو تڑپا سکتی ہے۔

جراح کیا سوچا بتا، کیا رنگ دیکھا کیا ہوا؟ کیوں کھول لی پٹی مرے زخم جگر سے باندھ کر

زخم کے ناقابل شفا ہونے کی موثر حالت کھینچنے کے لئے اس سے بہتر شاید ہی کوئی اسلوب بیان ہاتھ آسکے۔ شاعر نے آپ کے سامنے سارے واقعات ایک ایک کر کے پیش کر دئے ہیں۔ کسی نتیجہ پر پہونچنا آپ کا کام ہے ایک صاحب فن کا جو فرض تھا اس نے اس کو انجام تک پہونچا دیا۔ اب ذرا ماہرِ فن کا کمال دیکھیے۔ جراح نے زخم پر پٹی باندھی اور باندھ کر کھول لی۔ صرف اتنا مواد موجود ہے شاعر کو اتنے سے مواد میں ثابت یہ کرنا ہے کہ جراح خاموش ہے۔ مجروح بے قرار ہے اور جراحت ناقابل شفا ہے تینوں حالتوں کا تذکرہ نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن الفاظ خود یہ معنی پیدا کرتے ہیں۔ جراح نے پٹی زخمِ جگر سے باندھی اور کھول لی ظاہر ہے کہ پٹی باندھ کر کھولنا کسی سبب پر مبنی ہوگا۔ مجروح جراح کے اس فعل کو دیکھ کر سوال کر اٹھتا ہے "جراح کیا سوچا بتا" مگر کوئی جواب نہیں ملتا۔ دوسرے سوال کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے "کیا رنگ دیکھا" مگر جراح کی طرف سے خاموشی کے سوا دوسرا جواب نہیں، زخمی پھر پوچھتا ہے "کیا ہوا"۔ یہاں آکر مصرع ختم ہوتا ہے۔

اب جراح کا طرز دیکھیے۔ مجروح کا پے در پے سوال کرنا جو بیقراری کی علامت ہے، اور اس پر جراح کی خاموشی یہ مومنؔ ہی اتنے بڑے شاعر کا کام تھا جو اتنی کامیابی کے ساتھ اپنے فرض سے عہدہ برآ ہوا ہے۔

آتی ہے بوئے داغ شب تار ہجر میں سینہ بھی چاک ہو نہ گیا ہو قبا کے ساتھ

دردؔ کا خیال ہے کہ لطیف تاثرات کا لطیف انداز میں بیان کرنا حقیقی شاعری ہے یہاں اندازِ بیان کی لطافت کا یہ عالم ہے کہ میرؔ و دردؔ کے سوا اردو زبان میں کسی کو نصیب نہ ہوا ہوگا۔ یہ صحیح ہے کہ خیال مبالغہ کے ساتھ بیان کیا ہے مگر تاثیر ہے کہ شعر سے ٹپکی پڑتی ہے اور مومنؔ کا کمال یہی ہے کہ اسے مبالغہ کی حدود سے نکال دیا۔ سینے کے چاک ہونے کا اپنی زبان صرف احتمال ظاہر کرتا ہے۔ لیکن سامع یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہے کہ سینہ بھی قبا کے ساتھ ضرور بالضرور چاک ہوگیا۔ میرؔ کا بھی ایک

ایسا ہی شعر ہے :۔

میرے مرنے کی حقیقت جس میں تھی ایک مدت تک وہ کاغذ نم رہا

اس شعر میں مبالغہ کے ساتھ تاثیر موجود ہے اور یہی مقصود بالذات ہے۔ بحیثیت ناقد دو ایسے شاعروں کے کمال فن کو دیکھیے۔ مومن نے سینے کے چاک ہونے کا صرف احتمال ظاہر کیا ہے۔ میر نے کاغذ نم رہے کا حکم لگا دیا، لیکن استاد تھے اور انداز بیان کی اس کمزوری کو محسوس کرتے تھے لہٰذا، ایک مدت تک، کا ٹکڑا جوڑ کر بات بنالی اور تاثیر کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ اس ٹکڑے نے کاغذ کے نم کو محدود کر دیا۔ اہل نظر ان دونوں شعروں میں دونوں اُستادانِ فن کے کمال کا موازنہ کریں تو اس نتیجے تک پہونچنے پر مجبور ہیں کہ اس مقام پر مومن زیادہ کامیاب رہے ہیں۔ مومن کے انداز بیان کی لطافت بڑھی ہوئی ہے :۔

عیش میں بھی تو نہ جاگے کبھی تم کیا جانو کہ شب غم کوئی کس طور سحر کرتا ہے

ایک طرف مومن نے اگر فارسی ترکیبوں سے اپنے کلام کی بندش کو چست تر کیا تو دوسری طرف اپنے کلام کی تاثیر کو بڑھا دیا ہے غالب نے جب سادگی اختیار کی تو بقول خود میر کا طرز آگیا۔ اردو زبان میں سادگی کی آمیزش تاثیر کے ساتھ کر دیجیے، پھر میر کے تتبع کے سوا چارہ کار نہیں اس مقام پر پہونچکر غالب نے بھی اپنی انفرادیت کھو دی جس کا انھوں نے خود اقرار کیا ہے۔ اب مومن کا کمال دیکھیے اور مثال میں یہی شعر لیجئے۔ کمال سادگی کے ساتھ انتہائی تاثیر موجود ہے۔ لیکن میر کا رنگ نہیں، مومن کی انفرادیت صاف نمایاں ہے اُردو شعراء میں مومن نے ایسی کامیابی حاصل کی ہے جس کی نظیر نہیں ملتی۔

بخت بدنے یہ ڈرایا کہ کانپ اٹھتا ہوں تو کبھی لطف کی باتیں بھی اگر کرتا ہے،

اگر شاعر کا قلم اتنی بھی تاثیر نہیں پیدا کر سکتا تو اس کا ٹوٹ ہی جانا بہتر ہے۔ مومن کی حالت یہ ہے کہ وہ سرود پر ایک زخمہ لگا کر اپنے نغموں کو ختم کر دیتا ہے، اس کی آواز فضا میں پھیلتی ہے اور محرم کے کان بقدر استعداد اس سے آشنا ہو سکتے ہیں۔ شاعر نے بخت بد کی ایذا رسانیوں کے لئے صرف "یہ ڈرایا ہے" سے ایک لطیف اشارہ کر دیا ہے۔ اس 'یہ' سے بقدر ظرف مستفید ہو جیئے اور شاعر کے کمال فن کی داد دیجیے :۔

اب یہ حالت۔ ہے کہ اے پردہ نشیں تجھ سے احباب چھپاتے ہیں مجھے

جس بلندی پر من و تو کا امتیاز اٹھ جاتا ہے، مومن نے اپنے شاعرانہ کمال سے اس کی ایک جھلک اپنے اس شعر میں دکھادی ہے تاثیر و اصلیت کے جستجو کرنے والے اس شعر میں اس تجلی کا نظارہ کر سکتے ہیں جس کے لئے صرف حقیقی شاعر کی آنکھیں بنی ہیں۔ مومن کا کمال دیکھیے کہ پردہ نشیں کی صفت جو محبوب کے لئے مختص تھی اب اپنے لئے ضروری قرار دیدی۔ اب تک وہ خود مریض سے پردہ کرتے تھے لیکن اب مریض ان سے پردہ کر رہا ہے۔ کیا اس سے زیادہ عجیب و غریب انداز بیان اپنی حزیں حالت کے اظہار کیلئے اور اس سے بہتر عشق چکاں اسلوب ادا دنیائے شاعری میں پیش کیا جا سکتا ہے ؟

ایک ناقد کا خیال ہے کہ "معشوق و محبوب کے بجائے مومن نے پردہ نشیں کا لفظ پسند فرمایا ہے۔ اور تمام دیوان میں تقریباً بیس پچیس دفعہ استعمال کیا ہے۔ اوّل تو یہ لفظ ماہ پیکر، غیرت ناہید۔ رشک آفتاب۔ آفتاب حسن وغیرہ الفاظ کے مقابلہ میں جو معشوق کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ چست اور فصیح نہیں لیکن پھر بھی اگر اس لفظ کو باندھ کر مومن کوئی خاص مضمون ادا فرماتے جب بھی کوئی بات تھی مگر نہ معلوم انھوں نے کیوں ایک غیر فصیح لفظ کو ایک فصیح لفظ پر ترجیح دیکر اس کی گردان کی" اس میں شک نہیں کہ تنقید نگار نے اپنی رائے نہایت ایماندارانہ طریقہ سے سپرد قلم کی ہے اور میں ان کی رائے کا احترام کرتے ہوئے اختلاف پر

مجبور ہوں میرا خیال ہے کہ جناب ناقد نے لفظ "پردہ نشیں" کو غیر فصیح کہنے میں احتیاط سے کام نہیں لیا۔ ماہ پارہ کو فصیح سمجھنا اور پردہ نشین کو غیر فصیح کہنا کچھ زیادہ درست نہیں معلوم ہوتا۔ نہ تو پردہ نشین کسی اصول فصاحت سے غیر فصیح ہے اور نہ ماہ پارہ کسی ایسے اصول سے فصیح ہے جس سے پردہ نشین فصیح نہ ثابت ہو۔ اگر ذوق کو معیار فصاحت تسلیم کیجئے تو اختلاف یہیں نمایاں ہے جس لفظ کو جناب ناقد غیر فصیح کہتے ہیں میں غیر فصیح ماننے کو طیار نہیں بہت ممکن ہے کہ مومن اس لفظ کو بہت سے الفاظ سے فصیح تر سمجھتے ہوں ۔ اب اس لفظ کی معنویت پر جائیے۔ تو میرا خیال ہے کہ یہ لفظ ماہ پارہ ۔ غیرت ناہید۔ رشک آفتاب۔ آفتاب حُسن سے زیادہ معنویت رکھتا ہے۔ "پردہ نشین" اور غیرت ناہید۔ رشک آفتاب۔ آفتاب حسن و ماہ پارہ میں وہی فرق ہے۔ جو حُسن پس پردہ اور حُسن بے پردہ میں ہے ۔ بہت ممکن ہے اس دور میں حُسن پس پردہ پر حُسن بے پردہ کو ترجیح دی جائے ، لیکن مومن کے عہد میں حُسن پس پردہ ہی کو ترجیح حاصل تھی ۔ پردہ نشین کا اور شعر سنئے ۔

جلوہ دکھلائے تا وہ پردہ نشیں　　میں نے دعوے کیا تحمل کا

---

ہجر پردہ نشیں میں مرتے ہیں　　زندگی پردہ در نہ ہو جائے

---

میں بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے　　تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

حیوانوں میں انسان کی امتیازی خصوصیت نطق ہے۔ یوں تو اظہار مدعا کے لئے گائے بیل سے بھی ایسے حرکات ظاہر ہوتے ہیں جن سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اس وقت وہ بھوکے ہیں اس وقت وہ پیاسے ہیں اس وقت وہ کسی خطرے سے دوچار ہیں اگر انسان نے بھی اپنی زبان سے اتنا ہی کام لیا تو کوئی وجہ نہیں کہ اسے غیر ناطق حیوانوں کی صف میں جگہ نہ دی جائے۔ میرا خیال ہے کہ نطق عقل و بیان کے مجموعے کا نام ہے ۔ کسی شئے کے بیان کرنے میں حدود سے متجاوز نہ ہونا چاہیئے منطقی اصطلاح میں اسی کو جامع و مانع بیان کہیں گے شعر امنطق کی بندشوں سے یقیناً آزاد ہیں لیکن وہ شاعری کی بندشوں سے آزاد نہیں ہو سکتے اگر شعر میں ( Accuracy of statement ) نہیں ہے تو وہ انسان کا شعر نہیں ، اس کے ہونے سے اس کا نہ ہونا بہتر ہے۔ صحت مقال کی یہ خصوصیت ہے کہ کوئی ایسا پہلو نکل ہی نہ سکے جو اسے غلط ثابت کر سکے یہ وہ جگہ ہے جہاں مومن دنیائے شاعری میں یکتائی کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ پہلے میرے خیال کو دوسروں کے اشعار روشنی میں سمجھ لیجئے اس کے بعد مومن کی اس امتیازی خصوصیت پر بحث کروں گا۔

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے　　دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں　　(میر)

مفتی صدر الدین آزردہ نے اس شعر کو قل ہو اللہ کی صورت سے تشبیہ دی تھی۔ یعنی اس کا جواب محال ہے۔ اگر آپ غور کیجئے تو یہ صرف صحت مقالی نتیجہ ہے ۔ "شاید" اور اس پر "کچھ" کے الفاظ نے مضمون کو مطلق العنان ہونے نہیں دیا شعر کی تاثیر بڑھ گئی شاعر کے قول پر کسی پہلو سے کوئی اعتراض وارد ہو نہیں سکتا یہاں نہ پرواز تخیل ہے نہ اسلوب بیان میں کوئی ندرت ہے نہ جدت ادا ہے مگر شعر ہے کہ ایک مفتی مجبور ہو کر اسے قل ہو اللہ سے مثال دیدیتا ہے ۔ اسی سلسلہ میں درد کا بھی ایک شعر سن لیجئے :-

میرے تغیر حال پر مت جا　　یوں بھی اے مہربان ہوتا ہے　　(درد)

اس شعر کے معنی بیان کرتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ شعر کا سارا لطف غارت نہ ہو جائے غور کیجئے وہ کون سی چیز ہے جو نشتر بنائے ہوئے ہے وہی صحت مقالی ہے جس کو شاعر نے دبی زبان سے "یوں بھی اے مہربان ہوتا ہے" کہا ہے۔ دنیا میں کسی کی جرأت ہے جو شاعر کے اس قول کی تکذیب کر سکتا ہے۔ ظلم ہوگا اگر صحت مقالی کی مثالیں پیش کرتے ہوئے شیفتہ، شاگرد مومن کا نہایت مشہور شعر مثالاً نہ پیش کروں:۔

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

اگر صحت مقامی کا خیال نہ رکھیے تو نہایت آسانی کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ سینے کے اندر جو آگ لگی ہوئی ہے اسی کا نام محبت ہے لیکن کیا مضمون میں کوئی لطف باقی رہ گیا۔ یہ صحت مقالی کا کوچہ ایسا ہے جہاں پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔ 'شاید' 'اک'، 'سی' یہ وہ الفاظ ہیں جو سینے کے اندر لگی ہوئی آگ کو ہوا دے رہے ہیں۔ شاید یہ بات اب واضح ہوگئی ہوگی کہ اردو زبان کے تین موثر ترین شعر کی امتیازی خصوصیت صحت مقالی ہے۔ صحت مقالی کا جو مفہوم میرے ذہن میں موجود ہے وہ کسی حد تک ان مثالوں سے واضح ہو گیا ہو۔ اب ایک بار مومن کا شعر پھر سن لیجئے:۔

میں بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی،

یہ شعر بھی انہیں شعروں میں ہے جن کی نزاکت جنبش قلم کو برداشت نہیں کر سکتی۔ حق تو یہ ہے کہ یہ شعر کسی تنقید و تبصرہ کا متحمل بھی نہیں ہو سکتا مومن نے جن جنچے تلے الفاظ میں اپنے خیال کو ظاہر کیا ہے جتنی احتیاط برتی ہے اس کا اندازہ ہونا مشکل ہے۔ ایسے اشعار جن میں صحت مقالی کا خیال رکھا جاتا ہے ان میں جتنے لفظی قیود زیادہ ہوتے ہیں معانی میں وسعت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ یہاں ذرا اس حقیقت کا تصور کیجئے کہ جو شخص مطلوب کے نباہ نہ کرنے پر شکایت کے بجائے شکر ادا کرے اس کی یاس کی دنیا کتنی وسیع ہوگی۔ 'تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی'، یہ الفاظ جس دل سے نکل سکتے ہیں اور جس قلم سے صفحۂ قرطاس پر آ سکتے ہیں وہ کس دنیا میں ہوگا۔ شاعر جس خیال کو موزوں کرنا چاہتا تھا آپ خود دیکھئے کہ اس نے کتنی کامیابی حاصل کی ہے۔ جس مایوس کے لئے برائی بھلائی ہو سکتی ہے جس کے لئے بے وفائی وفا سے کم نہیں ثابت ہوتی اس کی حالت بعینہٖ اس شخص کی سی ہے جو انتہائے یاس میں رو نہیں سکتا اور ہنسنے پر مجبور ہے۔ اس کے بعد شاعر دنیا اور اہل دنیا سے قریب تر ہو رہا ہے اور خدا جانے کیا سمجھ کر کہہ اٹھتا ہے:۔

'میں بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے'

کردیا خواہشِ بیداد نے احوال تباہ تو تو ظالم نہیں زنہار پہ میں ہوں مظلوم

میں نہیں خیال کر سکتا کہ ایک شاعر اس سے زیادہ متعین (Definite) ہو سکتا ہے۔ یہ حسنِ بیان کا معجزہ ہے کہ کسی کو کچھ کہنے کا مجھ سے کوئی حق ہی نہیں میں اگر کچھ کہہ سکتا ہوں تو صرف اپنی ہی بابت۔ کیونکر کہوں کہ تو ظالم ہے خدا جانے تو ظالم ہے یا رسول بہرحال میں تو مظلوم ہوں۔ یہ حقیقت ہے اور ناقابل انکار حقیقت۔ ہاں ہاں سچ ہے میں ہی اپنی بربادی کا باعث ہوا ہوں۔ بیشک تو ظالم نہیں۔ تجھ پر الزام نہیں۔ مگر اس کا کیا علاج کہ مجھ پر ظلم ہوا ہے۔ شاعر کا یہ بیان جس سے انتہائی احتیاط برس رہی ہے اتنے ہی زور کے ساتھ کسی کے ظالم ہونے کی حقیقت کو سامع کے دل پر نقش کرا دیتا ہے جس قدر وہ اپنی مظلومی پر زور دیتا ہے اور کسی کا ظلم بغیر کہے بلکہ انکار کے باوجود بھی آشکارا سا ہو جاتا ہے:۔

اس کوچے کی ہوا تھی کہ میری ہی آہ تھی کوئی تو دل کی آگ پہ پنکھا سا جھل گیا

'سا' کا لفظ، 'کوچے کی ہوا' اور 'میری آہ' کو پنکھا نہ بناتے ہوئے پنکھا بنا رہا ہے۔

سب تا بہ فتنہ چونک پڑے تیرے عہد میں — اک میرا بخت تھا کہ وہ بیدار کم ہوا

"کم ہوا" کہکر شاعر نے یہ محسوس کرا دیا کہ میرا بخت کبھی بیدار نہ ہوا۔

کچھ قیس اور میں ہی نہیں سب کے سب مرگئے — اچھا تو درد عشق کا بیمار کم ہوا

دیکھئے شاعر اس "کم" سے کیا کیا کام لے رہا ہے جتنے نرم لہجہ میں کہہ رہا ہے اتنا ہی زبردست اثر پیدا کر رہا ہے آرٹ (ART) اسی کا نام ہے۔

نہ جاؤں گا کبھی جنت میں میں نہ جاؤں گا — اگر نہ ہوئے گا نقشہ تمہارے گھر کا سا

---

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

یا شاذ و نادر ہی کم شاعروں کو نصیب ہوا ہے۔

یہاں تک تو میں نے اپنے اُن تاثرات کی بنا پر جو کلام مومن کے مطالعہ کے بعد مجھ پر طاری ہوئے عمومی طور پر صرف ان کیفیات کا اظہار کیا ہے جو ذوق سلیم میں ایک ہنگامہ کی سی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں اور جس میں ایک شخص اصول تنقید وغیرہ سے بھی گزر جانا چاہتا ہے لیکن چونکہ مقصود اپنے محض جذبات کا اظہار نہیں ہے بلکہ مومن کی شاعری کی صحیح قیمت متعین کرنا ہے، اس لئے میں اب اصل موضوع پر توجہ کرتے ہوئے سب سے پہلے یہ بتاؤں گا کہ ان خصوصیات شاعری کے لحاظ سے جن میں اور شعرا بھی مشترک ہو سکتے ہیں، مومن کا کیا مرتبہ تھا اور پھر یہ ظاہر کروں گا کہ اس کی انفرادیت کن خصوصیات سے متعلق تھی اور یہ کہ وہ اپنی مخصوص شاعرانہ حیثیت اور اپنے ممتاز تقدم شعری کے لحاظ سے کیا مرتبہ رکھتا تھا۔

اس موضوع پر تفصیلی نظر ڈالنے سے پہلے حکیم مومن خاں کی بابت آزاد کی رائے سن لیجئے، شاید یہ معلوم ہی ہوگا کہ جناب شمس العلماء نے خود مومن پر لکھنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی صرف کلام پر رائے ظاہر کی ہے جو خود انھیں کے قلم سے نکلی ہوئی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

"غزلوں میں ان کے خیالات نہایت نازک اور مضامین عالی ہیں اور استعارہ اور تشبیہ کے زور نے اور بھی اعلیٰ درجہ پر پہونچایا ہے ان میں معاملات عاشقانہ عجب مزے سے ادا کئے ہیں اسی واسطے جو شعر صاف ہوتا ہے اس کا انداز جرأت سے ملتا ہے اور اس پر وہ خود بھی نازاں تھے اشعار (مذکورہ) میں فارسی کی عمدہ ترکیبیں، دلکش تراشیں ہیں کہ اردو کی سلاست میں اشکال پیدا کرتی ہیں ان کی زبان میں چند وصف خاص ہیں جن کا جتلانا لطف سے خالی نہیں وہ اکثر اشعار میں "ایک شے کو کسی خاص صفت کے لحاظ سے ذات شئے کی طرف نسبت کرتے ہیں اور اس ہیر پھیر سے شعر میں عجیب لطیف لطیف بلکہ معانی پنہاں پیدا کرتے ہیں۔" یعنی آزاد بھی مومن کی نزاکت تخییل، علوئے مضامین، زور تشبیہ و استعارہ کے مداح ہیں۔ وہ گو مومن کی فارسی ترکیبوں کو عمدہ اور تراشوں کو دلکش کہتے ہیں مگر دبی زبان سے یہ بھی کہتے جاتے ہیں کہ یہ باتیں اردو کی سلاست میں اشکال پیدا کرتی ہیں۔ آزاد کی زیر خط عبارت میں کچھ سمجھ نہ سکا غالباً اس سے استعارہ بالکنایہ مراد ہے۔ یہ یاد رہے کہ کنایہ اور استعارہ بالکنایہ میں فرق ہے اگر لفظ یا جملہ غیر حقیقی معنوں میں استعمال ہوا ہے مگر اس طرح کہ حقیقی معنی بھی مراد لئے جا سکتے ہیں تو یہ کنایہ کہلائے گا اور اگر حقیقی معنی مراد نہیں لئے جا سکتے ہیں وہ استعارہ بالکنایہ ہوتا ہے جو ایک فرع تشبیہ کی ہے، بعض نقادوں نے خصوصیات مومن کے ضمن میں ندرت اسلوب بیان اور شوخی ادا پر بھی زور دیا ہے۔

ذیل میں کچھ مثالیں درج ہیں جن میں نزاکت نمایاں ہے

## نزاکتِ تخیل

مومن قدرت کی طرف سے ایک نہایت زبردست بلند پرواز تخیل لائے ہیں۔ وہ اپنی خصوصی فضا میں اُڑتے ہیں اور نہایت بلند اُڑتے ہیں اور یہاں کا نہایت ہی اعلیٰ کمال ہے اس میں شک نہیں کہ اردو شاعری مومن کی نزاکت تخیل کی مثال نہیں پیش کر سکی اب شاعری میں تخیل کا کیا درجہ ہے پہلے اسے متعین کر لیجئے پھر مومن کے کلام پر نظر ڈالئے۔ علامہ شبلی کی رائے ہے کہ۔ اگرچہ محاکات اور تخیل شعر کے عنصر ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاعری حاصل تخیل کا نام ہے اب مومن کے کلام میں تخیل کی گلکاریاں دیکھئے۔

اگر وہاں بھی یہ خموشی اثرِ افغاں ہوگا  حشر میں کون مرے حال کا پرساں ہوگا

اگر میرے نالوں کا یہی خاموش کن اثر رہا جس کے دور ہونے کی کوئی توقع نہیں تو حشر میں بھی کوئی میرا پرسان حال نہ نکلے گا۔ جس شخص کی ساری عمر نالہ و فریاد میں کٹی ہو جس کا دنیا میں کوئی پھر بھی پرسانِ حال نہ رہا ہو وہ اگر یہ نہ سوچے کہ کل بھی حشر میں یہی ہونا ہے تو کیا کرے۔ ذرا اس خموشی اثر افغاں کی وسیع المعنی ترکیب پر غور کیجئے۔ ظاہری معنی کے سوا اس ٹکڑے سے یہ معنی بھی پیدا ہوتے ہیں کہ شورِ فغاں نے سب آوازوں کو دبا دیا ہے۔ قاعدہ ہے کہ بلند آواز کے مقابل میں نیچی آواز خاموشی ہی کا حکم رکھتی ہے اور اگر یہ معنی نہ لئے جائیں تو سکوت و خاموشی کے الفاظ مہمل ہو جائیں گے۔ مثلاً سکوت شب کو لے لیجئے دن کے شور و شغب کے مقابل میں رات ساکت ہی معلوم ہوتی ہے۔ میں بھی ان لوگوں میں ہوں جو شور و سکوت میں صرف کمیت کا فرق سمجھتے ہیں میں دونوں کی کیفیت میں فرق سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ اب مومن کی تخیل کے کارنامے دیکھئے کہ اس نے شور فغاں سے شور محشر کو دبا دیا ہے اور حشر کو دنیا کے پہلو بہ پہلو لا کھڑا کیا ہے۔

بیٹھنے نہ غیر مجھے بزم سے اٹھانے پر  سبک ہے وہ جو تری طبع پر گراں نہ ہوا

مومن نے اس میں تضاد سے بہت فایدہ اُٹھایا ہے جس کی مفصل بحث انشاء اللہ آئندہ صفحات میں آئے گی۔ شاعر کی خیال آرائی دیکھیے کہ اس نے اپنی رسوائی میں بھی منطق سے کام لے کر غیر کی سبکی کا پہلو نکال ہی لیا۔ مومن محفل سے نکالے گئے اس سے بڑی سبکی اور کیا ہو سکتی ہے غیر نے بھی یہی خیال کیا اور مومن کے رسوا کیے جانے پر خندہ زن ہوا لیکن زخم رسوائی پر اغیار کی نمک پاشی دیکھی نہ گئی اور بول اٹھے کہ میرے نکالے جانے پر غیر خندہ زن کیوں ہے۔ میں تو اس وجہ سے اٹھایا گیا کہ تیری طبع نازک پر بار ہوا وہ سبک ہوں گے جبھی تو تیری طبیعت پر بار نہیں گزرے یہاں لفظ سبک سے فایدہ اٹھایا گیا جس کے ایک معنی تو ذلیل ہونے کے ہیں اور دوسرے گراں کی ضد۔ یہ مومن کا خاص انداز ہے کہ وہ کسی حالت میں اپنا فایدہ نہیں چھوڑتے۔ یہ تخیل کے کارنامے ہیں جو عزت کو ذلت اور ذلت کو عزت کر دکھاتے ہیں۔ اسی رنگ کا مومن کا دوسرا شعر ہے :۔

یاد سہواً اسے لے غیر ہے نسیاں عمداً  یاد رکھ بھول گیا جس کو وہی یاد رہا

دیت میں روز جزا لے رہیں گے قاتل کو  ہمارا جان کے جانے میں بھی زیاں نہ ہوا

سارا دیوان مومن کا نزاکت و رفعت تخیل سے بھرا ہوا ہے۔ چند مثالیں اور ملاحظہ ہوں :۔

یہ عذر امتحاں جذب دل کیسا نکل آیا  میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

عاشق فرطِ شوق سے مجبور ہو کر محبوب کی محفل میں جا پہنچا ہے اور محبت کے ثبوت میں یہ پیش کرتا ہے کہ اس کی الفت اسے وہاں کشاں کشاں لائی اگر محبوب کے دل میں بھی عاشق کی الفت ہوتی تو کوئی وجہ نہ تھی کہ اس کے ہاں نہ جاتا اس سے عیاں ہے کہ انہیں اس سے کوئی تعلق نہیں یہ سن کر محبوب فوراً کہہ اٹھا ہے کہ تمہاری دلیل بجائے اس کے کہ تمہارے لئے مفید ہو

میری موید مقصد ہے تمہارا میرے ہاں یوں بیتاب ہو کر آنا میرے جذبۂ دل کی قوت کا نتیجہ ہے اگر تم میں بھی یہ جذب کارفرما ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ میں تمہارے ہاں کھنچا کھنچا نہ چلا آتا اور کوئی وجہ نہ تھی کہ اگر تمہارا جذبۂ دل قوی تر نہ ہوتا تو مجھے اپنی طرف کھینچ نہ لیتا گویا تمہارے جذبۂ دل کی کمیت کا یہ امتحان تھا جس میں تم ناکامیاب رہے اتنے مبسوط مضمون کو مومن نے ایک شعر میں ادا کرکے کس خوبی سے دریا کو کوزے میں بند کیا ہے " یہ جناب غلام ربانی صاحب عزیز کا خیال ہے جن کا مضمون "کلام مومن پر اک نظر" اسی نمبر میں شامل ہے...... شعر کا مطلب مختصراً یہ ہے کہ عاشق محبوب سے اس کی بے نیازی کا شکوہ سنج ہوا۔ ادھر سے جواب ملا کہ میں اب تک تمہارے جذب دل کا امتحان کرتا تھا اگر تمہارا جذبۂ دل صادق ہے تو مجھے خود کھینچ بلائے گا۔

واعظ بتوں کو خلد میں لیجائیں گے کہیں ہے وعدہ کافروں سے عذاب الیم کا

بت پرست کافروں کے لئے سخت سے سخت عذاب یہ ہے کہ بت اُن سے جدا کر دئے جائیں۔ مومن کی شوخی اور ساتھ ہی ساتھ تخئیل کی بلندی دیکھئے کہہ رہا ہے کہ لے واعظ شاید بتوں کو جنت ملے گی کیونکہ کافروں سے عذاب الیم کا وعدہ ہے ایک کافر کے لئے ہجر بت کے سوا اور کوئی مصیبت نہیں۔ اگر کافر اور بت دونوں دوزخ ہی میں ڈالے گئے تو یہ عذاب الیم نہ ہوا اس سے زیادہ کافر اور کس چیز کا خواہاں ہو سکتا ہے۔ کافروں کو عذاب دینے کی ایک اور صرف ایک صورت ہے اور وہ یہی کہ انہیں کافروں سے علیٰحدہ کرکے جنت میں جگہ دی جائے۔

صبر وحشت اثر نہ ہو جائے کہیں صحرا بھی گھر نہ ہو جائے

عموماً شعراء نے جب بلند پروازی کی تو زیادہ سے زیادہ یہ کر سکے کہ گھر کو صحرا بنا دیا۔ لیکن مومن نے اس پامال روش کو چھوڑ کر اپنے لئے دوسری راہ نکالی وہ صحرا کو گھر بنا رہے ہیں۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ صحرا پر میں نے قناعت تو کرلی ہے مگر اس کا خوف ہر وقت باقی ہے کہ کہیں صحرا بھی میری جنوں جولانیوں کے لئے تنگ نہ ثابت ہو۔

رشک پیغام ہے عناں کش دل نامہ بر راہ بر نہ ہو جائے

اس رشک کا کیا ٹھکانا جس نے نامہ بر کو راہ بر بنا دیا ہے۔ نامہ بر یار کو خط دے گا زبانی پیغام کہے گا مومن سے تو یہ نہیں دیکھا جاتا اور وہ بھی نامہ بر کے پیچھے پیچھے جانے کے لئے آمادہ ہے۔

دیکھ مت دیکھیو کہ آئینہ غش تمہیں دیکھ کر نہ ہو جائے

اس شعر میں بھی رشک کا پہلو ملاحظہ ہو کہ آئینہ اس آئینہ رو کو دیکھ رہا ہے، مومن یہ نہیں دیکھ سکتا۔ لہٰذا وہ کہتا ہے للہ آئینہ مت دیکھو ڈرتا ہوں کہ کہیں تم خود آئینہ کو دیکھ کر غش نہ ہو جاؤ اس شعر کے متعدد پہلوؤں پر نظر رکھئے۔ جمال یار کی تعریف کے لئے کتنا لطیف انداز بیان اختیار کیا ہے کہ آئینہ مت دیکھو کہیں تم اپنا جمال آئینہ میں دیکھ کر خود غش نہ ہو جاؤ۔ رشک کی وجہ سے عاشق یہ نہیں چاہتا کہ مطلوب آئینہ دیکھے لیکن صاف صاف کیونکر کہے لہٰذا ایسا انداز اختیار کرتا ہے جس میں بظاہر مطلوب کا فایدہ ہو اور درپردہ اپنا۔

میرے تغیر رنگ کو مت دیکھ تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے

عاشق لاکھ اپنی مصیبتوں میں گرفتار ہو لیکن اس کے دل سے کبھی محبوب کا خیال جا نہیں سکتا۔ وہ اپنی مصیبتوں کو بھول جائے گا مگر مطلوب کو پریشان حال نہیں دیکھ سکتا۔ اس شعر میں مومن نے وہی اپنا مخصوص انداز بیان قائم رکھا ہے۔

جہاں تک تخیئل کی نزاکت کا تعلق ہے مومن کا شعر یقیناً میر کے اس شعر سے بڑھا ہوا ہے۔

میرے تغیرِ حال پہ مت جا　　اتفاقات ہیں زمانے کے

لیکن شعر میں ایک چیز تخیئل و محاکات سے بھی بڑی ہوتی ہے جس کو میں نے ایک جگہ صحت مقالی سے تعبیر کیا ہے، اس نے میر کے شعر کو مومن کے شعر سے کہیں بلند کر دیا ہے لیکن درد نے میر سے بھی اپنے شعر کو بلند تر کر دیا ہے:۔

میرے تغیرِ حال پہ مت جا　　یوں بھی اے مہربان ہوتا ہے

مرزا غالب کا شعر بھی ملاحظہ کیجئے:۔

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو　　یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

میرے خیال میں مومن کی نازک خیالی کہیں بڑھی ہوئی ہے۔ شبلی نے لکھا ہے کہ غالب نے خسرو کے اس شعر پر ترقی کی ہے:۔

جراحت جگر خستگاں چہ می پرسی　　زغمزہ پرس کہ ایں شوخی از کجا آموخت

---

ہے ایک خلق کا خوں سر پہ اشک خوں کے مرے　　سکھائی طرز اسے دامن اٹھا کے آنے کی

نازک خیال مومن اپنے انداز بیان کو کبھی ترک نہیں کرتا حسن کو وہ ہمیشہ عشق کا رہین منت ثابت کرتا ہے۔ یہاں بھی دیکھئے اشک خونیں کے ڈر سے وہ آتے ہیں تو دامن اٹھائے ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک عالم اُن کی اس ادا کا شہید ہو گیا اور عزیزوں کا خون میرے اشک خونیں یعنی میرے سر رہا۔

داغ خوں سے میرے وہ حیراں ہوا　　دامن اُلجھا ہے گل بے خار سے

شبلی نے شاعری کو محاکات اور تخیئل کا مجموعہ کہا ہے۔ اس شعر میں تخیئل لطف تشبیہ کی صورت میں جلوہ گر ہوئی ہے وہ اپنے دامن پر خون کے دھبے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ظاہر ہے کہ شعر کا مطلب صرف اتنا ہے مگر تشبیہ نے اسے کہاں سے کہاں پہونچا دیا۔ اب دامن یار کی نزاکت دیکھئے کہ وہ گل بے خار سے بھی اُلجھتا ہے۔

اب تو مر جانا بھی مشکل ہے ترے بیمار کو　　ضعف کے باعث کہاں دنیا سے اٹھا جائے ہے

اس شعر میں مومن نے ضعف کی حد کر دی ہے۔ یہاں تک کہ شعر بے تاثیر ہو کر رہ گیا۔ لیکن اب بھی ایک طبقہ اس شعر پر سر دھننے کے لئے تیار ہے۔

خاک میں ملجائے یا رب بیکسی کی آبرو　　غیر میری نعش کے ہمراہ روتا جائے ہے

یہ مثالیں نازک خیالی کو تو ضرور ظاہر کرتی ہیں۔ مگر تصنع نے شعر کو شعر نہ رکھا۔ آئندہ صفحات میں میں ان تاثرات سے بحث کروں گا جنہوں نے مومن سے یہ شعر کہلوائے:۔

ہے اعتماد مرے بخت خفتہ پر کیا کیا　　وگرنہ خواب کہاں چشم پاسباں کے لئے

کیا حسن کی تعلیل ہے۔

دفن جب خاک میں ہم سوختہ ساماں ہوں گے　　فلس ماہی کے گل شمع شبستاں ہوں گے

اس مطلع میں مبالغہ حد درجہ کیا گیا ہے۔ یعنی جب ہم سوختہ ساماں خاک میں دفن ہوں گے تو فلس ماہی ہمارے لئے

گل شمع شبستاں ہو جائیں گے یعنی ہماری سوختہ بختی کے اثر سے وہ مچھلی جو قدیم خیال کے موافق طبق زمین کے نیچے بالائے آب ہے اور حامل زمین ہے اس طور پر کہ مچھلی گائے کو لئے ہوئے ہے، اور گائے کے سینگ پر طبق زمین ہے جل جائے گی۔ اور اس کے فلس گل شمع شبستان کا کام دیں گے اور مچھلی کی چربی کی شمع بھی بنتی ہے۔ مومن کے اکثر اشعار میں بناوٹ ہے مگر بناوٹ بھی لازمۂ شاعری ہے۔ کیونکہ اس کا دوسرا نام معنی آفرینی ہے۔ جب شاعری کو محض سادگی اور بول چال سے بڑھایا جائے گا تو ضرور ہی بلند پروازی کی جائے گی اور بلند پروازی کا تقاضا دقت پسندی ہے۔" یہ ایک لکھنوی کی رائے ہے جس کا مضمون زمانہ سنہ ۱۱ء میں شائع ہوا ہے۔ دیکھئے ایسے اشعار کی بھی داد دینے والے لوگ موجود ہیں۔ زمانے کے اثر کو دیکھئے غالب کو بھی بعض مرتبہ ایسے ہی شعر کہنے پڑے۔

عرض کیجئے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں  کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

مومن کیوں پیچھے رہتے انھوں نے مذکورۂ بالا مطلع لکھ کر مبالغے کی حد کر دی۔ رفعت تخیل اور نزاکت خیال کے تحت میں سچ پوچھئے تو علوئے مضامین۔ جدت ادا۔ اسلوب بیان وغیرہ سب کچھ آجاتا ہے۔ کیونکہ جب تک شاعر کی تخیل بڑھی ہوئی نہ ہوگی وہ ادائے بیان میں کیا خاک جدت دکھا سکے گا۔ نزاکت خیال کا عنوان اتنا جامع ہے کہ مومن کے اکثر اشعار اس کے تحت میں آسکتے ہیں۔ یہاں اب میں مثالاً وہ اشعار درج کروں گا جن میں مومن کی تخیل نے علوئے مضامین وجدت ادا، ندرت اسلوب بیان سے کام لیا ہے لیکن اشعار میں اگر آپ علوئے بیان جدت ادا یا ندرت اسلوب بیان کے متجسس ہیں تو ضرورت اس امر کی ہے کہ چند عنوان مقرر کر لیجئے اور دیکھئے کہ مومن نے ایک ایک مضمون کو کس طرح سے باندھا ہے۔ وصل۔ فراق غم۔ ملال۔ رنج۔ ضد۔ عداوت۔ حسد۔ رشک۔ اضطراب۔ بیتابی۔ بیخوابی کے مضامین۔ بقول شمس العلماء نواب امداد امام اثر مومن خاں خوب باندھتے ہیں "حقیقت یہ ہے کہ مومن خاں نے جس قدر اسالیب بیان میں نزاکت و لطافت پیدا کر دی ہے وہ اُن کی ذہانت اور جولانی طبیعت کی تماشاگاہ ہے۔"

## وصل و فراق

یہ جوش و یاس تو دیکھو کہ اس نے قتل کے وقت  دعائے وصل نہ کی وقت تھا اثر کا سا
کیا سناتے ہو کہ ہے ہجر میں جینا مشکل  تم سے بے رحم پہ مرنے سے تو آساں ہوگا

جمع متضاد میں مومن کو یدِ طولیٰ حاصل ہے یہ بھی ان کی خصوصیات شاعری میں ہے۔ کہتے ہیں، یہ سب صحیح کہ ہجر میں زندگی مصیبت ہو جائے گی، لیکن بہر حال مرنے سے تو جینا آسان ہی ہے۔ لفظ مرنے سے کیا فایدہ اُٹھایا ہے:۔

آخر امید ہی سے چارۂ حرماں ہوگا  مرگ کی آس پہ جینا شب ہجراں ہوگا

اس انداز بیان کی کیا تعریف ہو سکتی ہے۔ موت کے خیال سے دل کو سمجھا کر شب ہجر کاٹنا ہی کیا کم تھا۔ کہ اُس کے لئے بھی امید کا شرمندۂ احسان ہونا پڑتا ہے۔ مومن نے اپنی انفرادیت اس نادر اسلوب بیان کرنے کے باوجود بھی باقی رکھی ہے۔ مومن کے اکثر شعروں میں آپ یہی جمع اضداد کی بات پائیں گے۔

زندگی ہجر بھی ایک موت تھی  مرگ نے کیا کار مسیحا کیا

زندگی ہجر کا نقشہ اس سے زیادہ موثر طور پر اور کیا کھینچا جا سکتا ہے۔ زندگی ہجر کو مرگ مسلسل کہیے جس کی دوا صرف موت ہے۔

جب ہو چکا یقیں کہ نہیں طاقتِ وصال  دم میں ہمارے وہ ستم ایجاد آگیا

دیکھیے ستم ایجاد نے کیا ستم ایجاد کیا ہے۔ خدا جانے اس ستم ایجاد کرنے کا سہرا مومن کے سر ہے یا ستم ایجاد کے سر۔

وعدۂ وصلت سے دل ہو شاد کیا　　تم سے دشمن کی مبارک باد کیا

تم سے دشمن کے وعدۂ وصل کی حقیقت کوئی میرے دل سے پوچھے۔ میں ہی جانتا ہوں کہ وہ کہاں تک باعث مسرت ہو سکتا ہے۔

بیخود تھے غش تھے محو تھے دنیا کا غم نہ تھا　　جینا وصال میں بھی تو مرنے سے کم نہ تھا

وصال و ہجر میں مومن ایسا شاعر کوئی فرق محسوس نہیں کر سکتا، ژرف بیں نگاہیں جانتی ہیں کہ کیفیت میں دونوں ایک ہیں۔ یہی اس شعر میں ثابت کیا ہے۔

ہجر بتاں میں تجھ کو ہے مومن تلاش زہر　　غم پر حرام خوار توکل نہ ہو سکا

ہجر اور وصال کے مضمون کے لئے مومن نے جو جو اسلوب بیان اختیار کئے ہیں کم شعرا کے ہاں اتنی مثالیں مل سکتی ہیں۔ انداز بیان میں اتنا تنوع مومن کے نازک خیال دماغ کا سچ پوچھیے، تو معجزہ ہے۔

ہم جان فدا کرتے گر وعدہ وفا ہوتا　　مرنا ہی مقدر تھا وہ آتے تو کیا ہوتا

مومن کے طرز ادا میں ایک بات اور بھی ہے جس کو مولانا شبلی نے شعر العجم میں خصوصیات غالب میں بیان کیا ہے یہ صحیح ہے کہ مرزا غالب بھی اُن کے ساتھ شریک ہیں۔ مگر مومن کے یہاں یہ بات بہت نمایاں ہے کہ اکثر موقعوں پر مضمون کے بعض اجزا چھوڑ جاتے ہیں، جس سے ایک خاص لطف پیدا ہو جاتا ہے، یہ وہ موقعے ہوتے ہیں جہاں سننے والے کا ذہن خود بخود اس جزو کی طرف منتقل ہو سکتا ہے، اس شعر میں مومن نے اپنی اسی ادا سے کام لیا ہے اور نہایت حُسن کے ساتھ ثابت کر دکھایا ہے کہ وصل ہو یا ہجر نتیجہ دونوں کا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ ہم جان فدا کرتے گر وعدہ وفا ہوتا۔ یعنی وعدہ وفا نہیں ہوا اور شب وعدہ شب وصل ہونے کے بجائے شب ہجر ہو گئی۔ لیکن بفرض محال اگر وعدہ وفا بھی ہوتا تو ہم اس پر جان فدا کرتے۔ دوسرا مصرعہ ملاحظہ ہو "مرنا ہی مقدر تھا وہ آتے تو کیا ہوتا" مرنا بہر حال قسمت میں لکھا تھا وہ آتے تو ہم اُن پر اپنی جان قربان کرتے وہ نہیں آئے تو ہم غم ہجر سے مرے مرنا ہر دو حال میں تھا پھر نتیجہ کے لحاظ سے ان کا آنا اور نہ آنا دونوں برابر ہے۔

واں طعنہ تیر بار یہاں شکوہ زخم ریز　　باہم تھی کس مزے کی لڑائی تمام شب

شب وصل کا نقشہ کتنا کامیاب کھینچا ہے۔ فارسی ترکیبوں نے شعر کو کتنا چست کر دیا ہے ان فارسی ترکیبوں کی استعمال کی وجہ بھی سن لیجئے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے کہیں دیکھا تھا کہ مومن اور غالب کا یہ خیال تھا وہ صحیح خیال کہ غزل میں دو ایک شعر کے سوا زیادہ اچھے اشعار نکلنا مشکل ہے ایسی حالت میں بہترین صورت ہے کہ فارسی کی عمدہ ترکیبوں کو استعمال کر کے بقیہ اشعار کی بندش چست کر دی جائے

کس واسطے اے شمع زباں کاٹتے ہیں لوگ　　کیا تو نے بھی کی تھی شب ہجراں کی شکایت

"بھی" کا لفظ رکھ کر کس انداز سے اپنی مصیبت کا ذکر کیا ہے۔

امید وعدہ بھی تو نہیں روز ہجر میں　　ہم سے وفائے زندگی بے وفا عبث

روز ہجر میں زندگی کا بلائے جان ہونا کس انداز سے ادا کیا ہے۔

اے روز حشر کچھ شب ہجراں بھی کم نہیں　　بدنام ہو جہاں میں تیری بلا عبث

مضمون کی بلندی دیکھیے اور اس پر انداز بیان۔ شب ہجراں کو روز حشر سے صرف "کم نہیں" کہا ہے، لیکن اثر یہ پیدا کیا ہے کہ شب ہجر کا نمبر تجھ سے کہیں بڑھا ہوا ہے۔

ہم تو بچتے نہیں تا شام وہ آئے تو کیا　　اے دعائے سحری منت تاثیر نہ کھینچ
روز غم کون بھلا اُن کے ہوتا ہے شریک　　انتظارِ اثر نالۂ شبگیر نہ کھینچ

---

مرچک کہیں کہ تو غم ہجراں سے چھوٹ جائے　　کہتے تو ہیں بھلے کی و لیکن بری طرح،

کتنا کامیاب اندازِ بیان ہے۔

نے تاب ہجر میں ہے نہ آرام وصل میں　　کمبخت دل کو چین نہیں ہے کسی طرح

---

شوقِ وصال دیکھ کہ آیا عدو کے گھر　　سوجھا نہ کچھ مجھے شب مہتاب دیکھکر

تلاش مضمون دیکھیے۔ شب مہتاب تھی میں سمجھ گیا کہ وہ عدو کے گھر گئے ہوں گے۔ بُرا ہو شوقِ وصال کا مجھے کہاں لے گیا۔

محوِ حیرت کو وصال و ہجر دونوں ایک ہیں　　بلبلِ تصویر کو کب یاد آتی ہے بہار

عاشقِ حیراں وصال و ہجر سے بلند ہے۔ وہ اپنے خیال ہی میں محو ہے۔ دیکھیے عشق کا کتنا بلند نظریہ پیش کیا ہے۔

جوں نقاب اٹھی مری آنکھوں پہ پردہ پڑ گیا　　کچھ نہ سوجھا عالم اُس پردہ نشیں کو دیکھ کر

منشی امیر احمد مینائیؔ کا بھی ایک شعر سن لیجیے:۔

ترے مشتاق کو حسرت رہی دیدار کی تیرے　　نقاب اٹھی تو پردہ پڑ گیا آنکھوں پہ حیرت کا

شاید یہ شعر مومنؔ ہی کے شعر سے ماخوذ ہو۔ مومنؔ نے پردہ نشین کے لفظ کو یہاں بھی نہ چھوڑا۔ لیکن اتنا تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس لفظ نے شعر کی معنویت کو ترقی دیدی۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مومنؔ کا معشوق اپنے دور کے مذاق کے خلاف صنف لطیف ہی کا ایک فرد ہوتا تھا۔ اسی ضرورت کو مد نظر رکھ کر مومنؔ نے بار بار پردہ نشین کے لفظ پر اتنا زور دیا ہے۔ رشک آفتاب۔ آفتاب حُسن کے الفاظ ایسے ہیں جو ہر دو صنف کے لئے استعمال ہو سکتے ہیں۔ لیکن پردہ نشین کے لفظ نے مومنؔ کے محبوب کو مختص کر دیا ہے۔ اردو شاعری پر جو یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اس کا محبوب جنس قوی سے بھی ہوتا ہے وہ مومنؔ پر وارد نہیں ہو سکتا۔ غالبؔ کی طرح مومن کا دیوان ایسے اشعار سے پاک ہے۔

سبزۂ خط سے ترا کاکُل سرکش نہ دبا　　یہ زمرد بھی حریف دم افعی نہ ہوا　　(غالبؔ)

---

وصل میں احتمال شادی مرگ　　چارہ گر درد لا دوا ہے عشق

اس شعر میں مومنؔ ایک پورا جزو چھوڑ گئے ہیں۔ صرف ایک مقدمہ جس میں احتمال کا اختلاف ہو سکتا ہے سے بیان کر دیا ہے اور دوسرے مقدمہ کی پروا کئے بغیر نتیجہ نکال دیا کہ "چارہ گر درد لا دوا ہے عشق"، یہ مسلم ہے کہ ہجر میں عاشق کی جانبری ناممکن ہے وصل کی بابت شاعر شادی مرگ کے قوی احتمال کو ظاہر کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ عشق کی زندگی دو حال سے خالی نہ ہو گی یا وصل ہو گا یا ہجر — ہجر میں مرنا مسلم۔ وصل میں جان کا جانا اغلب۔ پھر اگر درد عشق

ادا نہیں ہے ۔ یہ مومن کا مخصوص انداز بیان ہے

کس توقع پر امید وصل اب　　　طاقت صبر و شکیبائی نہیں

وہی وصل و ہجر کا مضمون ہے لیکن مومن نے ہر جگہ ایک نئے انداز سے باندھا ہے اور کس خوبصورتی کے ساتھ ۔

کیا رحم کھا کے غیر نے دی تھی دعائے وصل　　　ظالم کہاں وگرنہ اثر میری آہ میں

اسلوب بیان اور جدت ادا کی اس سے بہتر مثال ملنا مشکل ہے ملاحظہ ہو کس انداز سے مومن محبوب سے اپنے ایام فراق کی مصیبتوں کو بیان کر گیا ۔ وہ مصیبتیں کتنی سخت ہوں گی جن کو دیکھ کر غیر کو بھی رحم آگیا ہو۔

تا مدیڑے خلل کہیں آپ کے خواب ناز میں　　　میں نہیں چاہتا کمی اپنی شب دراز میں

کم عاشق دنیا میں پیدا ہوئے ہوں گے جو اپنی شب ہجر کی درازی کے خواہاں ہوں ۔ دیکھئے مومن نے درازیِ شب ہجر سے کیا بات پیدا کی ہے ۔

منظور ہو تو وصل سے بہتر ستم نہیں　　　اتنا رہا ہوں دور کہ ہجراں کا غم نہیں

جس مہجور کے لئے ہجر عادت ثانیہ بن گئی ہو جس مہجور کے لئے وصل ستم ہو جائے خیال کیجئے ، اس کی ہجر کی مصیبتیں کیسی ہوں گی ۔ اس شعر کو غالبؔ کے اس مشہور شعر سے موازنہ کیجئے :۔

رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج　　　مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں

دونوں اشعار میں جو یقیناً ہم معنی ہیں دیکھئے رنگ تغزل کہاں ہے اور کس مقام پر شاعری خشک فلسفے سے علٰحدہ ہوتی ہے ۔

دن بھی دراز رات بھی کیوں ہے فراق یار میں　　　کا ہے سے فرق آگیا گردشِ روزگار میں

یہ شعر شرح و تفسیر کی حدود سے بہت بلند ہے ۔

اے اجل کاش الٹ جائیں شب ہجراں میں　　　وہ دعائیں کہ تری جان کو ہم کرتے ہیں

خیال کی جدت قابلِ داد ہے ۔

ربط اُس سے ہے مثل شعلہ و شمع　　　مر جاؤں گر ایک دم جدا ہوں

چھوٹی بحروں میں دراصل مومن کا کمال نمایاں ہوتا ہے ۔ حالت جدائی میں جس میں مرنا یقینی ہے اس وقت نظر انداز کر دیجئے ۔ صرف حالت وصل کو لیجئے ۔ تشبیہ نے اس میں بھی عاشق کی بیقراری اور تپش کا نقشہ کھینچ دیا ہے ۔

آتی ہے بوئے داغ شب تار ہجر میں　　　سینہ بھی چاک ہو نہ گیا ہو قبا کے ساتھ

اس شعر پر "زمانہ" میں امز ۔ لکھنوی نے لکھا تھا کہ اگر حزیں بھی زندہ ہوتے تو رشک کرتے ۔

تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے　　　ہم تو کل خواب عدم میں شب ہجراں ہوں گے

ایک ناقد کا خیال ہے کہ مومن کی زبان نہایت پاکیزہ و شستہ ہے گو بعض نقادان فن کے یہاں ذوق کی زبان اپنے تمام معاصرین سے سلیس اور لطیف سمجھی جاتی ہے ۔ مگر میرے نزدیک مومن کی زبان اپنے معاصرے کہیں زیادہ صاف ہے ۔ محاورہ کی آمیزش بھی کچھ کم پر لطف نہیں ہے " یہ مومن کی مشہور عام غزل کے مقطع کو چھوڑ کر سب سے زیادہ مشہور شعر ہے ۔ ایک لطیف خیال جس لطیف انداز سے ظاہر کیا گیا ہے صرف ذوق اس سے لطف اندوز

ہوسکتا ہے۔ مومن اپنے کو خاتم العشاق سمجھتا ہے۔ لہٰذا ساری بلائیں ساری مصیبتیں اس پر ختم تھیں۔ مصیبت تو سب کا ساتھ دیتی ہے لیکن مصیبت کا ساتھ دینے والا عاشق کے سوا کوئی نہیں تھا۔ اس انداز بیان کو دیکھئے کہ مومن کو اب اپنی فکر کے بجائے شب ہجراں کی فکر لگی ہوئی ہے۔ غالب نے بھی اس مضمون کو صرف موزوں کیا ہے۔ ملاحظہ ہو :۔

آئے ہے بے کسی عشق پہ رونا غالب　　کس کے گھر جائے گا سیلاب فنا میرے بعد

غالب وہ سلاست نہ پیدا کر سکے جو مومن کے اس شعر میں پائی جاتی ہے۔ علاوہ بریں انداز بیان کے فرق نے شعر میں زمین و آسمان کا فرق پیدا کر دیا۔

لذت مرگ سے ہجراں میں دعا ہے کہ خدا　　مزا ہو نہ نصیبوں میں کسی بیحس کے

بیحس لذت مرگ سے کیا خاک لطف اندوز ہوسکتا ہے اسے مومن ہی کے لئے مخصوص ہونا چاہیئے۔ نیش کو نوش بنانا شاعر کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ مومن کی تخیئل کو دیکھئے کہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ عدد کو نہ کبھی ہجر کی مصیبت اٹھانا پڑے گی نہ اس کے صدموں سے کبھی مرنا ہوگا یہ شرف تو صرف عاشق صادق کی قسمت میں لکھا ہے۔ جب یہی ہونا ہے تو کیوں نہ مرگ کو شربت بنا کر اس طرح پیو کہ ایک بار تو رقیب کو بھی رشک ہو جائے یہ مومن کی وہ پرواز تخیئل ہے جس کے متعلق غلام ربانی صاحب عزیز کا خیال ہے کہاں طمطراقوں پر غالب ایسے سدرہ نشین کے پر جلنے لگتے ہیں۔

ہیہم سجود پائے صنم پر دم وداع　　مومن خدا کو بھول گئے اضطراب میں

فارسی بندشوں سے شعر کو چست کرنا مومن، غالب اور ان کے متبعین کا طرۂ امتیاز ہے۔ مومن کی خصوصیات میں عام طور پر سب سے مشہور خصوصیت تخلص کا نباہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مومن کا تخلص جو اُن کا نام بھی ہے۔ اُن کے لئے بہت کچھ مفید ثابت ہوا۔ لیکن لفظ مومن کی معنوی خصوصیت کو نظر انداز کر دیجیئے یا مومن کی جگہ کوئی دوسرا ہموزن تخلص رکھ دیجیئے اور پھر بھی اس مقطع کو دیکھئے تو اس کی لطافت میں کوئی کمی نہ واقع ہوگی۔

مومن کے اکثر مقطعے آپ ایسے ہی پائیں گے۔ اگر لفظ مومن ہٹا بھی دیا جائے تو کوئی معنوی نقصان نہیں پیدا ہوسکتا۔ یہ خیال میرے نزدیک صحیح نہیں کہ مومن کا اپنے مقطعوں میں کامیاب ہونا صرف اس کے تخلص کی وجہ سے ہے۔ یہ درست ہے کہ لفظ مومن اختراع مضامین کے لئے ایک بہانہ ضرور ہو جاتا ہے، لیکن جو معانی مومن پیدا کرتے ہیں وہ اُن کے تخلص کے لفظی رعایت سے بہت ارفع و اعلیٰ ہوتے ہیں۔

یاں وصل ہے تلافیِ ہجراں میں اے فلک　　کیا سوجھتا ہے تازہ ستم انتقام کو

آسمان وصل کا بدلہ لینے کی فکر میں ہے۔ مومن کہتے ہیں بدلہ کس چیز کا لے گا یہ وصل تو خود ہجر کا بدلہ تھا۔

یارب وصالِ یار میں کیونکر ہو زندگی　　نکلی ہی جان جاتی ہے ہر ہر ادا کے ساتھ

وصال یار میں یار کی جانگداز اداؤں نے ہجر اور وصل میں کم از کم مومن کے لئے کوئی فرق باقی نہ رکھا۔ مومن اپنے لئے وصل و ہجر کو بلحاظ نتیجہ یکساں سمجھتے ہیں۔ اُن کا بھی یہی فلسفہ ہے۔

نہ کٹی ہم سے شب جدائی کی　　کتنی ہی طاقت آزمائی کی

کہنا یہ تھا کہ شب ہجر میں ہم بچ نہ سکے لیکن انداز بیان نے اس پامال اور فرسودہ مضمون میں جان ڈال دی۔

امید مرگ پہ ہر فتنہ راحت باں ہے　　شب فراق میں کیا بیم روزگار مجھے

خوف مرگ کے بجائے امید مرگ پر زندگی بسر کرنے والوں کے لئے اگر یہ فتنہ راحت جاں نہ ہوگا تو کیا ہوگا۔ غالب کا ایک مشہور شعر ہے :-

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید ؛ ناامیدی اس کی دیکھا چاہیئے

غالب نے اس شعر میں جتنے معنی پیدا کئے ہیں مومن نے اس سے زیادہ صرف "امید مرگ" کے ٹکڑے سے پیدا کر دئے ہیں۔ غالب کے ہاں دوسرا مصرع بالکل زائد ہے۔ چونکہ خیال میں کوئی وسعت نہ پیدا کر سکے لہذا دوسرے مصرع میں پہلے مصرع سے جو خیال پیدا ہوتا ہے صرف اس کی تفسیر کرنے پر اکتفا کی پہلا مصرع دیکھئے :۔ "منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید"۔ جس کی امیدوں کا انحصار مرنے پر ہو ظاہر ہے کہ اس کی ناامیدی کیا ہوگی۔ لیکن دوسرا مصرع جو بداہی سے محض بیکار ہو گیا اور وہ پہلے مصرع کو مطلق ترقی نہ دے سکا نہ اس کے معنی پر کوئی اضافہ کر سکا۔ اب مومن کے "امید مرگ" کے ٹکڑے کو لیجئے۔ دنیا اور اہل دنیا کے لئے بیم مرگ ہے مگر عاشق کے لئے امید مرگ، مومن جس وقت شاہراہ عام سے علٰحدہ ہوا ہے یعنی جس وقت بیم مرگ کے بجائے اس نے امید مرگ لکھا ہے وہیں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس شخص کی کیا حالت ہوگی جس کے لئے مرگ بیم کے بجائے امید مرگ ہو جائے۔ غالب نے دوسری ٹھوکر یہ کھائی ہے کہ ان کی نظم متشایم (PESSIMISTIC) ہو کر رہ گئی اور مومن نے وہی بات کہی ہے مگر انداز بیان متفاول OPTIMISTIC ہے غالب انتہائے ناامیدی کا نقشہ کھینچتے ہیں اور مومن کمال امید داری کا منظر دکھاتے ہیں۔ تنقید کے اس جزو کو میں مومن کے اس شعر پر ختم کرتا ہوں جس میں مومن کا پورا رنگ موجود ہے :-

دُعا بلا تھی شب غم سکون جاں کے لئے ؛ سخن بہانہ ہوا مرگ ناگہاں کے لئے

## زبان

مومن کے علوئے تخیل کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض اشعار میں تعقید پیدا ہو گئی۔ لیکن پھر بھی ایسے اشعار کی اُن کے کلیات میں کمی نہیں ہے جن کی زبان سے آج بھی ہم پوری طرح لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ شاید مومن کے ایسے ہی اشعار دیکھ کر ایک ناقد نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اُن کی زبان ذوق سے بہتر ہے۔ بعض اشعار میں فارسی ترکیبوں نے بندش کو اس قدر چست کر دیا ہے کہ شعر کڑی کمان کا تیر معلوم ہوتا ہے۔ یہاں پر مومن کے کچھ ایسے اشعار نقل کروں گا جن کی فصاحت اور سلاست مسلم ہے۔ بعض پوری پوری غزلیں زبان کی خوبیوں سے آراستہ ہیں۔

اس نقش پا کے سجدے نے کیا کیا ذلیل ؛ میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

سجدے کے تسلسل کے اظہار کے لئے "سر کے بل چلنے سے بہتر انداز بیان اختیار نہیں کیا جا سکتا۔

درد ہے جاں کے عوض ہر رگ و پے میں ساری ؛ چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا

درد کو جان ثابت کر دیا، لیکن شعر میں سلاست زبان کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ جب درد ہی جان ہے تو ظاہر ہے درماں جان ہی لے کر جائے گا۔

آنکھ نہ لگنے سے سب احباب نے ؛ آنکھ کے لگ جانے کا چرچا کیا،

محاورہ ضرور باندھا ہے مگر استاد ذوق کی طرح شعر کو محض محاورے کی وجہ سے موزوں نہیں کیا ہے اس میں ایک معنویت ہے جو شعر سے جدا نہیں ہوتی جس کو جناب غلام ربانی صاحب عزیز نے یوں ظاہر کیا ہے۔
آنکھ نہ لگنا شب بیداری کے معنوں میں آتا ہے اور آنکھ کا لگ جانا محبت کرنے کے معنی دیتا ہے دونوں محاورں

کے بے ساختہ استعمال نے کتنا پر کیف مضمون پیدا کر دیا ہے۔

وقت وداع بے سبب آزردہ کیوں ہوئے — یوں بھی تو ہجر میں مجھے رنج و عذاب تھا
دم لینے کی طاقت ہے بیمار محبت میں — اتنا بھی غنیمت ہے مومن کا سنبھل جانا

سلاست زبان کے ساتھ تاثیر شعر سے دست و گریباں ہے۔

سینے پہ ہاتھ دھرتے ہی کچھ دم پہ بن گئی — تو جان کا عذاب ہوا دل کا تھامنا
اللہ رے ناتوانی جب شدتِ قلق میں — بالیں سے سر اٹھایا دیوار تک نہ پہونچا
ہجر بتاں میں تجھ کو ہے مومن تلاش زہر — غم پر حرام خور توکل نہ ہو سکا
آپ کی کون سی بڑی عزت — میں اگر بزم میں ذلیل ہوا
رات دن بادۂ و صنم مومن — کچھ تو پرہیز گار ہونا تھا
تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے — ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا
تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
ایک ایک ادا سو سو دیتی ہے جواب اسکے — کیونکر لب قاصد سے پیغام ادا ہوتا
ہے یہ بندہ ہی وفا صاحب — غیر اور تم بھلے بھلا صاحب
کیوں الجھتے ہو جنبشِ لب سے — خیر ہے میں نے کیا کہا صاحب

مطلع کا طنزیہ انداز ملاحظہ ہو۔ دوسرے شعر میں زبان کو لئے ہوئے کتنا صحیح نقشہ کھینچا ہے۔ اگر آپ نے کسی کو جنبش لب سے الجھتے دیکھا ہوگا تو یقیناً اس شعر سے محظوظ ہوں گے۔ میرے خیال میں اس حالت کو ظاہر کرنے کے لئے جنبش لب۔ الجھنا بالکل نئی تعبیر ہے۔

کیوں لگے دینے خط آزادی — کچھ گنہ بھی غلام کا صاحب
ستم آزار، ظلم، جور و جفا، — جو کیا سو بھلا کیا صاحب
کس پہ بگڑے تھے کس پہ غصہ تھا — رات تم کس پہ تھے خفا صاحب
کس کو دیتے تھے گالیاں لاکھوں — کس کا شب ذکر خیر تھا صاحب
نام عشق بتاں نہ لو مومن — کیجئے بس خدا خدا صاحب

دیکھئے غزل کی غزل لطف زبان میں ڈوبی ہوئی ہے اور ایک طرح کا طنز ہے جو ساری غزل میں ساری ہے لیکن مومن نے محض لطف زبان کے لئے معنویت کو کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔

اے روز حشر کچھ شب ہجراں بھی کم نہیں — بدنام ہو جہاں میں تیری بلا عبث

اس شعر میں مومن نے شاعرانہ کمال کی انتہا کر دی ہے۔ مصرعۂ اولیٰ پھر ملاحظہ ہو:-

"اے روز حشر کچھ شب ہجراں بھی کم نہیں"

شاعر نے یہ تو ضرور کہد یا شبِ ہجراں روز حشر سے کم نہیں لیکن یہ نہ بتایا کہ کس چیز میں۔ مصرع میں اس کا کہیں ذکر نہیں اور یہی شاعر کا کمال ہے کہ اس نے مقابلہ کسی ایک پہلو کو مخصوص کر کے محدود نہیں کر دیا ہے بلکہ تعمیم سے یہ فایدہ

اٹھایا ہے کو بغیر اظہار مصرع سے یہ بات ثابت ہے کہ اے روز حشر شب ہجراں تجھ سے کم نہیں ۔ لہذا بد نام ہو جہاں میں تیری بلا عبث ۔

نے تاب ہجر میں ہے نہ آرام وصل میں　　کم بخت دل کو چین نہیں ہے کسی طرح
کیا دکھ نہ دیکھے عشق میں کیا کیا نہ ہائے داغ　　زخموں پہ زخم جھیلے ہیں داغوں پہ کھائے داغ
جانے دے چارہ گر شب ہجراں میں مت بلا　　وہ کیوں شریک ہوں مرے حالِ تباہ میں
بے جرم پائمال عدو کو کیا کیا،　　مجھ کو خیال بھی ترے سر کی قسم نہیں

محبوب عاشق سے اپنی وفا جتانے کو کہتا ہے کہ میں نے تمہارے عدو کو بے جرم پائمال کیا مجھے تمہاری خاطر اتنا مدنظر تھی ۔ اب عاشق کا جواب سنئے :"

بے جرم پائمال عدو کو کیا کیا　　مجھ کو خیال بھی ترے سر کی قسم نہیں"۔

تم نے عدو کو بے جرم پائمال کیا ، کیا ہوگا ضرور کیا ہوگا ۔ لیکن تمہارے سر کی قسم مجھے اس کا مطلق خیال نہیں ۔ اللہ اکبر اب کہ عاشق کی بن آئی ہے عدو کو وہ اتنا حقیر سمجھ رہا ہے کہ اس کی پائمالی کو وہ کوئی اہمیت نہیں دیتا یہ صرف انداز بیان ہے جس نے اتنے بڑے مضمون کو دو مصرعوں میں نہایت صفائی کے ساتھ ادا کر دیا ہے ۔

کیسے گلے رقیب کے کیا طعن اقربا　　تیرا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

عاشق اپنے محبوب سے جو ایک عرصہ کے بعد اس کے پاس آیا ہے شکوہ کرتا ہے کہ اب تم نے میرے یہاں آنا ہی بند کر دیا ہے ۔ وہ جواب دیتا ہے کیا کروں مجبور ہوں اقربا طعنہ دیتے ہیں تمہارے رقیب گلہ کرتے ہیں آؤں تو کیونکر آؤں ۔ عاشق یہ سنکر جواب دیتا ہے ۔

کیسے گلے رقیب کے کیا طعن اقربا　　تیرا ہی دل نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں
محتسب وہم ہے تو پہلے بھلا دیکھو مجھے　　نہ لنڈھاپی لے مئے ناب زہر آب نہیں

مصرع آخری چار جملوں سے مرکب ہے میرا خیال ہے کہ اس بحر میں ایک مصرع میں چار سے زیادہ مربوط جملوں کا استعمال کرنا آسان کام نہیں ۔ مومن کو زبان پر جو قدرت حاصل ہے اس کا یہ ایک اچھا نمونہ ہے ۔

ہر ذرہ میری خاک کا برباد ہو چکا　　بس اے خرام ناز کہ تاب و تواں نہیں
مومن تم اور عشقِ بتاں اے بندہ پرور خیر ہے　　یہ ذکر اور منہ آپ کا صاحب خدا کا نام لو
عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن　　آخری عمر میں کیا خاک مسلماں ہوں گے
وہ بدر ناصیہ فرسائی سے کیا ہوتا ہے　　وہی ہوتا ہے جو قسمت کا لکھا ہوتا ہے
تسلی دم واپسیں ہو چکی　　ہمیں ہو چکے جب ہنسی ہو چکی

مومن کی دلکش فارسی تراشوں اور نادر ترکیبوں کی تعریف آزاد کو بھی کرنا پڑی ۔ مومن نے فارسی ترکیبوں سے کام لے کر کہیں شعر کی بندش کو چست کیا ہے کہیں ایک وسیع خیال فارسی کی نئی ترکیب سے ادا کیا ہے ۔ چند مثالیں غالباً میرے اس خیال کو صحیح ثابت کرنے کے لئے کافی ہوں ۔

گر وہاں بھی یہ خموشی اثر افغاں ہوگا　　حشر میں کون مرے حال کا پرساں ہوگا

خموشی اثر افغاں - یعنی وہ فغاں جس کا اثر خموشی ہو -

شبنم خرابِ مہر و کتاں سینہ چاک ماہ — لو اور بھی ستم زدۂ روزگار ہیں ،

دیکھیے فارسی ترکیبوں نے شعر کی بندش کو کتنا چست کر دیا ہے -

چرخ و زمیں میں توبہ کا ملتا نہیں سراغ — ہنگامۂ بہار و ہجوم سحاب میں

اہلِ بازار محبت کا بھی کیا سودا ہے — عشرت عمر ابد قیمت غم دیتے ہیں

سجدہ نہ کہیں کرنا مومن قدمِ بت پر — کعبے ہی میں ہوتی ہے بیہودہ سری اتنی

بیہودہ سری کی کیسی پیاری ترکیب مومن نے اختراع کی ہے -

بیمار اجل چارہ کو گر حضرتِ عیسیٰ — اچھا بھی کریں گے تو کچھ اچھا نہ کریں گے

بیمار اجل چارہ کی ترکیب جس قدر وسیع مفہوم کو ظاہر کرتی ہے وہ ارباب ذوق سے پوشیدہ نہیں - مثنوی - قصاید اور غزل میں مومن نے بہت سی نئی ترکیبیں ایجاد کی ہیں - مثلاً خموشی اثر - اجل چارہ - آشوب گاہ حشر غم - جراحت زار - آئین سرا - زبان اجابت - بیہودہ سری - دم خونناب ریز - حادثہ ریز - زخم ریز - تیر بار - رند خمکدہ کش - گرم پائی برق تپاں - زبان بیہودہ سایل - گلریز کلم - بے پرواخرامی - حسرت فرماں روا - بخت بخواب آسودہ - عقوبت ربا - قدم فرسا - خواب تمنا یاب - عشق حیات - زبوں اضطراب - مصیبت بہرہ - قبول شوق دشواری پسند - رقیب فریفتیاں میکدہ آشام - آہوئے نیم خواب - جان نہفتہ راز - نالہ رخنہ ساز - اثر اہتمام - چشم ستارہ باز - شوق ہرزہ کار وغیرہ - مثالیں طوالت کے اندیشہ سے نظر انداز کی جاتی ہیں -

## تشبیہات واستعارات

یہی وہ مقام ہے جہاں شاعر کے زود طبیعت کا پتہ چلتا ہے -

کیا کیا شکن دئے ہیں دل زار کو مگر — اس کے خیال میں ورق انتخاب تھا

بالکل اچھوتی تشبیہ ہے - لفظ شکن سے کیا کیا فایدے اٹھائے اور دلِ زار کو شکن دینے کی کیا پیاری توجیہ کی ہے - ورق انتخاب کو عموماً موڑ دیا جاتا ہے - مومن کا دل اس بنا پر دکھایا جاتا ہے کہ وہ محبوب کی نظروں میں چڑھا ہوا ہے -

کس کی زلفوں کا دھیان تھا کہ میں شب — محو دودِ چراغ خانہ رہا ،

زلف کو دود چراغ کہنا کئی حیثیتوں سے پر لطف ہے - مشبہ بہ اور مشبہ میں ایک وجہ شبہ حرکت ہے - دوسری سیاہی - اور تیسری پریشانی پھر لطف یہ ہے کہ دود چراغ کی ترکیب فوراً خیال کو چراغ کی لو کی طرف لے جاتی جس کے مقابل یہاں محبوب چہرہ ہے -

آتش تھم گئے اثر سے مرے — آسماں گلشنِ خلیل ہوا

تشبیہ کی جدت قابل داد ہے - آسماں کو کس خوبصورتی کے ساتھ گلشن خلیل ثابت کیا ہے -

مو سفیدی کے قریب اور ہے غفلت مومن — نیند آتی ہے با آرام دگر آخر شب

واں تو ہے زرد پوش یہاں میں ہوں زرد رنگ — واں تیرے گھر بسنت یہاں میرے گھر بسنت

لیکن تیری بسنت مستعار ہے اور میری بسنت اصلی ہے -

داغ جدائی دُر دنداں در روے و زلف — ہے اشک شمع شعلۂ شمع و خال شمع

کتنی مسلسل تشبیہ ہے۔

ربط اُس سے ہے مثل شعلۂ و شمع   مرجاؤں گر ایک دم جدا ہوں

اس تمثیل سے کس نئے انداز سے یہ خیال ادا کیا ہے۔ کہ وصل میں جلنا قسمت میں لکھا ہے۔ اور ہجر میں مرنا۔

واعظ کے ذکر مہر قیامت کو کیا کہوں   عالم شبِ وصال کی آنکھوں میں چھا گئے

محبوب کے روئے انور کی تابش کو کس لطف سے بیان کیا ہے۔

**محاکات** | کسی چیز یا حالت کی تعریف اس طرح بیان کرنا کہ اس شئے کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھنچ جائے۔ محاکات کہلاتی ہے۔ رقیب کی رقابت۔ غم عشق۔ وعدۂ وصال۔ امید وفا وغیرہ سیکڑوں قسم کے واقعات ہیں۔ جو عاشق کو عشق میں پیش آتی ہیں۔ ان واردات کو شعر میں بیان کرنا کہ سننے والے کے دل میں وہی جذبات موجزن ہونے لگیں۔ شاعری کا بہت بڑا کارنامہ ہے، ورنہ رقابت، شب ہجراں کی مصیبت، عشق کی جانکاہی وعدۂ وصل میں انتظار وغیرہ فی نفسہ کوئی ایسے واقعات نہیں جو کسی کو نہ پیش آتے ہوں۔ اس لئے ایک ہی چیز کا وقوع اتنا عام ہو، اس میں کوئی جاذبیت نہیں پیدا ہو سکتی۔ مگر شاعر اپنے جوش بیان اور طرز ادا سے اسے اس قدر لطیف اور پر کیف بنا دیتا ہے کہ اس کا لطف کئی گناہ زیادہ ہو جاتا ہے سننے والے سنتے اور سر دھنتے ہیں جس قدر شاعری کی تخییل زبردست ہوگی۔ اسی قدر اس کی شاعری کیف بار اور رنشہ آور ہوگی۔ محاکات کی مثالیں مومن کے کلام سے پیش کرنے سے پہلے ضرورت اس امر کی ہے کہ اگر محاکات اور تخییل میں کوئی فرق ہے تو اسے واضح کر دیا جائے صاحب مراۃ الشعراکی رائے ہے کہ شعر کی ایسی تقسیم نہیں کی جاسکتی کہ وہ حکائی ہو اور تخییلی نہ ہو یا تخییلی ہو حکائی نہ ہو۔ غرض یہ ہے کہ محاکات کو ہم تخییل سے الگ نہیں کر سکتے۔ شعر بہر حال تصویر معنوی ہے۔ میری رائے میں محاکات تصویری اور دوسرے محاکات تخیلی ہے۔ ظاہر ہے کہ محاکات تصویری میں صوری پہلو غالب ہوگا اور محاکات تخیلی میں خیالی پہلو۔ اب مثالیں ملاحظہ ہوں :-

گی ہچکی ہے سر زانوئے غم پر سر ہے کہ یاد آیا   کسی کا ہاتھ ہر دم مار نا زانو پہ قہ قہ کر

کسی کو زانو پر ہاتھ مار کر ہنستے ہوئے کسی نے نہ دیکھا ہوگا۔ یہاں بھی تشبیہ کا تسلسل دیکھئے ادھر وہ زانو پر ہاتھ مارتے ہیں یہاں زانوئے غم پر سر ہے وہاں قہ قہ ہے یہاں ہچکی بندھی ہوئی ہے۔

ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم   منہ دیکھ دیکھ کے روتے ہیں کس بیکسی سے ہم

مومن نے بیکسی کی کتنی مکمل تصویر کھینچی ہے۔

جو پہلے دن ہی سے دل کا کہا نہ کرتے ہم   تو اب یہ لوگوں کی باتیں سنا نہ کرتے ہم
اگر نہ ہاتھ میں اس دلربا کے دل دیتے   تو دل پہ ہاتھ سدا دھر لیا نہ کرتے ہم
اگر نہ دام میں زلفِ سیہ کے آجاتے   تو یوں خراب و پریشاں رہا نہ کرتے ہم
اگر نہ لگتی چپ اس بدگماں کی شوخی سے   تو بات بات میں مضطر رہا نہ کرتے ہم
نہ جاتے اس بت ہرجائی کی گلی میں اگر   تو دوڑے دوڑے تلق سے پھرا نہ کرتے ہم
ہی آفت دل و جاں پر اگر نہ مر جاتے   تو اپنے مرنے کی ہر دم دعا نہ کرتے ہم
نہ بھرتے دم جو کسی شعلہ رو کی خواہش کا   تو ٹھنڈی سانس ہمیشہ بھرا نہ کرتے ہم
اگر نہ آنکھ تغافل شعار سے لگتی   تو بیٹھے بیٹھے یونہی چونک اٹھا نہ کرتے ہم

نہ ہوش کھوتے اگر اس پری کی باتوں پر — تو آپ ہی آپ یہ باتیں کیا نہ کرتے ہم
اگر نہ ہنسنا ہنسانا کسی کا بھا جاتا — تو بات بات میں یوں رو دیا نہ کرتے ہم
اگر نہ دیکھتے وہ پیاری پیاری صورت آہ — تو ایک ایک کی صورت تکا نہ کرتے ہم
جو عمر بتوں کا نہ ہوتا تری طرح مومن — تو دیکھ چرخ کو ہے ہے خدا نہ کرتے ہم

غزل کے دوسرے مصرعوں میں جو نقشہ کھینچا گیا وہ کس دلدادہ و آشفتہ حال پر صادق نہ آئے گا راہ عشق میں جن جن منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے ان کا کماحقہٗ بیان اور کیا ہو سکتا ہے۔

کس کی خراب آنے کی کس لئے ہے یہ بیتابی، — کس لئے ہیں ہم ہر دم پھرتے آتے ہیں اور جاتے ہیں

سب وعدہ اپنی بیقراری کا کتنا موثر اور صحیح نقشہ کھینچا ہے۔ کسی کے انتظار میں بیتابی کا اس طرح مظاہرہ بالکل فطری ہے۔

دمبدم رونا ہمیں چاروں طرف تکنا ہمیں — کیا کہیں عاشق ہوئے یا ہو گیا سودا ہمیں

عاشق کی کتنی حسرت بھری تصویر کھینچی گئی ہے۔ "دمبدم رونا ہمیں چاروں طرف تکنا ہمیں"

اپنی آواز قدم سے بھی وہ ڈر کر رات کو — مڑ کے پیچھے دیکھ لیتا ہر قدم پر آپ کو

شاعری بہر حال معنوی مصوری ہے، رات ہے۔ بہت ممکن ہے اندھیری ہو۔ وہ کہیں جانے کے لئے چھپ کر گھر سے نکلے ہیں قدم قدم پر خوف دامن گیر ہے کہ کہیں کوئی دیکھتا نہ ہو، تنہائی ہے۔ اپنی آواز قدم سے بھی دوسروں کے پیروں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اس تمام منظر کا ہو بہو نقشہ مومن نے اس شعر میں کھینچ کر رکھ دیا ہے۔

ہونے اتفاق سے گر بہم تو وفا جتانے کو دمبدم — گلۂ ملامتِ اقربا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

اس ایک شعر میں پوری حدیث شوق موجود ہے۔ آغاز محبت سے لیکر انجام محبت تک کی ساری سرگزشت اس ایک شعر میں رکھدی گئی ہے۔ آغازِ عشق کی سرگزشت سنئے۔ رازِ عشق افشا ہو چکا ہے۔ وہ چھپنے لگے ہیں بلکہ چھپائے جانے لگے ہیں اگر کبھی حسن اتفاق سے ملاقات ہو گئی تو پیشتر اس کے کہ عاشق اس کی شکایت کرے کہ اب تو آپ نے اپنی صورت دکھانا بھی چھوڑ دیا ہے وہ ملتے ہی بول اٹھتے ہیں ہم مجبور تھے تم سے نہ مل سکے کیا کریں اور ملامت کرتے ہیں۔ گھر گھر ہماری محبت کا چرچا رہتا ہے مطلب اس کہنے سے یہ ہوتا ہے کہ ہماری وفا اور محبت میں فرق نہیں آیا ہے عزیزوں کی ملامت سے جان مصیبت میں ہے ہمیں خود تم سے جلد جلد نہ ملنے کا افسوس ہے اب انجامِ محبت کا بھی حال سن لیجئے۔ یا ایک وہ زمانہ تھا کہ اتفاقیہ ملاقات میں محض اظہار وفا کے لئے تم ملامت اقرباء کا ہم سے گلہ کرتے تھے یا اب وہ دن آگیا ہے کہ اب مجھے اس میں بھی شک ہے کہ آیا تمہیں یاد بھی ہیں یا نہیں۔ ساری غزل کی غزل حالیہ ہے سادگی اصلیت تاثیر اور تسلسل بیان ایک بار عہدِ الفت کے بھولے ہوئے افسانے کی یاد کم از کم ضرور تازہ کر سکتا ہے۔ اسی غزل کے چند شعر اور ملاحظہ ہوں:۔

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو — وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی — سو نباہنے کا تو ذکر کیا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
جسے آپ گنتے تھے آشنا جسے آپ کہتے تھے باوفا — میں وہی ہوں مومن مبتلا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

یہ ہے سرگذشتِ بلاکشانِ محبت۔ یہی وہ مقام ہے جہاں مصور کا قلم رک جاتا ہے اور شاعر کی دُنیا شروع ہوتی ہے۔

گلہ ہرزہ گردی کا بجا نہ تھا مجھ — وہ کیوں مسکرائے بجا کہتے کہتے

میں نے ہرزہ گردی کا جب شکوہ کیا تو انھوں نے مسکرا کر فرمایا جی ہاں بجا ہے۔ یہ بجا کا طنزیہ استعمال ہے اور اس پر تبسم اور بھی قیامت ہو گیا یہاں مومن کی قوت مشاہدہ اور قوت بیانیہ کو دیکھیے۔ آپ نے بھی دیکھا کہ آپ نے جایز شکایت کی اور وہ بجا ہے کہکر ٹال دی گئی۔ بجا ہے کے متعدد پہلو ہوتے ہیں۔ ایک تو اس طرز اقرار میں، اقرار کی ندامت نہیں باقی رہتی دوسرے انکار کا بھی پہلو نکلتا ہے تیسرا قومی پہلو طنزیہ ہے۔ مومن نے قیامت یہ کی ہے کہ اس پر مسکراہٹ بھی زیادہ کر دی یہاں سے اس دنیا کی سرحد شروع ہوتی ہے جہاں سے مومن نے دنیا سے الگ ہو کر اپنی دنیا بسائی ہے اور اسی لحاظ پر مومن کو س لمن الملکی بجاتے ہیں۔

## خصوصیات مومن

مومن کے کلام میں ایک مخصوص وصف ہے جس میں کوئی استادان سے بہتر تو در کنار ان کے برابر بھی نہ ہو سکا وہ یہ کہ مومن اپنے مطلب کو اس طرح ادا کرتے ہیں کہ مخاطب اس میں اپنا فایدہ تصور کرتا ہے مثلاً یہ کہنا ہے کہ دشمن کی طرف نہ دیکھو تو اس کے لئے یہ انداز اختیار کرتے ہیں۔

ہے دوستی تو جانب دشمن نہ دیکھنا  جادو بھرا ہوا ہے تمہاری نگاہ میں

اب بخیال دوستی دشمن محبوب مجبور ہے کہ وہ غیر کی طرف نہ دیکھے۔ محبوب پر ثابت کیا ہے کہ تمہارے نہ دیکھنے سے دشمن کا فایدہ ہے اور فایدہ اپنا متصور ہے۔

نرگیس آنکھوں سے تم نامہ لگاتے کیوں ہو  خاک میں نام کو دشمن کے ملاتے کیوں ہو

محبوب کو اور کس طرح رقیب کے خط کی تکریم کرنے سے روکا جا سکتا ہے۔

منظور ہو تو وصل سے بڑھ کر ستم نہیں  اترا رہا ہوں دور کہ ہجراں کا غم نہیں

یوں کہنے سے کون سنتا ہے کہ آیئے مجھ سے مل جایئے۔ لہٰذا یہ کہا کہ ہجر کے صدمے اٹھاتے، اٹھاتے عادت سی پڑ گئی ہے۔ تم ستمگر ہو میں تمہیں صلاح نیک دیتا ہوں اب تو تم مجھ پر صرف یونہی ستم کر سکتے ہو کہ کبھی آن کر مل جاؤ لیکن سچ تو یہ ہے کہ یہ شعر محض شوخی ادا کا کارنامہ نہیں ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ مومن نے ہجر میں اتنے دن کاٹے ہیں کہ وہ عادت ثانیہ بن گئی ہے اور ہجر کے نشتر میں وہ خلش نہیں رہ گئی اگر تم ستم ہی کے خوگر ہو تو ایسی حالت میں وصل سے بڑھ کر اور کیا ستم ہو سکتا ہے لیکن یہ بھی تمہاری پسند پر موقوف ہے۔ منظور ہو تو وصل سے بڑھ کر ستم نہیں، ورنہ میں تو وصل ہجر کے جھگڑوں سے دور نکل گیا ہوں۔

خواہش مرگ ہو اتنا نہ ستانا ورنہ  دل میں پھر تیرے سوا اور بھی ارماں ہوگا

گویا مومن خاں محبوب کے جور و جفا سے باز آنے کی صلاح دیکر خود اسی پر احسان کر رہے ہیں۔ دیکھیے محبوب سے کہنے اور التماس دعا کرنے کا کتنا لطیف انداز بیان اختیار کیا ہے۔ ادبی زبان سے شکوہ جور بھی کرتے جاتے ہیں کہیں کہیں اس داستان کے پردے میں عرض وفا کے بھی افسانے سنائے جاتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ تقاضائے کرم بھی کرتے جاتے ہیں۔ سب کچھ کہتے جاتے ہیں۔ مگر فایدہ اسی دشمن جاں کا مدنظر ہے شعر ایک بار پھر پڑھ لیجیے۔

خواہش مرگ ہو اتنا نہ ستانا ورنہ  دل میں پھر تیرے سوا اور بھی ارماں ہوگا

بہت ستا چکے للہ اتنا نہ ستاؤ کہ میرے دل میں مرنے کی آرزو پیدا ہو جائے۔ جفائے بعض آور وہ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جس دل میں اب تک تمہاری آرزو بسی ہوئی ہے اسی دل میں موت کی آرزو بھی ہوگی جسے میں نہیں دیکھ سکتا۔ شعر کا بلند پہلو یہ ہے کہ جور و ستم کی عاشق حکایت ضرور کرتا ہے لیکن نہ اس لئے کہ اسے تکلیف ہوتی ہے، بلکہ صرف اس خوف سے کہ کہیں دل میں دوسری

آرزو (موت) کی نہ پیدا ہو جائے۔ یعنی شعر کا ایک سطحی پہلو تو یہی ہے کہ مومن اپنا فایدہ چاہتا ہے لیکن یہ خود غرضی ہے اور دنیائے عاشقی میں جائز نہیں۔ بلند معیار عاشقی یہ ہے کہ اپنی جاتی ہے تو جائے لیکن دل میں عجز کا خیال نہ آنے پائے۔ مومن نے اس پہلو کو ترک نہیں کیا ہے۔ بہت تم نے ستایا، شوق سے ستاؤ، لیکن اتنا نہیں کہ موت کی تمنا بھی دل میں پیدا ہو جائے۔ شکوۂ جور، تقاضائے کرم حسنِ وفا، ایک سانس میں مومن ساری داستان عشق ختم کر گئے۔

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا　　میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا

بزم میں اگر آپ نے سب کی طرف دیکھا اور صرف مجھ سے تجاہل برتا تو، لامحالا اغیار یہی نتیجہ نکالیں گے کہ آپ کو مجھ سے کوئی نہ کوئی خصوصیت ضرور ہے، بہتر یہی ہے کہ میری طرف بھی اک نگاہ غلط انداز، ڈال لیجئے۔

شعلۂ دل کو ناز تابش ہے　　اپنا جلوہ زرا دکھا جانا

یہ بلند پروازی تنہا مومن کے حصے میں آئی تھی۔ بقول میرے ایک دوست کے جب میں اس شعر کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں تو کثرت معنی سے میرا دم گھٹنے لگتا ہے اور گھبرا کر شعر بھول جانے کی ناکام کوشش کرتا ہوں۔ ملاقات کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوتی اور آتش ہجر نے دل و جگر کو پھونک رکھا ہے۔ عاشق محبوب کے مزاج سے واقف ہے اسے معلوم ہے کہ محبوب دعوئ یکتائی ہے۔ دیکھئے ملاقات کی کیا پیاری صورت نکالی ہے کہتا ہے شعلۂ دل کو اپنی تابش پر ناز ہو چلا ہے۔ خدارا آؤ اور اپنا جلوہ تو دکھا جاؤ یہ تو وہی مومن کا مخصوص انداز بیان ہے۔ اب ذرا شعر کی وسعت پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے۔ کہتا ہے، جو آگ تم نے لگائی تھی وہی آج بلند ہو ہو کر تمہاری تجلی پر چشمک زنی کر رہی ہے تمہارے ہجر میں بھی وہ اثر ہے کہ وہ شعلۂ دل میں اتنی تابش پیدا کر سکتا ہے۔

محفل میں تم اغیار کو دزدیدہ نظر سے　　منظور ہے پنہاں نہ رہے راز تو دیکھو

محبوب جب کبھی اغیار کو دزدیدہ نظر سے دیکھتا ہے تو عاشق کو تکلیف ہوتی ہے مگر یہ تکلیف دور کیونکر ہو عاشق کو یہ تدبیر سوجھی کہتا ہے آپ اگر راز عشق کو ظاہر کرنے پر ہی تلے ہیں تو محفل اغیار کو دزدیدہ نظر سے دیکھیے اور ضرور دیکھیے۔

شام سے تا صبح مضطر صبح سے تا شام ہم　　ایک عالم میں ہیں کیوں اے گردشِ ایام ہم

کیوں اے گردش ایام کیا اسی کا نام گردش ہے کہ ہم اب تک اُسی عالمِ اضطراب میں ہیں۔

لذتِ جور کشی نے مجھے شرمندہ کیا　　طعنے کیا کیا اسے ارباب ستم دیتے ہیں

یعنی اب مجھ پر ستم کرنے کی صرف یہی ایک صورت رہگئی ہے کہ وہ ترک ستم کرے۔

گر ذکر وفا سے یہی غصہ ہے تو اب سے　　گو قتل کا وعدہ ہے تقاضا نہ کریں گے

تقاضا نہ کرنے کے لئے صرف وعدۂ قتل کو تجویز کیا ہے۔ اپنا مطلب ہر حال میں حاصل ہے۔

میرے سینے پر قدم زور سے مت رکھ ظالم　　ہاں نہ چبھ جائیں کف پا میں کہیں دل کے خار

اس شعر کی بندش بھی ملاحظہ فرمائیے۔ یہاں مومن کا کمال فن اپنے منتہائے کمال تک پہونچ گیا ہے پہلا مصرع ہے میرے سینے پر قدم زور سے مت رکھ ظالم کیونکہ مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ اس شعر کی تحلیل لفظی کیجئے ممکن ہے اس کے بعد مومن کے کمال کا کچھ اندازہ ہو سکے۔ موقعہ یہ ہے کہ عاشق محبوب کو جور و جفا سے باز رکھنا چاہتا ہے جس کی صرف ایک صورت اس کے ذہن میں آتی ہے یعنی یہ کہ کوئی ایسی تدبیر نکالے جس میں بظاہر یا حقیقتاً محبوب کا فایدہ بھی مد نظر

رہے اب اس تعمیم کو تخصیص سے بدل دیجئے اور صورت حال یہ پیش نظر رکھیے کہ عاشق کے سینے پر محبوب کا قدم ہے اور اسے تکلیف ہورہی ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہوگیا کہ کوئی تدبیر ایسی کی جائے جس سے یہ تکلیف رفع ہوسکے۔ عاشق نے سوچا کہ اگر یہ کہا جائے کہ میرے سینے پر زور سے قدم مت رکھ تو وہ کیوں ماننے لگا لہٰذا یہ کہا جائے کہ اگر تم نے میرے سینے پر زور سے قدم رکھا تو ڈر ہے کہ میرے دل کے خار تیرے پائے نازک میں چبھ نہ جائیں۔ چونکہ یہ موثر صورت تھی اس نے یہی آخری صورت اختیار کرنے کا ارادہ کیا موقعہ کی نزاکت کا یہ خیال ہے کہ سینہ پاؤں کے نیچے دبا ہوا ہے، کہنا چاہتا ہے کہ میرے سینے پر زور سے قدم مت رکھ ورنہ خوف ہے کہ میرے دل کے خار تیرے کفِ پا میں چبھ جائیں۔ ظاہر ہے کہ دوسری صورت محض مقصد براری کے لئے نکالی گئی ہے گھبراہٹ میں عاشق اپنی پہلے سے سوچی ہوئی تدبیر پر عمل کرنے کے بجائے صاف کہہ جاتا ہے کہ میرے سینے پہ قدم زور سے مت رکھ ظالم لیکن فوراً اسے احساس ہوتا ہے کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں اور کیا کہہ گیا فوراً وہیں سے بات بدلتا ہے "ہاں نہ چبھ جائیں کفِ پا میں کہیں دل کے خار" ہاں، کا لفظ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ عاشق نے دفعتہً اپنی بات بدلی ہے انسان جھوٹ بولنا چاہتا ہے لیکن بعض اوقات گھبرا کر سچ بول دیتا ہے اور جب اسے احساس ہوتا ہے کہ میں کیا کہہ گیا وہیں سے بات بدلنا چاہتا ہے۔ اور ایسی ہی صورتیں اختیار کرتا ہے یہ صرف مومن کا کمال ہے کہ اس نے تمام واردات کو ایک شعر میں پوری طرح ظاہر کردیا ہے۔

**طنز** ادبیات میں طنز نے ایک نمایاں حصہ لیا ہے۔ انگریزی ادبیات میں (STEEL) اسٹیل اور (SWIFT) سوفٹ اپنی طنزیہ طرز تحریر کی بابت بہت مشہور ہیں سنزیہ پیرائے میں بیان کے لئے ایک خاص طور کی ذہنیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ طنز ہجو سے مختلف اور بلند ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ایک ہجو گو طنزیہ شاعری بھی کرسکے بلکہ میرا تو خیال ہے کہ ہاجی، طنز گو ہو ہی نہیں سکتا۔ طنز نہایت بلند چیز ہے، ہاجی کی پرواز تخیئل وہاں تک نہیں پہونچ سکتی نثر میں طنزیہ پیرایۂ بیان اختیار کرنا اتنا مشکل نہیں جتنا نظم میں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نثر کی تحریروں میں کبھی کبھی بعض مصنفین کے یہاں طنزیہ رنگ جھلک جاتا ہے لیکن نظم میں بہت کم شاعر اتنا لطیف مذاق فطرت کی طرف سے لے کر آئے ہیں جو طنزیہ شاعری کرسکیں۔ ہجو گو شاعر بہت گزرے ہر زبان میں گزرے لیکن کلام میں طنز نہ پیدا ہوسکا۔ جہاں تک تاثیر کا تعلق ہے میرا خیال ہے کہ طنز وہ نشتر ہے جو رگِ جاں پر کارگر ہوتا ہے طنز میں نزالت ہے اور ہجو میں سخاوت۔ خصوصیات مومن میں طنزیہ شاعری بھی ہے یہ بات کسی شاعر کو کم نصیب ہوتی ہے۔ مومن کی لطافت مذاق کا یہ عالم ہے کہ وہ طنز گو ہیں لیکن ہجو گو نہیں۔ میرے ایک محترم دوست نے طنزیات میں پھبتی۔ جلی کٹی آوازے وغیرہ کو بھی شمار کیا ہے ممکن ہے یہ تقسیم غلط نہ ہو لیکن مجھے تو طنز کے مقابل میں ان سب چیزوں میں سخاوت کی بو آتی ہے ان کا شمار طنزیات کے بجائے ہجو میں زیادہ کامیابی کے ساتھ ہوسکتا ہے اور طنز کو میں ہجو سے بالکل علٰحدہ چیز سمجھتا ہوں بہرحال میرے دوست نے طنزیات میں طعن، آوازہ، تشنیع، استہزا، زجر و توبیخ، ملامت، ہجو، بولی ٹھولی شکوہ شکایت، نوک جھونک، رمز و کنایہ، جلی کٹی، واسوخت سب کچھ داخل کیا ہے۔ اردو شاعری میں مومن سے پہلے طنز پایا نہیں جاتا۔ اکبر مرحوم کے کلام میں طنز کا کہیں کہیں ہلکا سا رنگ ضرور موجود ہے مگر چونکہ اکبر مرحوم کی شاعری یکسر سطحی شاعری ہے لہٰذا ان کے طنزیہ کلام میں وہ نشتریت نہ پیدا ہوسکی جو مومن کا طرۂ امتیاز ہے۔ میں ذیل میں مومن کی طنزیہ شاعری کو چند مثالوں سے واضح کرنے کی کوشش کروں گا۔

کس دن تھی اس کے دل میں محبت جواب نہیں  سچ ہے کہ تو عدو سے خفا بے سبب ہوا

طنزیہ کلام کو سمجھنے میں عموماً پہلی غلطی یہ ہوتی ہے کہ متکلم کے بارے میں ہمارا پہلا خیال یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے صحیح نہیں ہے یعنی الفاظ کا مفہوم کچھ اور ہے اور مدعا کچھ اور مثلاً شاعر کہتا ہے :۔

" سچ ہے کہ تو عدو سے خفا بے سبب ہوا "

ظاہر ہے کہ اس کہنے سے وہ یہ مفہوم لے رہا ہے کہ یہ بالکل جھوٹ ہے کہ تو عدو سے بے سبب خفا ہوا، لیکن یہ طنز کا سطحی پہلو ہے۔ اب ذرا غور کیجیے کہ اگر شاعر جو کہہ رہا ہے اس کو محسوس بھی کر رہا ہے اور اس سے وہی مطلب لیتا ہے جو کہہ رہا ہے نہ کہ اس کا برعکس تو اس کے کلام کے طنز کا کیا ٹھکانا۔ میں دوسری مثال سے اپنے مفہوم کو واضح کرنے کی کوشش کروں گا (SWIFT) کے نام سے کم انگریزی داں حضرات ہوں گے جو ناواقف ہوں گے جس ماحول میں اس کی زندگی بسر ہوئی اس کا تقاضا تھا کہ وہ طنز مجسم ہو کر رہ جائے ملک میں قحط و افلاس کا دور دورہ ہے بوڑھے بچے جوان فاقے کے ہاتھوں مر رہے ہیں سلطنت اس پریشانی کو دور کرنے کی ہر طرح ساعی ہے لیکن کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی سوفٹ کی زندگی ان ایام میں بھی جب خوشحال تھا تنگدستی کے ساتھ بسر ہو رہی تھی اب کہ ملک میں قیامت برپا تھی اس کا پرسان حال کون تھا۔ سلطنت کی تدابیر جب اس صورت حال کو بدلنے سے ناکامیاب رہی تو سوفٹ نے تنگ آ کر ایک قیامت خیز تجویز پیش کی اور اس کا عنوان ——— (A Modest Proposal) تجویز کیا۔ تجویز بیس کیا تھا۔ آپ سننے کی تاب نہ لاسکیں گے اس نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ غریب والدین کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو حلال کر دیا جائے اس کی رائے تھی کہ ان کی رانوں کا کباب نہایت عمدہ ہوگا۔ سینہ قورمہ کے لئے بہت موزوں ہے۔ اس تجویز کا فایدہ یہ دکھایا تھا کہ ان بچوں کو حلال کرنے سے ان کے والدین کو ایک بڑی مصیبت اور فکر سے نجات مل جائے گی یہ لڑکے جو غذا کھاتے وہ بچ جائے گی، اور دوسرے ان کا گوشت خود غذا کا کام دے گا۔ اس تجویز کے طنزیہ پہلو کو نظر انداز کیجیے کہ ایک شخص دنیا کا ستایا ہوا زندگی کی آسائشوں سے محروم چلا ہوئے مگر صدق دل سے یہ تجویز پیش کرتا ہے تو کیا آپ اسے محض طنز کہکر نظر انداز کر دیں گے جن لوگوں نے سوفٹ کی زندگی پر ہامعان نظر ڈالی ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ سوفٹ کی یہ تجویز مذاق نہ تھی بلکہ دراصل وہ اسے محسوس کرتا تھا کہ یہی ایک حل اس مشکل کا ممکن ہے اب اپنے شاعروں کو دیکھیے جو دن رات جور آسمان اور معشوق کا گلہ کرتے رہتے ہیں اگر وہ سچے دل سے گلہ کرتے ہیں تو وہ طنز نہیں بول سکتے جو صداقت سے خالی ہو۔ مومن نے دنیائے عشق و محبت میں جو مصیبتیں جھیلی ہیں جن کا نقشہ ہمیں ان کی آپ بیتی مثنویوں میں نظر آتا ہے کم از کم مجھے تو ضرور مجبور کرتا ہے کہ میں اُن کے طنزیہ کلام کو محض تعن و تشنیع کہکر ٹال نہ دوں، بلکہ اس تلخ حقیقت پر غور کروں جو ان طنزیہ اشعار کے لفظ لفظ میں ساری ہے۔ شعر کے دوسرے مصرعے میں مومن نے محبوب کے بیان کو بلا اضافہ الفاظ دہرایا ہے۔ سچ ہے کہ تو عدو سے خفا بے سبب ہوا، یہ سچ اگر جھوٹ ہو جائے تو یقیناً اس میں وہ طنز باقی نہ رہے گا جو سچ ہونے کی حالت میں موجود ہے :۔

ہے یہ بندہ ہی بے وفا صاحب　　غیر اور تم بھلے بھلا صاحب

طعن، آوازہ، تشنیع، استہزاء، پھبتی، زجر و توبیخ، ملامت، ہجو، بولی ٹھولی، شکوہ و شکایت، نوک جھونک، رمز و کنایہ، جلی کٹی، واسوخت وغیرہ اور طنز میں یہی فرق ہے کہ ان سب اصناف سخن کے یہ دو پہلو نکلتے، اسی شعر کو لے لیجئے "ہے یہ بندہ ہی بے وفا صاحب" ایک تو اس کے عام معنی ہوئے کہ بیوفا کہکر اپنی وفا شعاری پر زور دیا جا رہا ہے۔ لیکن اگر اسی کو سچ سمجھ لیجئے کہ "ہے یہ بندہ ہی بے وفا صاحب" اور اس مصرعے کی کوئی تاویل نہ کیجیے پھر اس کے

بعد مومن کی ذہنیت کا تجزیہ کیجئے اس وقت آپ پر روشن ہوگا کہ اس شعر میں کتنے تیز و نشتر پوشیدہ ہیں جو شخص یہ کہہ سکے کہ ہے یہ بندہ ہی بے وفا صاحب غیر اور تم بھلے بھلا صاحب۔ وہ کس دنیا کا رہنے والا ہوگا۔ طنزیہ شاعری میں قدم قدم پر مومن کی انفرادیت نمایاں ہوتی ہے۔

آپ مجھ سے نباہیں گے سچ ہے باوفا حسن و بے وفا ہے عشق،

سچ ہے نباہ نہ کر سکا۔ عشق ہی بے وفا ہے۔ اس ناکامیابی کا احساس کس کامیابی سے کم ہے جو اس تاویل کی ضرورت محسوس ہو کہ شعر طنزیہ ہے اور سیدھے سادے الفاظ میں اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کیا نباہیں گے حسن کیا باوفا ہوگا شعر طنزیہ ضرور ہے لیکن طنز سطحی چیز نہیں۔ اقرار ناکامیابی کافی ہے کہ بیوفا عشق کو باوفا حسن پر ترجیح دلا دے۔

خنجر تو نہ توڑ سخت جانی، پھر کس کو گلے لگائیں گے ہم

سخت جانی کو طعنہ دیتا ہے کہ تیری بدولت روز مجھ پر خنجر ٹوٹتے ہیں لیکن کس انداز سے کہ اگر خنجر ٹوٹ گیا تو کوئی گلے لگانے کے قابل بھی تو نہ ملے گا۔ یہ ایک لطیف طنزیہ انداز ہے جو مومن پر ختم ہے۔

بندے ہیں ہم صیاد کے کہتا ہے کس کس لطف سے گر ہو سکے راہ چمن اے رستگان دام لو

جب صیاد کو معلوم ہو چکا کہ ہم گرفتار دام نہیں ہیں بلکہ گرفتار صیاد ہیں تو کتنا لطف لے لے کر کہتا ہے اگر ہو سکے راہ چمن اے رستگان دام لو، صیاد نے کتنا طنزیہ پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے لیکن گرفتار کو مجبوراً یہ زہر کا گھونٹ بھی پینا پڑتا ہے۔

کر علاج جوشِ وحشت چارہ گر، لا دے اک جنگل مجھے بازار سے

اس شعر میں مومن نے طنز کا کمال دکھا دیا ہے۔ ہاں اے چارہ گر اگر تو جوش وحشت کا علاج کرتا ہے تو پہلے یہ بتا کہ تو بازار سے جنگل بھی لا سکتا ہے یا نہیں، مومن کا خیال ہے اور صحیح خیال ہے کہ جو لوگ جوش وحشت کا علاج کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ گویا بازار سے جنگل خریدنا چاہتے ہیں، جوش وحشت کا علاج تو یونہی ممکن ہے کہ وحشیوں کے لئے جنگل مہیا کیا جائے۔ لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ بازار سے جنگل لانا کیا معنی ان سے پوچھیے جوش وحشت کے علاج کے کیا معنی۔

میرے آنسو نہ پوچھنا دیکھو کہیں دامان تر نہ ہو جائے

یقیناً میرے آنسو پوچھنے سے ان کا دامن تر ہو جائے گا لیکن اس نشتر کو دیکھیے جو اس شعر کے لفظ لفظ میں پوشیدہ ہے میں رو رہا ہوں وہ دیکھ رہے ہیں اتنا نہیں ہوتا کہ اپنے دامن سے میرے آنسو پونچھکر مجھے تسلی دیں۔ وہ میرے آنسو پوچھنا گناہ سمجھتے ہیں شعر کا مختصر الفاظ میں مطلب یہ ہوا کہ دیکھئے میرے آنسو نہ پوچھئے گا کہیں آپ گناہگار نہ ہو جائیں یا کہیں دامان تر نہ ہو جائے

ہنسو نہ تم تو مرے حال پر میں ہوں وہ ذلیل کہ میری ذلت و خواری سے تم کو شان لگی

دُنیا مجھ پر ہنستی ہے ہنستے لیکن تمہیں میری ذلت پر ہنسنے کا کوئی حق نہیں میری ذلت خواری نے تمہاری شان بڑھائی۔ اس شخص کی زندگی پر ذرا غور کیجئے جو یہ کہنے پر مجبور ہو جائے۔ ایسے ہی حالات انسان کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ طنز مجسم ہو جائے۔

رشک دشمن بہانہ تھا سچ ہے میں نے ہی تم سے بے وفائی کی

یہ محبوب کے الفاظ تھے مومن نے صرف انہیں دہرا دیا ہے اور صرف ایک ٹکڑا ' سچ ہے' کا بڑھا دیا محبوب کی

شکایت کو مومن نے پلٹ کر طنز بنا دیا۔ سچ ہے ' میں نے ہی تم سے بیوفائی کی۔ میں ہی خطاوار ہوں۔

میں بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے    تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

اب تک آپ نے طنزیہ انداز بیان میں مومن کا کمال دیکھا۔ اس شعر میں مومن کچھ اور بلند اڑ رہے ہیں، یہاں مومن نے طنز کو بلند کیا ہے یہ جو حقیقت سے ہمدوش ہے۔ ہر حقیقت آگے چل کر تلخ حقیقت ثابت ہوتی ہے اور ہر تلخ حقیقت طنز کا دوسرا نام ہے۔ طنز کا دوسرا پہلو جو میں نے سوفٹ کی ( A modest Proposal ) میں واضح کیا ہے وہ یہاں اس سے بھی زیادہ عریانی اور تلخی کے ساتھ روشن ہے، محبوب سے کوئی شکایت نہیں بلکہ الٹے شکریہ ادا کیا جا رہا ہے لیکن یہ شکریہ شکایت سے تلخ تر ہے۔ طنز کی نشتریت اس کی واقعیت میں پوشیدہ ہے۔ میر کا ایک شعر ہے۔

اب حال دل ہے ان کے الخواہ    کیا پوچھتے ہو الحمد للہ،

الحمد للہ میں جو طنز اور معنویت ہے زبان اس کے بیان سے قاصر ہے لیکن مومن کا شعر بھی پڑھیے۔

میں بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے    تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

ممکن ہے کہ آپ بھی میرے ہم خیال ہو جائیں کہ مومن نے اسی تلخ حقیقت کا اظہار کچھ کم قاتل لہجہ میں نہیں کیا ہے۔

**اجتماع ضدین** شعر کی ایک تعریف یہ بھی ہے کہ موسیقی جب الفاظ کا جامہ پہن لیتی ہے تو شعر کہلاتی ہے، موسیقی کا تخیل توازن اور تسلسل کے بغیر نہیں ہو سکتا یہ توازن کیا ہے، یہ تسلسل کیا ہے۔ سکون و حرکت کا دوسرا نام بغیر سکون کے سمجھے ہوئے ہم حرکت کو سمجھ نہیں سکتے اسی طرح حرکت کو سمجھے بغیر ہم سکون کی بابت کوئی رائے نہیں قائم کر سکتے۔ اجتماع ضدین کے بغیر تخلیق کا تصور محال ہو جاتا ہے۔ مثال میں موسیقی ہی کو لیجئے ترنم تال و سم کے بغیر پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ محض تال یا محض سم یعنی محض حرکت یا سکون سے ترنم نہیں پیدا ہو سکتا ضدین میں ( Compromise ) مصالحت کے سوا کوئی دوسرا طریقہ ممکن نہیں۔ بجلی جو آپ کے گھروں کو روشن کرتی ہے مثبت اور منفی لہروں کے اتصال کا نتیجہ ہے تنہا مثبت یا تنہا منفی لہر بیکار ہے، کائنات میں بھی یہی اصول کار فرما ہے "خلقناہ کل شئی زوجاین" جنہوں نے مخلوقات کے اس پہلو پر غور کیا ہے کہ ان کی تخلیق اتصال اضداد کے سوا کسی اور طریقے سے ممکن نہیں بچھ وہی اس کو سمجھ سکتے ہیں کہ دنیا میں جن مسایل سے ہمیں دوچار ہونا پڑتا ہے ان کا حل اضداد میں مصالحت پیدا کرنا ہے مذہب کا یہی کام ہے کہ وہ ایسا راستہ بتائے جو حیات قبل موت اور حیات بعد موت میں یک رنگی پیدا کر دے۔ بعض مذاہب نے اس دنیا کی زندگی پر انتہائی زور دیا ہے۔ بعض مذاہب نے عقبیٰ کے لئے اس دنیا کو ترک کر دینے کا مشورہ دیا ہے۔ اسلام کی کامیابی یہی ہے کہ اس نے دونوں کا خیال رکھا۔ الغرض تمام عالم اجتماع ضدین کا مظہر ہے۔ ایک حقیقی شاعر خلقت کے اس پہلو کو نظر انداز نہیں کر سکتا مومن کے شاعرانہ دل و دماغ نے حقیقت کو پالیا اور مختلف طریقوں سے مختلف صورتوں میں اپنے اشعار میں اس حقیقت کو بیان کیا ہے۔ چند مثالیں مومن کی اس خصوصیت کو بھی ظاہر کر دیں گی جہاں تک کم شاعروں کی نظریں پہونچی ہونگی۔

آخر امید ہی سے چارہ حرماں ہوگا    مرگ کی آس پہ جینا شب ہجراں ہوگا

حرماں یعنی ناامیدی کا علاج امید ہی سے ہو سکتا ہے۔ بظاہر اس مرض کا اصول علاج بالضد معلوم ہوتا ہے لیکن غور کرنے سے یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ اس مرض کا اصول علاج۔ علاج بالمثل ہے۔ حرماں کیا ہے ناکامیاب امیدیں۔ اس کا علاج کیا ہے وہی امید ہی مرض حرماں کا باعث ہوئی امید ہی سے اس کا علاج ہو سکتا ہے۔

موئے نہ عشق میں جب تک وہ مہرباں نہ ہوا　　بلائے جان ہے وہ دل جو بلائے جاں نہ ہوا

مومن پر ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ وہ بعض الفاظ ایسے بھی استعمال کر جاتے ہیں جو مذاقِ سلیم پر گراں گزرتے ہیں حالانکہ دوسرا بہتر لفظ موجود ہوتا ہے۔ مثلاً یہاں موئے، کہا ہے جس کا ترک اولیٰ تھا۔ ہم اس امر کو قطع نظر کرکے کہ 'موئے'، مومن کے عہد میں متروک تھا یا نہیں، دیکھنا یہ چاہتے ہیں کہ "موئے" آج بھی قابل ترک ہے یا نہیں۔ موئے کو ترک کرکے مرے استعمال کرنے کی صلاح دی جاتی ہے۔ مصرع اولیٰ میں موئے کے بجائے "مرے" رکھیے اور پھر غور کیجیے کہ مرنے کا لفظ موئے کی جگہ رکھنے سے مصرعے میں کتنی معنوی کمزوری پیدا ہو جاتی ہے۔ مرے نہ عشق میں جب تک وہ مہرباں نہ ہوا، یہاں نہ سکے، کی مزید ضرورت مصرع میں محسوس ہوتی ہے۔ لفظ موئے، نہ سکے کا محتاج نہیں، علاوہ بریں مرے اور موئے دونوں طرح سے مصرع کو پڑھیے۔ اگر آپ غور کریں گے تو آپ کو محسوس ہوگا۔ کہ "مرے" سے مصرعے میں ایک ثقل پیدا ہو جاتا ہے۔ جو موئے رکھنے کی صورت میں باقی نہیں رہتا کیونکہ "ر" حرف صحیح ہے اور "و" حرف علت۔ حرف علت سے زیادہ ثقیل ہوتا ہے 'موئے' میں جو روانی لوچ اور نرمی ہے وہ مرے میں نہیں، بنا بریں میں اسے قابل ترک نہیں سمجھتا شاید مومن بھی مرے کو موئے کے مقابلے میں ثقیل سمجھتے ہیں۔ رہ گیا یہ شعر وہ خود جس عالمگیر حقیقت کا مظہر ہے اس سے انکار ناممکن ہے۔ عشق کے بغیر زندگی کا لطف نہیں اور عشق کے بعد زندگی ممکن نہیں۔ اس حقیقت کا اظہار اس سے بہتر لفظوں میں ممکن نہیں کہ بلائے جان ہے وہ دل جو بلائے جاں نہ ہوا۔ ایسے اشعار میں صنعت تجنیس یا صنعت تضاد تلاش کرنے کے بجائے معنی پر زیادہ زور دینا چاہیے۔

تیرے پردے نے کی یہ پردہ دری　　تیرے چھپتے ہی کچھ چھپا نہ رہا

فطرت انسانی کا تقاضا ہے کہ وہ زیر نقاب ہستی کو برافگندہ نقاب دیکھنا چاہتی ہے نگاہ شوق کو نقاب حجاب ہونے کے بجائے تازیانہ ہو جاتی ہے۔ مومن اسی واسطے پردے کو پردہ در سمجھتا ہے۔

کرۂ خاک ہے گردش میں تپش سے میری　　میں وہ مجنوں ہوں کہ زنداں میں بھی آزاد رہا

مومن خاں سے قبل شعرائے اردو زمین کی گردش سے واقف بھی نہ رہے ہوں گے چہ جائیکہ انھیں یہ بھی معلوم ہوتا کہ زمین کی گردش کا ایک سبب اس کی تپش بھی ہے۔ مومن نے زمین کی گردش سے فایدہ اٹھایا اور کہہ دیا کہ کہنے کو تو میں زنداں میں ہوں لیکن درحقیقت آزاد ہوں۔ حیات انسانی انھیں اجتماع اضداد کا نام ہے انھیں تعفیوں نے جبر و اختیار کے جھگڑے کھڑے کر دئے ایک شخص جس کو اختیار کہتا ہے اسی کو دوسرا شخص جبر کہتا ہے۔ ایک شخص جس کو اسیری کہتا ہے دوسرا اسی کو آزادی سمجھتا ہے۔

جوں نقاب اٹھی مری آنکھوں پہ پردہ پڑ گیا　　کچھ نہ سوجھا عالم اُس پردہ نشیں کا دیکھ کر

نقاب مانع دید تھی۔ جب تک چہرے پر نقاب رہی دیدار نہ ہو سکا لیکن قیامت تو یہ ہے کہ نقاب اٹھی بھی تو دیدار نہ ہو سکا —— انوار جمال کی کثرت نے آنکھوں کو خیرہ کر دیا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پہونچ کر جبر و اختیار کی حقیقت کھلتی ہے جہاں حسن زیر نقاب اور حسن برافگندہ نقاب نگاہِ شوق کی دسترس سے دور ہیں۔ یہاں امتیاز ضدین محال ہو جاتا ہے۔

اُس کو میں جا مریں گے مدد اے ہجوم شوق　　آج اور زور کرتے ہیں بے طاقتی سے ہم

زمانہ ثابت کر رہا ہے کہ بے طاقتی ہی اصل طاقت ہے جس کا توڑ نہیں ۔

اے آہ آسماں میں عبث رخنہ گر نہ ہو ڈر ہے کہیں نزول بلا بیشتر نہ ہو

وہی آہ جو کبھی آسمان سے اثر لاتی تھی اب بڑھتے بڑھتے آسماں میں رخنہ گر ہونے لگی جو علاج تھا وہی اب، مرض ثابت ہو رہا ہے۔

پامال اک نظر میں قرار و ثبات ہے اس کا نہ دیکھنا نگہ التفات ہے

معلوم نہیں نہ دیکھنے کا شکر ادا کیا جائے یا شکایت ۔

**قصائد** مومن کے قصائد بہت بلند ہیں اور ان سے علمی لیاقت اور شاعرانہ تخیل بخوبی ثابت ہے اور بے شک ان کے قصاید نہ صرف ان کے معاصرین مشہور کے ہم پایہ ہیں ۔ بلکہ ان کا درجہ اساتذہ فارسی سے ملتا ہوا ہے اور ان کے مطالعہ سے معمولی استعداد کا آدمی لطف نہیں اٹھا سکتا ۔ اُردو میں مومن نے وہ قصاید لکھے جو سلمان ساوجی کے قصیدوں سے ملتے ہوئے ہیں ۔

الحمد لواہب العطایا اس شور نے کیا مزہ چکھایا والشکر لصانع البرایا جس نے ہمیں آدمی بنایا

دوسرے شعر میں ترقی محال ہے کسی زبان میں اس سے بہتر حمد کا شعر ملنا دشوار ہے ۔ اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا کرم ہم پر یہی ہے کہ اس نے ہمیں آدمی بنایا ۔

اب بھی نظر اس مجاز میں ہے کیوں مہر نگاہ میں سمایا
نے عقل بسیط اس کا پرتو نے نور مجرد اس کا سایا
سبحانک یا الٰہ عالم، عالم ترا عجز نے دکھایا
ہر جائے ہے تیرا جلوہ لیکن دیکھا تو کہیں نظر نہ آیا
یاں عقل ہے گم کہ بس تجھی کو پایا ہر شئے میں پر نہ پایا

مومن نے شریعت اور شاعری دونوں کو کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے ۔ مولوی ضیاء احمد صاحب ایم اے[1] کی رائے ہے کہ مومن سے پہلے جس قدر شعراء گزرے ہیں قصیدہ میں باستثنائے سودا ۔ مومن کا کوئی ہمسر نہیں اگرچہ پختگی اور روانی میں قصاید ذوق کا درجہ کہیں ارفع ہے ۔ تاہم زور اور ندرت میں مومن کا جواب نہیں ہو سکتا ۔ ان کی تشبیب عموماً نادر اور انوکھی ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ہر قصیدہ میں تعلی اور شکایتِ زمانہ کہ شعرا کی سنت ہے اس شکوہ اور زور کے ساتھ پائی جاتی ہے کہ عرفی کا دھوکا ہوتا ہے ۔ تخلیص یا گریز البتہ نسبتاً کمزور ہوتی ہے ۔ کلام میں عقیدت کی جھلک اکثر نظر آتی ہے اور اسی کے ساتھ کہیں کہیں مذہبی تعریض بھی کر جاتے ہیں قصاید میں علمی مضامین بکثرت لاتے ہیں اور چونکہ خود نجوم و رمل و طب میں ید طولیٰ رکھتے ہیں اس لئے مخصوص مصطلحات سے کلام کا اغلاق بڑھا دیتے ہیں ، کہیں کہیں تلمیحات اور آیات و احادیث کی طرف بھی اشارات کرتے ہیں اور عربی جملوں کو تو اس خوبی سے تضمین کر جاتے ہیں کہ انگوٹھی میں نگینے کا گمان ہوتا ہے ۔

صاحب موصوف کا یہ جملہ کہ "پختگی اور روانی میں قصاید ذوق کا درجہ کہیں ارفع ہے" میں کوشش کے باوجود بھی نہ سمجھ سکا ۔ اگر پختگی کے معنی ہیں زیادہ قصاید کہنے کے تو اس میں شک نہیں کہ ذوق نے زیادہ قصیدے لکھے ہیں ۔

[1] ا ۔ ز ۔ لکھنوی ۔ زمانہ فروری سنہ ۱۱ء

ورنہ قصاید کے لئے اگر شوکت الفاظ۔ ندرت تشبیہ - زور بیان - بلند پروازی - عالی خیالی، علوئے مضامین کی ضرورت ہے تو وہ مومن کے یہاں بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔ آیندہ مثالیں اس امر کو واضح کریں گی۔ مومن کی قصیدہ گوئی پر کوئی مفصل بحث کرنے سے پہلے یہ طے کرلینا چاہیئے کہ تقاضائے قصیدہ گوئی کیا ہے اور مومن کے قصائد اس معیار پر کہاں تک پورے اترتے ہیں۔ نواب امداد امام صاحب اثر فرماتے ہیں کہ "جاننا چاہیئے کہ قصیدہ کی اصل غرض یہ ہے کہ شاعری کے پیرایہ میں مسایل اخلاقی و معاشرت و تمدن و معاش و معاد وغیرہ کی تعلیم دینی و دنیوی بنی آدم کو نصیب ہو یا حمد خداوند و نعت محمد مصطفےٰ و منقبت علی مرتضیٰ وایہ باصفا سے شاعر کو ثواب حاصل ہو اور، سامعین کو ذکر خدا و رسول سے توفیق عبادت پیدا ہو۔"

اگر تقاضائے قصیدہ گوئی یہی ہے تو مومن سے زیادہ اردو قصیدہ گو شعراء میں شاید ہی کوئی زیادہ کامیاب ہوا ہو۔ مومن نے کل نو قصیدے کہے ہیں ایک حمد میں ایک نعت میں چار چار یار کی منقبت میں ایک سیدنا امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی منقبت میں ایک معذرت میں ایک بسلسلۂ اعتراف احسان یعنی نو قصیدوں میں سات قصیدے مذہبی رنگ لئے ہوئے ہیں اور باقی دو کسی صلہ کی خواہش یا امید پر نہیں لکھے گئے۔ ان قصیدوں میں پختگی روانی شکوہ علوئے مضامین بلند پروازی سب کچھ موجود ہے گریز یقیناً نسبتاً کمزور ہے۔ اگر یہی ثبوت قصیدوں کے پختہ نہ ہونے کا ہے تو بے شک مومن کے قصاید میں پختگی نہیں ملاحظہ ہو:۔

صبح ہوئی تو کیا ہوا ہے وہی تیرہ اختری ۔ کثرت دود سے سیہ شعلۂ شمع خاوری
سامعہ سوز و دل خراش گریہ فزا و زخم ریز ۔ نغمۂ لوک عندلیب قہقہہ گل تری
مجھ کو فغاں سے کام اور ذکر میں اہل خانقاہ ۔ دیر میں شور بید خواں میکدے میں رواگری
صبح کی جب بہار ہے ساقی غنچہ لب ہو پاس ۔ مے سے عذار لالہ رنگ لب سے مذاق شکری
میرے یہ بخت ہائے بخت ایسے نصیب یا نصیب ۔ چارۂ یاس امید حشر، مرگ علاج مضطری
جان جہاں کو دل دیا دشمن جاں ہوا جہاں ۔ سر میں ہوا نظر میں یاس سینہ میں آرزو بھری
یک دل و گونہ گونہ زخم یک تن و فوج فوج غم ۔ یک جگر و ہزار کاوش یک سر و صد گراں سری

یہ قصیدہ راجہ اجیت سنگھ کی تعریف میں کہا گیا ہے۔ راجہ صاحب نے ایک روز مومن خاں کو بلوایا اور رخصت کے وقت ہتھنی کسوا کر اُن کو اس پر بٹھا کر رخصت کیا۔

راجہ اجیت سنگھ نام کا مرولئے خاص و عام ۔ جو دسے جس کے با نظام کار جہاں کی ابتری
فیل نشیں بنا دیا خاک نشیں کو اس نساب ۔ خاک نہیں فلک کو زیب لاف و گزاف برتری

اسی قصیدے میں راجہ اجیت سنگھ کے نیزہ کی تعریف میں کیا شعر کہا ہے:۔

افعی رمح سینہ کو چیر کے دل نکال لے ۔ مار سیاہ زلف سے ہو نہ سکے یہ دلبری

تعریف تیغ و تیر:۔

خندۂ برق تیغ میں گرمی مہر ماہ تیر ۔ گریۂ زخم تیر میں جوشش سحاب آذری

تعلیاں ملاحظہ ہوں :۔

شاعر بے نظیر ہوں سحر بیاں دبیر ہوں    دم ہے مرا نمونۂ معجزۂ پیمبری
سحر حلال سے مرے جادوے سامری خجل    طور کلیم اوج فکر نور خدا فسوں گری
لاف زنی پس مدیح رسم قدیم کیا کروں    اس قسم تازہ سے نہیں مجھ کو امید جائزی
کفر حکایت غرور اس کے بغیر یہ محال    تا متنبی و جریر عار ہے مجھ کو ہمسری
میری زبان میں وہ بات جس سے ملک سخن پرست    میرے بیان میں وہ سحر جس سے جنوں زدہ پری
مجھ کو یہ گل زمیں پسند آگئی اتفاق سے    مزرع غیر میں کسے ورنہ سر گریلوری
نان گدا بہ رغبت شاہ جہاں غلط غلط    باہمہ برتری دروغ آرزوی فرد تری
اب نہیں کی ہے اختیار نظم کو میں نے یہ زباں    آپ ہیں لب پہ بوسہ زن ہندی و تازی و دری
باغ میں اپنے ہر شجر تا بہ چنار و سرو بید    اول و آخر بہار باد فروش نوبری
لذت مدح جانفزا تلخی ہجو تا بکاہ    شہد ہے یاں تو شہد ناب صبر ہے تو سقوطری
میری طلاقت لساں میری فصاحت کلام    چارۂ صدرہ آزما از پے گنگی و کری
میرے معاند و حسود ہرزہ ستائے زنگاں    ہاجی خویش و بے خبر مست طبب کف آوری
ہیں یہ سگان جیفہ خوار شعر سخن سے بے نصیب    کافر استخواں پرست طرفہ سگی دکافری
ہیں وہ شہ سریر فضل جس کے خطیب کے لئے    اوج حضیض آسماں پست و بلند منبری

اردو شاعری اس شکوہ و زور کا جواب کہاں سے لاسکتی ہے۔ سودا، انشاء، ذوق، غالب تو کس شمار و قطار میں ہیں، فارسی زبان میں بھی چند ہی قصیدے اتنے زوردار نکل سکتے ہیں، چند مدحیہ اشعار ملاحظہ ہوں :۔

اس کے ادیم حشمت و مایدۂ جلال پر    خستہ ذباب کی طنیں طنطنۂ سکندری
جوش طراوت مشام دجہ عطاس عز و جاہ    لطف نسیم مشک بیز خلق شمیم عنبری
بوسہ روا بہر طریق سجدۂ و فرق ہر فریق    سنگ در اس کا اک صنم رشک بتان آذری
تو وہ بہار باغ حسن جس پہ کرے نثار جاں    لالہ رخی سہی قدی گلبدنی سمن بری
لب کو مثال کس سے دوں لعل و عقیق بے مزہ    گل ہیں کہاں یہ نازکی مل ہیں کہاں یہ احمری
چشم کا تیری امتیاز روح فزا نظر فزا    گریۂ و مستی نگاہ روح گلاب و عنبری
فصل بہار بعد یاس کس لئے غنچہ بھر ہوا    بزم میں تیری گر نہ تھی گل کو امید ساغری
جمع ہیں تجھ میں عدل و حسن جس سے خرابیاں خراب    مست شراب لب شراب محو پری رخی پری

دعائیہ اشعار کا اندازہ دیکھئے :۔

تا رہے الفت آزما ناز و غرور دلربا،    تا رہے آرزو فزا طرز ادائے دلبری

اس حسن بیان کا جواب ہوسکتا ہے :۔

حور پہ تیرے جاں نثار غارتیان دین و مال    وصل سے تیرے کامیاب لب شکران عسکری

تاکہ ہو نو بہار میں قسمت رند مشرباں — مستی و بے حجابی و نغمہ زنی و میخوری
بہر حسود جام زہر ساغر مے ترے لیئے — تا نہ ہو ناگوار طبع تلخی بادہ شکری
رقص و سرود سے تری انجمن نشاط گرم — شعلۂ و دود عارضِ روشن و زلف عنبری
سوئے ہزار گوش جاں روئے زمیں پہ زرفشاں — باغ میں جب تک اس طرح جلوہ کرے گل تری
تجھ کو نصیب بزم میں داد وہی صلہ وہی — مجھ کو مبارک ایک سو مدح گری گداگری

مومن عمر بھر مدح گری کو گداگری سمجھتے رہے یہ صرف سر سے راجہ کا بار احسان اتارنا تھا جس کے لئے اتنا زور طبع دکھایا گیا۔ مومن کا زور بیان آپ دیکھ چکے اور بہت ممکن ہے کہ آپ بھی میرے ہم خیال ہو جائیں کہ اُن کے قصاید ادب اردو کے لئے سرمایہ نازش ہیں۔ اب مومن خاں کے دریائے فکر کی روانی دیکھئے جس کی بابت ضیاء احمد صاحب کی رائے ہے کہ ذوق کے یہاں بڑھی ہوئی ہے۔ حمدیہ قصیدہ آپ کی نظر سے گزر چکا ہے ایک دوسرا قصیدہ ملاحظہ ہو جو ٹونک نہ پہونچ سکنے کی معذرت میں لکھا گیا ہے :۔

یادِ ایام عشرت فانی، — نہ وہ ہم ہیں نہ وہ تن آسانی
جایئں وحشت میں سوئے صحرا کیوں — کم نہیں اپنے گھر کی ویرانی
خاک میں رشک آسماں سے ملی — ہائے کیسی بلند ایوانی
کردیا گردش سپہر نے حیف — برج خاکی سپہر کیوانی

برج خاکی کی یہ تاثیر ہے کہ اگر سعد سیارہ ہے تو اس کی سعادت بڑھا دے گا اور اگر نحس سیارہ ہے تو اس کی نحوست میں اضافہ کردے گا۔ میری نحوست دیکھیئے کہ کیوان گھوم پھر کے برج خاکی ہی میں رہتا ہے:۔

ایسی وحشت سرا میں آئے کون — بے دری کر رہی ہے دربانی
کیا ہوئی وہ بلندی دیوار — کیا ہوئے وہ عماد طولانی
جائے گل ہائیں چمن میں ریزۂ سنگ — گاہ کرتی ہے ناز ریحانی
اٹ گئے حوض و نہر۔ غیر از چشم — ایک قطرہ کہیں نہیں پانی
نہ ملا کچھ نشان آب رواں — خاک سارے جہان میں چھانی
سقف رنگیں و زر نگار کہاں — جز سپہر و نجوم نورانی،

تخلیص عموماً مومن کی کمزوری خیال کی جاتی ہے :۔

اے فلک دل کو داغ کرتی ہے — زر خورشید کی درخشانی
بے زری سے مری تجھے حاصل — کچھ نہ ہوگا بجز پشیمانی
جان مومن پہ گو نہ گونہ ستم — کافر اتنی بھی نامسلمانی
تاکجا اے یزید شمر خصال، — فتنہ ہائے فریب مردانی
اس سے کاوش نہ کر نہ ہو ظالم، — آپ اپنا تو دشمن جانی
تجھے معلوم ہے کہ ہے وہ کون، — کھول دوں میں یہ راز پنہانی

مدح خوان شہ و زیر لقب ختم جس پر ہوئی سخندانی
پایہ سنج کمال اہل کمال فارق قلزمی و عمانی

گھوڑے کی تعریف اس سے بہتر کیا ہو سکتی ہے :-

شوخی یار کی سی چالاکی، نگہ شوق کی سی جولانی

انداز دُعا دیکھئے کتنا پاکیزہ ہے :-

جب تلک باعث نشاط و ملال ہے وصال و فراق جانانی
تیرے حساد و رنج گوناگوں تیرے احباب اور تن آسانی
تیرا اقبال روز افزوں ہو جیسے مومن پہ لطف رحمانی

روانی کی مثال میں نہیں تسلیم کر سکتا کہ ذوق کی قصیدہ گوئی اس سے بہتر پیش کر سکتی ہے مومن کی قصیدہ گوئی کی وہ خصوصیت جس کے اُردو اور فارسی شاعری میں وہ تنہا مالک ہیں اُن کی تشبیب جو حقیقی معنوں میں تشبیب کہلانے کی مستحق ہے۔ تشبیب کے لغوی معنی پر اگر نظر رکھی جائے تو اس کا انداز تغزل سے جدا نہیں ہو سکتا۔ مذہبی قصاید سے میں چند ایسی مثالیں پیش کروں گا جو مومن کی اس خصوصیت کو روشن کریں گی :-

دل اب کی بار ہوا ایسی بے جگہ مایل کہ جان کو بھی ٹھکانے لگا رکھے گا دل

بے جگہ کا استعمال کتنا با محل ہے :-

وہ بد شعار طرحدار دلربا جس سے امید وصل خطا ترک آرزو مشکل
تم اور حسرت ناز آہ کیا علاج کروں میں نیم جاں نہ رہا امتحاں کے قابل
چلا ہی جاتا ہوں میں گو چلا نہیں جاتا عضب ہے شوق رسائی و دوری منزل
خدا سے ڈر بت بیدرد ہے یہ کیا انصاف کہ تو جفا سے نہ ہو اور وفا سے ہوں میں خجل
ہے یہی حسرت دیدار تو مرنا دشوار دم شماری کی مری عمر ہے تا روز شمار
بدگمانی نے نہ چاہا سے بھی رکھا محروم آہ راز دل غیر سے کس طرح میں کرتا اظہار
دھوم ہے تابش خورشید قیامت کی مگر مجھ سے اللہ نہ پوچھے گا عذاب شب تار؟

غالب کے دو شعر سن لیجئے اس کے بعد مندرجہ بالا شعر کو دیکھئے :-

آتا ہے یاد حسرت دل کا شمار یاد مجھ سے مری گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ
ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

اگر کنایہ صراحت سے زیادہ لطیف ہے تو غالب کی کردہ گناہوں کی سزا اور مومن کی تابش خورشید قیامت کی دھوم اور غالب کے ناکردہ گناہوں کی حسرت و داد اور مومن کی پرستش عذاب شب تار سے کیا نسبت۔ غالب نے ایک ہی بات کو دو طریقوں سے ادا کیا لیکن بھونڈے طریقے سے مومن نے اسی خیال کے لئے کتنا لطیف پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے۔

ننگ نامی نہ سہی مجھ کو ہے تم سے سروکار چھوڑ دوں آج وفا گر ہو وفا سے بیزار

دنیا کی شاعری اس سے بہتر تسلیم و رضا کا درس نہیں پیش کرسکتی تیاگ کا فلسفہ اس سے اونچی تعلیم پیش کرسکتا۔

نقدِ جاں اپنی تجلی کی نہ کہنا قیمت　　صبح محشر کہیں بن جائے نہ روزِ بازار

میں قصاید کی بحث مومن کی دُعا پر ختم کرتا ہوں بحث ضرور تشنہ ہے مگر اتنا مواد جمع کردیا گیا ہے جس کو دیکھ کر اربابِ نظر مومن کی قصیدہ گوئی پر کسی نتیجے پر خود پہونچ سکیں

وہ عشق دے جس کا نام اسلام　　وہ شیوہ نبی نے جو بتایا
وہ نعرۂ علمہ صحابی　　جس نے کہ اُس آگ کو بجھایا
کچھ آب زنی کرے نہیں تو　　سر نارِ جحیم نے اٹھایا
مجھ کو بھی بچالے جیسے تونے　　یوسف کو گناہ سے بچایا
وہ رفعتِ حال دے کہ جس نے　　منصور کو دار پر چڑھایا

مومن غیر مقلد تھے اور عقاید میں نہایت سخت۔ تصوف جو ان کے یہاں نہیں پایا جاتا اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ وحدت وجود کو اسلام کے منافی سمجھتے تھے ان کا ایمان وحدت شہود پر تھا۔ وحدت وجود کے مسئلہ کو ترک کردیجئے پھر تصوف میں کیا خاک رہجاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس حمدیہ قصیدہ میں مومن یہ دعا کرہی گئے کہ:۔

وہ رفعتِ حال دے کہ جس نے　　منصور کو دار پر چڑھایا

بہت ممکن ہے کہ یہ قصیدہ شاہ سید احمد بریلوی کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے پہلے لکھا گیا ہو:۔

اس کا مرے دل پہ ایک پرتو　　جس شعلہ نے طور کو جلایا
مومن کہے کس سے حالِ آخر　　ہے کون ترے سوا خدایا

مقطع کی کس زبان سے تعریف کی جائے۔

## مثنویاں

مومن کی مثنویاں ان کی حیاتِ معاشقہ کی منظوم تصویر ہے۔ اُن کی سیرت کا وہ پہلو جس نے ان کے کلام پر اثر کیا ان مثنویوں کے مطالعے سے صاف واضح ہوجاتا ہے، سوال یہ اٹھ سکتا ہے کہ مثنویوں میں جو واقعات قلمبند ہوئے ہیں ان کے امرِ واقعہ ہونے کا کیا ثبوت ہے۔ داخلی ثبوت تو یہ ہے کہ مثنویوں میں جو سوز و گداز ہے وہ اس بات کا شاہد ہے کہ وہ سب آپ بیتی ہیں۔ فرضی قصوں میں یہ بات نہیں پیدا ہوتی دوسری بات جو ان مثنویوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ مومن کی حیاتِ معاشقہ میں صرف ایک حادثہ یہ پیش آیا ہے کہ محبوب کا انتقال ہوگیا۔ مثنوی ہی میں اس کا ماتم کیا گیا ہے لیکن طبیعت کو اس سے تسلی نہ ہوئی مومن نے دل کو تسکین دینے کے لیے ایک درد انگیز مرثیہ بھی لکھا جس کے ابتدا میں لکھا ہوا ہے۔ "ترکیب بند بہ مضمون مرثیۂ معشوقہ حور و ملک شیم حصلنی وصالہا فی جنت النعیم" آخر کا ٹکڑا "حصلنی وصالہا فی جنت النعیم" اس امر کو ظاہر کرتا ہے کہ کسی فرضی معشوقہ کا مرثیہ نہیں تیسری بات جو خلافِ روشِ وقت مومن کے کلام میں پائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ جنسِ لطیف ہی کا کوئی نہ کوئی فرد ان کا محبوب و مطلوب رہا ہے، مومن کے سارے کلیات میں ایک مصرع بھی ایسا نہیں نکل سکتا جس سے یہ وہم ہو سکے کہ مومن کا محبوب کبھی دوسری جنس کا کوئی فرد رہا ہے، یہی وجہ ہے کہ مومن خاں

اپنے کلام میں بار بار لفظ پردہ نشین پر زور دیتے ہیں۔ مثنویوں کی سادگی اور ان میں کسی پلاٹ کی عدم موجودگی بھی میرے اس خیال کو یقین کے درجے تک پہونچاتی ہے کہ یہ سب مومن نے اپنی ہی سرگزشت لکھی ہے ورنہ حکیم مومن ایسا نازک خیال شاعر اور یہ سادگی کوئی معنی نہیں رکھتا۔ خارجی ثبوت صرف ایک معتبر مل سکا ہے اور وہ گلشن بے خار ہے جس کے مولف نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ، مومن کے ہمراز اور شاگرد ہیں شیفتہ صاحب، کے تذکرہ میں لکھتے ہیں "نام امتہ الفاطمہ بیگم عرف صاحب جی۔ بتقریب مداوا با مومن خاں کارش افتادہ است چند کار بادر درد و الود۔ مثنوی قول غمیں، نام کہ از مصنفات خاں مغرے الیہ است شرح نسخہ حسن و جمال ہماں موزوں قداست۔" مثنوی قول غمیں کی صاحب جی (ہیروئن) ہیں قصہ مختصر طور پر یہ ہے :-

| | |
|---|---|
| ایک چندے یہی اوقات رہی | روز پہروں کی ملاقات رہی |
| واں ہر اک طرح بہلتا تھا دل | کہ ہوئی اس میں بلا اک نازل |
| کہیں باہر سے کوئی واں آیا | میرے بیٹھے ہی وہ مہماں آیا |
| سنتے ہی اور کے آنے کی خبر | پردے کے واسطے آیا باہر |
| اتنے میں دل جو مرا گھبرایا | جی میں کچھ سوچ کے میں گھر آیا |
| دوسرے دن جو ہوا گھر سے رواں | جانبِ کوچۂ رشکِ بستاں |
| الغرض جب میں وہاں جا پہونچا | تازہ پیغام اجل آ پہونچا |
| دم لیا بھی نہ کہ دم دینے لگے | تلخکامی کے مزے لینے لگے |
| دام الفت میں گرفتار ہوئے | پائے بند ستم یار ہوئے |
| یہ کچھ آشفتہ سری نے مارا | کہ مجھے چارہ گری نے مارا |
| کی یہ تشخیص نے میری تدبیر | کہ ہوا دمبدم احوال تغیر |
| ہوگیا نبض شناسی سے جنوں | سو حال دلِ دیوانہ کہوں |
| صاحب خانہ نے بعد اکرام | بیقرار نہ کیا مجھ سے کلام |
| کہ یہاں عید و محرم ہے بہم | کل سے کیا کیا طرب و غم ہے بہم |
| یعنی وارد ہے وہ مہمان عزیز | جس کے قربان مری جان عزیز |
| ایک بیمار پریشاں احوال | نہ وہ جلوہ نہ وہ رونق نہ جمال |
| آپ کچھ چارہ گری کیجیے غرض | نبض دیکھو کہ ہو تشخیص مرض |
| میں نے اس نبض پہ جو ہاتھ دھرا | ہاتھ سے میرے میرا دل ہی چلا |
| آفتِ تازہ جو جاں پر آئی | یہ غزل اپنی زباں پر آئی |
| کیا لگا دست دلارام سے ہاتھ | دل گیا ہاتھ سے اور کام سے ہاتھ |

سارے دن تو رہے ہم صحبت یار
اس کے کوچہ سے نہ اُٹھتا تھا قدم
واں سے آنے کی کہاں طاقت تھی
دل میں جب ہوک اٹھی بیٹھ گیا
عجب احوال سے گھر تک پہونچا
گھر میں آیا تو ولے ہوش کہاں
شوق فرمائے کہ ہاں پھر چلئے
دلِ بیتاب کو پھر تھام لیا،
بوئے گل لائی صبا لبتاں سے
واکیا جوں وہ طلسم افسوں
کہ تمہارے بھی عجب ہیں حرکات
کیا مناسب تھے یہ بیباک سخن
حرکت اچھی نہیں بدنامی کی
پاس رسوائی کا گر اپنی نہ ہو
بسکہ ہوتا ہے محبت میں اثر
دلِ مشتاق تپاں ہے یاں بھی
اب گیا واں تو تکلم برلب
پر وہی اگلی سی شیریں سخنی
اوروں سے حرفِ دلآویزانہ
یوں ہی باعشرت وعیش و آرام
بعدچند سے فلک نا ہنجار
جمع احباب پریشاں گرداں
دیکھ واں روز کا جانا میرا
راہ بیداد کی لی ظالم نے
سرپر اک آفتِ تازہ لایا،
یعنی واں کوچ کی اُن کی ٹھہری
جس گھڑی ہم تلک آئی یہ خبر
اک غلو ہوش پہ بے ہوشی کا
خود فراموشی وغفلت کوشی

جب ہوئی شام تو اٹھے ناچار
بیٹھے جاتے تھے ہراک گام پہ ہم
کیاکہوں آہ عجب حالت تھی
پاؤں اٹھا بھی تو جی بیٹھ گیا
خونِ دل دیدۂ تر تک پہونچا
دل وہاں جان وہاں دھیان وہاں
جی میں یہ آئے کہ واں پھر چلئے
بیقراری ہی میں آرام لیا
یعنی اک نامہ برآیا واں سے
ہاتھ آیا یہی گنج مضموں
ایسے ناداں کہ سمجھتے نہیں بات
نامناسب تھے، یہ بیباک سخن
یہی باتیں تو ہیں ناکامی کی
دیکھو تم مجھ کو تو رسوا نہ کرو
مجھ کو سب درد کی تیرے ہے خبر
زینت لب یہ فغاں ہے یاں بھی
دشنہ درجان و تبسم برلب
دل میں سوزخم ولے خندہ زنی
آشنا سے سخن بیگانہ
جب کہ گزرے ہیں کچھ اور ایام
بدچلن بدروش و کج رفتار
گردش افزائے بیاباں گرداں
بیٹھنا ہنسنا ہنسانا میرا
چھوڑدی راست روی ظالم نے
بدسلوکی سے مرے پیش آیا

. . . . . . . . . . . . . . .

چھاگئی بے خبری سی دل پر
عالم اک اپنی فراموشی کا
بیخودی بیخبری بے ہوشی

اس میں پیغامبر آیا واں سے　　ترجماں لعل لب جاناں سے
جی میں آجائے تو آجاؤ یہاں　　آن کر شکل دکھا جاؤ یہاں
اور اس وقت بھی گر آپ نہ آئے　　ہم کہاں اور کہاں تم پھر آئے
سن کے یہ بات میں باحال تباہ　　بیخود انہ ہوا اُس کے ہمراہ
پائے شوق کہاں تک پہونچا　　وہ تھے جس جائے وہاں تک پہونچا
کیا نئے ڈھب سے ملاقات ہوئی　　کہ نہ کچھ بولی نہ کچھ بات ہوئی
مل کے حیرت زدگانِ بے کس　　دور بیٹھے ہوئے روتے رہے بس
خونفشاں لب پہ وہ آہیں باہم　　حسرت آلودہ نگاہیں باہم
گرچہ ہرگز بھی نہ تھی تاب کلام　　پر یہ بولی کہ ذرا جی کو تھام
کہ یہ کیا حال ہے کیوں روتے ہو　　مفت کس واسطے جی کھوتے ہو
اب تم اوروں سے لگا لیجو جی　　نہ ہوئے ہم تو کوئی اور سہی
ہاں اگر فکر ہو تو ہم کو ہو　　رنج و اندوہ ہو جو ہم کو ہو
کہ بری آہ ہماری خو ہے　　ہم میں اک مہرو وفا کی بو ہے
خیر رہنا ہوا اب تک اپنا　　اب وطن تم کو مبارک اپنا
تم رہو خوش کسی جاناں کے ساتھ　　ہم چلے حسرت و حرماں کے ساتھ
کام دل رنج و بلا کو سونپا　　تم کو لو ہم نے خدا کو سونپا
کہہ کے یہ اُٹھ گئی جی کھوتی ہوئی　　ہچکیاں لیتی ہوئی روتی ہوئی
ہم بھی روتے ہوئے اپنے گھر آئے　　بادل مضطرب و مضطر آئے
کیا کہوں کیونکر گزاری وہ رات　　گزری کس حال میں ساری وہ رات
کس سے یہ صدمہ سہا جاتا ہے　　کس سے وہ حال کہا جاتا ہے
جو ہو دلدادہ وہ سمجھے آپی　　کار افتادہ سمجھ لے آپی

صاحب آبِ حیات کی رائے ہے کہ "مثنویاں نہایت درد انگیز ہیں کیونکہ درد خیز دل سے نکلی ہیں۔ زبان کے لحاظ سے جو غزلوں کا انداز ہے وہی ان کا ہے" مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ مومن خاں کی مثنویوں سے ملک نے کیوں اتنی بے اعتنائی برتی۔ اگر ان مثنویوں کو کوئی صاحب اخلاق سے گری ہوئی سمجھتے ہیں تو انھیں میر اثر دہلوی کی مثنوی خواب وخیال دیکھنا چاہیئے جس کی عریانی کہیں بڑھی ہوئی ہے جس معیار اخلاق سے مومن کی مثنویاں پست سمجھی جاتی ہیں اس کے لحاظ سے شاید غزل کا کوئی شعر بھی پڑھنے کے قابل نہ مل سکے نہ یہاں موقع ہے نہ مجھے فرصت کہ میں اس معیار اخلاق پر بحث کروں جس نے ہمیں تنگ نظر بنا رکھا ہے، میں تو ایسے اخلاق کو جو اظہارِ حقائق سے چشم پوشی کرے ننگ اخلاق سمجھتا ہوں مذکورہ بالا مثنوی کے یہ چند اشعار اردو زبان کے لئے قابل فخر ہیں۔

کیا نئے ڈھب سے ملاقات ہوئی　　کہ نہ کچھ بولی نہ کچھ بات ہوئی

آخری ملاقات کا کیا صحیح مرقع کھینچا گیا ہے۔ اس منظر کی حسرت ناکی اگر بیان ہو سکتی ہے تو اس کے لئے اس سے زیادہ بہتر الفاظ کہاں سے آئیں گے عاشق و معشوق گفتگو کرنے کے لئے بیتاب ہیں لیکن مہر بہ لب صرف زبان حال شرح آرزو کر سکتی ہے :-

مل کے حسرت زدگان بے کس　　دور بیٹھے ہوئے روتے رہے بس

آخری ملاقات ہے۔ وقت گزر رہا ہے اور زبان نہیں کھلتی ایک دوسرے کو حسرت زدہ دیکھتے ہیں اور روتے ہیں۔ عورت، عورت ہے اس کے تاثرات مرد سے ہمیشہ زیادہ ہوتے ہیں۔ اس لئے مثنوی پڑھیے اور دیکھیے کہ یہ جدائی صاحب جی پر کیا اثر کر رہی ہے اور مومن اس سے کہاں تک متاثر ہیں۔ عورت کے لفظ لفظ سے اس کی محبت اور مصیبت ٹپک رہی ہے :-

گرچہ ہرگز بھی نہ تھی تاب کلام　　پر یہ بولی کہ ذرا جی کو تھام
کہ یہ کیا حال ہے کیوں روتے ہو　　مفت کس واسطے جی کھوتے ہو
اب تم اوروں سے لگا لیجیو جی　　نہ ہوئے ہم تو کوئی اور سہی

یہی صاحب جی نے کہا ہوگا اور اس کا خیال غلط نہ نکلا مومن نے دوسروں سے اس کے بعد طبیعت بہلائی۔ لیکن صاحب جی کا کیا حشر ہوگا اسے بھی سن لیجیے :-

ہاں اگر فکر ہو تو ہم کو ہو　　رنج و اندوہ ہو جو ہم کو ہو
کہ بری آہ ہماری خو ہے　　ہم میں اک مہر و وفا کی بو ہے

کم از کم اس وقت عورت کے تاثرات اتنے عمیق ہیں کہ ہم مجبور ہیں کہ اس کی مہر و وفا کی داد دیں۔

خیر رہنا ہوا اب تک اپنا　　اب وطن تم کو مبارک اپنا

یعنی اب تم ہو اور عیش و عشرت ہم ہیں اور رنج و مصیبت!

کام دل رنج و بلا کو سونپا　　تم کو ہم نے خدا کو سونپا

عورت جانتی ہے کہ جہاں میں جدا ہوئی مرد مجھے بھول جائے گا لیکن محض یہ خیال اس کی محبت کو کم نہیں کر سکتا۔ ہم پر مصیبت کے پہاڑ ٹوٹیں۔ لیکن تم خوش رہو :-

کہہ کے یہ اٹھ گئی جی کھوتی ہوئی　　ہچکیاں لیتی ہوئی روتی ہوئی
ہم بھی روتے ہوئے اپنے گھر آئے　　بادل مضطرب و مضطر آئے

دونوں اٹھ کر چلتے ہیں لیکن صاحب جی ہچکیاں لیتی ہوئی اٹھی ہے اور مومن "روتے ہوئے اپنے گھر آئے" عورت بے اختیار ہو کر رو رہی ہے لیکن مومن صرف اس بنا پر روتے ہوئے اٹھے ہیں کہ محبوب روتا ہوا اٹھا ہے۔ خود ان کے رنج و غم کا ہم پر وہ اثر نہیں پڑتا جو صاحب جی کی رنج و مصیبت کو دیکھ کر پڑتا ہے۔

مومن کی مثنویوں میں خارجی مناظر کا بیان تلاش کرنا بے سود ہے۔ مومن نے مثنویاں نہیں لکھی ہیں بلکہ دل کے چند جلے پھپھولے ہیں جو توڑے گئے ہیں۔ مومن کی مثنویوں سے لطف اندوز ہونے کے لئے ضرورت ہے کہ انہیں اسی روشنی میں پڑھا جائے جن کے تحت وہ لکھی گئی ہیں، مصنوعی معیار پر انہیں پرکھنے سے کچھ حاصل نہیں۔

## رُباعیات

مومن کی ہمہ گیر طبیعت نے کس صنف سخن میں اپنی جولانی نہیں دکھائی۔ مومن کے اس زور طبیعت کو دیکھتے ہوئے اگر شیفتہ نے گلشن بیخار میں یہ لکھا تو کیا غلط ہے کہ "بزعم فقیر بقوت شاعری ایشاں کم کسے برخاستہ در ہر جنس آنچناں مکانتے دانی دارد کہ کسے در یک صنف ہم میسر نمادہ اگر خطے از فہم خدا داد داری بیا دیدیوانش نظرکن و بتصدیق و تکذیب من زبان انصاف بکشا" جس طرح مثنویاں مومن کی عاشقانہ زندگی کی آئینہ دار ہیں اسی طرح رباعیاں مومن کے عقاید پر روشنی ڈالتی ہیں۔

محروم حصول مدعا نے چاہا     حسرت زدہ بخت نارسا نے چاہا
مومن اس بت نے گر نہ چاہا نہ سہی     ہم خوش ہیں اسی میں جو خدا نے چاہا

بالکل سچ ہے صبر و شکر اسی مجبوری کا نام ہے :۔

ہے عہدِ شباب زندگانی کا مزا     پیری میں کہاں رہ نوجوانی کا مزا
اب یہ بھی کوئی دن میں فسانہ ہوگا     باتوں میں جو باقی ہے کہانی کا مزا

جواں مرگ مومن کا یہ صرف زور طبیعت تھا جس نے یہ رباعی کہلائی ورنہ پیری تو دیکھنا ہی نصیب ہوئی :۔

لکھا نہ گیا اگرچہ دفتر لکھا     لکھا وہی بالکل کہ ہے دل پر لکھا
حیراں ہوں کہ جو حال پریشاں ہے مرا     یہ کاتب تقدیر نے کیونکر لکھا

حق تو یہ ہے کہ اردو زبان رباعیوں سے قریب قریب خالی ہی ہے۔ کوئی عمر خیام کوئی ابوسعید ابوالخیر کوئی سرمد اردو زبان میں پیدا نہ ہوا درد، مومن، انیس و دبیر کے یہاں کچھ رباعیاں ضرور ملتی ہیں لیکن انہیں فارسی زبان کی رباعیوں سے کیا نسبت ۔

مومن ہے اگرچہ سب اسی کا یہ ظہور     توحید وجودی کا نہ کرنا مذکور
یعنی کہ بنائے ہیں خدا نے بندے     بندے کو خدا بنائے کس کا مقدور

توحید وجودی کو چھوڑ کر تصوف کی شاعری ناممکن ہو جاتی ہے یہ صرف مومن خاں کا کمال تھا کہ انھوں نے توحید شہودی لے کر شاعری کی ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں :۔

مظہر سے بری ہے کبریائی اس کی ۔ آئینہ گداز خود نمائی اُس کی

آئینہ گداز خود نمائی اس کی، توحید وجودی کے خلاف اس سے بہتر شاعرانہ حربہ نہیں مل سکتا۔

روتا ہوں حسین ابنِ علی کے غم میں     ہے عیش جہاں کی آز اس ماتم میں
حیف آلِ نبی میں کوئی باقی نہ رہا     لازم ہے کہ باقی نہ رہے کچھ ہم میں

مومن نے جہاں دوسرے مذاہب پر شاعرانہ انداز سے مذہبی چوٹیں کی ہیں وہاں اس امر کو نظر انداز نہ کرنا چاہئے کہ حضرت امام حسین کے ماتم میں بھی وہ سیاہ پوش نظر آتے ہیں اسی مضمون کی پانچ چھ رباعیاں ان کے دیوان میں موجود تھیں، حالانکہ رباعیوں کی حیثیت سے ان کا پایہ چنداں قابل ذکر نہیں ۔

مومن یہ اثر سیاہ مستی کا نہ ہو     اندیشہ بلند و پستی کا نہ ہو
توحید وجودی میں جو ہے کیفیت     ڈرتا ہوں یہ حیلہ خود پرستی کا نہ ہو

ایک نئے مضمون کو بالکل نئے انداز سے لکھا ہے:۔

بے شاہد و بے بادۂ و صبر توبہ توبہ　　　اس عمر میں دل پہ جبر توبہ توبہ
ایام شباب اور دلجو ساقی　　　فصل گل و جوش ابر توبہ توبہ

کلیات میں سوا سو سے زیادہ رباعیاں موجود ہیں اور بقول ا۔ ز۔ لکھنوی، رباعیوں میں بھی طبیعت کا اصل رنگ موجود ہے۔

**مرثیہ**

مومن کی عاشقانہ زندگی کا دور نویں سال سے شروع ہوتا ہے:۔

یعنی طفلی سے ہوں میں پیر مغاں　　　بلد راہِ گمرہانِ جہاں
تھے برس ہم شمارۂ افلاک　　　کہ ہوا پائمال صورتِ خاک

ابھی دو سال بھی آرام سے نہیں کٹے تھے کہ "معشوقہ حور و ملک شیم کا انتقال ہوگیا۔

آفت جان و دل فراق و وصال　　　الغرض کٹ گئے یونہی دو سال
بہر تسکین شدت خفقاں　　　ٹھہری گلگشت روضۂ رضواں
گئی جنت میں بسکہ ایسی حور　　　ہوئی بیتاب کیسی کیسی حور

مومن کی ساری حیات معاشقہ میں صرف اسی ایک محبوب کا انتقال ہوا اور یہ مرثیہ اسی کا لکھا گیا ہے ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں مرثیہ بہت بعد کو لکھا گیا ہوگا۔ یہ مومن کا کمال ہے کہ بلا کسی فوری اثر سے متاثر ہوئے اتنا بھی اثر پیدا کر دیا ہے۔ میر انیس اور مرزا دبیر کے مراثی ہیں اگر وہ تاثیر پیدا کر سکتے ہیں تو اس کی وجہ اور بھی قوی ہے کہ وہ رونا رلانا باعث نجات سمجھتے ہیں۔ حالی نے غالب کا جو مرثیہ لکھا ہے وہ غالب کے مرنے کے بعد لکھا ہے اور حالی خود مرگِ غالب سے نہایت متاثر تھے غالب نے عارف کا مرثیہ لکھا ہے اور خوب لکھا ہے لیکن وہ بھی فوری تاثیر کے ماتحت موتمن نے جو مرثیہ لکھا ہے وہ کسی فوری تاثر کے تحت نہیں لکھا ہے اس کے باوجود بھی مومن نے اپنے مرثیہ میں کسی سے کم اثر پیدا نہیں کیا ہے۔ یہیں کافر مومن کی شاعری پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ نمونے کے لئے دو بند پر اکتفا کرتا ہوں جنھیں پڑھ کر شاید آپ بھی میرے ہم خیال ہو جائیں کہ مرثیہ میں مومن کی کامیابی شاعرانہ اعجاز سے کم نہیں۔

دل کی طرح سے یہ بھی چلی جاں کو کیا ہوا　　　دم میں نہیں ہے دم مرے جاناں کو کیا ہوا
سر پیٹتا ہے شانہ پڑا دونوں ہاتھ سے　　　کیا جانے اس کی زلف پریشاں کو کیا ہوا
پیتی ہے اپنا خون دل افسوس سے حنا　　　اس دست رشک پنجۂ مرجاں کو کیا ہوا
شبنم کو پھر ہے جانب خورشید التفات　　　شرمندہ ساز مہر درخشاں کو کیا ہوا
دل میں شکن ہے زلف مسلسل کدھر گئی　　　برہم ہے حال کاکل پیچاں کو کیا ہوا
لیوے قبائے یوسف گل ہے نسیم میں　　　اس کی شمیم عطر گریباں کو کیا ہوا
لذت فزا نہیں الم اس لب پہ کیا بنی　　　کچھ زخم بیمزہ ہیں نمکداں کو کیا ہوا
گردش پہ اپنی ناز ہے چرخ روزگار کو　　　اس چشم رشک فتنۂ دوراں کو کیا ہوا
دعوی ہے شوخیوں کا غزالوں کو دشت میں　　　اس خوش نظر کی جنبش مژگاں کو کیا ہوا
کتاں ہے سینہ چاک رخ ماہ دیکھ کر　　　اُس غیرت مہ تاباں کو کیا ہوا

عیب و حجاب شمع رخاں جہاں گیا وہ مہر آسمان نکوئی کہاں گیا

---

کھودی خزاں نے رونقِ گلزار ہائے ہائے پژمردہ ہو گئے گل رخسار ہائے ہائے
پھرتی نہ تھی جو پردہ نشیں گھر میں بے حجاب لغزش اس کی جائے ہے سر بازار ہائے ہائے
سروِ فتادہ قامت محشر خرام ہے کیا ہو گئی وہ شوخی رفتار ہائے ہائے
ہم خواب مہ جبیں کی مرے آنکھ مند گئیں کیا سو گئے ہیں طالع بیدار ہائے ہائے
وہ شمع مہر پرتو مہ جلوہ بجھ گئی دن رات ہے فروغ شب تار ہائے ہائے
ہے کچھ خبر بھی گھر مرا ویران ہو گیا سر پھوڑ وا پنا اے در و دیوار ہائے ہائے
اب پوچھے مجھ سے عاشق بے کس کی بات کون اس میں نہیں ہے طاقتِ گفتار ہائے ہائے
روتا ہوں جان کو ملک الموت کی ذرا کہہ میرے ساتھ تو بھی تو غمخوار ہائے ہائے
اے چرخ بار کش تجھے پاس وفا نہیں ہیں اور رنج و محنت آزار ہائے ہائے
نظارہ ہے محرک ماتم ہزار حیف ابرو ہوا ہلال محرم ہزار ہائے ہائے

اس مرثیے میں بھی مومن کا کمال فن درجہ کمال کو پہونچ گیا۔ فن کی اس سے بہتر مثال اردو شاعری پیش نہیں کر سکتی تاثیر صرف زور قلم سے پیدا کی گئی ہے۔

**واسوخت** حکیم مومن خاں کے کلیات میں تین واسوخت بھی موجود ہیں۔ مومن کی عاشقانہ طبیعت کے لئے یہ صنف سخن خصوصیت کے ساتھ موزوں تھی۔ انھوں نے معشوقوں کی بیوفائیاں دیکھی ہیں۔ واسوخت میں جو فرضی باتیں ہوتی ہیں وہ ان پر الف تا ے گزر چکی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کی واسوخت کی نشتریت کس بلا کی ہوگی لیکن میں بخوف طوالت انہیں نقل نہیں کر سکتا کہیں کہیں سے کوئی بند لے لیا گیا ہے بہت ممکن ہے ان مثالوں سے ان کے طرز کا پتہ چل سکے۔

کچھ زمانے کا اعتبار نہیں دور گردوں پہ اختیار نہیں
عشرت دہر پائیدار نہیں چرخ کو ایک دم قرار نہیں
ہو نہ جائے ہماری بات بڑی
کبھی دن ہے کبھی ہے رات بڑی

ذلت تھی ہم اثر شام غریباں کس دن صبح محشر تھا بھلا چاک گریباں کس دن
برق خرمن تھا کبھو خندۂ پنہاں کس دن سرمہ تھا رشک بلائے شب ہجراں کس دن
خوبی طرز تغافل کی خبر کا ہکو تھی
شوخی جنبش مژگاں پہ نظر کا ہکو تھی

میں ہی تو رہا ہوں کہیں شب کو خوش و خرم میں نے ہی تو کی بادہ کشی غیر سے باہم
میری ہی نظر سے ہے عیاں نیند کا عالم آتی ہے جمائی پہ جمائی مجھے ہر دم

انگڑائیاں لیتا ہوں یہ اب میں ہی تو یہیم — میری ہی تو گردن میں پڑ جاتے ہے کچھ خم
میری ہی تو آنکھوں میں غضب نیند بھری ہے — میری ہی جبیں ہے کہ جو گھٹنے پہ دھری ہے

آخری بند کا طنز قابل ملاحظہ ہے۔ مومن کی کامیاب واسوخت نویسی کی داد مومن کی شاعرانہ منزلت کو کچھ ایسا بلند نہیں کرسکتی صرف عاشق مزاجی اور شوروانی طبیعت ان کے واسوخت کو واسوخت بنا سکتی ہے۔

## تضمین

شاعر کی زور طبیعت اور سخن فہمی کی آئینہ دار ہوتی ہے بعض اوقات اونچے شاعروں کی تضمین اصل غزل یا قصیدے کو بلند کر دیتی ہیں اور خود ان سے بلند ہوتی ہیں مثال میں محسن کاکوروی کا مشہور قصیدہ لے لیجئے جس کا مطلع ہے:۔

مٹا نا لوں دل سے نقش ناموس اب وجد کا — دبستان محبت میں سبق تھا مجھ کو ابجد کا

خود منشی امیر احمد صاحب، محسن کاکوروی سے بلند پایہ شاعر تھے اور میری رائے میں ان کی تضمین اصل قصیدے سے بلند مرتبہ رکھتی ہے۔ اسی طرح مومن نے اپنے شاگرد شیفتہ کے ایک غزل کی تضمین کی ہے اور غزل کو بلند کر دیا ہے۔

تضمین شعر طوطی شکرستان ہند:۔

صبح دمید شب گزشت ماہ شبینہ خانہ رفت — روے سحر سیہ کنید یار بایں بہانہ رفت

تضمین کے دو تین بند ملاحظہ ہوں:۔

ہائے نظر میں پھرتی ہیں شب کی سیاہ مستیاں — بادۂ سرخ رنگ کے فرش پہ ہیں کئی نشاں
تاب گسل خمار ہے نشۂ وصل اب کہاں — سیل سرشک لالہ گوں چشم سے کیوں نہ ہو رواں
صبح دمید شب گزشت ماہ شبینہ خانہ رفت — روے سحر سیہ کنید یار بایں بہانہ رفت

جلوۂ بزم عشرت و رونق خانہ ہائے ہائے — زمزمۂ و ترنم و رقص و ترانہ ہائے ہائے
ساقی و مطرب و مے وصل شبانہ ہائے ہائے — گردش چرخ حیف حیف دور زمانہ ہائے ہائے
صبح دمید شب گزشت ماہ شبینہ خانہ رفت — روئے سحر سیہ کنید، یار بایں بہانہ رفت

مومن بادہ گو حریف تو نہیں اپنے راز کا — رات کو یاں گزر ہوا اس بت دلنواز کا
وقت اذاں تلک رہا زمزمہ عیش و ناز کا — کس سے ادا ہوا اب صلوٰۃ ہوش کہاں نماز کا
صبح دمید شب گزشت ماہ شبینہ خانہ رفت — روئے سحر سیہ کنید یار، بایں بہانہ رفت

حافظ، نظیری، عرفی، کلیم، میلی، قدسی کی غزلوں پر تضمینیں موجود ہیں کلیات ملاحظہ ہو۔

## معمے اور تاریخیں

مومن کی طبع رسا نے تاریخوں میں معمے و تخرجہ کو جن کا شمار عیوب میں ہوتا تھا محسنات تاریخ میں داخل کر دیا مومن سے پہلے شعراء اور ان کے معاصرین نے بھی تاریخیں لکھی ہیں لیکن اعداد کو جمع کرنے کے علاوہ اور کوئی تکلیف گوارا نہیں کی ہے۔ مومن کی تاریخیں شاعرانہ نزاکتوں سے مالا مال ہیں۔

تاریخ رحلت حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب قدس سرہ العزیز:۔

دست بیداد اجل سے بے سر و پا ہو گئے — فقر و دیں فضل و ہنر لطف و کرم علم و عمل

فقرو دیں فضل و ہنر علم و عمل کے پہلے حرف کے اعداد خارج کردینے سے تاریخ نکلتی ہے۔

تاریخ ولادت دختر مومن خاں:۔

نال کٹنے کے ساتھ ہاتف نے — کہی تاریخ دخترِ مومن

دختر مومن سے نال، کے اعداد خارج کر دیجئے، ۱۲۵۹ھ نکل آئے گا۔

تاریخ وفات دختر:۔

خاک بر فرق دولتِ دُنیا — من فشاندم خزانہ برسر خاک

سادہ تاریخوں میں مومن نے اپنے والد ماجد حکیم نبی خاں کی وفات کی تاریخ قد فاز فوزاً عظیماً اور ابنی جد کے انتقال کی تاریخ دخلت بالنعیم سے نکالی ہے۔

گلشن بیخار کی تاریخ مع قطعہ دیکھنے کی چیز ہے:۔

کیا تذکرہ شیفتہ نے لکھا — ہے شیفتہ جس کے جان معنی
یوں نکتہ شناس ہیں پر ایسا — کوئی نہیں قدردان معنی
افکار بلند سے بنایا — نہ چرخ پہ آسمان معنی
ہر فقرۂ نثر جان مضموں — ہر شعر رواں دوان معنی
کیا بات ہے منتخب کی تیرے — اے منتخب جہان معنی
ہر نقطۂ انتخاب تیرا — خال رخ دلبران معنی
تیرے جو سخن سے ہے سرافراز — الفاظ کا پایہ شان معنی
معنی ہیں ثنا طراز الفاظ — الفاظ مدیح خوان معنی
ہے تذکرہ یا ریاض فردوس — فردوس ہے، یا جہان معنی
اے تازہ بہار باغ مضموں — اے گلشن بے خزان معنی
مومن نے جب اس میں دیر تک کی — سیر گل و ضیمران معنی
آیا ہے خیال سال اتمام — تھا وہ بھی تو باغبان معنی
غنچہ کی طرح سے سرفرو تھا — یک چند وہ ہمزبان معنی
جب نغمہ سرا نہ ہو سکا وہ — دستان زن داستان معنی
ہاتف نے کہی ہے اس کی تاریخ — گلدستۂ گلستان معنی ۱۲۵۰

معموں میں ایک معمہ لاجواب ہے اور بقول آزاد ایسا تو سنا نہیں گیا۔

معمہ باسم مہتاب رائے

ہے کیونکر کہ ہے سب کار اُلٹا — ہم الٹے بات الٹی یار الٹا

ہم بات یار کو الٹ دیکھئے مہتاب رائے نکل آئے گا۔

## مومن کی عدم مقبولیت کے اسباب

مومن کی کلیات پر ایک سرسری نظر ڈالنے کے بعد بھی جو پہلا سوال ذہن میں پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اتنا بڑا جامع شاعر جس نے کوئی صنف سخن ایسی نہیں چھوڑی جس میں اس نے کماحقہٗ داد سخنوری نہ دی ہو کیونکر اپنے معاصرین کی بہ نسبت گمنام رہا۔ غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ مومن خاں کے زیادہ مشہور نہ ہونے کا سبب انکی خودداری تھی۔ جو خود پرستی تک پہونچ گئی تھی، دوسرا سبب انکی مذہبیت تھی جس میں تعصب کا رنگ آگیا تھا، تیسرا سبب ان کے کلام کی نازک خیالی تھی جس کی زمانہ قدر نہ کر سکتا تھا۔ یہی تین وجوہ دراصل ان کی عدم مقبولیت کا باعث تھے اور مجھے یقین ہے کہ ایک زمانہ وہ بھی آئے گا بلکہ آرہا ہے جب یہی عیوب محاسن بن کر ان کی شہرت کا باعث ہوں گے۔ مومن کی خودداری کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے احباب کا ادنیٰ سا احسان بھی گوارا نہ کرتے تھے یہی خودداری تھی جنھوں نے اُن کو شاہی دربار سے کبھی وابستہ نہ ہونے دیا خود ان کا کلام ان کی خودداری کا شاہد ہے۔ خود پرستی بُری چیز کہی جائے لیکن خودشناسی کا شمار عیوب میں نہیں ہو سکتا۔ اسی خودشناسی نے مومن میں خود اعتمادی پیدا کردی تھی جس نے یہ صورت اختیار کرلی تھی کہ وہ اپنے معاصرین کو شاعر ہی نہیں سمجھتے تھے۔ بارہا انھوں نے اُن کو سگان جیفہ خوار لکھا ہے لیکن کسی کی ذات پر حملہ نہیں کیا۔ ذاتی طور پر ان کو ذوق یا غالب کسی سے پرخاش نہیں تھی۔ جس طرح ذوق و غالب میں چوٹیں چلتی رہتی تھیں۔ مومن اس سے بلند نظر آتے ہیں اگر مومن نے غالب و ذوق پر چوٹیں نہیں کی ہیں تو اس کی صرف وجہ یہ ہے کہ وہ ان شعراء کو اپنا مدمقابل گوارا ہی نہ کرتے تھے۔ مومن کی تبحر علمی اور جامعیت کے سامنے مفتی صدرالدین آزردہ جیسے فاضلوں کو خاموش رہنے کے سوا چارہ کار نظر نہیں آتا ذوق و غالب غریب کس شمار و قطار میں تھے۔ آزاد نے ذوق کو شیخ اکبر، ابو حنیفہ، فخر رازی سب کچھ لکھ دیا ہے لیکن انصاف یہ ہے کہ شاہ عبدالقادر اور شاہ عبدالعزیز کے شاگرد مومن کے سامنے ذوق کے ادعائے علمیت کی کیا حقیقت رہ جاتی ہے۔ مومن کی یہ ادا بُری ہو یا بھلی مومن کے کلام میں نمایاں ہیں:۔

ہیں یہ سگان جیفہ خوار مغز سخن سے بے نصیب | کافر استخواں پرست طرفہ سگی و کافری

اپنے معاصرین کی طرف اشارہ ہے لیکن انداز کلام اس کا شاہد ہے کہ کسی کی ذات پر حملہ نہیں کیا گیا ہے۔

اپنے انداز کی بھی ایک غزل پڑھ مومن | آخر اس بزم میں کوئی بھی سخنداں ہوگا

سخن گو تو کیا مومن مشکل سے کسی کو سخن فہم سمجھتے تھے۔

مومن بخدا سحر بیانی کا جبھی تک | ہر ایک کو دعویٰ ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
اگرچہ شعر مومن بھی نہایت خوب کہتا ہے | کہاں ہے ایک معنی بند مضموں یاب اپنا سا
مومن تجھے تو وہب ہے مومن ہی وہ نہیں | جو معتقد نہیں تری طبع سلیم کا
مومن اسی نے مجھ سے دی برتری کسی کو | جو پست فہم میرے اشعار تک نہ پہونچا
حق تو یہ ہے کہا غزل اک اور مومن نے پڑھی | آج باطل سارے استادوں کا دعویٰ ہوگیا
ایسی غزل کہی یہ کہ جھکتا ہے سب کا سر | مومن نے اس زمین کو مسجد بنا دیا
وہ مشق رہی اور نہ وہ شوق ہے مومن | کیا شعر کہیں گے اگر الہام نہ ہوگا
مومن سے اچھی ہو غزل تھا اس لئے یہ زور شور | کیا کیا مضامیں لائے ہم کس کس ہنر سے باندھ کر

پڑھتا ہے کہیں غزل جو مومن　　لگ اٹھتی ہے ایک بار آتش
ایک اور پڑھ دو مومن شعلہ زبان غزل　　جل جائیں جس کے رشک سے حاسد بسان شمع
مومن یہ شاعروں کا مرے آگے رنگ ہے　　جوں پیش آفتاب ہو بے نور تر چراغ
مردوں کو تجھ پہ دیتے ہیں ترجیح جو حسود　　مومن یہ جان لے کہ سگ جیفہ خوار ہیں
شعر تر وہ ہیں مرے مومن کو ہنگام جواب　　خوف سے منہ اور زبان ہر سخنور خشک ہو
مدت سے نام سنتے تھے مومن کا بارے آج　　دیکھا بھی ہم نے اس شعراء کے امام کو

---

عبث ترقی فن کی ہوس ہے مومن کو　　زیادہ ہو ائے گا کیا اس سے بیمثال تو ہے

اسی طرح قصاید میں تعلیاں کی گئیں لیکن مومن اسے تعلّی نہیں کہتا امر واقعہ سمجھتا ہے۔ بہر حال معاصرین فطرتاً مومن سے خوش نہ رہ سکے اور نہ رہ سکتے تھے۔

دوسری بات مومن کی مذہبیت ہے۔ انھوں نے شیعوں پر اور حنفیوں پر جہاں موقعہ پایا ہے چوٹیں کی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کا اثر مومن کی شہرت پر اچھا نہیں پڑا۔ پہلا بدلہ مومن سے شمس العلماء مولوی محمد حسین صاحب آزاد نے لیا کہ آب حیات کے پہلے اڈیشن میں مومن کا نام ہی نہ آیا۔ لیکن جب آب حیات میں مومن کی عدم موجودگی کی توجیہ لوگوں نے نئی نئی طرح کرنا شروع کر دی تو مجبوراً شمس العلماء کو دوسرے اڈیشن میں یہ کہکر مومن کو بھی جگہ دینی پڑی۔ کہ "مجھے بہ مجبوری ان کا حال قلم انداز کرنا پڑا تھا۔ دنیا کے لوگوں نے اپنے اپنے حوصلے کے بموجب اس پر جو چاہا سو کہا۔"

قصاید اور مثنویوں میں اثنا عشریوں پر حملے کئے ہیں غزل اور رباعیاں حنفیوں کے لئے وقف ہیں۔

ایک قصیدہ کی تشبیب کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

وہ بد شعار طرحدار دلربا جس سے　　امید وصل خطا ترک آرزو مشکل
وہ شوخ بے سبب آزار بے گنہ خونریز　　کہ جرم قاتل عثمان کا نہ ہو قایل
وہ نکتہ داں کہ تقیہ کو اصل دین کہے　　دم شکایت عاشق نہ ہو جفا سے خجل
وہ دور بیں کہ خدا پر کرے بدا ثابت　　نہیں ہے غیر زبس اعتماد کے قابل
وہ کج ادا صنم خود پسند کافر کیش،　　کہ جس کے زعم میں باطل حق اور حق باطل
وہ فتنہ گر بت حق ناشناس ناانصاف　　جو فرض جس گنے کین داور عادل

---

نرالا سب سے اس کا کیش و آئین　　رقیب اہل بیت و دشمن دیں
غضب خونریز دکا فر ماجرا ہے　　فضائے خانہ دشت کربلا ہے
گلے اپنے شہید دل کے لگے خاک　　جسد مردے کا اس مذہب میں ناپاک
نہ ڈھونڈے قتل عاشق میں سبب کچھ　　برائے مصلحت جائز ہے سب کچھ
طلسم شیعگی جادو کلامی،　　. . . . . . . . . . . .

لیکن یہ دل آنے کی باتیں تھیں۔ حنفیوں پر تو خالص مذہبی نقطۂ نظر سے حملہ کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

یہ چند منافق و سراپا بدعت، ہے کفر و ضلال و فسق جن کی طینت
بتلاتے ہیں بدعتی امام حق کو گویا کہ جہاد ہے خلاف سنت

---

یہ کچھ رہ سنت نہ طریقِ توحید پھر کیا ہے ضرور سب کی یکساں فہمید
ہم سمجھے ہیں معنیِ حقیقی یعنی، حیواں ہیں حقیقت میں یہ اہل تقلید

---

ہر چند نہیں قیاس سے کچھ سروکار پر تو ہے از بسکہ ہوا میں بیمار
ہے بہر دوا پینے کو مفتی کے حضور تقلید ابو حنیفہ کا ہے اقرار

غرض ہر ممکن پہلو سے حنفیوں پر حملہ کیا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیعہ سنی کوئی ان سے خوش نہ رہا اور اس جرم میں ان کا کلام جس داد کا مستحق تھا اس سے بھی محروم رہا۔ لیکن اس عصبیت کا کیا سبب ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سیاسی ہے نہ کہ مذہبی مومن اپنے عقاید میں وہ مذہبی ہوں یا سیاسی (نہایت شدید) واقع ہوئے تھے۔ ان کی شاعری بھی ان کی اسی خصوصیت کو ظاہر کرتی ہے دلی بھر میں مومن خاں کے ہم خیال ایک مولوی اسمٰعیل شہید تھے۔ ہندوستان نصرانیوں کا پنجۂ آز کا رفتہ رفتہ شکار ہو رہا تھا۔ مولوی سید احمد صاحب بریلوی کی دور بین نگاہوں نے دیکھ لیا تھا کہ اگر اس نصرانی فتنہ کا سد باب نہ کیا گیا تو وہ دن دور نہیں جب سارا ہندوستان ان کے قبضہ میں ہوگا چنانچہ جہاد اسی خیال کا نتیجہ تھا۔ مسلمانوں پر ہمیشہ یہ الزام رکھا جاتا ہے کہ انہیں ہندوستان سے کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی، ان کی ہمدردی ہمیشہ عربوں اور ترکوں کے ساتھ رہی، مسلمانوں کو یہ طعنہ دینے والے دیکھیں کہ انیسویں صدی کے وسط میں مولوی سید احمد صاحب بریلوی نے جو تحریک جہاد کی تھی وہ کس خیال پر مبنی تھی۔ مومن خاں مولوی صاحب کے سرگرم متبع تھے۔ دوسرے لوگ جب اس تحریک کی اہمیت کو سمجھنے سے قاصر رہے تو مومن خاں کو مجبور ہو کر اُن کے خلاف اپنی آواز بلند کرنی پڑی۔ مومن خاں کا انتقال غدر سے پہلے ۱۸۵۱ء میں ہوگیا۔ ہندوستان رفتہ رفتہ انگریزوں کے قبضہ میں جا رہا تھا یہ دیکھ دیکھ کر مومن خاں کا دل دکھتا تھا دلی میں کوئی ایسا نہ تھا جس سے وہ اپنا درد دل کہتا سارا غبار وہ شعر کہہ کر نکالتا۔ تحریک جہاد کی وجہ بھی سن لیجیے:۔

مومن حسد سے کرتے ہیں ساماں جہاد کا ترسا صنم کو دیکھ کے نصرانیوں میں ہم

کلیات میں ایک جہادیہ مثنوی بھی موجود ہے۔ افسوس دلی اس غیر معمولی دل و دماغ کے آدمی کی قدر نہ کر سکی اور اس تحریک جہاد کو کماحقہ کامیابی نہ حاصل ہو سکی۔ ........ بہرحال سطحی نگاہوں نے مومن کی اس عصبیت کو دیکھ کر ان کے کلام کو بھی ٹھکرا دیا، لیکن اس جذبہ کی قدر نہ کی جس کا یہ نتیجہ تھا اُردو میں فارسی کی چست بندشوں کے اول اول استعمال کرنے کا سہرا جو آج غالب کے سر ہے اس کے بانی اردو شاعری میں مومن خاں ہوئے ہیں۔ جس دلی نے اس دور میں غالب کی قدر نہ کی وہ مومن کی قدر کیا کر سکتی تھی۔ ذوق کے کلام سے لطف اٹھانے والے مومن کی شاعری کیا خاک سمجھ سکتے تھے۔ زمانہ نے پلٹا کھایا اور دنیا ذوق کو چھوڑ کر غالب سے لطف اندوز ہونے

لگی اب وہ زمانہ بھی دور نہیں کہ مومن اردو شاعری میں غالب کے دوش بدوش نظر آئیں۔ فلسفہ اخلاق و تصوف کو جو لوگ شاعری میں ڈھونڈتے ہیں اُن کے لئے مومن کی کلیات میں کوئی سامان دلچسپی کا نہیں لیکن جو لوگ اظہار جذبات اور لطیف انداز بیان کو شاعری سمجھتے ہیں وہی مومن کی قدر کر سکتے ہیں۔ مومن فلسفہ اخلاق و تصوف کو شاعری کا موضوع نہیں سمجھتے وہ جذبات کی شاعری کو شاعری جانتے ہیں۔

جذبات کے اظہار کے لئے مومن نے نئے نئے اسلوب بیان اختیار کئے جہاں کہیں جذبات کا تجزیہ مشکل ہو جاتا ہے وہاں شاعر کو اپنی قدرت بیان اور زور طبیعت کا جوہر دکھانا پڑتا ہے اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات اسے نئی نئی بندشیں اور ترکیبیں ایجاد کرنا پڑتی ہیں اور بعض موقعوں پر خیالات اتنی پیچیدگی اختیار کر لیتے ہیں کہ معمولی سمجھ کا آدمی ان سے پورا لطف نہیں اٹھا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ذوق کی سادگی بیان کے سامنے مومن و غالب کا رنگ نہ جم سکا۔ لیکن اسلوب بیان کی ندرت بھی کوئی معمولی چیز نہ تھی وہ وقت بھی آیا کہ مومن اور غالب نگاہوں پر چڑھے اور وہی وجوہ جو کبھی مومن کے عدم مقبولیت کا باعث تھے اب قبول عام کا سبب بن رہے ہیں۔

## تصویر کا دوسرا رخ

ایک ناقد کا تلخ فرض یہ ہے کہ تصویر کے روشن رخ کی طرح اس کے تاریک رخ کو بھی منظر عام پر لائے اس لئے ضروری ہے کہ محاسن کے ساتھ عیوب کا بھی بیان کیا جائے اصل یہ ہے کہ عرفی کی طرح مومن کی اٹھان بھی خوب ہوئی مگر افسوس کہ ترقی کا موقعہ نہ مل سکا۔ اگر مومن کی عمر وفا کرتی اور ان کی مجتہدانہ ایجاد پسندی اور رندانہ وارستہ مزاجی کچھ مہلت دیتی تو اس میں شک نہیں کہ اردو شاعری میں ان کا جواب نہ ہوتا۔ انھوں نے شاعری کو فن کی حیثیت سے کبھی اختیار نہیں کیا البتہ تفریح کی نیت سے کیا اور اپنے دوسرے مشاغل کی طرح سامان دلبستگی سمجھا۔ یہی سبب تھا کہ اُن کے کلام میں چند نقایص رہ گئے جنھوں نے کلام کو پیچیدہ بنا دیا۔ اخلاق کی تہ میں خیالات کی پیچیدگی اور زبان کی ناہمواری دو خاص عنصر ہیں جو قابل بحث ہیں۔ مومن پر بحث کرتے ہوئے اس امر کو کبھی نظر انداز نہ کرنا چاہیئے کہ وہ شاہ نصیر کے شاگرد تھے گو وہ شاگردی چند ہی دن رہی کیوں نہ رہی ہو صاحب شعر الہند نے شاہ نصیر کو بجا طور پر دہلی کا ناسخ لکھا ہے۔ مومن نے جب آنکھ کھولی تو دہلی میں شاہ نصیر کی استادی کا ڈنکا بج رہا تھا جب جوان ہوئے تو دہلی میں ناسخ کا دیوان پہونچ چکا تھا جس کا وہ شہرہ تھا کہ بقول غالب ہم نے اور مومن خاں نے یہ عہد کر لیا کہ ناسخ کا تتبع کرنا چاہیئے۔ لیکن یہ عہد کسی سے نبھ نہ سکا مومن خاں اپنے پرانے رنگ پر آ گئے اور میں نے میر کا طرز اختیار کیا۔ نسخۂ حمیدیہ میں غالب کی ایسی غزلیں ہیں جن میں ناسخ کا رنگ تیزی کے ساتھ جھلکتا نظر آتا ہے اسی طرح کلیات مومن میں بہت سی غزلیں ایسی نظر آئیں گی جن میں نصیر اور ناسخ کا تتبع صاف ظاہر ہوتا ہے اس میں شک نہیں کہ شاعری بحیثیت آرٹ اور فن ناسخ کے یہاں حد کمال کو پہونچ گئی لیکن شعرائے دلی کے لئے جن کی شاعری سراسر جذبات کی شاعری ہے یہ رنگ مفید نہیں ہو سکتا کیونکہ کلام میں آورد جذبات کے اثر کو کھو دیتا ہے۔ ذیل کی مثالیں میرے اس بیان کو واضح کر دیں گی۔

بن ترے لے شعلہ وہ آتشکدہ تن ہو گیا — شمع قد بر میرے پروانہ برہمن ہو گیا
لبکہ میں سارے برس روتا رہا غم میں ترے — جیٹھ اور بیساکھ کا بھی چاند ساون ہو گیا
آخر اشکوں کے بھر آنے نے ڈبویا ہے مجھے — چشم کا سوراخ کو کشتی کا روزن ہو گیا

علم کا ثمرہ بھی نخل دیکھ کر گلہائے داغ — بید مجنوں دیکھ کر دہ سرو رعنا ہوگیا
ہے مشبک بسکہ روتے روتے چشم نے ماہرو — شب جو اشک آیا تو اک عقد ثریا ہوگیا

---

نعش کا ہمدم کفن لاتا کہ بس میں مرگیا — جلوتوں سے جلوۂ خورشید سا دیکھ کر
یاد آیا سوئے دشمن اُس کا جانا گرم گرم — پانی پانی ہوگیا میں موج دریا دیکھ کر

---

دوستو مرتا ہوں اس روئے عرق آلودہ پر — لاش بھی میری بہانا بعد مردن آپ میں

## خیالات کی پیچیدگی

مومن خاں فارسی کے نہایت اچھے شاعر تھے اس لئے متاخرین کے طرز سے ان کو خاص دلچسپی تھی، اسی وجہ سے اردو میں بھی بلاارادہ وہی طرز اختیار کی اگرچہ اس کی تقلید کا اعتراف کرنا ان کی شان اجتہاد کے خلاف تھا علاوہ بریں خاں صاحب طبعاً روشِ عام سے احتراز کرنا اپنی خودداری کا مقتضا سمجھتے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے اُردو میں میرو مرزا، سید انشاء و شیخ مصحفی کسی کی پیروی نہ کی بلکہ اپنی راہ دنیا سے الگ نکالی۔ حد ہوگئی کہ خیالات کی پرواز اور اسلوب بیان کی جدت میں غالب بھی ان سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ سننے والے سنتے ہیں اور سر دھنتے ہیں یہی بلند پروازی اور نازک خیالی جب اعتدال سے بڑھ جاتی ہے تو معمہ بن کر رہ جاتی ہے۔ مثال ملاحظہ ہو:-

دیکھ اپنا حال زار منجم ہوا رقیب — تھا سازگار طالع ناساز دیکھنا
اس بے پری وش کو جو دیکھے کوئی — مجھ کو مری شرم نے رسوا کیا۔
تاثیر بیقراری ناکام آفریں — ہے کام ان سے شوخ شمایل کو تھامنا
کیا رم نہ کروگے اگر ابرام نہ ہوگا — الزام سے حاصل بجز الزام نہ ہوگا
ذکر اغیار سے ہوا معلوم، — حرف ناصح برا نہیں ہوتا
دفن جب خاک میں ہم سوختہ ساماں ہونگے — فلس ماہی کے گل شمع شبستاں ہوں گے
لیا ہے دل کے عوض امتحان دے رقیب تو دوں — میں اور آپ کی سوداگری زیاں کے لئے

## زبان کی ناہمواری

اساتذۂ دہلی باستثنائے ذوق معنی کو الفاظ پر ترجیح دیتے ہیں جس کا اکثر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خود اُن کے کلام میں صحت زبان اور درستی بندش کی خامیاں جا بجا نظر آتی ہیں یہی حال مومن خاں کا ہے کہ انھوں نے کبھی صحت زبان کی طرف توجہ نہ کی اس بات کو ان کے رتبے سے فرو تر سمجھے یا بالاتر مگر واقعہ یہ ہے کہ وہ اس بارے میں مرزا غالب سے بھی زیادہ بدنام ہیں اور بجا طور پر بدنام ہیں۔ خیالات کی نزاکت اور ندرت کے علاوہ بندش کی تعقید خاص طور پر ان کے کلام کے اخلاق کی غماز دار ہے۔ دیوان ایسے اشعار سے بھرا پڑا ہے۔ یہاں چند مثالیں درج کی جاتی ہیں:-

بے حجابی کا گلہ کیجیے تو کہتا ہے ترے — پردۂ چشم کی تقصیر کہ حایل نہ ہوا

شوخ کہتا ہے بے حیا ہے وہ — دیکھو دشمن نے تم کو کیا جانا
ہاں جونِ تپش چھیڑ چلی جائے کہ پرتو — جھڑ جائیں گے فرسودہ اگر دام نہ ہوگا
غرقِ گریۂ خونیں رہا نہ کر ہمدم — لباس یعنی بھیتے نہیں مسلماں سرخ
خدا یا لشکرِ اسلام تک پہونچا کہ آپہونچا — لبوں پر دم ہلا ہے جوشِ خوں شوقِ شہادت کا
ہے کفر و بدعت ایک نہیں تار سبحہ سے — زنار مومن آئے ہے کیوں برہمن کی یاد
لکھ کے بدمستیٔ غم تاکہ وہ میکش پڑھ لے — باندھ دیتا ہوں سرِ شیشۂ صہبا کا غذ
غم خانہ تنگ و تار ہے اور ہم سیاہ روز — بنتے ہیں یعنی چاہیے آٹھوں پہر چراغ
وہ گردن دیکھو یہ حالت ہوئی تغیرِ شیشہ کی — کر تمتی ہی نہیں ہچکی ہوئی ہے دیرِ شیشہ کی
محفل میں تم اغیار کو دزدیدہ نظر سے — منظور ہے پنہاں نہ رہے راز تو دیکھو

ان کی عادت ہے کہ جملے کا ایک ٹکڑا ایک مصرع میں اور دوسرا ٹکڑا دوسرے مصرع میں لاتے ہیں جن کی مثالیں اوپر گزری ہیں کبھی نامانوس ترکیبوں اور ثقیل الفاظ سے کبھی مشکل اصطلاحات اور اشارات بعیدہ سے شعر کو گورکھ دھندا بنا دیتے ہیں، جیسے بندۂ شورِ عجز، ادراک سیمائے عرضِ شمو، نہ فلک لو آفریں، وجہ عطاس عز و جاہ، خجلت آب پیکری، زبان بہبدہ سایل وغیرہ یا املاؤس، انیوس، ادافیوس، شاموہ، بلبوس، جام نمرود، فال اختر ترجاہ، مثلث عامل، تجدد امثال، افنائے سدوم، حدیث صغانی وغیرہ۔

وہ نعرۂ علمہ سحابی — جس نے کہ اس آگ کو بجھایا

کو پڑھ کر فوراً ذہن کا قصۂ حضرت خلیل کی طرف منتقل ہونا یا

جلتا ہوں ابل نار کی تبدیل جلد سے — مومن غضب ہے لذتِ آتش فزائے داغ

سے معاً آیۂ کریمہ۔ بدلنا ہم جلو د اغیرہا تک خیال کا پہونچنا۔ یا

تیشہ کچھ دشنۂ شیرویہ نہیں اے غیرت — اپنے ہی خوں سے مگر دامن فرہاد بھرے

کو سن کر شیرویہ کے اپنے باپ (خسرو پرویز) کو قتل کرنے کے تاریخی واقعے تک حافظے کا رسا ہونا دشوار اور یقیناً دشوار ہے۔

خاں صاحب نے باوجود تبحر علمی بے پروائی سے بعض الفاظ کا غلط استعمال کیا ہے مثلاً شمر بسکون میم کو شمر بفتح میم لکھا ہے یا مضاف الیہ کی نون آخر کا اعلان کیا ہے، جیسے "یہ دیکھو لو کہ مجھے طاقت بیان نہیں"، اسی سلسلہ میں ہم اتنا اور اضافہ کرنا چاہتے ہیں کہ مومن نے بعض موقعوں پر ردیف بالکل بے کار رکھی ہے، جیسے :-

مجھ پہ طوفان اٹھائے لوگوں نے — مفت بیٹھے بٹھائے لوگوں نے
مل دیکھ کے وہ غدار آتش — کیا کیا ہی جلی ہے یار آتش

یہ نقائص ان کے کلام میں نہ ہوتے تو بہتر تھا، تاہم ان کے کمال میں فرق نہیں آسکتا۔

## شاگردانِ مومن

مثنوی نجم الموسوم بہ حنینِ غم میں مومن نے اپنے بعض شاگردوں کا تذکرہ کیا ہے ملاحظہ ہو :-

کون سے شاگرد وہ استاد فن — بے سخن ہے دلربا جن کا سخن
حسن و عنبر تہم، تسکین و یاس — .............

اکبرِ عظمت سر افرازِ سخن ....................
شیفتہ سرِ دفتر اہلِ قلم نکتۂ خاطر نشاں جن کا رقم

شاگردانِ مومن و غالب نے مومن اور غالب کی چست و نادر ترکیبیں بحال رکھیں اور صفائی زبان کا زیادہ اہتمام کیا۔ آج حسرت، فانی، جگر نے اردو شاعری میں جو رنگ اختیار کیا ہے اس کی بنا مومن اور غالب نے ڈالی تھی۔ اردو شاعری ذوق کے نقش قدم پر چل کر ترقی نہیں کر سکتی۔ آج تو وہی مومن کا اجتہاد کام آرہا ہے جو کبھی بُری نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ مومن کے کئی ایک شاگردوں نے ان کے مرنے کے بعد مرزا غالب سے اصلاح لی۔ جن شاگردوں کا کلام تلاش و جستجو سے دستیاب ہو سکا اُن کا انتخاب ہدیۂ ناظرین ہے :-

آشفتہ :- حکیم سید منور علی خلف سید علی نواز رضوی سادات بارہہ سے تھے۔ دلّی ہی میں رہتے تھے :-

بہت روئے تو اپنی جان کھوئی کسی کا ہم نے بتلاؤ کیا کیا
سنا تھا ہم نے آشفتہ کو کوئی دم کا مہماں ہے کئی دن ہو گئے اس کو نہ مرتا ہے نہ جیتا ہے

آہی :- میر عبد الرحمٰن خلف میر حسین تسکین۔ مومن خاں کے داماد اور ان کی کلیات کے مرتب ہیں :-

اٹھ کہیں ہے آمد آمد اس ستمگر کی وہاں اہلِ محشر مجھ کو یہ مژدہ سنا کر نے گئے
ہے غلط دھوم کہ نکلا تھا وہ گھر سے باہر شہر میں چاک کسی کا تو گریباں ہوتا

قلق :- حکیم مولا بخش میرٹھی :-

بے اعتباریوں نے مری تجھ کو کھو دیا ہے مجھ میں جو نہاں وہی تیرا ظہور تھا
نہ ہو آرزو کچھ یہی آرزو ہے فقط میں ہی میں ہوں تو پھر تو ہی تو ہے
محبت میں کہاں شرکت گوارا اٹھائے نالہ کیوں تہمت اثر کی
دیکھو ستم ظریفی دودِ دل و جگر کی اک آسماں کو پھونکا اک آسماں بنایا
فصل بہار اپنی گزری ہے یوں ہی ساری یاں آشیاں بنایا واں آشیاں بنایا
کچھ تماشا ہے کھیل ہے کیا ہے اِک زمانے کو قتل کر بیٹھے

بیتاب :- نواب عباس علی خاں رامپوری :-

داد سے روزِ جزا کے بھی رہوں گا محروم یہ نظر آئی ہے طولِ شبِ ہجراں مجھ کو
سحر نہ دیکھنی ہم کو نصیب ہو یارب شبِ فراق میں اپنی یہی دعا ہوگی

بیمار :- شیخ علی بخش، سنبل مراد آباد کے رہنے والے۔ طور کلیم۔ بزم سخن۔ خمخانۂ جاوید میں مصحفی اور غفلت کے شاگرد بتائے گئے ہیں مولانا حسرت موہانی کی تحقیق ہے کہ قدرت اللہ شوق کے شاگرد ہیں۔ اڈیٹر "نگار" نے نظام شاہ رامپوری کے تذکرے میں انہیں مومن کا شاگرد لکھا ہے :-

کون پرساں ہے حالِ بسمل کا خلق منہ دیکھتی ہے قاتل کا
لبِ جو کون سیر کو آیا موج منہ چومتی ہے ساحل کا
سانس آہستہ لیجیو بیمار ٹوٹ جائے نہ آبلہ دل کا

**تسکین:-** میر حسین۔ ۱۲۶۸ھ میں وفات پائی۔ مومن خاں کے ارشد تلامذہ میں ان کا شمار ہوتا ہے :-

کوچۂ یار میں میں نے تسکیں ۔۔۔ پاؤں رکھا تھا کہ سر یاد آیا
تسکین کر دل کیا دل مضطر کا علاج اب ۔۔۔ کم بخت کو مر کر بھی تو آرام نہ آیا
تسکین نے لے کے نام ترا وقت مرگ آہ ۔۔۔ کیا جانے کیا کہا تھا کسی نے سنا نہیں
قاصد آیا ہے وہاں سے تو ذرا تھم تو سہی ۔۔۔ بات تو کرنے دے اس سے دلِ بیتاب مجھے
فتنۂ محشر کا تھا سب کو گماں ۔۔۔ تجھ کو پہچانا تری رفتار سے
اب یہ حالت ہے کہ اُن سا بیدرد ۔۔۔ میرے مرنے کی دُعا مانگے ہے
ابھی اِس راہ سے کوئی گیا ہے ۔۔۔ کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی

**تہوّر:-** مرزا غلام فخرالدین مرزا صابر کے بھائی تھے۔ کبھی کبھی مومن سے بھی اصلاح لی ہے :-

اب ہے کیا باقی جو کاوش ہے تری دستِ جنوں ۔۔۔ چاک داماں ہو گیا ٹکڑے گریباں ہو گیا

**برق:-** قاضی نجم الدین ابن سراج الدین سکندر آبادی :-

اے برق تیز دستی وحشت کو دیکھنا ۔۔۔ دامن کو سیتے سیتے گریباں نکل گیا
وہ بھی نہ رہا جوشِ محبت میں الٰہی ۔۔۔ پہلے جو مری آہ میں تھوڑا سا اثر تھا
وحشی نے تیرے خاک اڑائی یہاں تلک ۔۔۔ ملتا نہیں زمیں کا پتہ آسماں تلک
حرم و دیر کے جھگڑے ترے پیچھے ہیں پڑے ۔۔۔ تو اگر پردہ اُٹھا دے تو تو ہی تو ہو جائے

**راحت:-** مرزا محمود بیگ دہلوی :-

ہم سے تو وہ کبھی چھٹے اور دل شیدا چھوٹا ۔۔۔ یاد کس کس کو کرو بن خیر جو چھوٹا چھوٹا

**راسخ:-** سعادت علی خاں متوطن دہلی :-

ہوں تو آنکھوں میں پر نہیں یہ خبر ۔۔۔ سرمہ ہوں یا غبار ہوں کیا ہوں

**سالک:-** مرزا قربان علی بیگ سالک غالباً مومن کی حیات تک خاں مرحوم سے اصلاح لیتے رہے۔ اس کے بعد غالب کے شاگرد ہو گئے۔ صاحب دیوان ہیں :-

واں وصل و ہم کو نہ گزر ہے خیال کا ۔۔۔ اچھی جگہ ہے دل کو بھروسہ وصال کا
دل وہ کافر ہے کہ مجھ کو نہ دیا چین کبھی ۔۔۔ بے وفا تو بھی اسے لے کے پشیماں ہو گا
یوں عمر گزاری تری فرقت میں کہ ہر دم ۔۔۔ جینے کا گماں تھا مجھے مرنے کا یقیں تھا
جب تھک کے تری راہ میں بیٹھے تو کھلا حال ۔۔۔ جو کھوئے ہوئے ہیں وہی کچھ پائے ہوئے ہیں
ہم بیٹھے ہیں یوں منتظر اس راہ گزر میں ۔۔۔ گویا کہ اسی شوخ کے ٹھہرائے ہوئے ہیں

**صاحب:-** نام امۃ الفاطمہ بیگم عرف صاحب جی، صاحب گلشن بیخار نے لکھا ہے کہ "بتقریب مدارا با مومن خاں کارش افتادہ ما ہے چند کار بادرد ورد الود مثنوی قول غمیں ، نام کہ از مصنفات خاں معزے الیہ است شرح نسخہ حسن و جمال بجمال موزوں قدامت القصہ بفیض شان دلش بشعر و شاعری میل کرد از موزونی قامت

بموزونی طبع گرایندہ و از آرایش زلف پیچاں بموشگافی اشعار پیچیدہ از دست ۔

گنہ کیا صنم کے نظارے میں زاہد  خدا نے یہ جلوہ دکھایا تو دیکھا
کھولے ہیں اس نے پیرہن یوسفی کے بند  نہ کر رکھے نسیم سے کہدو قبائے گل

شیفتہ :- نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ :-

ہائے اس برق جہاں سوز پہ آنا دل کا  سمجھے جو گرمی ہنگامہ جلانا دل کا
کس لئے لطف کی باتیں ہیں پھر  کیا کوئی اور ستم یاد آیا
کہتا تھا وقت نزع کے ہر اک سے شیفتہ  دینا کسی کو دل تو وفادار دیکھ کر
آشفتہ زلف چاک قبا نیم باز چشم  ہیں محبت شبانہ کے ظاہر نشاں ہنوز
اے تاب برق تھوڑی سی تکلیف اور بھی  کچھ رہ گئے ہیں خار و خس آشیاں ہنوز
یا اپنے جوش عشوۂ پیہم کو تھام لے  یا کہئے میں بھی نالۂ شورش ادا کروں
آشفتہ خاطری وہ بلا ہے کہ شیفتہ  طاعت میں کچھ مزا ہے نہ لذت گناہ میں
کچھ اور بیدلی کے سوا آرزو نہیں  اے دل یہ یاد رکھیو کہ ہم ہیں تو تو نہیں
شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ  اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی
اک نیم ناز بس ہے ہمارے ہلاک کو  کچھ بھی نہ کیجئے دیکھ کے بس مسکرا دیجئے

ظہور :- ظہور علی ابن مولوی فتح علی ہریالوئی۔ مومن سے بھی اصلاح لی ہے ۔

اے اشک مرے دیدۂ نمناک سے ٹھہر  جاتا ہے کدھر تو تو مرا لخت جگر ہے

عظمت :- پیر عظمت اللہ ولد پیر قدرت اللہ جذب دہلوی ۔

نام عظمت ہے نہ شوکت نہ شکوہ  کیا ہی اس نام سے گھبراتا ہوں

شورش :- نام غلام احمد ۔

نامہ جو بنا لائے ہے قاصد تو صنم کا  ایمان نہ کھوتا کسی مایوس کرم کا
کیا جانتے عدو خون جگر پینے کی لذت  شورش سے مزا پوچھئے تلخابۂ غم کا

صغیر :- میاں جان دہلوی ۔

کہتے ہو جان جائے تری اور تمہیں ہو بلا  ہے ہے خدا نخواستہ یہ تم نے کیا کہا
ہوا ہو سہو تو پھر خوب یاد کر لیجے  کہ رہ نہ جائے کوئی جور آسماں کے لئے

قیصر :- مرزا خدا بخش نواسہ شاہ عالم ۔

تو لطف کرے یا نہ کرے خوش ہو کہ ناخوش  اس بات پہ مرتا ہوں کہ عاشق ہوں ترا میں

ناظم :- کاظم علی منڈ اور ضلع بجنور کے رہنے والے تھے ۔

اے طفل شک ہم تجھے آنکھوں میں لیں رکھیں  اور تو ہمارے راز کو یوں برملا کرے

کرم:۔ شیخ غلام علی مناسن دہلوی کچھ دنوں حیدرآباد میں رہے۔ بھوپال میں انتقال کیا۔

ہاتھ ہو دیکھا مرا اور ترا داماں ہوگا  چاک جب صبح قیامت کا گریباں ہوگا
سہہ دیں گے جور طاقت و تاب و تواں تلک  لیکن یہ پوچھتے ہیں تجھی سے کہاں تلک

نسیم:۔ مرزا اصغر علی نسیم کچھ دنوں اصغر بھی تخلص کیا

جب دیکھئے قرار نہیں ایک شکل پر  میراسباب تو حال ہوا روزگار کا
جب اور کسی پر کوئی بیداد کروگے  یہ یاد رہے ہم کو بہت یاد کروگے
کہے دیتی تھیں یہ نیچی نگاہیں  کہ بالائے زمیں کیا۔ کیا نہ ہوگا
نام میرا سنتے ہی شرما گئے  تم نے تو خود آپ کو رسوا کیا
ہاتھ میں خنجر کمر میں تیغ تیز  یہ ارادے ایک مشت خاک پر
سفر ہے دشوار خواب کب تک بہت بڑی منزل عدم ہے  نسیم جاگو کمر کو باندھو اٹھاؤ بستر کہ رات کم ہے

وحشت:۔ میر غلام علی خاں وحشت ابن پیر فرحت اللہ خاں مراد آبادی۔

دل میں عدو کے بڑھ گئی کیا الفت آپ کی  کچھ ان دنوں میں پہلے سے لطف و کرم نہیں
میرے مرنے کی خبر غیر کو یوں دیتے ہیں  مرگیا وحشت جانباز تری جان سے دور
کیوں نہ باطل سمجھوں اقرار وفا  سحر ٹپکے ہے تری گفتار سے

یاس:۔ خیر الدین دہلوی:۔

وصل کی شب دیکھتا بھی ہے تو شرمایا ہوا  اب تلک ہے آنکھ میں شب کا سماں چھایا ہوا

یاس کا مصرع اولیٰ یوں تھا۔ اس طرف کو دیکھتا بھی ہے تو شرمایا ہوا

شربت وصل نہ پینے دو نہ سم کھانے دو  کیا قیامت ہے نہ جینے دو نہ مرجانے دو

# اردو غزلگوئی میں مومن کا مرتبہ

(مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی)

سن رکھو سیکھ رکھو اس کو غزل کہتے ہیں
مومن اسے اہلِ فن اظہار ہنر کرتا ہے

مومن کی شاعری میں چند ایسی خصوصیتیں ہیں (میں صرف غزل سے بحث کروں گا) جو اردو کے کسی دوسرے شاعر میں نہیں پائی جاتیں یا الشاذ کالمعدوم کا حکم رکھتی ہیں ۔

اول ۔ اُس نے اپنے دائرہ تخیل کو بہت محدود کر دیا ہے ۔مسائل تصوف و سائنس و فلسفہ کی کہنا چاہیے کہ جھلک بھی نہیں صرف ایک متلون شاہد مجازی سے محبت ہے اور اسی کے تمام لوازم ہیں ادا و ناز و غمزہ و کرشمہ کی مصوری ہے اپنے یا غیر کے جذبۂ رشک و حسد و رقابت کی نقاشی ہے اور ادابندی و معاملہ نگاری ہے واردات حسن و عشق کا تذکرہ و تجزیہ ہے طرب مجاز کا پہلو لئے ہوئے تاہم اس محدود دائرہ میں اس نے ایسی حیرت انگیز جدت اور تنوع سے کام لیا ہے کہ جو شعر ہے نیا ہے اور اسی کے ساتھ بے حد دلکش ۔

دوم ۔ باوجودیکہ اشعار میں نہ تو اسرار حکمیہ ہیں نہ دقیق مسایل علمیہ ۔ نہ الفاظ مشکل یا غیر مانوس ہیں نہ محذوفات ہیں نہ مقدرات فرض کرنے کی ضرورت ہے ۔ پھر بھی اکثر اشعار ایسے ہیں جن کا مفہوم سمجھنے میں نہایت کاہش اور دماغ سوزی کی ضرورت ہوتی ہے ۔صرف انداز بیان سے خیال کو مشکل بنا کر ایسی صورت میں پیش کرتا ہے کہ مطلب تک ذہن کی رسائی بآسانی نہیں ہوتی ۔خود کہتے ہیں ۔

اگرچہ شعر مومن بھی نہایت خوب کہتا ہے
کہاں ہے لیک معنی بند مضمون یاب اپنا سا

اس دشواری مطالب کا ایک سبب ایہام بھی ہے اپنے معاصرین میں غالباً مومن ہی ایسا شاعر ہے جس نے ایہام کا احیا کیا ورنہ یہ اسلوب متروک ہو چکا تھا ۔

کہیں ایجاز نے معنی میں تنوع پیدا کر دیا ہے مگر یہ صفت مومن اور دیگر اساتذہ میں مشترک ہے۔

سوم۔ جس خوبی سے وہ اپنا تخلص مقطع میں لاتا ہے دوسرے شاعر کو یہ بات نصیب نہیں ہوئی۔ یہ سچ ہے کہ تخلص ہی ایسا ہے جو کافر یا بت یا اسی قسم کے دوسرے الفاظ کے تقابل یا تناسب سے محض تخلص نہیں رہتا بلکہ اور معنی بھی دیتا ہے مگر اس قسم کے تخلص اور بھی ہیں مثلاً حسرت، جرأت، سودا وغیرہ وغیرہ۔ ان شاعروں نے اپنے تخلص سے مومن کی طرح فایدہ نہیں اُٹھایا۔

مومن کا معشوق عورت ہے۔ میں نے جہاں تک مطالعہ کیا اُس کے دیوان میں ایک شعر بھی ایسا نہیں ملا جس سے وثوق کے ساتھ کہا جا سکے کہ یہ معشوق کوئی امرد یا سبزہ آغاز نوجوان ہے۔ حالانکہ غالب بھی اس بلا سے نہیں بچے:۔

سبزۂ خط سے ترا کاکل سرکش نہ دبا
یہ زمرد بھی حریف دم افعی نہ ہوا (غالب)

اور صفات جو مومن کے لئے مخصوص نہیں بلکہ اُن کے معاصرین میں بھی پائی جاتی ہیں، مجملاً یہ ہیں:۔

فارسی کی خوشنما ترکیبوں کو سلیقہ سے برمحل صرف کرنا۔ اس صفت میں وہ غالب کا مدمقابل ہی نہیں بلکہ اس لحاظ سے پیش پیش ہے کہ ان کی طرح ایسی ترکیبوں کے استعمال میں بے اعتدالی نہیں برتی۔ جو ترکیب ہے خوبصورت ہے اور گویا اسی جگہ کے لئے وضع ہوئی تھی بعض ترکیبیں فارسی شعراء سے مستعار لینے کے بجائے اس نے خود گڑھی ہیں ان میں بھی وہی لطافت ہے۔ اصول صرف و نحو کے اعتبار سے ان کی صحت میں تامل نہیں البتہ اُن حضرات کے اعتراض کا کوئی جواب نہیں جو ایسی ترکیبوں کو جائز نہیں سمجھتے جن کی سند شعرائے فارسی کے دواوین میں نہ ملے۔

مومن کے دیوان میں ایک شعر بھی شاید آپ کو ایسا نہ ملے گا جس کی بندش سست ہو یا انداز بیان شاعرانہ نہ ہو یا خیال میں تازگی نہ ہو۔ فن کے لحاظ سے یہی شاعری کی معراج کمال ہے۔

نفسیات کے دشوار ترین مسایل کو سادہ الفاظ میں دلکش طریقہ سے بیان کیا ہے البتہ جیسا پہلے عرض کیا جا چکا تصوف نہیں ہے دو چار شعر کھینچ تان کر شاید اس زمرہ میں آجائیں ورنہ خیریت ہے مگر یہ کمی مومن کی شاعرانہ عظمت کو اور زیادہ نمایاں کرتی ہے اور شاعروں کے بیشتر اشعار میں وسعت معانی صرف ان مسایل کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے، حقایق و معارف کی بحث کا یہ لازمی نتیجہ ہے لیکن تجردات کو چھوڑ کر نفسیات کے مسایل کو مختصر الفاظ میں نظم کر دینا آسان کام نہیں۔ مومن کو زبان پر ایسی قدرت ہے اور فطرت انسانی کا اس قدر گہرا مطالعہ کیا ہے کہ واردات قلب اور محسوسات ذہینہ کو متشکل کر کے آنکھوں کے سامنے پیش کر دیتا ہے، اخلاقی نقطۂ نظر سے بعض اشعار قابل گرفت ہوں تو ہوں مگر جہاں تک فن کا واسطہ ہے اس کا ہر شعر مکمل ہے۔

مثال کے طور پر چند اشعار درج کر کے اس مضمون کو جس کی تشنگی کا اعتراف اور اسی کے ساتھ تاسف ہے ختم کرتا ہوں۔ انتخاب اشعار میں کوئی خاص التزام نہیں کیا گیا۔ اپنے انتخاب سے (اصل دیوان سے نہیں) الف کی ردیف شروع کی افسوس وہ بھی ختم نہ ہو سکی۔ اس میں سے بھی متعدد ایسے اشعار جو بہت اچھے اور شرح طلب تھے کلیجہ پر پتھر رکھ کے چھوڑ دئے۔

کہتے ہیں:۔

عنایت کر مجھے آشوب گاہ حشر غم اک دل کہ جس کا ہر نفس ہم نغمہ ہو شورِ قیامت کا

پہلے مصرع میں ایسے دل کی تمنا کی ہے جو صرف تمام عالم کے غم و درد کا مجموعہ ہو (لفظ حشر میں یہ انبوہ و ہجوم مضمر ہے) بلکہ اس ہنگامہ زار میں بھی ایک شورش برپا کر دے "آشوب گاہ حشر غم" ہو تاکہ میرا ہر نفس شور قیامت کا ہمنوا ہو جائے۔ دل درد مند و غم آشنا کی اس سے بہتر کیا تعریف ہو سکتی ہے اور یہ صرف تراکیب فارسی کی تراش خراش اور ان کا برمحل استعمال ہے جس سے مطلب اس قوت کے ساتھ ادا ہو گیا :۔

کیا روؤں خیرہ چشمی بخت سیاہ کو
واں شغل سرمہ ہے ابھی یاں نیل ڈھل گیا

خط کشیدہ الفاظ کی ترکیب و معنویت قابل ملاحظہ ہے۔ دوسرے مصرع میں ہندی کا محاورہ نیل ڈھلنا نظم ہے جس کے معنی ہیں نزع میں آنکھوں کا بے نور ہو جانا۔ پتلیاں پھر جانا۔ وہاں معشوق سرمہ لگا رہا ہے۔ یہاں نیل ڈھل چکا ہے۔ معنی و محاورہ کے علاوہ سرمہ و نیل میں رنگ کے لحاظ سے جو مناسب ہے ظاہر ہے مگر پہلے مصرع سے اس لفظ نیل نے جو عجیب و غریب ربط پیدا کیا ہے اس کی تعریف نہیں ہو سکتی نیل کی سلائی آنکھوں میں پھرنے سے بصارت زایل ہو جاتی ہے۔

شعر کا مطلب یہ ہے کہ شام وعدہ معشوق مصروف آرایش ہے مگر قسمت کی خوبی کہ اضطراب شوق نے عاشق کی حالت غیر کر دی۔ سرمہ اور آنکھوں کی رعایت سے بخت کی شکایت ان الفاظ میں کرتا ہے۔

کیا روؤں خیرہ چشمی بخت سیاہ کو

کس قدر بلیغ ہے جس نے پورے شعر میں تازگی کی ایک روح پھونک دی ورنہ مضمون فرسودہ و پیش پا افتادہ ہے۔ اس فقرہ (خیرہ چشمی بخت سیاہ) نے شعر کے مفہوم کو اور وسیع کر دیا معشوق مجھ سے ملنے کو آرایش میں اس قدر اہتمام کر رہا تھا مگر بد بخت ناصاحد کی خیرہ چشمی کو نہ سمجھا اور بے تابی انتظار نے قبل از وقت مجھے مار ڈالا۔

اس نقش پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل
میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

بہت مشہور شعر ہے اور اس کی خوبیاں کسی شرح کی محتاج نہیں، معشوق کے نقش پا کا سجدہ فریضۂ عشق ہے مگر مصیبت یہ ہے کہ یہ نقوش کوچۂ رقیب کی رہبری کرتے ہیں اور دیکھنے والے یہ تو سمجھیں گے نہیں کہ عاشق نقش پا کے سجدے کر رہا ہے بلکہ یہ خیال کریں گے کہ رقیب سے مرعوب ہو گیا اور اس کی خوشنودی کے واسطے ناصیہ فرسائی کرتا ہے لہذا کوچۂ رقیب میں نقش پا کے سجدے باعث ذلت ہوئے۔ سر کے بل (لکھنؤ میں بھل) چلنا اظہار و انکسار کے موقع پر استعمال ہوتا ہے :۔

یہ جوش یاس تو دیکھو کہ اپنے قتل کے وقت
دُعائے وصل نہ کی وقت تھا اثر کا سا

جذبۂ یاس کی تصویر کس خوبی سے کھینچی ہے۔ وصل سے مایوس ہو کر اپنے مرنے کی دُعا مانگی جو اس طرح قبول ہوئی کہ معشوق قتل پر آمادہ ہو گیا جس کا لازمی نتیجہ قرب قاتل و مقتول ہے اب وصل کوئی مشکل نہ تھا مگر جوش یاس نے دعائے وصل سے باز رکھا ورنہ دعائے مرگ کی طرح وہ بھی مستجاب ہوتی :۔

زرا ہو گرمیِ صحبت تو خاک کر دے چرخ
مرا سرور ہے گل خندۂ شرر کا سا

گل خندائ شرر کی ترکیب کتنی خوبصورت اور معنی خیز ہے۔ تناسبات لفظی نے معانی میں جو وسعت پیدا کردی ہے اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ شعر کا مطلب صاف ہے اور کسی وضاحت کی ضرورت نہیں:-

گر وہاں بھی خموشی اثر افغاں ہوگا،
حشر میں کون مرے حال کا پُرساں ہوگا،

افغاں،، بجائے فغاں اب متروک ہے۔ یہاں بھی فارسی کی ایک خوبصورت اور مومن کی وضع کردہ ترکیب نے ایک بڑے مطلب کو مختصر الفاظ میں ادا کردیا۔ خموشی اثر افغاں یعنی ایسی فغاں جس کا اثر خموشی ہو:-

اُن سے بدخو کا کرم بھی ستم جاں ہوگا
میں تو میں غیر بھی دل دے کے پشیماں ہوگا

معشوق بدخو ہے یہ اس کی سرشت ہے جو بدل نہیں سکتی۔ ایک مومن ہیں ایک غیر۔ کہتے ہیں کہ میں نشانۂ ستم ہوں اور غیر مورد کرم ہے میں تو ایسے بدخو سے محبت کرکے پشیمان ہوا مگر غیر خوش نہ ہو اس کا بھی یہی انجام ہوگا کیونکہ معشوق کی تندخوئی کرم میں ایک زہر آلود تیر چھپا دیگی۔ حاصل یہ ہے کہ معشوق کی خوئے بد کا اثر کرم کو بھی ستم میں مبدل کردے گا۔ ایسے معشوق کو چاہنے میں سوائے پشیماں ہونے کے اور کیا دھرا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اپنے آپ کو اخلاقاً رقیب سے بہتر ثابت کیا ہے ستم اٹھاتے اٹھاتے محبت سے پشیماں ہونا اس قدر مذموم نہیں جتنا معشوق کے باوجود پشیمان ہونا ہے۔ ایک پہلو یہ بھی نکلتا ہے کہ ممکن ہے کہ رقیب بوالہوس ان کا قول باور کرکے معشوق کی محبت سے ہاتھ اُٹھا لے اور اس طرح ان کی اشک شوئی ہوجائے۔

خواہش مرگ ہو اتنا نہ ستانا ورنہ
دل میں پھر تیرے سوا اور بھی ارماں ہوگا

ہمیں اتنا نہ ستا کہ جان سے عاجز ہوکر مرنے کی آرزو کریں۔ ایسی صورت میں تیرے ارمان کے سوا دل میں خواہش مرگ کو بھی جگہ ملے گی اور اس میں منقصت حسن ہے کیونکہ دلِ عاشق میں تیری آرزو کے سوا اور کسی خواہش کا امکان بھی نہ ہونا چاہیے۔

کیا سناتے ہو کہ ہے ہجر میں جینا مشکل
تم سے بے رحم پہ مرنے سے تو آساں ہوگا۔

کیا مزے کا شعر ہے۔ معشوق (دم رخصت) کہتا ہے کہ میرے ہجر میں تیرا جینا مشکل ہے بظاہر اظہار ہمدردی ہے مگر عاشق سمجھتا ہے کہ معشوق کا یہ قول محبت یا ترحم پر مبنی نہیں ہے بلکہ ادائے ناز ہے جس کا منشا یہ ہے کہ عاشق کو میری محبت اور ہجر سے اور میری جدائی کے صدمے کے علاوہ ان الفاظ کی یاد جو میں نے دم رخصت کہے ہیں تڑپا تڑپا کے مار ڈالے۔ عاشق اپنے دل میں کہتا ہے کہ اگر اسے میرا کچھ بھی خیال ہوتا تو مجھ سے جدا ہی کیوں ہوتا —————— لہٰذا جس طرح معشوق نے پہلو دار الفاظ سے زخموں پر نمک چھڑکا تھا ویسا ہی اس کو جواب دیا کہ ہجر میں جینا مشکل ہی مگر تم سے بے رحم پہ مرنے (عاشق ہونے) سے آسان ہے۔ تمہارے عشق میں ہر طرح مشکل ہے۔

کیونکر امید وفا سے ہو تسلّی دل کی
فکر ہے یہ کہ وہ وعدے سے پشیماں ہوگا

معشوق نے وعدہ کیا اور امید ہے کہ وعدہ پورا ہوگا تاہم دل کو تسکین نہیں ہوتی کیونکہ یہ فکر لگی ہوئی ہے کہ معشوق

وعدہ کرکے پشیماں ہوا ہوگا اس لئے کہ ایفائے وعدہ تو بڑی چیز ہے وعدہ کرنا ہی اُس کی فطرت اور انداز ستم کے خلاف ہے خاطر مروت یا کسی مصلحت یا مجبوری سے وعدہ کرلیا ہے مگر پچھتاتا ہوگا کہ وعدہ کیوں کیا۔ عاشق کو گوارا نہیں کہ معشوق پشیماں ہو لہٰذا ایفائے وعدہ کی امید سے دل کو تسلی نہیں ہوتی وہی الجھن اور بے چینی ہے جو وعدہ خلافی یا وعدہ نہ کرنے کی صورت میں لاحق ہوتی ہے ؎

دردہے جاں کے عوض ہر رگ وپے میں ساری
چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا

ہر لحاظ سے ایک لاجواب شعر ہے جب درد رگ وپے میں ساری ہو گیا تو اب درماں موجب ہلاکت ہے۔ یہ آخری ٹکڑا شعر کو اس مطلع سے بھی بلند کر دیتا ہے ؎

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا
درد کی دوا پائی دردِ بے دوا پایا

مومن کے شعر میں دردِ بے دوا ہی نہیں ہے بلکہ اس کے درماں کی فکر مہلک ہے۔ دردِ رگ وپے میں ساری ہے بہتوں نے کہا ہوگا مگر جان کے عوض کا اضافہ صرف مومن کا حصہ ہے اور اسی نے شعر میں تمام خوبیاں پیدا کر دیں ؎

بات کرنے میں رقیبوں سے ابھی ٹوٹ گیا
دل بھی شاید اُسی بدعہد کا پیماں ہوگا

معشوق نے وعدہ کیا تھا جس کا ایفا تو درکنار عاشق کی موجودگی میں رقیبوں سے ہمکلام ہے اور اس سے ملتفت نہیں ہوتا معشوق کے اس طرز عمل سے عاشق کا دل ٹوٹ گیا جس طرح معشوق کا پیمان بات کی بات میں ٹوٹ گیا۔ دل کی تشبیہ معشوق کے پیمان سے (دونوں نہایت بودے) کس قدر لطیف ہے۔ اس کی خوبیاں یہیں تک ختم نہیں ہوتیں۔ اسی کے سبب سے پردے پردے میں معشوق کا گلہ بھی ہو گیا ؎

دیدۂ حیراں نے تماشا کیا
دیر تلک وہ مجھے دیکھا کیا

جرأتِ عشق نے معشوق کو بھی محو کر دیا۔ یہ مطلع محاکات کی عمدہ مثال ہے ؎

آنکھ نہ لگنے سے سب احباب نے
آنکھ کے لگ جانے کا چرچا کیا

لطف محاورہ و زبان ملاحظہ فرمایئے پہلے مصرع میں آنکھ نہ لگنا بمعنی نیند نہ آنا ہے اور دوسرے مصرع میں آنکھ لگ جانا بمعنی عاشق ہونا ہے۔ یہ امر بدیہی ہے کہ عشق میں نیند اڑ جاتی ہے ؎

غیر عیادت سے برا مانتے ہیں،
قتل کیا آن کے اچھا کیا

دیکھیے ان سادہ الفاظ کے انداز بیان نے کس قدر معنی پیدا کئے ہیں۔ معشوق دراصل عاشق زار کو قتل کرنے آیا تھا جو انتہائے بے رحمی ہے گو معشوق کی شان یہی ہے مگر ہائے عشق جو معشوق کے آنے کو عیادت پر محمول کرتا ہے اور قتل کو جانے

معشوق کا پردہ بناتا ہے اس کے ساتھ اظہارِ رشک کرتا ہے جو جانِ عاشقی ہے۔ کہتا ہے کہ دراصل میری عیادت کو آیا تھا مگر اُسی کے ساتھ تجھے غیروں کا بھی پاس تھا اور اسی لئے کہ وہ برا نہ مانیں ان کے سمجھانے کو تو نے مجھے قتل کر ڈالا تاکہ اب وہ عیادت کا شکوہ نہ کر سکیں بلکہ یہ سمجھیں کہ تو میری عیادت کو نہیں گیا بلکہ قتل کرنا مقصود تھا۔

قافیہ "اچھا" سے ایک اور نازک مطلب پیدا ہوتا ہے۔ میں قتل ہوا اچھا ہوا اب رقیبانِ بوالہوس اگر بیمار ہوں گے تو اپنی جان کے ڈر سے تجھ سے عیادت کے متمنی نہ ہوں گے بلکہ اسی دھڑکے میں مر جائیں گے تو کہیں عیادت کے بہانہ سے 'آ کر مار نہ ڈالے۔

رحم فلک اور مرے حال پر
تو نے کرم اے ستم آرا کیا

فلک سنگدل مشہور ہے مگر معشوق نے ایسے ستم توڑے کہ فلک بھی کانپ اٹھا اور مظلوم عاشق کو رحم کی نظروں سے دیکھنے لگا۔ یہیں سے مومن کا پیچ شروع ہوتا ہے کہ اب تیرا ستم ستم نہیں رہا بلکہ کرم ہوا کیونکہ فلک سے بیدرد کو میرے حال پر مہربان کر دیا۔

ہنسنے نہ غیر مجھے بزم سے اٹھانے پر
سُبک ہے وہ جو تری طبع پر گراں نہ ہوا

معشوق نے عاشق کو بزم سے اُٹھا کر غیر کو ہنسی کا موقع دیا۔ معشوق سے عاشق کہتا ہے کہ تو ایسا نازک مزاج ہے کہ جو شخص تیری طبع پر گراں نہ ہو اُس سے زیادہ ذلیل اور چھچھورا کوئی نہیں ہو سکتا۔

اس شعر میں پہلے مصرع کا اندازِ بیان بلاغت کا عمدہ نمونہ ہے۔ غیر کو مخاطب نہیں کرتے نہ اُس سے آمادۂ پیکار ہوتے ہیں کیونکہ ایسے سبک وضع شخص سے جو دوسروں کی تذلیل سے خوش ہو گفتگو کسرِ شان ہے بلکہ معشوق کو مخاطب اور غیر کو سُنا کر کہتے ہیں کہ میں سبک نہیں ہوں بلکہ سبک دراصل وہ ہے جو تیری طبع پر گراں نہ ہوا۔ ہم بزم ہونے کا مقتضا یہ تھا کہ غیر مجھ سے ہمدردی کرتا نہ کہ خندہ زن ہو۔ مگر غیر خوش نہ ہو ایک دن وہ بھی یونہی نکالا جائے گا۔ نازک مزاج معشوق اُس سے بھی ایسا ہی سلوک کرے گا اور اس کی حالت مجھ سے زیادہ قابلِ عبرت ہوگی کیونکہ میری مثال سے اُسے کان ہوتے معلوم نہیں ہوتے ورنہ میری توہین کا مضحکہ نہ اڑاتا ؎

لگی نہیں ہے یہ چپ، لذتِ ستم سے ہیں
حریف کشمکشِ نالہ و فغاں نہ ہوا

فارسی ترکیب کی لطافت قابلِ داد ہے ؎

کیا مجھ میں دم بھی لینے کی طاقت نہیں رہی
کیوں شور نالہائے عزا بار کم ہوا

نالہائے عزا بار کی ترکیب کے علاوہ شعر معانی کے لحاظ سے بھی بہت بلند ہے۔

عاشق کے نالہائے غم نے ایک شور برپا کر دیا تھا مگر کہاں تک آخر طاقت جواب دے گئی اپنے آپ سے مخاطب ہو کر پوچھتا ہے کہ نالہ و زاری کی نہ سہی کیا مجھ میں سانس لینے کی بھی طاقت نہیں رہی ورنہ ہر نفس نالہائے عزا بار کا کام کیوں نہیں دیتا۔ میں نے نالہائے عزا بار کا مفہوم نالہائے غم لکھ دیا مگر دراصل ان الفاظ سے ادا نہیں ہوتا۔ کیونکہ نالہائے عزا بار کا یہ مطلب ہے کہ وہ نالے نہ صرف غمگین دل سے نکلتے ہیں بلکہ جو انہیں سُن لیتا ہے مصروفِ شیون ہو جاتا ہے ؎

وصل کی شب شام سے میں سو گیا
جاگنا ہجراں کا بلا ہو گیا

مجازی وصل کی بلند حقیقت مومن نے اپنے خاص رنگ میں نظم کی ہے۔ جب خود معشوق مل گیا تو کوئی حسرت و آرزو نہ رہی دل کو آرام ملا اور نیند آگئی۔ غالب نے اپنے اس شعر میں بھی نکتہ ملحوظ رکھا ہے۔ اور اسی نے شعر کو دلکش بنا دیا ہے

نیند اُس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
جس کے بازو پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں

آئینہ جلدی سے پٹک دو کہیں،
دل ہی نہیں ہاتھ سے دیکھو گیا

اللہ رے رشک یہ بھی گوارا نہیں کہ معشوق آئینہ میں اپنے جمال کا نظارہ کرے لیکن اس کا خیال کیونکر بیٹھے اور کس طرح باز رہے ؟ ع

دل ہی نہیں ہاتھ سے دیکھو گیا،

"پٹک دو" سے ایک خوبی یہ پیدا ہوئی کہ آئینہ ٹوٹ جائے گا اور آئندہ کے لئے بھی خود بینی کا سدباب ہو جائے گا۔ قریب قریب یہی مفہوم غالب کے اس شعر کا ہے:۔

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

اس میں رشک کا پہلو مفقود ہے صرف معشوق سے چھیڑ چھاڑ کا لطف ہے ؎

تیرے پردے نے کی یہ پردہ دری،
تیرے چھپتے ہی کچھ چھپا نہ رہا

مضمون جدید نہیں مگر انداز بیان انوکھا ہے۔ نہ معشوق پردہ کرتا نہ عاشق کا راز عشق انتہائے اضطراب کے باعث افشا ہوتا۔ یہ شعر اُن معدودے چند اشعار میں سے ہے جن کو حقیقت کی طرف منجر کر سکتے ہیں۔ اگر جلوہ حسن مطلق حجاب میں نہ ہوتا تو اس قدر شہرہ نہ ہوتا اب فریب شوق سے عاشق کو ہر شے میں اُسی کا جلوہ نظر آتا ہے ؎

دل لگانے کے تو اٹھائے مزے
جی بلا سے رہا رہا نہ رہا،

نظم کی صفائی آپ اپنی نظیر ہے۔ مفہوم وہی ہے جو میر کے اس مطلع کا ہے ؎

نہیں وسواس جی گنوانے کے
ہائے رے شوق دل لگانے کے

یہ دو شعر ملاحظہ ہوں:۔

۱۔ شب غم فرقت ہمیں کیا کیا مزے دکھلائے تھا
دم رکے تھا سینے میں کم بخت جی گھبرائے تھا

رات شب کو اُس سے منع بے قراری پر بڑھی
ہم تو سمجھے اور کچھ وہ اور کچھ سمجھائے تھا

مطلع تاثیر درد میں ڈوبا ہوا ہے۔

شعر میں ذرا پیچ ہے۔ عاشق بے قرار تھا معشوق نے منع کیا کہ بے قرار نہ ہو۔ اُسے اپنی رسوائی کا خوف تھا۔ یہ حضرت سمجھے مطلب یہ ہے "بے قرار نہ ہو تیری مراد پوری ہو گی" غلط فہمی پیدا ہوئی اور تکرار کی نوبت پہونچی۔ انہوں نے کہا "لیے اب تو میں بے قرار نہیں ہوں وعدہ وفا کر" معشوق نے کہا "ہائیں کچھ پاگل ہوا ہے کیسا وعدہ"۔

عبث الفت رہی تم کو وہ کب دیتا تھا دم تم پر
یہ مجھ کو دیکھ کر دشمن کلیجا تھام لیتا تھا

دشمن (رقیب) مر گیا ہے (صیغۂ ماضی سے یہی ظاہر ہوتا ہے) معشوق اس کو یاد کر کے کہتا ہے کہ ہمارا بڑا سچا عاشق تھا ہمیں دیکھ کر اس قدر بے قرار ہوتا تھا کہ کلیجہ تھام لیتا تھا بیچارے کا دل قابو سے باہر ہو جاتا تھا۔ مومن گھبرائے کہ یہ کیا غضب ہوا رقیب کے بعد اس کے عشق نے اثر کیا۔ میرا رنگ جمنے نہیں پائے گا۔ معشوق کو دشمن کی طرف سے بدظن کرنے کو اُس کے اس فعل یعنی کلیجا تھام لینے کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ مجھ کو دیکھ کر حسد سے اُس کی جان پر بن جاتی تھی اور اسی سبب سے کلیجہ تھام لیتا تھا تم کچھ کا کچھ سمجھے اس کی الفت دل سے نکالو ؎

نہ مانوں گا نصیحت پر نہ میں سنتا تو کیا کرتا
کہ ہر ہر بات میں ناصح تمہارا نام لیتا تھا

بڑے مزے کا شعر ہے۔ معشوق کو پرچہ لگا کہ آپ کا فلاں عاشق ناصح کی باتیں بڑے غور سے سُنا کرتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ناصح کی نصیحت کارگر ہو چلی ہے کہ معشوق کو اس کی تاب کہاں۔ اب جو یہ اُس کی بزم میں پہونچے تو معشوق نے آزردہ ہو کر کہا۔ "تم تو میری محبت کا دم بھرتے تھے یا ناصح کا جادو چل گیا؟ اس سے بیزاری کیسی گھنٹوں اس کی باتیں سنی جاتی ہیں۔ تمہیں عشق کا نام لیتے غیرت نہیں آتی"

مومن عرض کرتے ہیں کہ تم ناراض نہ ہو میں اُس کی نصیحت نہیں مانوں گا مگر سنتا نہ تو کیا کرتا وہ بار بار تمہارا نام لیتا تھا اور میں تمہارے نام کا عاشق ہوں۔

غور فرمایئے کہ "نصیحت نہیں مانی" (صیغۂ ماضی) کے بجائے "نہ مانوں گا نصیحت" (صیغۂ مستقبل) نے زبان اور حُسن بیان کا معجزہ دکھایا ہے۔ اول تو صیغۂ ماضی سے معشوق نے جو الزام دیا اس کی تردید ہوتی اور یہ آداب عاشقی کے خلاف تھا۔ صیغۂ مستقبل نے نہ صرف اس پہلو کو بچایا بلکہ یہ اضافہ کیا کہ میں ناصح کی باتیں سننے سے تو باز نہیں رہ سکتا سنا کیا ہوں اور سنتا رہوں گا کیونکہ اس طرح بار بار تمہارا نام سامعہ نواز ہوتا ہے البتہ یہ وعدہ کرتا ہوں کہ اس کی نصیحت پر عمل نہیں کروں گا۔ واضح رہے کہ "نصیحت نہ مانی" شعر میں کھپ سکتا تھا اور میرا دعویٰ ہے کہ ہزاروں شاعروں میں ۹۹۹ "نہ سنتا میں تو کیا کرتا" کے خیال سے پہلے ٹکڑے میں بھی صیغۂ ماضی نظم کرتے۔

نقد جاں تھا سزائے دیت عاشق حیف
خون فرہاد سر گردن فرہاد رہا

بڑے پایہ کا شعر ہے۔ فرہاد کے خون کا مواخذہ سوائے فرہاد کے کسی سے نہیں ہو سکتا کیونکہ جرم عشق کی سزا میں جان جانا کوئی سزا نہیں اس سے بھی سخت سزا کا مستحق تھا ؎

یاد سہواً اسے اے غیر ہے نسیاں عمداً
یاد رکھ بھول گیا جس کو وہی یاد رہا

دیکھیے ایک معمولی خیال کو انداز بیان نے کس قدر دلکش بنا دیا ہے۔

یہ شیوۂ معشوق ہے کہ اپنے عاشقوں کو یاد تو بھولے سے کرتا ہے مگر جان کر بھول جاتا ہے۔

غیر محفل یار میں باریاب ہے مومن راندۂ درگاہ ہیں۔ رقیب سے کہیں راستہ میں مڈبھیڑ ہو جاتی ہے۔ غیر ان سے بظاہر ہمدردی کرتا ہے مگر در اصل اس کا منشا دل آزاری ہے کہتا ہے کہ اب تو اس بزم میں تمہارا تذکرہ بھی نہیں ہوتا وہ تم کو بالکل بھول گیا مومن کہاں دبنے والے ہیں کہتے ہیں کہ تم اُس کی محفل میں روزمرہ آتے جاتے ہو مگر اب تک اس کا مزاج نہیں پہچانا ؏

یاد سہواً اُسے اے غیر ہے نسیاں عمداً

تم نے جو کہا کہ وہ مجھے بھول گیا تو میں سمجھ گیا اور خوش ہوا کہ اُسے یاد ہوں ؎

کرۂ خاک ہے گردش میں تپش سے میری
میں وہ مجنوں ہوں کہ زنداں میں بھی آزاد رہا

شعر نہیں ایک کارنامہ ہے۔ پہلا مصرع بندش اور بلاغت کے لحاظ سے اپنا جواب نہیں رکھتا۔ ایک تو اس زمانہ میں جبکہ دنیائے شاعری گردش فلکی کی قایل تھی (میں یہ نہیں کہتا کہ گردش ارضی سے واقف نہیں تھی) ؏

"کرۂ خاک ہے گردش میں تپش سے میری"

کہنا اختراع فایقہ ہے۔ مجھے علم نہیں، ممکن ہے کہ اوروں نے بھی کہا ہو مگر تپش عشق کو گردش ارضی کا سبب قرار دینا شاعری کی وہ منزلیں ہیں جن کے خیال سے بڑے بڑوں کے حوصلے پست ہو گئے ہوں گے۔

مندرجہ بالا شعر کی بلندی و شکوہ ملاحظہ فرما چکے اب یہ شعر پڑھیے جو سہل ممتنع ہے ؎

میں نے تم کو دل دیا تم نے مجھے رسوا کیا
میں نے تم سے کیا کیا اور تم نے مجھ سے کیا کیا

مطلع کے بعد پھر ایک دریا امڈا ؎

سر سے شعلے اٹھتے ہیں آنکھوں سے دریا جائے ہے
شمع سے کس نے یہ ذکر اُس محفل آرا کا کیا

معشوق نے محفل آراستہ کی اور شمع کو رونق محفل بنا کر خود روپوش ہو گیا۔ معشوق کے اشتیاق میں اب شمع کا یہ عالم ہے کہ ؏

سر سے شعلے اُٹھتے ہیں آنکھوں سے دریا جائے ہے

حُسن تعلیل کی عمدہ مثال ہے۔

اور ہائے یہ شعر ؎

کیا خجل ہوں اب علاج بے قراری کیا کروں
دھر دیا ہاتھ اُس نے دل پر تو بھی دل دھڑکا کیا

مقطع بھی لاجواب ہے ؎

عرضِ ایماں سے ضد اُس غارتگرِ دیں کی بڑھی
تجھ سے اے مومن خدا سمجھے یہ تو نے کب کہا

محاورہ "خدا سمجھے" نے اور چار چاند لگا دیے۔
یہ شعر بہت مشہور ہے ؎

کیا اس نے قتل جہاں اک نظر میں
کسی نے نہ دیکھا تماشا کسی کا

اس طرح کے قتل میں مرنے والوں کی کتنی حسرتوں اور امنگوں کا خون ہوا ہوگا۔ ایک اور نشتر ؎

کچھ قفس میں ان دِنوں لگتا ہے جی
آشیاں اپنا ہوا برباد کیا؟

نفسیات کے اہم مسائل کو مختصر الفاظ میں بیان کر دینا مومن پر ختم ہے۔
آشیاں سے ہزاروں امیدیں وابستہ تھیں اس کا برباد ہونا تھا کہ قفس میں دل بہلنے لگا۔ ہائے وہ خانماں برباد جو قفس کو نشیمن سمجھنے لگے۔

جب مجھے رنجِ دل آزاری نہ ہو
بے وفا پھر حاصل بیداد کیا؟

ایک اور سرِ تیز نشتر ہے۔ لفظ بے وفا جس خوبی سے صرف ہوا ہے اس کی داد دینا ممکن نہیں۔ غالب کے دو شعر بل کر اس مطلب کو پورا کرتے ہیں جو مومن نے چند الفاظ میں ادا کر دیا ہے ؎

۱- لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

۲- ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں
اِک چھیڑ ہے وگرنہ مراد امتحاں نہیں

"بے وفا" کی دل آزاری میں نہ تو "لاگ" کا پہلو نکلتا ہے نہ "لگاؤ" کا نہ مراد "چھیڑ" ہو سکتی ہے نہ "امتحان" نام بیداد ہے۔ عاشق حیران ہے کہ اس بیداد کا حاصل کیا ہے۔

یہ وسعت معانی فیض ہے اس عقیدے کا کہ معشوق صرف اس لئے ظلم کرتا ہے کہ عاشق کو رنج ہو۔ اور اس سے بھی وفا کی صفت جو معشوق میں موجود نہیں ہے زایل ہو جائے۔ ترک وفا کی امید جبھی ہو سکتی ہے جب عاشق جفائے معشوق سے آزردہ ہو۔ جب یہ بات بھی نہیں ہے تو معشوق سے دریافت کرتے ہیں کہ اس بیداد کا حاصل کیا ہے ؎

گر بہائے خون عاشق ہے وصال
انتقام زحمتِ جلاد کیا ؟

اس شعر میں ایہام ہے وصال کے معنی وصل کے بھی ہیں اور مرنے کے بھی۔ پہلے مصرع میں ایک زبردست نظریہ قایم کیا ہے کہ وصال قتل عاشق کا معاوضہ ہے مگر دوسرے مصرع میں اس کو غلط ثابت کیا ہے کہ وصال بہائے خون عاشق نہیں ہے (اب لفظ وصال بمعنی مرگ لینا ہوگا)، بلکہ اس زحمت کا انتقام ہے جو جلاد کو قتل کرنے میں پیش آئی۔ اگر ایسا نہیں ہے تو اس زحمت کا بدلہ کیا ہے

حاصل یہ ہوا کہ یہ بھی معشوق کا احسان ہے کہ اس نے ہمیں قتل کیا۔ ہم نے قتل کی زحمت دی اس کی پاداش ملنا چاہئے یہ عشق کی خامی ہے اگر جان دے کر اپنے آپ کو وصال معشوق کا مستحق سمجھے ؎

اسے خو پڑ گئی ہے بے طرح زانوئے جاناں کی
یہ سر تکیہ پہ ہمدم جس طرح رکھوں نہ ٹھہریگا

ایک بے پناہ شعر ہے "بے طرح" کی تعریف نہیں ہو سکتی ؎

یہ عذر امتحاں جذب دل کیسا نکل آیا
میں الزام اُس کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

مومن کی جو شامت آئی تو معشوق کو اس کے طرز عمل پر الزام دینے بیٹھے کہ تمہیں میرا خیال بالکل نہیں۔ یہ ظلم کیا۔ وہ ستم توڑا۔ مجھ سے کبھی سیدھے منہ بات نہیں کی۔ بڑے بے وفا ہو۔ معشوق شوخ و شنگ جواب دیتا ہے کہ سنئے حضرت میری جفا جفا نہیں تھی میرا تغافل تغافل نہیں تھا بلکہ میں آپ کے جذب دل کا امتحان لیتا تھا۔ آپ کو میرا ممنون منت ہونا چاہیے تھا کہ تکملۂ عشق میں آپ کا معین ہوا مگر آپ ایسے ناشکرے ہیں کہ مجھی کو قصوروار ٹھہراتے ہیں آپ کا عشق خام ہے چلئے اپنا رستہ لیجئے۔

مومن منفعل ہو کر کہتے ہیں کہ :۔

یہ عذر امتحان جذب دل کیسا نکل آیا
میں الزام اُن کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

یہ امر مسلمہ ہے کہ ہر شے کی معرفت اس کی ضد سے ہوتی ہے اگر معشوق جفاکار و تند خو تغافل آشنا نہ ہو تو عاشق کو اپنے عشق کے نقص یا کمال کا اندازہ دشوار ہو جائے۔

اسی قبیل کا یہ مطلع ہے :۔

روزِ جزا جو قاتلِ دلجو خطاب تھا
میرا سوال ہی مرے خوں کا جواب تھا

حضرت نے روز جزا اپنے "کشندہ" کو قاتلِ دلجو کہکر پکارا اس سے ثابت ہو گیا کہ یہ تو خود اپنی جان پر کھیلے ہوئے

تھے، قاتل کو دلجو کہتے ہیں، داد بیداد سب غلط کوئی سماعت نہ ہوگی ۔ ان کا خون انہی کی گردن پر ہے ؎

پھرنے سے شام وعدہ تھکے یہ کہ سو رہے
آرام شکوۂ ستم اضطراب تھا

شام وعدۂ معشوق کے انتظار میں ٹہلتے رہے ۔ دروازے کے ہزاروں چکر لگائے گلی کے سیکڑوں پھیرے کیے مگر معشوق نہ آنا تھا نہ آیا آخر تھک کر گر رہے اور سو گئے (جس کا استعارہ مرنے سے بھی ہو سکتا ہے) اب الزام یہ آتا ہے کہ حضرت! آپ کو معشوق کا انتظار کیسا تھا کہ سو گئے ۔ اس کا جواب دیتے ہیں کہ اضطراب نے میری جان پر ستم توڑا تھا مجھے آرام نہیں آیا بلکہ اس طرح میں نے ستم اضطراب کا شکوہ کیا ۔

اضطراب و سکون دو متضاد کیفیتیں ہیں جب اضطراب کے بعد مجبوراً سکون اختیار کیا گیا تو یقیناً یہ فعل شکوہ پر مبنی سمجھا جائے گا ، گویا خاموشی نے اضطراب کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ؎

روز جزا خدا بتِ جلاد کو ملا
گویا کہ خونِ ناحق مومن ثواب تھا

اس شعر میں بھی ایہام ہے ۔ بت جلاد نے مجھ کو بے گناہ قتل کیا حشر میں پرسش ہوئی ۔ خدا کے سامنے پیش ہونا پڑا سوال جواب کی نوبت آئی اس کی یوں تاویل کی کہ بت جلاد کو میرے خون ناحق کے سبب سے خدا ملا گویا میرا قتل کار ثواب تھا ۔ نہ مجھے قتل کرتا نہ خدا تک پہونچتا ۔

یہ تو ظاہری معنی ہوئے اصل مطلب یہ ہے کہ میں ایسا گنہگار تھا کہ اگر معشوق مجھے بے گناہ قتل نہ کرتا (اس کو شہادت کہتے ہیں اور شہید یقیناً جنتی ہے) تو میری بخشش نہ ہوتی ۔ چونکہ بت جلاد میری نجات کا باعث ہوا ۔ لہذا اُسے ثواب ہوا اور اس کا یہ فعل ایسا تھا جس نے اس کو بھی خدا سے ملا دیا ؎

دیکھ لو شوقِ ناتمام مرا
غیر لے جائے ہے پیام مرا

"شوق ناتمام" کی بلاغت ملاحظہ فرمایئے ۔ ایک مطلب تو یہ ہوا کہ غیر باوجود دشمن ہونے کے میرے شوق سے اتنا متاثر ہوا کہ میری طرف سے معشوق کو پیام پہونچانے پر آمادہ ہو گیا مگر یہ مومن کا خیال ہی خیال ہے ۔ غیر کو معشوق تک پہونچنے کا بہانہ ہاتھ آیا ۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ غیر کا دل (جسے پتھر سے زیادہ سخت کہنا چاہیے) پگھل گیا بجائے دشمن کے میرا دوست بن گیا اور میری طرف سے پیام لے چلا ۔ اگرچہ میرا شوق اس درجہ پر تھا پھر بھی ناتمام تھا ورنہ میں خود اپنا پیام لے جاتا یا معشوق کو خود بخود میرے حال کی خبر ہو جاتی ؎

میری نگاہِ خیرہ دکھاتے ہیں غیر کو
بے طاقتی پہ سرزنشِ ناز دیکھنا

"سرزنشِ ناز" کیسی خوبصورت ترکیب ہے ۔ نظارۂ جمال دوست سے مومن کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں ۔ عاشق کے لیے یہ خیرہ چشمی ہی سرزنش ہے کہ تاب دیدار نہ لایا ۔ مگر معشوق نے "سرزنش ناز" کا اضافہ کیا یعنی غیر سے کہا دیکھو مجھے دیکھ کر اس کی آنکھیں

چوندھیا گئیں یہ سرزنش ناز مبہم ہے مومن اسے اپنی سرزنش سمجھتے ہیں حالانکہ معشوق غیر کو سرزنش کرتا ہے کہ مومن کی آنکھیں مجھے دیکھ کر خیرہ ہوگئیں، یہ مقتضائے عشق تھا مگر تو ایسا دیدہ دلیر ہے کہ مجھے گھور رہا ہے اگر عشق تجھ پر حاوی ہوتا تو مومن کی طرح تو بھی بے طاقت ہوتا اور میری طرف دیکھ سکتا اور اگر شوق سے مجبور ہوکر اتنی جرأت کرتا تو تیری آنکھوں میں بجلی کوند جاتی۔ یا عورتوں کی زبان میں دیدے پٹم ہوجاتے

ہم بھی تو ناداں ہیں آخر یاس مطلب کس لئے
خضر موسیٰ کو پئے تعلیم دانائی ملا

دوسرے مصرع میں تلمیح ہے خضر و موسیٰ دونوں پیغمبران اولوالعزم تھے مگر حضرت خضر کو بعض ایسے علوم باطنی خدا کی طرف سے تعلیم ہوئے تھے جن سے حضرت موسیٰ ناواقف تھے اور ان کو حضرت خضر کے پاس پئے تعلیم بھیجا گیا۔ پورا قصہ قرآن مجید میں درج ہے۔ جس طرح خضر، موسیٰ کو تعلیم دانائی کے واسطے مل گئے اسی طرح مجھے بھی کوئی رہبر مل جائے گا۔ مایوسی کی کوئی وجہ نہیں تلمیح نے شعر کو اس وجہ سے بلند کردیا کہ خود حضرت موسیٰ کا درجہ بہت بلند تھا تاہم ان کو ایک ایسا شخص ملا جس کے مقابلہ میں گویا وہ نادان تھے۔

جستجو سے وصل دلبر کی تمنا کس لئے
کیا دل گم گشتہ لے ہنگامہ آرائی ملا

جب دل گم گشتہ تلاش سے دستیاب نہیں ہوا تو جستجو سے وصل دل بر محال ہے اور ہنگامہ آرائی بیکار۔ ہنگامہ آرائی کو ایک ذات قرار دینے اور اس سے تخاطب نے ہنگامہ آرائی کی اہمیت ثابت کی ہے

جوش عشق و حسن نے کیا رنگ بدلے دیکھنا
اشک خونی سے مرے منھ زرد اس کا ہوگیا

افسوس دوسرے مصرع میں قافیہ کی قید نے ہلکی سی تعقید پیدا کردی مگر مطالب کے لحاظ سے شعر کی جس قدر داد دی جائے کم ہے۔ عاشق کے چہرے پر اشک خوں بہتے دیکھ کر معشوق کا رنگ زرد ہوگیا (خوف رسوائی سے یا نزاکت سے یا "خون ہلکا" ہونے کے سبب سے یا باطنی ربط حسن و عشق سے۔ بہت سی توجیہیں ہوسکتی ہیں) اس کیفیت کو جوش حسن و عشق کا رنگ بدلنا کہنا کس قدر بدیع بات ہے معشوق کا رنگ جو قدرتی طور پر سرخ تھا زرد ہوگیا۔ اور عاشق کا رنگ زرد اشک خونی سے سرخ ہوگیا۔ محاورہ رنگ بدلنا کس خوبی سے صرف ہوا ہے۔ جوش کے لفظ نے معنویت میں اضافہ کیا۔ یہ انقلاب جس کی شاعر نے مصوری کی ہے اسی وقت رونما ہوتا ہے جب حسن و عشق دونوں اوج کمال پر پہونچ چکے ہوں۔

بعض حضرات کو شاید یہ خیال ہو کہ "کیا رنگ بدلے" کے بجائے "کیا کیا رنگ بدلے" چاہیئے۔ میں ادب سے عرض کروں گا کہ اعتراض غلط ہوگا کیا کیا سے محاورہ کا مفہوم کچھ سے کچھ ہوجائے گا ایک سے زیادہ رنگ بدلنے کا مطلب پیدا ہوگا جو شعر کو مضحک بنادے گا ؎

یہ کسی سے ہو کہ ان لطفوں پہ گستاخی نہ ہو
عجز ہم سا کب ہوا ہر چند ہم سا ہوگیا،

انہی الفاظ کو الٹ پلٹ کر ایک نیا مضمون پیدا کردینا مومن کا حصہ ہے۔ اس قسم کے متعدد اشعار اس کے دیوان میں ملتے ہیں۔

شعر کا مطلب یہ ہے کہ ایک زمانہ تھا کہ تو مجھ پر مہربان اور مجھ سے بے تکلف تھا۔ میں طرح طرح کے الطاف کا مورد تھا، تاہم

میں نے پاسِ ادب کبھی ترک نہیں کیا مجھ سے کوئی گستاخی سرزد نہیں ہوئی مگر غیر کا اتنا ظرف کہاں۔ تیرے مہربان ہوتے ہی گستاخ ہوگیا "یہ کسی سے ہو" سوالیہ جملہ ہے یعنی اور کسی سے ایسا نہیں ہوسکتا۔ غیر ہم سا ہے (یعنی ہم دونوں پر مہربانی ہوچکی ہے) غیر ہم سا کب ہوا (یعنی میری طرح عالی ظرف متحمل نہیں ہے)۔

کیا رشک غیر تھا کہ متحمل نہ ہوسکا،
میں جان کر حریف تغافل نہ ہوسکا

معشوق نے تغافل کیا مومن کی زبان پر بے اختیار شکوہ آگیا فوراً الزام لگا گیا کہ شکوہ یا اظہار ملال شیوۂ عاشقی کے خلاف ہے مومن نے فوراً بات بنائی کہ یہ غیر کا رشک تھوڑی تھا جو مجھ سے برداشت نہ ہوسکا معشوق نے مجھ سے تغافل برتا میں نے اس کی آگاہی اور تنبیہ کے واسطے جان کر (بے قابو ہو کر نہیں) حریف تغافل ہونے سے انکار کیا۔ پہلا مصرع استفہامیہ ہے۔ یہی خیال تھوڑے تغیر سے اس شعر میں نظم ہے۔

دھیان ہے غیر کے تحمل کا
ہوش دیکھا ترے تغافل کا

یہاں تغافل ہے مگر اس قدر نہیں کہ غم صبر کھو بیٹھے ۔

اشک واژونہ اثر باعث صد جوشش ہوا
ہچکیوں سے ہیں یہ سمجھا کہ فراموش ہوا

ہچکیوں دو قسم کی ہوتی ہیں ایک شدت گریہ کے بعد اور ایک وہ جو بغیر گریہ خود بخود آنا شروع ہوتی ہیں اور عام اعتقاد ہے کہ کسی نے یاد کیا مومن نے ان دونوں کیفیتوں کو پیش نظر رکھ کر مطلع کہا ہے۔

ایک الٹی بات کہتے ہیں کہ ہچکیاں آنے سے میں یہ سمجھا کہ معشوق نے مجھے فراموش کیا پہلے مصرع میں اس کی وجہ بیان کی ہے یہ ہچکیاں جوش اشک کا نتیجہ ہیں وہ نہیں جو خود بخود آتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ میرے جوش گریہ نے الٹا اثر کیا اور یہ ہچکیاں اس سے نہیں آتی ہیں کہ معشوق نے مجھے یاد کیا بلکہ اس کے فراموش کرنے کی علامت ہیں۔ اشک واژونہ اثر کی ترکیب یادگار ہے۔

# مومن کی حیاتِ معاشقہ

## مومن ۔ صاحب جی اور آزاد

(فرمان فتحپوری)

کسی قدیم تذکرے یا کتاب میں اس کا ذکر ہو یا نہ ہو لیکن ایک مدت سے یہ روایت سینہ بہ سینہ محفوظ چلی آتی ہے کہ مومن خاں مومن چونکہ محمد حسین آزاد کی ایک عزیزہ امت الفاطمہ صاحب جی سے عشق فرماتے تھے اس لئے آزاد نے آب حیات کے پہلے اڈیشن میں مومن جیسے نامور شاعر کو شامل کرنا پسند نہیں کیا ۔ اگر یہ روایت صرف زبانی ہوتی تو خیر کوئی بات نہ تھی لیکن آج کل چونکہ ہر معاملے میں کرید و تلاش سے کام لیا جا رہا ہے اور مومن پر جو مقالات یا کتابیں لکھی جا رہی ہیں اُن میں مومن اور صاحب جی کے معاشقے کا ذکر آزاد کے سلسلے میں اشارۃً و صراحتاً آنے لگا ہے ۔ اس لئے ضروری ہے کہ مومن کے معاشقوں کا تحقیقی جائزہ لے کر اس روایت کی صحت و عدم صحت کا سراغ لگایا جائے ۔

یوں تو مومن ایک ایسے خاندان کے فرد تھے جس پر مذہب کا اثر غالب تھا اور جس میں بچپن ہی سے زہد و تقویٰ کا پابند بنانے پر زور دیا جاتا تھا ۔ ان کے والد غلام نبی خاں حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی سے گہری ارادت رکھتے تھے ۔ مومن جب پیدا ہوئے تو شاہ صاحب ہی نے ان کے کان میں آواز دی اور حبیب اللہ کے بجائے مومن نام تجویز کیا ۔ ہوش سنبھالا تو شاہ عبدالقادر نے انھیں اپنے حلقۂ درس میں شامل کر لیا ۔ چنانچہ مومن کی ابتدائی تعلیم و تربیت انھیں دونوں بزرگوں کے ہاتھوں ہوئی ، ظاہر ہے ایسی فضا میں شاہد بازی اور کوچہ گردی کا موقع کم رہا ہوگا پھر بھی ہمیں اس نفسیاتی پہلو کو نظر انداز نہ کرنا چاہئے کہ لبا اوقات جنسی خواہش کو جس قدر دبانے کی کوشش کی جاتی ہے وہ اتنی ہی زیادہ قوت پکڑتی ہے ۔ مومن کے ساتھ بھی یہی ہوا وہ جس ماحول کے تربیت یافتہ تھے اس میں دل و نظر دونوں پر سخت پابندی تھی ۔ اس پابندی کا ردِ عمل بھی سخت ہوا اور مومن نے ایک سے نہیں کئی پردہ نشینوں سے دل لگایا ۔ ابتدا میں انھوں نے جنسی محبت کی آگ کو دبا رکھنے کی کوشش کی تھی ۔ لیکن بقول غالب ؎

کیا کس نے جگر داری کا دعوےٰ　　　شکیبِ خاطر عاشق بھلا کیا

زیادہ دنوں تک ضبط کا یارا نہ رہا ۔ دل کے ساتھ ہوش و حواس اور صبر و استقلال سب ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے ۔ "جان کے عوض رگ و پے میں درد جاری و ساری ہوا اور رازِ نہاں کا پاس باقی نہ رہا ۔ جیسا کہ خود مومن نے ایک مثنوی میں بیان کیا ہے ۔

رحم کی اس سے آس کہاں تک　　　رازِ نہاں کا پاس کہاں تک

ضبط کہاں تک جی پہ بنی ہے — صبر کہاں تک اپنے بھی جی ہے
جان کو کب تک کوئی کھوئے — ابتو کہیں گے ہووے سو ہووے
رخصت نام و ننگ ہے اب تو — قافیہ اپنا تنگ ہے اب تو
اب تو کدورت دل کی نکالیں — خاک کہاں سر بات پہ ڈالیں
کھولتے ہیں اب راز نہانی — شوخ بھی دیکھے شوخ بیانی

مومن نے اپنے راز نہاں کو کس طرح کھولا ہے اور کس شوخی سے بیان کیا ہے۔ اس کا اندازہ کرنے کے لئے انکی مثنویوں کا مطالعہ ضروری ہے، مومن نے اپنی مثنویوں میں اپنے معاشقوں کا تذکرہ محض سرسری نہیں کیا۔ بلکہ عشق و عاشقی کے پس منظر آغاز و انجام، نوعیت و کیفیت اور تلخی و شیرینی ہر پہلو پر تفصیل و بے باکی سے روشنی ڈالی ہے۔ لوگ عام طور پر اپنے معاشقوں اور جنسی علائق کو شخصیت کا تاریک پہلو خیال کر کے ڈھکائے چھپائے رکھتے ہیں اور دبی زبان سے کبھی کبھی ان کا ذکر کرنے کی ہمت نہیں کرتے۔ لیکن مومن کی اخلاقی جرأت کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنے ماحول، خاندان اور نام و ناموس کا لحاظ کئے بغیر جگہ جگہ اپنی عشق بازیوں کی تشہیر اس طرح کرتے ہیں۔

اس شہر میں ایک نوجوان تھا — عشاق میں شہرۂ جہاں تھا
تھا نام تو مومن اور دیں کفر — جاں محو بتاں و دل کشیں کفر
رسوائے زماں و تیرہ ایام — آوارہ و ہرزہ گو و بد نام
ربط اس کو بتانِ نازنیں سے — دنیا سے نہ کام کچھ نہ دیں سے
آشفتۂ کاکل پریشاں! — انداز پرست کفر کیشاں!
مدہوش شراب نوجوانی — سرشار نشاط کامرانی۔
آرام و طرب میں صرف اوقات — مشغول سرور و عیش دن رات
ہر لحظہ سیاہ مست کافر — تھا ایک ہی بت پرست کافر
ناگاہ کسی سے دل لگایا — اک رشک پری سے دل لگایا
اک بت کا ہوا وہ آستاں بوس — مومن سے بنا برہمن افسوس

(مثنوی قصہ غم مرقومہ ۱۲۳۵ھ بعمر بیس سال)

نہیں اشعار یہ ہیں نالے کئی — سوزش دل کے ہیں تبخالے کئی
یعنی اک شوخ پہ ہم مرتے تھے — صدقے دل۔ جان نذر کرتے تھے
دیکھی کیا کیا نہ تباہی میں نے — مدتوں پھر بھی نباہی میں نے
ناگہاں تھی وہ کہیں کوٹھے پر — مرے آنے کی نہ تھی اس کو خبر
بے خبر سامنے آئی اک بار — بیدھڑک ہوگئی مجھ سے دوچار
دیکھتے ہی مجھے غش آنے لگا — ہوش بھی صبر نمط جانے لگا

(مثنوی قول غمیں مرقومہ ۱۲۳۶ھ بعمر ۲۱ سال)

بسکہ طبیعت مشغلہ جو تھی — اپنی سدا سے چاہ کی خو تھی

اہلِ جفا میں دھوم تھی اپنی  جورکشی معلوم تھی اپنی
شوق نہاں مشہور ہمارا  دیکھ جہاں مذکور ہمارا
ہر دشوں سے لاگ ہی دل کو  گرم رکھے اب آگ ہی دل کو
ایک نہ اک سے کام ہی رہوے  نام سدا بدنام ہی رہوے

(مثنوی تف آتشیں مرقومہ ۱۲۴۱ھ بہ عمر ۲۵ سال)

ہو چکی ہے کیسی رسوائی مری  شہر ہے ہنگامہ آرائی مری
وحشیانِ عشق کا سرخیل ہوں  خانہ بربادی میں اشک سیل ہوں
جابجا قصہ مرا مشہور ہے  اہلِ وجد و حال تک مذکور ہے

(حنین مغموم مرقومہ بہ عمر ۲۸ سال)

جب ہم مومن کے زہد و تقدس آمیز ماحول اور ان کے مذہبی عقاید و رجحانات پر نظر ڈالتے ہیں تو ان کے یہ اعلانات ہمیں بڑے حیرت انگیز معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ خود ان کے بیانات اور ان کی زندگی سے ظاہر ہے مومن بہ یک وقت رند شاہد باز بھی تھے اور دیندار بھی۔ انھیں تصوف سے شغف نہ تھا۔ اس لئے دوسرے شعرا کی طرح انھوں نے مجازی عشق کو حقیقت کا زینہ تو نہیں بنایا لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ ان کا ایک قدم بت خانے میں تھا تو دوسرا مسجد میں۔ اپنے خاندانی ماحول اور ابتدائی تعلیم و تربیت کے زیر اثر وہ مذہب کے سختی سے پابند تھے دوسری طرف شاہدان مجازی کے ساتھ کھل کھیلنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ ایک طرف وہ پردہ نشیں دہرہ جمالوں پر جان چھڑکتے تھے تو دوسری طرف سید احمد شہید بریلوی کے ساتھ جہاد میں شریک ہو کر جام شہادت نوش فرمانے کا شوق بھی دل میں رکھتے تھے۔ یہ بات اس لئے کہی جارہی ہے کہ مومن کی عشق بازی اور سید احمد شہید کی تحریک جہاد اور مومن کا ان سے بیعت ہونے کا زمانہ ایک ہی ہے۔ مومن کی ساری عشقیہ مثنویاں جو ان کے معاشقوں کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں خود مومن کی دی ہوئی تاریخوں کے مطابق ۱۲۳۱ھ اور ۱۲۴۶ھ کے درمیانی زمانے میں لکھی گئی ہیں۔ یہی وقت سید احمد شہید کی تحریک کے عروج کا ہے۔ اس لئے کہ سید احمد شہید نے ۱۲۳۶ھ میں سکھوں کے خلاف جہاد کی تحریک پیش کی اور حج سے واپسی پر ۱۲۴۱ھ میں جہاد کے لئے روانہ ہوئے اور پانچ سال برسرپیکار رہ کر ۱۲۴۶ھ میں شہید ہوئے۔ اسی دوران میں مومن خاں سید احمد شہید سے بیعت ہوئے اور لشکر اسلام کا دل بڑھانے کے لئے ایک مثنوی بعنوان جہاد لکھی۔ اس میں اپنے شوق شہادت کا اظہار اس طور کیا ہے:-

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب  یہ افضل سے افضل عبادت نصیب
الٰہی اگرچہ ہوں میں تیرہ کار  پہ تیرے کرم کا ہوں امیدوار
تو اپنی عنایت سے توفیق دے  عروج شہید اور صدیق دے
یہ دعوت ہو مقبول درگاہ میں  مری جاں فدا ہو اسی راہ میں

ایک طرف یہ مذہبی جوش و خروش دوسری طرف ہوسناکی وہ عیش کوشی کی وہ ہنگامہ خیزیاں جن کا ذکر انھوں نے اپنی مثنویوں میں کیا ہے۔ اب نہ انھیں کافر کہتے بنتی ہے نہ مومن جس زمانے میں اپنے پیر و مرشد سید احمد شہید کے لشکریوں میں شامل ہو کر عاقبت سنوارنے کی فکر ہو رہی ہے۔ اسی زمانے میں "بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" کے مصداق پردہ نشینانِ خوش جمال کی صحبتوں میں ذوق گناہ کی داد طلب کی جارہی ہے۔ بظاہر ان دو متضاد مشغلوں کا اجتماع عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ان کی

واقعیت میں شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ یوں بھی مومن نے اپنی سیرت کے جن متضاد و متخالف پہلوؤں کا ذکر کیا ہے وہ بذات خود اتنے حیرت انگیز نہیں ہیں ہاں ان واقعات کے اظہار میں جس بے باکی اور اخلاقی جرأت سے کام لیا ہے وہ البتہ حیرت انگیز ہے اس لئے کہ مومن نے اپنی سیرت کے رسوا کن پہلوؤں کو جس طرح کھول کر ہمارے سامنے رکھ دیا ہے عام انسانوں میں اس کی ہمت بہت کم ہوتی ہے۔ خود میر کو اپنی روئداد محبت بالاعلان سنانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ انھوں نے ذکر میر میں سراج الدین علی خاں آرزو کو برا بھلا تو کہا ہے لیکن اپنی کمزوریوں کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنی آپ بیتیوں میں اپنے اوصاف و کمالات کا اظہار تو کر جاتا ہے لیکن اپنے عیوب کو اس طرح چھپا جاتا ہے گویا وہ انسان نہیں فرشتہ تھا۔ مومن نے یہ نہیں کیا بلکہ اپنی شخصیت کے دونوں رُخ سامنے رکھ دیئے ورنہ ان کا گناہ اس دنیا میں نیا نہیں ہے، فرق صرف یہ ہے کہ دوسرے اس پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں اور مومن نے سعدی کے لفظوں میں اسے آسمان پر اُچھال دیا ہے۔

ہیچ کس بے دامنِ ترنیست اما دیگراں　　بازی پوشند و ما در آفتاب افگندہ ایم　　(سعدی)

اخلاقی نقطۂ نظر سے ممکن ہے کہ مومن کی بے باکی اور اخلاقی جرأت کو عیب قرار دیا جائے لیکن ادبی نقطۂ نظر سے یہ باتیں حیات و کلام مومن کے بعض ایسے پہلوؤں کو بے نقاب کرتی ہیں جن کو ذہن نشین کئے بغیر ان کے عشقیہ جذبات سے لطف اندوز ہونا مشکل ہے اور اسی لئے ان کی مثنویوں یا منظوم معاشقوں کا تفصیلی جائزہ لینا ضروری ہے۔

مومن نے اپنی عشق بازی کے جو افسانے مثنویوں میں بیان کئے ہیں ان کا آغاز کب اور کس طرح ہوا۔ اس سلسلے میں ہمیں مومن کی پہلی عشقیہ مثنوی شکایت ستم مرقومہ ۱۲۳۱ھ کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ اس مثنوی میں مومن خاں نے خود اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ انھیں عشق کا چسکا بچپن ہی سے لگ چکا تھا اور اس کے نتائج و اثرات سے بے خبر رہ کر نو سال کی عمر ہی میں انھوں نے حظِ نفس کا سامان مہیا کرنا شروع کر دیا تھا۔ چند شعر دیکھئے:۔

لیعنی بچپن سے ہوں میں پیرِ مغاں　　بلکہ گمرہانِ راہ جہاں
تھے برس ہم شمارۂ افلاک　　کہ ہوا پائمال صورت خاک
کھو دیا چین ایک مہ رو نے　　شب سیہ کی ہلالی ابرو نے
ہائے بچپن کا دل کا آجانا　　کچھ سمجھتے نہ تھے یہ کیا جانا
شغلِ طفلانہ دل کے پاس گئے　　ہوش کے آتے ہی حواس گئے
شوق آیا تو دل نوازی کا　　کھیل کھیلے تو عشق بازی کا　　(شکایت ستم)

جس مثنوی کے یہ اشعار ہیں وہ ۱۲۳۱ھ میں لکھی گئی ہے۔ اس وقت مومن کی عمر سترہ کے لگ بھگ تھی جیسا کہ ان کے شعر سے ظاہر ہے۔

دیکھیں آگے دکھائے کیا کیا دن　　ہے ابھی سترہ برس کا سن

اس سے یہ بات طے پا جاتی ہے کہ مومن نے ۱۲۳۱ھ میں بہ عمر سترہ سال کوچۂ عشق و ہوس میں پہلی بار قدم رکھا اور اس راہ میں جو واقعات پیش آئے انھیں اسی سال شکایت ستم کے نام سے نظم کر دیا۔ شکایت ستم میں ان کے دو معاشقوں کا سراغ ملتا ہے۔ پہلا معاشقہ صرف دو سال تک قائم رہا۔

آفت جان و دل فراق و وصال　　الغرض یوں ہی کٹ گئے دو سال

اس کے بعد محفل طرب اٹھ گئی۔ محبوبہ پر سخت پابندیاں عائد کر دی گئیں اور چند دنوں میں وہ مجبور و مہجور اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔

تنگیٔ دہر وحشت افزا تھی     تپشِ دل قیامت آرا تھی
بہرِ تسکین شدتِ خفقاں     ٹھہری گلگشتِ روضۂ رضواں
گئی جنت میں بس کہ ایسی حور     ہوئی بیتاب کیسی کیسی حور

اسی مثنوی میں ایک دوسرے معاشقے کی داستان شروع ہوگئی ہے۔ اس میں محبوبہ سے روابط کی کیا نوعیت تھی۔ اس کا اندازہ ان اشعار سے کیجئے۔

ربطِ جذبِ دل دا اثر کیا کیا     دونوں مشتاق یکدگر کیا کیا
کوئی آیا تو ہٹ گئے ناچار     ورنہ ہر لحجہ شغلِ بوس و کنار
اک برس تک رہا یہی عالم     زندگی کے مزے اٹھائے بہم

ایک سال بعد ایک حیالہ کے بہکانے سے آپس میں کچھ اَن بن ہوگئی۔ دونوں کو رسوا و بدنام ہونا پڑا۔ لیکن کچھ دنوں بعد باہم ملاقات کی صورتیں پھر پیدا ہوگئیں۔ اور عیش رفتہ واپس آگیا جیسا کہ ان اشعار سے ظاہر ہے۔

ہوگئے دل سے دور کین و عناد     مل گئی بارے جو تھی اپنی مراد
پھر مئے وصل سے ہوئے بیہوش     بن گیا گھر دوکانِ بادہ فروش
اس کی دلبستگی کے ہائے مزے     خوب دل کھول کر اٹھائے مزے
یوں ہی اک چند انبساط رہا     دورہ عشرت و نشاط رہا

بعد ازاں ایک پیر زال نے عاشق و محبوبہ میں ایسا فراق ڈالا کہ پھر دوبارہ ملنے کی نوبت نہ آئی۔

مومن کی دوسری مثنوی ۱۲۳۵ھ میں "قصہ غم" کے نام سے وجود میں آئی۔ اس میں مومن کے کسی نئے معاشقے کا سراغ نہیں ملتا بلکہ جن معاشقوں کا ذکر پہلی مثنوی موسوم "شکایت ستم" میں آیا ہے۔ انھیں کی یاد تازہ کی گئی ہے۔

مومن کی تیسری مثنوی قول غمیں مرقومہ ۱۲۳۶ھ میں البتہ ان کے ایک نئے معاشقے کا ذکر ملتا ہے۔ اس میں ایک ایسی محبوبہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ جو علاج کی غرض سے پڑوس میں آئی ہوئی تھیں اور جن کے معالجے کے لئے حکیم مومن خاں مومن کو بلایا گیا۔ محبوبہ چونکہ علاج کی غرض سے بطور مہمان مقیم تھیں اس لئے مومن سے لگاؤ کے باوجود چار و ناچار اپنے وطن پورب کو واپس جانا پڑا۔ اس طرح یہ تیسرا معاشقہ بھی ختم ہوگیا۔

چوتھی مثنوی تف آتشیں مرقومہ ۱۲۴۱ھ میں مومن نے ایک نئی داستان محبت کا ذکر کیا ہے۔ اس میں جس محبوبہ کا ذکر ہے وہ پڑوس میں شادی کی ایک تقریب میں شرکت کرنے آئی تھیں۔ مومن سے آنکھ لڑی اور دونوں ایک دوسرے پر عاشق ہوگئے۔ کچھ دنوں تک رنگ رلیاں مناتے رہے، لیکن ایک کٹنی نے محبوبہ کو کچھ ایسا بھڑکا کہ وہ مومن سے ہمیشہ کے لئے بدظن ہوگئی اور پھر کبھی ملاقات نہ ہوئی۔

پانچویں مثنوی حنین مغموم مرقومہ ۱۲۴۲ھ میں اولاً گزشتہ معاشقے کی محبوبہ کی بے وفائی کا تذکرہ ہے۔ بعد ازاں ایک نئی محبوبہ کے عشق کا قصہ سنایا گیا ہے جس سے مومن کی ملاقات اتفاقاً حسینوں کے ایک جھرمٹ میں ہوگئی تھی۔ محبوبہ نے پہلے تو تغافل سے کام لیا۔ لیکن رفتہ رفتہ عشق نے اس پر بھی اثر کیا اور نامہ و پیام کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ وصال کی شادمانیاں بھی میسر آئیں۔ لیکن جس کریہ المنظر عورت نے پچھلی محبوبہ کو چھڑایا تھا۔ اس نے اس معاشقے میں بھی رخنہ ڈالا اور محبوبہ مومن سے ہمیشہ کے لئے بدگمان ہوگئی۔

چھٹی مثنوی ۱۲۴۶ھ میں "آہ و زاری" کے نام سے کہی گئی ہے۔ اس میں کسی نئی واردات کا ذکر نہیں ہے، بلکہ پچھلی محبوبہ سے اپنی

خستہ حالی کا واسطہ دے کر رحم و کرم کی درخواست کی گئی ہے۔ محبوبہ چونکہ مذہباً شیعہ ہے اور شاید عقیدے کا اختلاف یک جان دو قالب ہونے میں حارج تھا۔ اس لئے اس کو ہم مذہب بنانے اور اس کی تبدیلی عقائد کی دعا مانگی گئی ہے۔

یہ چھ مثنویاں جس میں مومن نے اپنے معاشقوں کا مفصل ذکر کیا ہے اور جو ۱۲۳۱ھ اور ۱۲۴۶ھ کے درمیان لکھی گئی ہیں صاف پتہ دیتی ہیں کہ مومن کے معاشقوں کا سلسلہ پندرہ سولہ سال تک برابر قائم رہتا ہے اس سارے زمانے میں مومن فی الواقع کتنی بار دام عشق میں گرفتار ہوئے اور ان کے کیا نتائج ہوئے اس کے متعلق وثوق سے کچھ کہنا آسان نہیں ہے۔ اس لئے کہ مومن نے خود جگہ جگہ اور بار بار دل لگانے کا دعوے کیا ہے ؎

ایک نہ اک سے کام ہی رہوے　　نام سدا بدنام ہی رہوے　　(تف آتشیں)

آشناؤں میں سدا گھر ہیں کہاں　　گہ وہاں، گاہ وہاں، گاہ وہاں　　(قول غمیں)

مومن کے معاشقوں کا جو تاریخی خاکہ مثنویوں کی مدد سے اوپر دیا گیا ہے۔ اس سے ان کے معاشقوں کی تعداد زیادہ سے زیادہ پانچ تک پہنچتی ہے۔ پہلے دو کا ذکر "شکایت ستم" مرقومہ ۱۲۳۱ھ میں، تیسرے کا ذکر "قول غمیں" میں، چوتھے کا ذکر "تف آتشیں" میں اور پانچویں کا ذکر "حنین مغموم" میں کیا گیا ہے۔ حنین مغموم کے شروع میں "تف آتشیں" کے معاشقہ کی مزید تفصیل ہے لیکن بعد میں مومن نے جو داستان سنائی ہے اس کے متعلق بھی میرا خیال ہے کہ وہ کوئی نئی داستانِ محبت نہیں ہے بلکہ اس میں "قول غمیں" یعنی صاحب جی کی داستان کو از سر نو دہرایا گیا ہے مثنوی کے یہ اشعار خاص طور پر اس خیال کو تقویت پہنچاتے ہیں۔

وقت رخصت مضطرب ہونے لگی　　دیکھ کر حسرت زدہ رونے لگی

چلتے چلتے کہہ دیا جلد آئیو　　کچھ بہانا ہو نہ ہو ہو جائیو

مضطرب رکھنے لگی آوارگی　　صاحبی اور اس قدر بے چارگی

اب اگر اسے درست خیال کیا جائے کہ "حنین مغموم" میں صرف گزشتہ معاشقوں کا تذکرہ ہے تو مومن کے معاشقوں کی تعداد صرف چار رہ جاتی ہے۔ لیکن بعض حضرات نے مومن کی مثنوی میں آٹھ معاشقوں کی نشان دہی کی ہے اس سلسلے میں ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

"شکایت ستم ۱۲۳۱ھ ان کی پہلی مثنوی ہے جس میں انھوں نے اپنے پہلے عشق کی تفصیل پیش کی ہے "خوب خوب ملاقاتیں رہیں بالآخر وہ مرگئی، ایک ہمسائی نے دل بھایا، ابھی وہ اس سے لطف لے ہی رہے تھے کہ ایک اور محبت کا آغاز ہوا لیکن اس میں انھیں کامیابی نہیں ہوئی اس کے بعد ایک اور سلسلہ شروع ہوا۔ لیکن اس میں بھی وہ ناکام ہوئے۔ اس کا بیان ان کی دوسری مثنوی قصۂ غم میں موجود ہے۔ جب یہ قصہ ختم ہوا تو ان کا وہ عشق شروع ہوا جس کی داستان انھوں نے قول غمیں میں لکھی ہے۔ یہی صاحب جی کا عشق تھا۔ بالآخر صاحب جی کو پورب بھیج دیا گیا۔ چنانچہ ایک شادی کے موقعہ پر انھوں نے کسی کو دیکھ لیا اور اس کو دل دے بیٹھے۔ لیکن کامیابی نہ ہوئی اور وہ اس کے فراق میں بیمار رہنے لگے۔ اس کے بعد ایک محبوبہ سے انھوں نے اور دل لگایا۔ لیکن وہ جال میں نہ پھنسی اور اس طرح یہ قصہ بھی ختم ہو گیا۔ "آہ و زاری مظلوم" ان کی آخری مثنوی ہے۔ اس میں ایک محبوبہ کا ذکر ہے جس نے ان کی طرف توجہ نہیں کی۔ غرض مومن نے کئی عشق کئے ہیں[1]"

اس اقتباس سے مومن کے معاشقوں کی تعداد کم از کم آٹھ متعین ہوتی ہے۔ لیکن یہ خیال درست نہیں معلوم ہوتا۔ مومن کی مثنویوں میں ان کے معاشقوں کی تعداد چار یا پانچ سے زیادہ نہیں ہے۔

---

[1] مومن اور مطالعہ مومن ص ۱۲۳

اب رہا یہ سوال کہ ان معاشقوں کے پردے میں کون کون تھا اور ان کے تعلقات کی نوعیت و حقیقت کیا تھی۔ اس کی تفصیل مومن نے نہیں بتائی پھر بھی مثنوی کے بعض قرائن و آثار سے دو ایک پردہ نشینوں کا سراغ لگانا مشکل نہیں اس لئے کہ مومن نے اپنی محبوبوں کے شمائل و خصائل کا ذکر حسب طور پر کیا ہے۔ اس سے یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ انھوں نے جنسِ لطیف کے سوا کبھی طوائفوں یا شاہدان بازاری سے سلسلۂ عشق قائم نہیں کیا بلکہ سدا اپنے ہم مرتبہ خاندان کی پردہ نشین خواتین کے دلدادہ رہے ہیں۔ مثلاً شکایت کے پہلے معاشقہ کے یہ اشعار ؎

هوئی شادی ہمارے یاں اکبار — آئی مہماں وہ دولت بیدار
شرکتِ محفل سراپا زیب — اس کے آنے کی ہوگئی تقریب
ایک خالی مکان میں آکر — مل گئی چپکے چپکے ڈھب پاکر

صاف پتہ دیتے ہیں کہ محبوبہ کوئی غیر نہ تھی بلکہ اس کا تعلق یقیناً کسی ایسے گھرانے سے تھا جو مومن سے رشتۂ قرابت رکھتا تھا یا پھر ان سے گہرے دوستانہ مراسم تھے۔ اس کے بغیر شادی کی تقریب میں محبوبہ کا آنا، اور چپکے چپکے ڈھب پاکر خالی مکان میں مومن سے ملنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ یہ لڑکی دوسرے عزیزو اقارب کے ساتھ تقریب میں شرکت کے لئے آئی تھی، دو دن رہی واپس چلی گئی۔

آگیا دو ہی دن میں شور نشور — منتشر ہوگئی وہ بزم سرور

اس کے بعد کچھ ایسے حالات رونما ہوئے کہ دوبارہ ملنے کا موقع ہاتھ نہ آیا۔

وہ ملاقات آخری ہے ہے — کیسی دلداریاں مری ہے ہے

طالب و مطلوب دونوں کا عنفوان شباب تھا۔ نئی نئی چوٹیں تھیں۔ پہلی پہلی محبت تھی۔ جدائی کیا ہوئی قیامت گزر گئی۔ محبوبہ عورت ذات زیادہ دنوں ضبط کا یارا نہ سکی۔ اور غم فراق میں جان سے گزر گئی۔ مومن کی عاشقانہ زندگی کا یہ پہلا حادثہ تھا۔ سخت صبر آزما ثابت ہوا۔ چنانچہ اس مثنوی میں مومن نے گریہ وزاری اور آہ و بکا کا ایک طویل سلسلہ چھیڑا ہے۔ اس محبوبہ کا کیا نام تھا، اس کے متعلق بھی تحقیق سے کہنا مشکل ہے۔ لیکن اس مثنوی کے بعض اشعار سے ایسا گمان ہوتا ہے کہ اس کا نام "حور" یا "حور طلعت" رہا ہو گا مثلاً ؎

گئی جنت میں بس کہ ایسی حور — ہوئی بیتاب۔ کیسی کیسی حور

یہاں "حور" کا اشارہ اسم علم پر بھی صاف دلالت کرتا ہے۔ کلیات مومن میں ترجیع بند کی صورت میں جو مرثیہ ملتا ہے اس کا عنوان مرثیہ "حور طلعت" "ملک شیم" بھی اس خیال کو قدرے تقویت پہنچاتا ہے۔ مومن نے اپنی مثنویوں میں جن محبوباؤں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں صرف پہلی مثنوی کی محبوبہ ایسی تھی جو مومن سے شدید محبت کرتی تھی اور جس نے مومن کے فراق میں جان دیدی تھی۔ مومن کی یہ اولین محبت تھی محبوبہ کی اس وفاداری اور جاں سپاری کا ضرور ان پر گہرا اثر ہوا ہوگا اور ممکن ہے یہ مرثیہ انھوں نے اسی کے غم میں لکھا ہو۔ کسی اور مثنوی سے ان کی کسی محبوبہ کا سراغ نہیں ملتا۔ اس لئے اس مرثیے کو کسی اور سے منسوب کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ اسے صاحب جی کا مرثیہ بھی نہیں کہہ سکتے۔ اس لئے کہ مومن کے فراق میں صاحب جی کا جان دینا کہیں سے ثابت نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب نے "قول غمیں" کے سلسلے میں لکھا ہے کہ "صاحب جی نے خودکشی" کی تھی لیکن مثنوی میں کہیں اس قسم کا اشارہ نہیں ہے اور صاحب جی کے پورب چلے جانے پر مثنوی ختم ہو جاتی ہے۔ آخر میں صاحب جی کی محبت پر اعتماد کر کے تاثیر عشق کی ایک مثال ضرور دی گئی ہے۔ لیکن وہ صرف اس تسکین کے لئے ہے کہ صاحب جی اور مومن کبھی نہ کبھی دوبارہ ضرور ملیں گے۔ ان کی محبت ایک نہ ایک دن رنگ لائے گی اور ان کا فراق وصال میں بدل جائے گا۔ اس سے یہ نتیجہ کسی طرح مرتب نہیں ہوتا کہ صاحب جی نے خودکشی کر لی تھی۔ اس لئے مومن کے مذکورہ مرثیہ کو ان کی

پہلی محبوبہ کا مرثیہ خیال کرنا چاہئے اور اسی سے گمان ہوتا ہے کہ شاید اس کا نام "حور طلعت" رہا ہو۔

"شکایت ستم" کے دوسرے معاشقے میں ایک ایسی محبوبہ کا ذکر آیا ہے جو یک بیک ان کے سرہانے آموجود ہوتی ہے ؎

دیکھتا کیا ہوں ایک زہرہ جبیں　　جلوہ افروز ہے سرِ بالیں

اس زہرہ جبیں کی عمر اس وقت غالباً بارہ سال تھی۔

سال عمر اب تھے ہم شمارِ بروج　　کہ ہوا اختر بلا کا عروج

مومن اس دوازدہ سالہ حسینہ پر عاشق ہو جاتے ہیں، اور پورے ایک سال تک ہم آغوشی کا لطف اُٹھاتے ہیں۔

یک برس تک رہا یہی عالم　　زندگی کے مزے اٹھائے بہم
بعد یک سال قصۂ دیرینہ　　چرخ بیداد گر زمین کینہ
آگیا اپنی کج خرامی پر　　عشق ہوا واڑ گونہ کامی پر

لیکن مومن نے اس محبوبہ کے حسب نسب کا بھی کوئی پتہ نہیں دیا۔ مثنوی کے اشعار سے یہ ضرور اندازہ ہوتا ہے کہ یہ زہرہ جبیں مومن کے قریبی رشتہ داروں میں تھی اور اسی رشتے کی قربت نے انھیں اس سے ملنے کے بے تکلف مواقع بہم پہنچائے تھے اس شعر سے۔

کئی دن بعد ایک شب تنہا　　اتفاقاً ملی وہ مہ سیما

البتہ یہ خیال ہوتا ہے کہ اس معاشقے کی محبوبہ کا نام "سیما" تھا ہر چند کہ "مہ جبیں" اور "زہرہ جبیں" کی ترکیب طرح "مہ سیما" کی ترکیب مرکب توصیفی کی حیثیت سے استعمال ہوئی ہے پھر بھی دوسری مثنویوں کے بعض اشعار سے اس خیال کو قوت پہنچتی ہے کہ ان کی ایک محبوبہ کا نام سیما ضرور تھا خصوصاً چھٹی مثنوی "آہ وزاری مظلوم" میں جس محبوبہ کی خصوصیات وصفات بیان کی گئی ہیں اور جس میں گزشتہ معاشقے کے تاثرات پیش کئے گئے ہیں اگر ان کا تعلق فی الواقع "شکایت ستم کے دوسرے معاشقے سے ہے تو پھر یقیناً اس محبوبہ کا نام سیما تھا جیسا کہ ان اشعار سے مترشح ہوتا ہے۔

کہاں ہے بدر سیما وہ ترحّم　　کہ ہوں میں رازدار سرو انجم
نہیں کیوں گرمی صحبت کا ایما　　کہ میں پروانہ ہوں تم شمع سیما

مثنوی حنین مغموم میں پہلی محبوبہ سے دوبارہ ملنے اور عیش رفتہ کو واپس لانے کی آرزو اس طور پر کی گئی ہے۔

پھر فروغ ماہِ سیما دیکھ لوں　　چشم حیراں کا تماشہ دیکھ لوں

ان اشعار میں خاص طور پر دوسرے شعر میں "سیما" کا لفظ صاف اسم علم پر دلالت کرتا ہے ہو سکتا ہے کہ مومن نے اس کی ذو معنویت کا پردہ ڈالنے یا صنعت ایہام سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہو۔

مومن کے تیسرے معاشقے کی تفصیل "قول غمیں" میں دی گئی ہے۔ اس میں محبوبہ کے حسب ونسب یا نام کے متعلق مومن نے کوئی وضاحت نہیں کی پھر بھی مومن نے آغاز عشق کے بیان میں کچھ ایسی وضاحتیں کر دی ہیں کہ اس مثنوی کے محبوبہ کا سراغ لگانا مشکل نہیں رہ جاتا، مومن ایک طبیب کی حیثیت سے ایک محترمہ کے معالجے کے لئے بلائے جاتے ہیں اور نبض پر ہاتھ رکھتے ہی ہاتھ سے دل نکل جاتا ہے ؎

میں نے اس نبض پر جو ہاتھ رکھا　　ہاتھ سے میرے میرا دل ہی چلا
اس کو جوں ہاتھ لگایا میں نے　　دل سے بس ہاتھ اٹھایا میں نے

بلا کسی خارجی شہادت کے اس مہ لقا کا نام لینا مشکل تھا۔ لیکن نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے بے تامل واضح کر دیا ہے کہ ان کا نام امت الفاطمہ تھا۔ شیفتہ کا بیان ہے کہ :-

"ان کا نام امت الفاطمہ بیگم تھا صاحب جی کے نام سے مشہور تھیں۔ حسن و صفات میں مثل آفتاب تھیں۔ اپنے معالجہ کے سلسلے میں مومن خاں سے سابقہ پڑا۔ کچھ مہینے زیر علاج رہیں۔ مدت ہوئی کہ لکھنؤ چلی گئیں۔ خاں موصوف کی مثنوی قول غمیں انھیں کے حسن و جمال کی شرح ہے۔ المختصر ان کے فیضان صحبت سے ان کی طبیعت شعر و شاعری کی طرف مائل ہوئی اور موزونی قد موزونی طبع کی طرف راغب ہوئی اور ان زلف پریشاں کی زینت اشعار گوئی میں متبذل ہوئی [1]"

اس بیان کے بعد شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی اور قول غمیں کے معاشقے کی محبوبہ صاحب جی ہی قرار پاتی ہیں۔ مومن کے یہاں متعدد اشعار میں صاحب جی کا ذکر آیا ہے ایک غزل بھی صاحب جی کی ردیف میں موجود ہے۔ اور یہ اس بات کا یقین دلاتی ہے کہ مومن اور امت الفاطمہ کے عشق کا واقعہ یکسر سچا ہے۔

یہی امت الفاطمہ صاحب جی ہیں جن کے متعلق یہ روایت سینہ بہ سینہ چلی آتی ہے کہ وہ آزاد کی کوئی عزیزہ تھیں اور آزاد نے اسی واقعہ کی بنا پر مومن کا ذکر آب حیات کے پہلے اڈیشن میں نہیں کیا۔ ڈاکٹر عبادت صاحب لکھتے ہیں کہ :-

"بعض لوگوں کا یہ خیال ہے لیکن انھوں نے اس کو لکھا نہیں اور وہ اس کو لکھ بھی نہیں سکتے تھے کہ امت الفاطمہ بیگم صاحب کا تعلق دلی کے ایک مشہور خاندان سے تھا اس خاندان میں بہت اچھے ادیب اور انشا پرداز پیدا ہوئے ہیں۔ صاحب جی ان کی قریبی عزیزہ تھیں [2]"۔

عبادت صاحب نے ان لوگوں کا نام نہیں لیا جو اس قسم کا اظہار خیال کرتے ہیں۔ نام بھی کس کس کے لیتے۔ اس لئے کہ سبھی لوگ یہی گمان کرتے ہیں انھوں نے اس سلسلے میں آزاد کا نام لینے سے بھی گریز کیا ہے۔ پھر بھی یہ کہ امت الفاطمہ کو دلی کے اچھے ادیب و انشا پرداز کی عزیزہ تھیں، واضح کر دیتا ہے کہ ان کا اشارہ آزاد کے سوا کسی اور طرف نہیں ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بیاض سالک اور برکت خیرآبادی کی مثنوی میں اس معاشقے کی تفصیل موجود ہے۔ مولانا ابوالخیر مودودی کے خط کا ایک اقتباس دیکھئے۔

"بیاض سالک تو ناقابل یافت ہے۔ برکت خیرآبادی کی مثنوی ممکن ہے دستیاب ہو سکے۔ قلمی تھی۔ مگر اس کی بکثرت نقلیں ہوئی تھیں، برکت، جنرل اکٹرلونی کے پیشکار تھے۔ مومن سے بڑا یارانہ تھا۔ عمر میں مومن سے بڑے تھے۔ مگر مومن کی نباضی اور نباضی سے زیادہ شعر میں کمال نے برابر کا یار بنا دیا تھا۔ مومن نوجوان تھے، یہ باراں دیدہ، انھوں نے ذرا سی بات کہی یہ تہہ تک پہنچ گئے، برکت کی مثنوی مومن کے عشق کی پوری روداد تھی۔ امت الفاطمہ عنفوان شباب میں شادی کے دوسرے تیسرے سال بیوہ ہو گئی تھیں۔ ایک ڈپٹی صاحب سے متعہ ہوا۔ اندارے کنویں کے عین سامنے (قاسم جان کی گلی میں) ایک اونچا پھاٹک آپ نے دیکھا ہوگا۔ وہ پھاٹک انہیں ڈپٹی صاحب کے گھرانے کی یادگار ہے۔ ڈپٹی صاحب سے بھی برکت کا یارانہ تھا۔ معالجہ کے سلسلے میں وہی وجہ تقریب ہوئے۔ امت الفاطمہ حسن و جمال میں فرد تھیں۔ متعہ کا فیضان کچھ ایسا ہوا کہ آئین ہم آغوشی میں طاق ہو گئیں۔ وہ اولین تھیں جن پر مومن چھوٹے اور اسیر ہو گئے۔ پھر مومن کا معاملہ تو یہ تھا کہ عین شباب میں عالم آشوب نگاہ ہے سراہم بگرفت سید احمد شہید کے مرید ہو گئے اور بے چاری امت الفاطمہ صاحب جی خانگی بن گئیں۔ عشق مومن کی داستان قول غمیں نہیں بلکہ برکت کی مثنوی ہے اس سے اندازہ فرما لیجئے کہ پانسو بیت میں کیا کیا ہوگا [3]"

[1] گلشن بے خار [2] مومن اور مطالعہ مومن ص ۵۳ - [3] مومن اور مطالعہ مومن ص ۴۷

ہمیں مولانا ابو الخیر مودودی صاحب کی اس رائے کو تسلیم کرنے میں بھی تامل ہے کیونکہ وہ خود یہ فرماتے ہیں کہ "بیاض سالک تو نا قابل یافت ہے۔ اور برکت خیر آبادی کی مثنوی ممکن ہے دستیاب ہو سکے" اس کا مطلب یہ ہے کہ بیاض سالک یا برکت خیر آبادی کی مثنوی اب تک کسی کی نظر سے نہیں گزری اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ مولانا نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے وہ برکت خیر آبادی کی مثنوی کا خلاصہ ہے تو اس سے یہ کہیں مستنبط نہیں ہوتا کہ امۃ الفاطمہ صاحب جی محمد حسین آزاد کی عزیزہ تھیں۔ لیکن اس قیاس پر کہ امۃ الفاطمہ چونکہ مذہباً شیعہ تھیں اور آزاد بھی شیعہ تھے۔ اس لئے امۃ الفاطمہ ضرور ان کی عزیزہ رہی ہوں گی کسی طرح درست خیال نہیں کیا جا سکتا، اول تو اب تک ایسا مستند حوالہ نہیں ملا جس سے یہ ثابت کیا جائے کہ امۃ الفاطمہ فی الواقع شیعہ تھیں۔ دوسرے یہ کہ اگر ان کا شیعہ ہونا ثابت بھی ہو جائے تو انھیں آزاد کی عزیزہ کہنے کی کیا دلیل ہے۔ مولانا کے اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مومن اول اول صاحب جی کے عشق میں گرفتار ہوئے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ مومن اس سے پہلے کم از کم دو بار دام عشق میں گرفتار ہو چکے تھے۔ اور بڑی مشکلیں اٹھائی تھیں۔ جیسا کہ ان کی پہلی مثنوی "شکایت ستم" سے واضح ہے۔ اسی طرح مومن نے امۃ الفاطمہ کے معاشقے کے بعد بھی کئی پردہ نشینوں اور زہرہ جبینوں سے دل لگایا تھا اور ان میں ایک محبوبہ کا تعلق یقیناً شیعہ گھرانے سے بھی تھا۔ غزل کے متفرق اشعار اور مثنوی "گریہ وزاری مظلوم" میں مومن نے خود نہایت صراحت سے یہ بتایا ہے کہ ان کی ایک محبوبہ مذہباً شیعہ تھیں اور اسی اختلاف عقیدہ کے سبب وہ اک جان دو قالب ہو کر ایک جگہ نہ رہنے پائے۔ اس سلسلے میں مثنوی گریہ وزاری کے چند اشعار دیکھئے، جن میں انھوں نے اپنی ایک محبوبہ کے عقائد کا ذکر کیا ہے۔

نرالا سب سے اس کا کیش و آئیں　　محب اہل بیت و دشمن دیں
غضب خونریز کافر ماجرا ہے　　فنائے خانہ دشت کربلا ہے
طلسم شیعگی جادو کلامی　　صفت میری جو ہو تو نیک نامی
مری الفت چھپائے مجھ سے بیدین　　تقیہ فرض جانے مستحب کیں

یہ شیعہ خاتون مہذب و تعلیم یافتہ تھیں اور عقائد کے سلسلے میں اکثر مومن سے رد و کد رہا کرتی تھی۔ چنانچہ مومن کو انھیں اپنا ہم خیال بنانے کی بڑی آرزو تھی۔

نکالے عرض ایماں مطلب اپنا　　کروں آخر اسے ہم مذہب اپنا
پڑھے کلمہ میرا وہ نامسلماں　　مبارک باد دیں کیا کیا مسلماں
ادا ہو احتساب پاک ساقی　　بنے دیندار کافر ماجرائی

لیکن شاید مومن کی یہ آرزو پوری نہیں ہوئی۔ اس لئے کہ مومن نے اپنے ایک منظوم خط میں محبوب کے ان عقائد کی طرف دوبارہ اشارہ کئے ہیں اور محرم کے زمانے میں بھی اسے غمناک و نم دیدہ دیکھنے کی تاب نہیں لا سکے۔ کہتے ہیں :۔

یعنی از بس محرم آیا　　ہنگام وفور ماتم آیا
تھا غم ترا دل کو ناگوارا　　اس فکر نے مجھ کو جاں سے مارا
ہر چند غم امام ہووے　　پر تجھ کو نہ غم سے کام ہووے

اسی طرح مومن کی غزلوں میں کئی شعر اس طرح کے مل جاتے ہیں جن سے ان کی ایک محبوبہ کا شیعہ ہونا ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً یہ اشعار دیکھئے :۔

سو زندگی نثار کروں ایسی موت پر — یوں روئے زار زار تو اہل عزا کے ساتھ
دل ایسے شوخ کو مومن نے دیدیا کہ جو ہے — محب حسین کا اور دل رکھے ستمر کا سا

اس قسم کے اشعار سے یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ مومن ایک شیعہ خاتون پر بھی عاشق تھے ۔ لیکن اس سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا کہ یہ شیعہ خاتون آزاد کی عزیزہ یا امت الفاطمہ صاحب جی تھیں ۔ مومن نے " قول غمیں " میں صاحب جی کی داستان محبت کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے ۔ لیکن اس میں کہیں بھی صاحب جی کے عقاید پر کوئی بحث نہیں کی ۔ صرف ایک شعر میں ایک لفظ آیا ہے ۔ جس سے شبہ ہوتا ہے کہ امت الفاطمہ شیعہ تھیں ۔

منھ کو مومن سے چھپایا کافر — یہ تقیہ تو نہ بھایا کافر

لیکن امت الفاطمہ کو شیعہ ثابت کرنے کے لئے یہ دلیل کافی نہیں ہے اس لئے کہ مومن نے اپنی مثنویوں میں خاص طور پر مثنوی ، گریہ وزاری مظلوم میں جس محبوبہ کے شیعی عقائد کا ذکر کیا ہے اس کے متعلق یہ بات قطعاً واضح کر دی ہے کہ وہ صاحب جی کے علاوہ کوئی اور خاتون ہیں ایک شعر دیکھئے ۔

نہ تھے صاحب کہ نکلے ہیو قائم — کہو میں بھاگتا ہوں یا کہ تم

ایسی صورت میں امت الفاطمہ کو شیعہ خیال کرنا اور محض شیعت کی بنا پر انھیں آزاد کی عزیزہ تسلیم کرنا مشکل ہے ۔

مومن کی چوتھی مثنوی لعف آتشیں میں مومن کی جس نئی محبوبہ کا ذکر آیا ہے اس کے متعلق صرف اس قدر پتہ چلتا ہے کہ وہ انھیں کے ہم نسبوں اور ہم مذاقوں کے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں ۔

یعنی ہمارے ہم سبزوں میں — ہم نسبوں میں ہم گھروں میں
شادی اٹھی اک گھر میں شتابی — اس میں ہوئی یہ خرابہ خرابی
پردے سے اک آواز خوش آئی — جس نے یہ چپ ہے مجھ کو لگائی

یہاں اس بات کی طرف اشارہ تو موجود ہے کہ محبوبہ کسی شاعر یا ادیب کے یہاں شادی کی تقریب میں آئی ہوئی تھیں اور ممکن ہے کہ وہ رشتہ قرابت کی وجہ سے شادی میں آئی ہوں لیکن ان پر امت الفاطمہ یا آزاد کی عزیزہ کا گمان کرنا چاہئے کیونکہ مثنوی میں کوئی ایسا قرینہ موجود نہیں ہے ۔

پانچویں مثنوی حنین مغموم جیسا کہ ابتدا میں بتایا جا چکا ہے ۔ ایک نئے معاشقے کا ذکر معلوم ہوتا ہے لیکن مثنوی کے اس شعر سے

مضطرب رکھنے لگی آوارگی — صاحبی اور اس قدر بے چارگی

صاف اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں صاحب جی کے معاشقے کو از سر نو دوسرے پیرائے میں سنایا گیا ہے ۔

چھٹی مثنوی " گریہ وزاری مظلوم " میں بھی کوئی نئی داستان نہیں ہے ۔ اس مثنوی کے مطالعے سے اس بات کا یقین ضرور ہو جاتا ہے کہ مومن کے چار عشقیہ افسانوں میں سے کسی ایک کی ہیروئن کوئی شیعہ خاتون ضرور تھیں لیکن جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے اس شیعہ محبوبہ کو امت الفاطمہ یا آزاد کی عزیزہ خیال کرنا ہنوز تحقیق طلب ہے ۔

# مومن کا تغزل

(نظیر صدیقی)

مومن اردو کے ان خوش نصیب شاعروں میں سے ہیں جن کے ممتاز غزل گو ہونے پر تذکرہ نگاروں سے لے کر اس دور کے نقادوں تک کے درمیان دو رائیں نہیں ہیں۔ مومن کو غالب اور شیفتہ جیسے معاصرین نے بھی خراج تحسین ادا کیا تھا اور آج کے بھی اکثر اہل نظر ان کے بڑے مداح ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر مومن کے کلام کی قدر و قیمت متعین کرتے وقت عقیدت مندانہ مبالغہ آرائی اور طرفداری سے کام نہ لیا جائے ۔۔۔ تب بھی انکو اردو کے بڑے غزل گو شاعروں کی فہرست میں رکھنا ہی ہوگا۔ لیکن میں مومن کے تغزل کا قایل ہونے کے باوجود ان کے نقادوں سے اکثر مقامات پر متفق نہیں ہوں۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ مومن کے کلام کا جو حصہ ہمیشہ پرکیف و شاداب رہنے والا ہے اسکی طرف اب تک یا تو سرے سے توجہ نہیں کی گئی یا نگاہ غلط انداز کو کافی سمجھا گیا۔ اور جو اشعار وقت کے ہاتھوں اپنی آب و تاب کھو چکے اور کھو رہے ہیں ان کو مومن کا سرمایۂ کمال قرار دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ صرف ذوق و وجدان کے اختلاف کا نتیجہ ہے کہ مومن کے جو اشعار میرے نزدیک سدا بہار ہیں ان کی طرف دوسرے نقاد ملتفت نہ ہوسکے یا ان کو اتنا وقیع نہ سمجھ سکے جتنا کہ میں سمجھ رہا ہوں ــــ لیکن اگر تنقید صرف ذوق و وجدان کے فیصلے کا نام نہیں بلکہ اس میں غور و فکر اور تحلیل و تجزیہ کے نتائج بھی اہمیت رکھتے ہیں تو نامناسب نہ ہوگا اگر میں مومن پر اظہار خیال کے سلسلے میں ان کے نقادوں سے اپنے اختلافات کا بھی ذکر کروں۔

کلام مومن کی جو خصوصیت بڑے فخر کے ساتھ پیش کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ مومن نے غزل کو عشق و محبت کے جذبات و معاملات تک محدود رکھا اور اس طرح تغزل کی حدود سے متجاوز نہ ہوئے۔ بحث و تمحیص کے لئے اس مسئلہ میں بڑی جان ہے کہ عشق و محبت کے علاوہ دوسرے مضامین کو غزل کا موضوع بنانا مستحسن ہے یا نہیں۔ لیکن مجھے اس مسئلہ سے کوئی سروکار نہیں۔ یہاں دیکھنا صرف یہ ہے کہ مومن کے متعلق پروفیسر ضیا احمد بدایونی کا یہ دعویٰ کہ انھوں نے "غزل کو اس کے حقیقی مفہوم میں منحصر کر دیا"، یا معجز سہسوانی کا یہ قول کہ انھوں نے "جو کچھ کہا تغزل کے اندر ہی کہا" اور "عشق و محبت کے جذبات سے تمام دیوان کو مملو کر دیا" کس حد تک صحیح ہے اس امر کے جانچنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ تغزل کی حدوں سے انحراف کی کتنی صورتیں ممکن ہیں۔ ان میں سے ایک تو یہی ہے کہ غزل میں تصوف، اخلاق اور فلسفہ وغیرہ کے مضامین بیان کئے جائیں۔ جب مومن کے پرستار یا نقاد یہ کہتے ہیں کہ مومن نے غزل کو تمام بیگانہ اور اجنبی مضامین سے محفوظ رکھا تو ان کا مطلب صرف اتنا ہی ہوتا ہے کہ مومن کا کلام تصوف کے مضامین سے خالی ہے چنانچہ نیاز فتحپوری ایک جگہ لکھتے ہیں۔ "دوسری خصوصیت جو مومن کو اپنے دیگر ہم عصر شعراء سے ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ رنگ تغزل میں ان کا کلام اس غیر متغزلانہ چیز سے پاک ہے جس کو تصوف یا عشق حقیقی سے موسوم کیا جاتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ مومن نے تصوف اور فلسفہ کے مسائل کو ہاتھ نہیں لگایا۔ لیکن تغزل کی حدوں سے متجاوز ہونے کی جو دوسری صورت ہوسکتی ہے اس کی طرف مومن کے پرستاروں اور نقادوں کی نگاہ نہیں جاتی درانحالیکہ وہ چیز مومن کے یہاں موجود ہے۔ آپ بیتابی سے پوچھیں گے وہ کیا ہے؟ ـــ دوسری

صورت یہ ہے کہ غزل میں ایسے مضامین ادا کئے جائیں جو بظاہر حسن و محبت سے متعلق تو ضرور ہوں لیکن اگر ان پر غور کیا جائے تو وہ نہ صرف جذبات و محسوسات اور واردات و معاملات سے عاری ثابت ہوں بلکہ مفہوم و معنی سے بھی بیگانہ نکلیں۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں: ـ

خدا کرے ملک الموت ان سے پہلے آئے　　　بہت سی لینی ہیں جانیں پئے نثار مجھے

اس شعر میں ایک ایسے عاشقِ ہجراں نصیب کا ذکر ہے جو اپنی محبوبہ کی آمد کا منتظر ہے مگر اس کی آرزو یہ ہے کہ محبوبہ کے آنے سے پیشتر ملک الموت اس کے پاس روحوں کا پشتارہ لئے ہوئے آ جائے تاکہ محبوبہ پر نچھاور کرنے کے لئے بہت سی جانیں مستعار لی جا سکیں۔ اب ذرا سوچئے کہ کیا عاشقوں کے دماغ میں اسی قسم کے لایعنی خیالات پرورش پاتے رہتے ہیں کیا عشق و محبت میں دیوانگی کا مفہوم یہی ہے کہ عاشق ذہنی مجہولیت اور لغویت کی اس سطح پر اتر آئے؟ فرض کئے لیتا ہوں کہ جنون محبت کے زیر اثر انسان اس قسم کی باتیں بھی کر سکتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جب ایک طرف متصوفانہ مسائل و نکات کو غزل کے لئے اجنبی اور بیگانہ مضامین قرار دیا جا سکتا ہے تو دوسری طرف کسی مخبوط الحواس عاشق کی ہرزہ سرائی اور یاوہ گوئی کو غزل میں کیونکر روا رکھا جا سکتا ہے۔

گر پھر بھی اشک آئیں تو جانوں کہ عشق ہے　　　حقّے کا منھ سے غیر کی جانب دھواں نہ چھوڑ

بزم ناز کا کیا عجیب و غریب منظر پیش کیا گیا ہے۔ محبوب کے پاس عاشق اور رقیب دونوں بیٹھے ہوئے ہیں۔ محبوب جس کی خصوصیات جمیل میں حقّہ نوشی بھی ہے حقّے کا کش لے لے کر رقیب کے منھ پر دھواں چھوڑتا جاتا ہے۔ دھوئیں کے اثر سے رقیب کی آنکھوں میں آنسو نکل آتے ہیں۔ محبوب اس قدر سادہ لوح یعنی عقل و فہم سے بے بہرہ واقع ہوا ہے کہ رقیب کے ان آنسوؤں پر اسے محبت کا گمان ہونے لگتا ہے۔ حضرت عاشق محبوب کے اس گمان کو غلط ثابت کرنے کے لئے اس سے کہتے ہیں کہ تم رقیب کے منھ پر حقّے کا دھواں نہ چھوڑو۔ اگر اس کے بعد بھی اس کی آنکھوں میں آنسو نکل آئیں تو میں سمجھوں کہ اس کو واقعی تم سے محبت ہے۔ کیا بزم ناز کی یہ مضحکہ خیز تصویر جو شاعر کی خوش مذاقی، سلاست طبع اور لطافتِ ذوق کی دلیل ہے تغزل کے تحت آ سکتی ہے؟ کیا تغزل اور تمسخر ایک ہی چیز کے دو نام ہیں؟

ممکن ہے آپ یہ کہیں کہ تنقید میں کسی شاعر کے گھٹیا اشعار کو سامنے رکھ کر گفتگو کرنا مناسب نہیں۔ لہٰذا اب میں مومن کے وہ ایک ایسے شعر پیش کرتا ہوں جن کی تعریف میں ایک اہلِ نظر رطب اللسان ہیں: ـ

غیر عیادت سے بُرا مانتے ہیں　　　قتل کیا آن کے اچھا کیا

اثر لکھنوی اپنے مضمون میں اس شعر کے متعلق لکھتے ہیں: "دیکھئے ان سادہ الفاظ کے انداز بیان نے کس قدر معنی پیدا کئے ہیں۔ معشوق دراصل عاشقِ زار کو قتل کرنے آیا تھا جو انتہائے بیرحمی ہے گو معشوق کی شان یہی ہے۔ مگر ہائے عشق جو معشوق کے آنے کو عیادت پر محمول کرتا ہے اور قتل کو حیلۂ معشوق کا پردہ بتاتا ہے۔ اس کے ساتھ اظہار رشک کرتا ہے جو جان عاشقی ہے۔ کہتا ہے کہ دراصل میری عیادت کو آیا تھا مگر اسی کے ساتھ تجھے غیروں کا بھی پاس تھا اور اسی لئے کہ وہ بُرا نہ مانیں۔ ان کے سمجھانے کو تو نے مجھے قتل کر ڈالا تاکہ اب وہ عیادت کا شکوہ نہ کر سکیں بلکہ یہ سمجھیں کہ تو میری عیادت کو نہیں گیا بلکہ قتل کرنا مقصود تھا قافیہ "اچھا" سے ایک اور نازک مطلب پیدا ہوتا ہے۔ میں قتل ہوا اچھا ہوا۔ اب رقیبانِ بوالہوس اگر بیمار ہوں گے تو اپنی جان کے ڈر سے تجھ سے عیادت کے متمنی نہ ہوں گے بلکہ اسی دھڑکے میں مر جائیں گے کہ تو کہیں عیادت کے بہلانے سے آکر مار نہ ڈالے۔"

ایک اور مثال لے لیجئے :-

یہ جوشِ یاس تو دیکھو کہ اپنے قتل کے وقت　　　دعائے وصل نہ کی وقت تھا اثر کا سا

اثر لکھنوی لکھتے ہیں :- "جذبۂ یاس کی تصویر کس خوبی سے کھینچی ہے ۔ وصل سے مایوس ہو کر اپنے مرنے کی دعا مانگی جو اس طرح قبول ہوئی کہ معشوق قتل پر آمادہ ہو گیا جس کا لازمی نتیجہ قربِ قاتل و مقتول ہے ۔ اب وصل کوئی مشکل نہ تھا ۔ مگر جوشِ یاس نے دعائے وصل سے باز رکھا ورنہ دعائے مرگ کی طرح وہ بھی مستجاب ہوتی ۔"

مندرجۂ بالا دو مثالوں کے متعلق میں اپنی طرف سے کچھ بھی نہیں کہنا چاہتا ۔ اس محل پر نیاز فتحپوری اور پروفیسر ضیا احمد کے مضامین سے دو اقتباسات پیش کر دینا کافی سمجھتا ہوں تاکہ ان کی روشنی میں آپ خود فیصلہ کر لیں کہ متذکرہ اشعار تغزل کے منافی ہیں یا نہیں ۔ پروفیسر ضیا لکھتے ہیں :- "ہمارے خیال میں ایک غزل نگار کا یہ فرض ہونا چاہئے کہ غزل کی بنیاد صرف ان واردات پر رکھے جن کا تعلق جذبات عشق و محبت سے ہے ۔" نیاز صاحب لکھتے ہیں :- "تصوف کے حدود وہاں سے شروع ہوتے ہیں جہاں عقل کی پرواز ختم ہو جاتی ہے اور وہ فضا جو ماورا و سرحدِ عقل و شعور ہے ۔ اس کی وسعت کی کوئی انتہا نہیں یہاں تک کہ مجانین و مجاذیب کی باتیں بھی وہاں کوئی نہ کوئی مفہوم اختیار کر لیتی ہیں اس لئے میرے نزدیک تغزل میں تصوف کو شامل کر لینا ایک غزل گو شاعر کا کمال نہیں بلکہ اس کا عجز ہے ۔"

اب آپ دو باتوں پر غور فرمائیں اول تو یہ کہ مندرجۂ بالا شعروں میں مومن نے غزل نگار کا فرض کس حد تک ادا کیا ۔ دوسرے یہ کہ اگر غزل میں تصوف سے تعلق رکھنے والے مجانین و مجاذیب کی بے معنی باتوں کا بیان غیر مستحسن اور غزل گو شاعر کا عجز ہے تو پھر کسی عاشق کے بھی لایعنی خیالات کو تغزل کے منافی کیوں نہ قرار دیا جائے ؟ میں سمجھتا ہوں کہ یہ مسئلہ ان حضرات کی توجہ کا خاص طور پر مستحق ہے جن کا یہ خیال ہے کہ مومن نے غزل کو اس کے حقیقی مفہوم میں منحصر کر دیا ۔

میں نے اوپر کی سطروں میں مثال کے طور پر صرف چار شعر پیش کئے ہیں ۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ مومن کے دیوان میں مجھے مثال کے لئے صرف چار ہی شعر مل سکے ۔ واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کے اشعار سے دیوان مومن کا ایک بھی صفحہ خالی نہیں ۔

مومن کے تغزل سے متعلق پروفیسر ضیا کے دو ایک اور بیانات خصوصیت کے ساتھ محل نظر ہیں ۔ ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ مومن دنیا کو اپنی نسبت مغالطے میں رکھنا نہیں چاہتے کہ عشق کے جذبے سے ناآشنا ہوں اور بہ "ضرورت شعر" خود کو عاشق ظاہر کریں ۔ یا عشق مجازی کی منزل میں ہوں اور متصوف بنیں ۔ یہ صحیح ہے کہ مومن عشق کے جذبے سے ناآشنا نہیں تھے ۔ اس میں بھی کلام نہیں کہ انھوں نے نہ تو "حقیقت" کو "مجاز" کے پردے میں چھپایا اور نہ "مجاز" کو حقیقت تک پہونچنے کا بہانہ بنایا لیکن بایں ہمہ یہ واقعہ ہے کہ ان کے کلام کا کثیر حصہ "بہ ضرورت شعر" کہا گیا ہے نہ کہ اپنے تجربات و محسوسات کے اظہار کی غرض سے ۔ چنانچہ ان اشعار کے آئینہ میں جس عاشق کا عکس نظر آتا ہے وہ ان تمام خصوصیات کا مالک ہے اور اردو شاعری کے روایتی عاشق سے منسوب کئے جاتے ہیں اُردو شاعری کی سب سے بڑی بدنصیبی یہی تو رہی ہے کہ ہمارے شعراء نے عشق میں بہکنے کی جرأت کی ہو یا نہیں لیکن وہ عشقیہ شاعری میں بہکی بہکی باتیں ضرور کرتے ہیں ۔ انھوں نے محبت میں جو کچھ نہیں کیا اور نہ کیا جا سکتا ہے اس کے بیان میں سیکڑوں اشعار کہہ ڈالتے ہیں اور فی الواقع جو کچھ ان پر گزرتی ہے اسے اپنی شاعری میں بہت کم جگہ دیتے ہیں ۔

پروفیسر ضیا ایک جگہ لکھتے ہیں :- مومن کی شاعری اکثر اساتذۂ دہلی کی طرح تقریباً تمام تر داخلی ہے ۔ لکھنؤ کے شعراء خارجی متعلقات حسن و عشق پر زیادہ زور دیتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا کلام پھیکا اور بے اثر ہو کر رہ گیا ۔ اس کے برخلاف مومن

کے یہاں مضامین وصل، ہجر، رشک، رندی، جنون، نارسائی سب میں داخلی انداز نمایاں ہے "
جب کوئی شعر کسی جذبہ یا احساس پر مبنی ہوگا تو خواہ اس کا موضوع دنیا کی کوئی چیز ہو اس میں داخلی انداز یقیناً نمایاں ہوگا لیکن جب کسی شعر کی بنیاد تخیل کے ہوائی قلعوں پر ہوگی وہاں داخلیت کیا معنی، ڈھب کی خارجیت تک پیدا نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ مومن کے کلام کا نصف سے زاید حصہ ایسا ہے کہ داخلیت اور خارجیت کے اعتبار سے اس پر کوئی حکم لگایا ہی نہیں جا سکتا۔ لہٰذا پروفیسر ضیاء کا یہ خیال کہ مومن کی شاعری اکثر اساتذۂ دہلی کی طرح تقریباً تمام تر داخلی ہے۔ خوش عقیدگی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا مومن نے ہر چند کہ خارجی متعلقات حسن و عشق پر لکھنوی شعرا کی طرح زیادہ زور نہیں دیا پھر بھی ان کے کلام کے بیشتر حصے میں پھیکا پن اور تاثیر کی کمی ضرور ہے۔

موصوف نے اپنے مندرجۂ بالا دعویٰ کے اثبات میں چند شعر پیش کئے ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے :-

شبِ ہجر میں کیا ہجوم بلا ہے　　زباں تھک گئی مرحبا کہتے کہتے

باوجود انتہائی غور و فکر کے میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ شعر داخلیت کی مثال کے طور پر کیوں پیش کیا گیا۔ اگر اس شعر کے معنی یہ ہیں کہ شب فراق میں عاشق پر بلاؤں کا نزول ہوتا رہا اور ہر بلا کو خوش آمدید کہتے کہتے اس کی زبان تھک گئی تو ذرا سوچئے کہ یہ بات کیا ہوئی۔ آخر وہ کون سی حسین بلائیں تھیں جو یکے بعد دیگرے عاشق کو پیش آتی گئیں اور وہ بڑی کشادہ دلی اور خندہ پیشانی کے ساتھ ان کا خیر مقدم کرتا گیا۔ واقعات کی دنیا میں ہر عاشق شب فراق کی جانگداز اذیتوں سے پناہ مانگتا ہے۔ مگر یہ شعر جس عاشق کے حال کی ترجمانی کے لئے کہا گیا ہے اس کی بلند حوصلگی اور ضبط و تحمل کا کیا کہنا۔ واقعی سوز و گداز اور درد و اثر سے لبریز داخلیت کی اس سے بہتر مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔

جس طرح پروفیسر ضیاء اس بات کے دعویدار ہیں کہ مومن کی شاعری تمام تر داخلی ہے اسی طرح پروفیسر وقار عظیم کا دعویٰ ہے کہ "مومن اُردو کے تنہا غزل گو شاعر ہیں جن کے رنگِ تغزل میں ہر جگہ خلوص اور سچائی ہے۔" اس جملے کو پڑھ کر مجھے بے اختیار غالب کا یہ شعر یاد آگیا تھا ؎

نامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھئے　　ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے

لیکن اب جبکہ مومن پر مضمون لکھ رہا ہوں مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ وقار عظیم صاحب کے اس جملہ پر قلم کو انگشت بدنداں اور ناطقہ کو سر بگریباں چھوڑ کر آگے بڑھ جاؤں۔ قبل اس کے کہ وقار عظیم صاحب کی اس رائے عالیہ کے متعلق کچھ عرض کروں آپ ان کی چند سطریں اور ملاحظہ فرمالیں جن میں موصوف نے متذکرہ دعوے کی وضاحت کی ہے۔ لکھتے ہیں :- "یہ کہتے وقت کہ مومن اُردو کے تنہا غزل گو شاعر ہیں جن کے رنگِ تغزل میں ہر جگہ خلوص اور سچائی ہے میرے ذہن میں تغزل کا وہی مفہوم ہے جو عاشق محبوب اور رقیب کے مثلث میں گھرا ہوا ہے۔ غزلوں میں اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔ لیکن میں اسے تغزل نہیں کہتا اور اسی لئے یہ دعویٰ کرتے وقت میری نظر میں میرؔ، غالبؔ اور آتشؔ کی عظمت مومن کی غزلوں سے زیادہ ہے جس چیز کا نام تغزل ہے اس کی کمی میرؔ، غالبؔ اور آتشؔ کے یہاں بھی نہیں، بلکہ جیسا کہ میں نے ابھی کہا یہ تغزل اکثر صورتوں میں محض رسمی اور روایتی ہے۔ میرؔ، غالبؔ اور آتشؔ اپنی شاعرانہ پیمبری کے باوجود تغزل کو اکثر ان کی رسمی اور روایتی قیدوں سے باہر نہ نکال سکے۔ یہ کام سب سے پہلے مومن نے کیا اور اس طرح کیا کہ یہ ان کا رنگ خاص بن گیا۔ اس میں ان کا کوئی شریک نہیں۔ مومن کی غزلوں میں عشق کی داستان گل اور بلبل، شمع اور پروانے، ساقی اور بادہ کی زبان سے بیان نہیں کی گئی۔ ان کی

رشک پسند طبیعت کو گوارا نہ تھا کہ اپنے عشق کی کہانی ان پیامیوں کی زبانی دوسروں تک پہنچائیں اور اس لئے چند گنے چنے شعروں کو چھوڑ کر جن میں یہ اشارے برائے نام موجود ہیں (ان کے اچھے شعروں میں یہ بات نہیں) مومن کی غزلیں ان روایتی اشاروں سے بالکل پاک ہیں "

اس اقتباس کا غور سے مطالعہ کرنے پر دو نتیجے نکلتے ہیں۔ اوّل تو یہ کہ اگرچہ وقار عظیم صاحب نے دعویٰ تو یہ کیا ہے کہ مومن کے رنگ تغزل میں ہر جگہ خلوص اور سچائی ہے لیکن " ہر جگہ " سے ان کی مراد مومن کا پورا کلام نہیں بلکہ صرف اچھے اشعار ہیں۔ دوسرے یہ کہ " خلوص اور سچائی " سے ان کا مطلب یہ ہے کہ مومن نے اپنی غزلوں (بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ اپنے اچھے اشعار) کو گل و بلبل ۔ شمع و پروانہ ، اور بادۂ و ساقی جیسے روایتی اشاروں سے پاک رکھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر کسی شاعر کے اچھے اشعار میں بھی خلوص اور صداقت کے عناصر نہ ہوں گے تو اور کہاں ہوں گے ۔

دوسرے یہ کہ اگر کوئی شاعر غزل کے چند روایتی علامات و استعارات کو بر سر کار نہ لائے تو اس سے یہ کیونکر لازم آتا ہے کہ اس کی شاعری سرتاسر خلوص اور صداقت پر مبنی ہے۔ خلوص اور صداقت کا اتنا محدود بلکہ غلط تصور شاید ہی دنیائے ادب میں اب تک کسی نے پیش کیا ہو یہ بالکل ممکن ہے کہ چند رسمی و روایتی اشاروں سے دامن چھڑا لینے کے باوجود ایک شاعر کے کلام کا بیشتر حصہ خلوص اور صداقت سے خالی رہ جائے۔ اس خیال کی تصدیق کے لئے خود مومن کے دیوان کا دیانتداری کے ساتھ مطالعہ کر لیجئے پھر یہ بھی ناممکن نہیں کہ رسمی علامات و استعارات سے کام لینے کے باوجود خلوص اور صداقت کا سر رشتہ شاعر کے ہاتھ میں رہ گیا ہو۔ ثبوت کے لئے چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

بُلبُل ہوں صحن باغ سے دور اور شکستہ پر　　پروانہ ہوں چراغ سے دور اور شکستہ پر　　(ذوقؔ)
باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے　　جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے　　(ثاقبؔ)
خزاں کیا فصل گل کہتے ہیں کس کو کوئی موسم ہو　　وہی ہم ہیں قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے　　(غالبؔ)
تھا آفتِ جاں اس کا اندازِ کماں داری　　ہم بچ کے کہاں جاتے گر تیر خطا ہوتا　　(حالیؔ)
کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل　　کل نہ پہچان سکے گی گلِ تر کی صورت　　(حالیؔ)

خوفِ طوالت زیادہ مثالیں دینے میں مانع ہے۔ ان میں سے ایک بھی شعر ایسا نہیں جو روایتی اشاروں سے پاک ہو۔ پھر بھی ان اشعار کے خلوص اور صداقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ممکن ہی نہیں کہ آپ ان میں سے کوئی بھی شعر کسی بھی صاحب ذوق کے سامنے پڑھیں اور وہ اس کے دل میں نشتر کی طرح اُتر نہ جائے ۔ لہٰذا اگر ان اشعار کو خلوص اور صداقت سے بیگانہ مان لیا جائے تو یہ بتانا ممکن نہ ہوگا کہ ان میں دل کے تاروں کو چھو لینے والی کیفیت کہاں سے آئی۔ غرض کہ بعض اوقات " بادہ و ساغر " کے پردے بھی خلوص اور صداقت کو مجروح نہیں کرتے ۔ دراصل کلام میں خلوص اور صداقت کا پیدا ہونا محض روایتی علامات و اشارات کے عدم استعمال پر منحصر نہیں اس کے لئے ضروری یہ ہے کہ شعر حقیقی جذبات اور سچے تجربات کی ترجمانی کے لئے کہا جائے نہ کہ تخیل کی بلند پروازی اور مینا کاری دکھلانے کی غرض سے ۔ مومن کے اچھے اشعار کے متعلق خلوص اور صداقت کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا مگر چونکہ ان کے بیشتر کلام میں بے راہ روتخیل کی کارفرمائی زیادہ ہے اس لئے ہر دیانتدار نقاد پر یہ اعتراف واجب ہے کہ مومن کے زیادہ تر اشعار خلوص اور صداقت سے معرا ہیں ۔

وقار عظیم صاحب متذکرہ بالا دعویٰ کو مضبوط بنانے کے لئے ایک بڑے پتے کی بات کہہ گئے ہیں آپ بھی اس سے لطف اندوز ہوتے

چلیں۔ فرماتے ہیں، "ہمارے غزلوں کے صدہا دیوانوں میں تغزل کی جو شوخیاں، رنگینیاں اور درد اور سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی جو تاثیر اور تڑپ ہے اس میں خلوص بہت کم جگہ ہے،" میں سمجھتا ہوں کہ تناقص ( Self contradiction ) کی اس سے بہتر مثال ڈھونڈے نہیں مل سکتی۔

یہ کتنی عجیب ہے کہ ایک طرف تو وقار عظیم صاحب اس بات پر زور دیتے ہیں کہ سب سے پہلے مومن نے تغزل کو رسمی اور روایتی قیود سے باہر نکالا اور دوسری طرف وہ مومن کے ان اشعار پر سر دھنتے نظر آتے ہیں ؎

پشیماں آئے ہیں وہ لاش پر اب — تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے
موئے آغاز الفت میں ہم افسوس — اسے بھی رہ گئی حسرت جفا کی
تا نہ پڑے خلل کہیں آپ کے خواب ناز میں — ہم نہیں چاہتے کمی اپنی شب دراز میں

کیا تغزل کی رسمی اور روایتی قیدیں محض گل و بلبل، شمع و پروانہ اور ساقی و بادہ کے چند الفاظ تک محدود ہیں کیا محبوب کا عاشق کی لاش پر آنا اور عاشق کا مرنے کے بعد بھی محبوب کی پشیمانی دیکھ سکنا اور یہ تمنا کرنا کہ "تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے" یا کسی عاشق کا آغاز الفت میں مر جانا اور مر جانے کے باوجود اپنے دل میں یہ خلش محسوس کرنا کہ "اسے بھی رہ گئی حسرت جفا کی" رسمی اور روایتی باتیں نہیں ہیں؟ کیا مومن کا یہ کہنا کہ چونکہ وہ اپنے محبوب کے خواب ناز میں خلل اندازی پسند نہیں کرتے لہٰذا اپنی "شب دراز" میں کمی نہیں چاہتے محض ادعائے شاعرانہ نہیں ہے؟ ـ مندرجہ بالا آخری شعر کے متعلق نیاز فتحپوری کی ایک دلچسپ عبارت یاد آگئی۔ فرماتے ہیں "مومن کا عشق باوجود مادی ہونے کے اس درجہ بلند فتادگی رکھتا ہے کہ وہ اپنی ہر ناکامی کا شکار خود ہی بننا پسند کرتے ہیں اور محبوب سے کوئی مطالبہ ایسا نہیں کرتے جو شانِ عاشقی و محبوبی کے خلاف ہو۔ زمان ہجراں میں عاشقوں اور شاعروں کا واویلا خاص چیز ہے۔ لیکن مومن کا ذوق اس باب میں یہ ہے ؎

تا نہ پڑے خلل کہیں آپ کے خوابِ ناز میں — ہم نہیں چاہتے کمی اپنی شبِ دراز میں

اب یہ نیاز صاحب سے کون کہے کہ حضرت! ایک ایسا شخص جس کو صحیح معنی میں عاشق کہہ سکیں، جس کے دل میں واقعی محبت کی تڑپ ہو کبھی اس بات کی تمنا نہیں کر سکتا کہ جدائی کی رات جس کا ایک ایک لمحہ اس کو پہاڑ معلوم ہوتا ہے جلد سے جلد سحر میں تبدیل نہ ہو جائے اور اس لحاظ سے مومن کا وہ ذوقِ بلند جو متذکرہ شعر سے ظاہر ہوتا ہے ایک شاعرانہ ڈینگ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ اسکے برعکس "زمانِ ہجراں میں عاشقوں یا شاعروں کا واویلا" انسانی فطرت کا صحیح اظہار ہے۔ عشق و محبت میں عقل کے مطالبات دل کے تقاضوں پر غالب نہیں آتے۔ وہاں دل کی مجبوریاں دماغ کی وضعداریوں سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں غالب جیسے انانیت پسند شاعر کو بھی آخر کار کہنا ہی پڑا ؎

پھر وضعِ احتیاط سے رکنے لگا ہے دم — برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کئے ہوئے
دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے — پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے

مومن کی جس خصوصیت پر تذکرہ نگاروں، اُردو ادب کے مورخوں اور نقادوں نے سب سے زیادہ زور دیا ہے وہ ان کی نازک خیالی اور معنی آفرینی ہے۔ چنانچہ اردو شاعری میں جس طرح میر اپنے سوز و گداز، درد اپنے متصوفانہ رنگ اور غالب اپنے مفکرانہ انداز کے لئے ضرب المثل ہیں اسی طرح مومن بھی اپنی نازک خیالی اور معنی آفرینی کے لئے خاص طور پر مشہور ہیں۔ مومن کو خود بھی اپنی خصوصیت پر ناز تھا ؎

اگرچہ شعر مومن بھی نہایت خوب کہتا ہے　　　کہاں ہے لیک معنی بند و مضمون یاب اپنا سا

مومن پر لکھنے والوں نے ان کی معنی بندی و مضمون یابی، دقیقہ سنجی و بلند پردازی، نازک خیالی و معنی آفرینی کی داد جن بلند آہنگ الفاظ میں دی ہے وہ پڑھنے والوں کو مرعوب کر دیتے ہیں لیکن اس باب میں انھوں نے جو مثالیں پیش کی ہیں ان کو دیکھ کر ایک سوچنے سمجھنے والا دماغ یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ غزل سے متعلق اصطلاحات میں نازک خیالی اور مضمون آفرینی سے زیادہ خوش آہنگ مگر پر فریب اور دھوکے باز اصطلاح شاید ہی کوئی اور ہو۔ اگر آپ سے کہا جائے کہ فلاں شاعر خرافات و مُہملات کا بادشاہ ہے۔ اس کے کلام میں تخیل کی بے اعتدالیاں اور گمراہیاں نقطۂ عروج پر نظر آتی ہیں تو مجھے یقین ہے کہ آپ اس کے کلام کو ذرا بھی لائق التفات نہ سمجھیں گے لیکن اگر انھیں خصوصیات کو یوں بیان کر دیا جائے کہ وہ شاعر نازک خیالی اور معنی آفرینی میں اپنا جواب نہیں رکھتا تو آپ نہ صرف اس کے کلام کے متعلق بلند رائے قائم کریں گے بلکہ اس کے سامنے سرِ عقیدت بھی خم کر دیں گے۔ حالانکہ یہ دونوں باتیں نفس حقیقت کے اعتبار سے ایک ہی ہیں۔ ثبوت کے لئے مومن کی نازک خیالی اور معنی آفرینی کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔ اس ضمن میں میں صرف وہی اشعار پیش کروں گا جو مومن پرست قسم کے ارباب قلم نے پیش کئے ہیں تاکہ آپ یہ نہ کہہ سکیں کہ میں نے مثالوں کے انتخاب میں نیک نیتی سے کام نہیں لیا۔ سب سے پہلے پروفیسر ضیاء کی منتخب کردہ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

کرۂ خاک ہے گردش میں تپش سے میری　　　میں وہ مجنوں ہوں کہ زنداں میں بھی آزاد رہا

اس شعر کے معنی بھی موصوف ہی کے الفاظ میں سن لیجئے۔ لکھتے ہیں: ”مجھے حالتِ اسیری میں بھی آزادی میسر ہے۔ اس واسطے کہ جب میں زنداں میں تڑپتا ہوں تو میری تپش کے اثر سے تمام کرۂ زمین گردش کرنے لگتا ہے اور اس کے ساتھ میں بھی گردش کرنے لگتا ہوں۔ اب آزادی کے لئے اور کیا چاہیے۔“

اگر قدرت نے آپ کو فہم عامہ کا تھوڑا سا بھی حصہ عطا کیا ہے تو غور فرمایئے کہ اس شعر میں کونسی بات ایسی ہے جس کی بنا پر اس کو مہمل نہ کہا جا سکے۔ دعویٰ یہ ہے کہ میں زنداں میں آزاد رہا۔ دلیل یہ ہے کہ جب میں تڑپتا ہوں تو میری تپش کے اثر سے تمام کرۂ زمین گردش کرنے لگتا ہے اور اس کے ساتھ میں بھی گردش کرنے لگتا ہوں۔ یعنی ایک لغو دعوے کو لغو تر دلیل سے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اسی کا نام ہے نازک خیالی و معنی آفرینی۔ غالباً ایسے ہی موقع کے لئے کہا گیا ہے۔ برعکس نہند نام زنگی کافور۔

یادش بخیر۔ جناب اثر لکھنوی نے اس شعر کو ایک اور نقطۂ نظر سے سراہا ہے لکھتے ہیں: ”شعر نہیں ایک کارنامہ ہے۔ پہلا مصرع بندش اور بلاغت کے لحاظ سے اپنا جواب نہیں رکھتا۔ ایک تو اس زمانے میں جب کہ دنیائے شاعری گردش فلکی کی قائل تھی (میں یہ نہیں کہتا کہ گردش ارضی سے واقف نہیں تھی) ۶

”کرۂ خاک ہے گردش میں تپش سے میری“

کہنا اختراع فائقہ ہے۔ مجھے علم نہیں ممکن ہے کہ اوروں نے بھی کہا ہو مگر تپش عشق کو گردشِ ارضی کا سبب قرار دینا شاعری کی وہ منزلیں ہیں جن کے خیال سے بڑے بڑوں کے حوصلے پست ہو گئے ہوں گے۔“ قربان جایئے اس نکتہ سنجی و سخن فہمی کے جس کی بدولت ایک لایعنی شعر ایک کارنامہ اور اختراع فائقہ کے مرتبے کو پہونچ گیا۔ خواجہ حافظؔ نے حسرت آگیں لہجے میں پوچھا تھا:

آنا نکہ خاک را بہ نظر کیمیا کنند　　　آیا بود کہ گوشۂ چشمے بہ ما کنند؟

معلوم نہیں کہ ان کی تمنا پوری ہو سکی یا نہیں لیکن مومن کے بارے میں شک نہیں کہ ان کو اس دور میں ایک ایسا اہل نظر

مل ہی گیا جس کی توجہ نے اُن کی "خاک" کو "کیمیا" بنانے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ کاش اثر صاحب سمجھ سکتے کہ مومن کا مندرجہ بالا شعر یا اسی قسم کے اور اشعار کہنے کے لئے حوصلہ کی بلندی قطعی ضروری نہیں صرف "ذوقِ فضول" کا ہونا کافی ہے۔

مومن:۔ دیکھ اپنا حالِ زار منجم ہوا رقیب تھا سازگار طالع ناساز دیکھنا

پروفیسر ضیاؔ کے الفاظ میں اس کے معنی یہ ہیں:۔ "منجم نے شاعر کا حالِ زار دیکھا اور تاثیر نجوم کے حساب سے اسکی ناکامیِ عشق کا پتہ لگا لیا اور خود اس کا رقیب بن بیٹھا کیونکہ عاشق کی ناکامی دریافت کرکے اس کو اپنی کامرانی کی توقعات پیدا ہوئیں اس طرح اس کا طالع ناساز دیکھنا منجم کے حق میں سازگار ہوا۔"

دنیا صدیوں سے اس غلط فہمی میں مبتلا تھی کہ محبت ایک قسم کا جذبۂ بے اختیار ہے اس ضمن میں مومن کی تحقیق کچھ اور نکلی چنانچہ انھوں نے دنیا کی صدیوں پرانی غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے مندرجہ بالا شعر تصنیف کیا اور بتایا کہ عشق کسی خود رو جذبہ کا نام نہیں۔ اس میں مصلحت نوازی، دور اندیشی اور عاقبت بینی کو اتنا ہی دخل ہے جتنا کہ سیاست اور تجارت میں۔ جب تک کسی کو اس بات کی قوی امید نہ ہو کہ وہ فلاں سے عشق کرنے میں کامیاب ہوگا اس وقت تک وہ اس کام میں ہاتھ نہیں لگاتا اور جس طرح ایک بنیا تجارت میں صحیح (Speculation) کی مدد سے نسبتاً زیادہ منافع حاصل کرسکتا ہے اسی طرح ایک منجم عشق کے معاملے میں اپنے علم نجوم سے نسبتاً زیادہ فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ غالباً اسی قسم کے اکتشافات جدیدہ کا نام نازک خیالی اور معنی آفرینی ہے۔

مومن ؎ پامال اک نظر میں قرار و ثبات ہے اس کا نہ دیکھنا نگہِ التفات ہے

پروفیسر ضیاؔ کی تشریح:۔ "محبوب کا میری طرف نہ دیکھنا بھی نگہ التفات کا حکم رکھتا ہے کیونکہ اگر وہ اِدھر دیکھتا تو میرا قرار و ثبات پامال ہو جاتا۔"

اس عالمِ آب و گل میں جب کوئی انسان کسی سے محبت کرتا ہے تو اس وقت تک بے قرار اور مضطرب رہتا ہے۔ جب تک محبوب اس کی طرف ملتفت نہیں ہوتا۔ عاشق کی طرف محبوب کا التفات اس کی بے قراری اور بے چینی میں تسکین کا باعث ہوتا ہے نہ کہ اس کا رہا سہا صبر و قرار پامال ہو جاتا ہے لیکن مومن کا تجربہ ٹھیک اس کے برعکس ہے۔ اور کیوں نہ ہو بقول مومن ؏ "ہم لٹے، بات اُلٹی یار اُلٹا" یہ یار اُلٹا ہو یا نہ ہو لیکن باقی دو کا اُلٹا ہونا یقینی ہے۔

مومن ؎ بیزار جان سے جو نہ ہوتے تو مانگتے شاہد شکایتوں پہ تری مدعی سے ہم

"مدعی (رقیب) نے معشوق سے کہا کہ عاشق (مومن) تمھاری شکایتیں کرتا پھرتا ہے۔ اس پر معشوق آمادہ قتل ہو گیا، عاشق کہتا ہے کہ مدعی کا الزام جھوٹا ہے اور اگر میں خود جان سے بیزار نہ ہوتا تو اس ناکردہ جرم کے مواخذہ سے بچنے کے لئے اس سے ضرور گواہ طلب کرتا۔ لیکن میں تو خود مشتاق قتل ہوں۔"

آپ خود فیصلہ کرلیں کہ یہ مضمون تخیل کی نزاکت ہے یا خرافیت! معنی آفرینی ہے یا مہمل طرازی؟

مومن ؎ عدو اس اوج پر شاکی ہے شاید غصہ آ جائے ملا دے خاک میں یہ تو بھی شکر آسماں کیجے

پروفیسر ضیاؔ کی تشریح:۔ "اگر آسماں مجھے خاک میں بھی ملا دے تو بھی مجھے چاہئے کہ اس کے ظلم پر شکر کرتا رہوں۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ اس (آسماں) کی عادت بگڑ جائے گی۔ اور وہ اس شکر کو اپنا حق سمجھنے لگے گا۔ ادھر رقیب کا یہ حال ہے کہ اس اوج کے باوجود آسمان کی شکایت کرتا رہتا ہے اور بالآخر کسی دن آسمان شکایت پر بگڑ کر اس کو نیچا دکھائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ آسمان تو مجھ ستم زدہ

کی شکر گزاری کا خوگر ہوگا ۔ رقیب کی شکوہ سنجی (اوج کے باوجود) اس کو برہم کردے گی ۔"

اگر کوئی عاشق اس قسم کے خیالات کا اظہار اپنے کسی رازدار یا غمگسار سے بھی کرے تو مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی تمام ترہمدردی کے باوجود اس قسم کی باتوں کو معاف نہ کرسکے گا اور بے اختیار کہہ اٹھے گا " یہ کیا بکواس ہے!" لیکن جب کوئی شاعر اسی بکواس کو دو مصرعوں کی شکل میں پیش کردیتا ہے تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے ارباب نقد و نظر تک اس بکواس کو نازک خیالی اور معنی آفرینی سے کیوں تعبیر کرنے لگتے ہیں ۔

پروفیسر ضیا ؔ نے اپنے مرتب کردہ " دیوان مومن " کے مقدمے میں نازک خیالی اور معنی آفرینی کے عنوان کے تحت اور بھی کئی اشعار پیش کئے ہیں ۔ جن سے بخوف طوالت میں صرف نظر کئے لیتا ہوں اور بعض دوسرے ارباب قلم کی پیش کردہ مثالوں سے بحث کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہوں تاکہ یہ بات واضح ہوجائے کہ مومن کے لایعنی اشعار پر نازک خیالی اور معنی آفرینی کا دھوکا صرف پروفیسر ضیا ؔ ہی کو نہیں ہوا بلکہ دوسروں کو بھی ۔

مومن کے پرستاروں میں ایک صاحب ہیں متجز سہسوانی ۔ انھوں نے "مومن و غالب" کے نام سے ایک چھوٹی سی کتاب لکھی ہے ۔ جس میں نازک خیالی اور معنی آفرینی کے اعتبار سے مومن و غالب کا موازنہ کرکے مومن کو غالب سے برتر شاعر ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے یہاں اس کے موازنہ سے کوئی بحث نہیں ۔ میں اس میں سے مومن کے صرف دو تین ایسے اشعار لیتا ہوں جن کی نزاکت تخیل اور معنی آفرینی پر جناب متجز لوٹ ہیں ۔

مومن ؎ دیکھا ادھر کو تو نے کہ بس دم نکل گیا اترے نظر سے اپنی نگہبانیوں میں ہم

جناب متجز لکھتے ہیں :۔ " یعنی معشوق[1] کا کسی کی طرف دیکھنا ہم کو گوارا نہیں ہے ۔ یہاں تک کہ اپنی جانب بھی اور جس کی طرف وہ دیکھتا وہی ہم کو اپنا دشمن نظر آتا ہے ۔ اس وجہ سے جب اس نے ہماری جانب دیکھا تو ہم خود اپنی نظر سے اتر گئے یہ ہماری نگہبانی کا نتیجہ نکلا ۔ اس تخیل کی نزاکت قابل تحسین ہے ۔"

عام قاعدہ تو یہی ہے کہ جذبۂ رشک کی بنا پر عاشق کو محبوب کا کسی اور کی طرف دیکھنا گوارا نہیں ہوتا لیکن مومن جو عشق کے معاملے میں بھی صاحب طرز واقع ہوئے تھے انھیں یہ گوارہ نہ تھا کہ محبوب خود ان کی طرف دیکھے ۔ بدقسمتی یا سوء اتفاق سے ایک مرتبہ ان پر محبوب کی نگاہ پڑ ہی گئی ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اور رقیبوں کی طرح مومن خود بھی اپنی نظر سے اتر گئے ۔ خیر یہ تو جو ہونا تھا سو ہوا ۔ زندگی میں بے تکے واقعات بھی وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں ۔ لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ جب مومن نے اس بے تکے واقعہ کو نظم کردیا تو اس میں تخیل کی نزاکت کہاں سے پیدا ہوگئی ۔

مومن :۔ دعا بلا تھی شب غم سکون جاں کے لئے سخن بہانہ ہوا مرگ ناگہاں کے لئے

جناب متجز لکھتے ہیں :۔ مومن خاں کا یہ ) شعر دقیق و کثیر المعنی ہے ۔ یعنی ہم نے ۔ یعنی ہم نے شب غم سکون جاں کے لئے جو دعا مانگی وہ مرگ ناگہاں کے لئے بہانہ ہوگئی اور اس نے آکر قصہ فیصل کردیا ۔ یا یہ کہ دعا مانگنے میں ضعف سے روح پرواز کرگئی اور یہ پہلو بھی درست ہے کہ موت خود ہی آنے والی تھی ۔ دعا کا ایک بہانہ ہوگیا ۔ حاصل تمام معانی کا ایک ہے ۔ اس بلاغت کا جواب نہیں ہوسکتا ۔"

---

[1] پروفیسر ضیا ؔ کی تشریح متجز صاحب کے بیان کردہ مطلب سے مختلف ہے ۔ لیکن ان دونوں کے درمیان میر اتصفیہ کرانا میرا کام نہیں ۔

یوں تو اس شعر میں بے مزہ مبالغے کے سوا کچھ بھی نہیں لیکن اگر کوئی شخص جناب معجز کی سی بصارت و بصیرت کا مالک ہو تو وہ اس میں خیال کی دقت، معنی کی کثرت، طرزِ ادا کی بلاغت غرض کیا کچھ نہیں دیکھ سکتا ؟ ۔

اب مومن کے دو ایک ایسے شعر ملاحظہ ہوں جن کی نازک خیالی اور معنی آفرینی نے جناب آسی لکھنوی سے خراجِ تحسین وصول کیا ہے ۔

مومن ؎ تیری جفا ہو تو ہے سب دشمنوں سے امن
بدمست غیر، محو دل، اور بخت خواب میں

جناب آسی لکھتے ہیں :- "...... غیر اس وقت شراب عیش سے بدمست ہے۔ میرا دل محو ہو کر رہ گیا ہے۔ میرا نصیب محو خواب ہے۔ اگر ایسے میں تو بھی جفا سے باز آجائے تو مجھے تمام دشمنوں سے نجات مل جائے۔ تغزل کی حد میں ایسی مضمون آفرینی اور اسی کے ساتھ بیان میں شگفتگی مومن ہی کا حصہ تھا ۔"

یہ شعر مومن کی زندگی کے ایک خاص لمحے کی یادگار ہے۔ حسنِ اتفاق سے اس وقت رقیب شراب پی کر بدمست ہو گیا تھا اور مومن کو اس کی ستم رانیوں سے نجات مل گئی تھی۔ اِدھر ان کی پر آشوب قسمت (زیرِ بحث شعر کا ایک اہم نقص یہ ہے کہ "بخت خواب میں" کا مفہوم وہ نہیں جو مومن کا مقصود ہے۔ بخت خواب میں ہونا بدبختی کی علامت ہے نہ کہ خوش نصیبی کی) بھی سو رہی تھی ۔ صرف محبوب کے مظالم کی مشین بدستور چل رہی تھی اور اگرچہ اس وقت مومن کا دل بھی محو ہو کر رہ گیا تھا۔ پھر بھی مومن کو تکلیف ہو رہی تھی کیونکہ محبوب کے مظالم دل کی بجائے ان کے اعصاب پر اثر انداز ہو رہے تھے۔ چنانچہ انھوں نے بیتاب ہو کر فرمایا ؎

تری جفا نہ ہو تو ہے سب دشمنوں سے امن
بدمست غیر، محو دل، اور بخت خواب میں

اب ایک آخری مثال پیش کرتا ہوں جو مومن کے ایک نقاد سید امتیاز احمد کا انتخاب ہے ۔

مومن ؎ لذتِ مرگ سے بچوں میں دعا ہے کہ خدا
یہ مزا ہو نہ نصیبوں میں کسی بے حس کے

امتیاز صاحب لکھتے ہیں :- "بے حس لذتِ مرگ سے کیا خاک لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ اسے مومن ہی کے لئے مخصوص ہونا چاہئے۔ نیش کو نوش بنانا شاعر کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ مومن کی تخیل کو دیکھئے۔ کہتا ہے ظاہر ہے کہ عدو کو نہ کبھی ہجر کی مصیبت اٹھانا پڑے گی نہ اس کے صدموں سے کبھی مرنا ہوگا۔ یہ شرف تو صرف عاشقِ صادق کی قسمت میں لکھا ہے۔ جب یہی ہونا ہے تو کیوں نہ مرگ کو شربت بنا کر اس طرح پیو کہ ایک بار تو رقیب کو بھی رشک ہو جائے۔ یہ مومن کی وہ پروازِ تخیل ہے جس کے متعلق غلام ربانی عزیز کا خیال ہے کہ ان بلندیوں پر غالب ایسے سدرہ نشین کے پر جلنے لگتے ہیں ۔"

امتیاز صاحب کا یہ کہنا صحیح ہے کہ "نیش کو نوش بنانا شاعر کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے"۔ لیکن یہ بھی غلط نہیں کہ شاعر جب بائیں ہاتھ کا کھیل دکھانے پر اتر آتا ہے یا تخیل کے زور سے آسمان پر چڑھنے لگتا ہے اس وقت وہ اور جو کچھ بھی رہے شاعر باقی نہیں رہتا اور اس عالم میں جو کچھ کہتا ہے اسے شعر کہنا بھی ایک وجدانی جرم ہے ۔

یہ صحیح ہے کہ نازک خیالی اور مضمون آفرینی کی آڑ میں "اناپ شناپ فرمانے" کے گنہگار تنہا مومن نہیں ہیں۔ دراصل یہ ایک مستقل روایت ہے جو اردو شاعری کو فارسی شاعری سے بطور وراثت ملی۔ اس غیر صحت مند روایت سے فارسی و اردو شاعری میں بڑے بڑوں کے دامن داغدار ہیں۔ یہ دونوں زبانوں کی انتہائی بدنصیبی تھی کہ ان کے اساتذہ سخن اس مفروضہ روایت کے شکار ہو گئے۔ لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس روایت کے نتائج کو تعریف و تحسین کا مستحق ٹھہرا کر اور ان کو اپنے اساتذہ سخن کا سب سے بڑا کمال قرار دے کر دوسری غلطی ہم کیوں کریں ؟

آپ مومن کی نازک خیالی اور معنی آفرینی کی چند مثالیں دیکھ چکے ۔ ان کے دیوان میں اسی قسم کے اشعار کی کثرت ہے ۔ اس کے باوجود مومن کے بعض پرستاروں مثلاً جناب متجز کا دعویٰ ہے کہ مومن کا " ہر شعر دقیق معنی اور لطیف احساس کا ایک طلسم ہے اور پروفیسر ضیاء کے نزدیک مومن حسنِ تخیل کے اعتبار سے یوسف مصر معانی کہے جانے کے مستحق ہیں " لیکن جب دورِ حاضر کا ذوقِ شعری مومن کے ان اشعار کو صحیح شاعری کے دائرے سے خارج قرار دیتا ہے تو مومن کے پرستار بعض ادبی نظریات کے دامن میں پناہ لینے کی کوشش کرتے ہیں ۔ مثلاً جب پروفیسر کلیم الدین احمد نے مومن پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا کہ " مومن کی نازک خیالی اور بدیع الاسلوبی مسلّم ۔ مگر یہ صحیح شاعری نہیں ۔ کیونکہ اول الذکر تاثیر سے مہجور ہے اور آخر الذکر تصنع سے معمور " تو پروفیسر ضیاء نے جواب میں دو ادبی نظریات کا سہارا لیتے ہوئے فرمایا ۔

" جب ہم اچھے شعر کے لئے صداقت کی شرط لگاتے ہیں تو ہمارا مقصود سادہ اور سپاٹ حقیقت کا اظہار نہیں ہوتا ورنہ دندان تو جملہ در دہانند ، چشمان تو زیر ابروآنند ، کو بھی شعر ماننا پڑے گا ۔ بات یہ ہے کہ شعری حقیقت اور سائنٹفک حقیقت میں آسمان و زمین کا فرق ہے ۔ شعر میں حقیقت اس زاویے سے بیان کی جاتی ہے جس سے شاعر کا ذہن اسے محسوس کرتا ہے ۔ اس کے برخلاف سائنس کا نصب العین حقیقت نفس الامری کا اظہار ہے ۔ ایک کا نقطۂ نظر موضوعی ، داخلی اور جذباتی ہے ۔ دوسرے کا معروضی ، خارجی اور عقلی ۔ ایک تخلیق حسن کا ضامن ہے ۔ دوسرا اضافۂ معلومات کا ....... "

" اولاً ان ( مومن ) کے خیالات کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہر خیال حسب معمول جذبات اور تخیل کے امتزاج کا نتیجہ ہے دوسرے الفاظ میں انھوں نے واردات محبت کی جو ترجمانی کی ہے اس کا تعلق جذبات سے ہے جن میں ان کے تخیل نے اپنا رنگ بھر دیا ہے ۔ یا یوں کہئے اپنے جذباتی تجربات کو انھوں نے اپنے تخیل کی رنگین عینک سے دیکھا ہے ۔ جذبات کی اصلیت و صداقت کی بحث اوپر گزری ۔ رہی تخیل ۔ یہ دراصل قوت اختراع کا نام ہے جس کے بغیر شعر شعر نہیں کہلاتا "

شاعرانہ حقیقت اور حکیمانہ حقیقت کا فرق مسلّم ۔ لیکن اس بحث سے کلیم صاحب کے اعتراض کی تردید ممکن نہیں ۔ اگر ایک طرف دندان تو جملہ در دہانند چشمان تو زیر ابروآنند والی حقیقت کسی شعر کا موضوع نہیں بن سکتی تو دوسری طرف ان حقائق پر بھی شاعری کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی جو ( مثال کے طور پر ) مومن کے ان اشعار میں پائے جاتے ہیں ؎

کرۂ خاک ہے گردش میں تپش سے میری　　میں وہ مجنوں ہوں کہ زنداں میں بھی آزاد رہا

دعا بلا تھی شبِ غم سکونِ جاں کیلئے　　سخن بہانہ ہوا مرگ ناگہاں کے لئے

یہ اشعار جہاں سائنٹفک حقیقت سے خالی ہیں وہاں شاعرانہ حقیقت سے بھی بیگانہ ہیں ۔ رہا یہ نظریہ کہ تخیل کے بغیر شعر شعر نہیں کہلاتا سو وہ بھی درست ہے لیکن انھیں یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ " جہاں[1] تخیل شعر کی روح رواں ہے وہاں اس کی بے راہ روی اور بے اعتدالی شعر کی موت بھی ہے " اور مومن کے کلام میں تخیل کی بے اعتدالیاں کثرت سے پائی جاتی ہیں ۔ پروفیسر ضیاء کا یہ زیرِ لب اعتراف کہ " مومن کے یہاں تخیل کے اعتدال کے ساتھ اس کی بے اعتدالی کی مثالیں بھی ملتی ہیں ۔ خصوصاً ابتدائی دور میں جب کہ وہ رنگ ناسخ کے پیرو تھے " یا ایک جگہ یہ کہنا کہ " مومن کے یہاں خصوصاً ابتدائی کلام میں ( جب کہ وہ رنگ ناسخ کی طرف مائل تھے ) اور کہیں کہیں بعد میں شاید عام مذاق کے اثر سے رسمی اور غیر حقیقی جذبات کا سراغ بھی ملتا ہے ۔ لیکن یہاں کا اصلی رنگ نہیں " دراصل کلام مومن کے ایک نمایاں عیب پر پردہ ڈالنے کے برابر ہے ۔

---

[1] عندلیب شادانی

چونکہ مومن کی نازک خیالی اور مضمون آفرینی سے متعلق زیادہ تر اشعار غیر فطری اور مبالغہ آمیز ہیں اس لئے مومن کے ایک پرستار سید امتیاز صاحب نے ان کی شاعری کو متذکرہ نقص سے بری ثابت کرنے کیلئے ایک عجیب منطق پیش کی ہے۔ فرماتے ہیں "اردو شاعری کو مبالغہ آمیز کہہ کر جو ٹال دیا جاتا ہے وہ درحقیقت کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اگر ایک شاعر کی حس بڑھی ہوئی ہے اور اس کا بیان ہمارے محسوسات کی رو سے مبالغہ آمیز معلوم ہوتا ہے تو یہ ضروری نہیں کہ وہ مبالغہ آمیز ہی ہو۔

مثلاً مومن کہتا ہے:-

تیرے [illegible]　　گل نہ ہوں گے شررِ آتشِ سوزاں ہوں گے

پہلی نظر میں یہ شعر صاف مبالغہ معلوم ہوتا ہے اور ہے۔ مگر اس کا کیا علاج کہ مومن کسی طور پر یہ محسوس ہی نہیں کر سکتا کہ تیرے دلِ تفتہ کی تربت پر گل ہوں گے اگر ہوں گے تو شررِ آتشِ سوزاں ہوں گے۔ اس بڑھی ہوئی حس کے سامنے مبالغہ آمیز کہنے والوں اور مدعی کے بیان کی کیا وقعت باقی رہ سکتی ہے۔ انداز بیان نے اس غیر فطری بیان میں تاثیر پیدا کردی ہے"

امتیاز صاحب کی مندرجۂ بالا سطریں ان کے دعوے کو ثابت تو نہ کر سکیں لیکن ان سے اس امر کا پتہ ضرور چلتا ہے کہ ایک پڑھا لکھا آدمی بھی اگر ذوقِ سلیم سے محروم ہو تو کس درجہ لغو گفتگو کر سکتا ہے۔ انھوں نے مومن کا جو شعر پیش کیا ہے اس کی تاثیر کو محسوس کرنا ان ہی کے دلِ گداختہ کے بس کی بات تھی۔ پھولوں کی شررِ آتشِ سوزاں کہنا مبالغہ نہ سہی شاعر کی بڑھی ہوئی حس کا نتیجہ سہی لیکن کیا قبر کے اندر سے مدعی کے بیان کی تردید بھی جناب عاشق یا جناب شاعر کی بڑھی ہوئی حس ہی کا نتیجہ ہے؟۔ اس میں شک نہیں کہ ایک عام آدمی کی بہ نسبت ایک شاعر کے احساسات زیادہ مشتعل اور تیز ہوتے ہیں مگر اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ جو چیز ایک عام آدمی کو رائی کے برابر نظر آتی ہے وہ شاعر کو پہاڑ کی ہمسر نظر آئے۔ اگر ایسا ہوتا تو ایک عام شخص شاعروں کے کلام میں اپنے جذبات و محسوسات کا عکس دیکھنے سے قاصر رہتا۔ شاعر کی قوتِ حس کے زیادہ تیز ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ جن کیفیات و جذبات کو ایک عام انسان مبہم طور پر اپنے دل میں محسوس کرتا ہے۔ ایک شاعر ان کو وضاحت اور شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے اور بس۔ جب میر یہ کہتے ہیں:-

میرے مرنے کی حقیقت جس میں تھی　　ایک مدت تک وہ کاغذ نم رہا

یا جب مومن یہ کہتے ہیں:-

مہتاب کا کیا رنگ کیا دورِ فغاں نے　　احوالِ شبِ تار سے روشن ہے ہمارا
جا بجا نہریں ہیں جاری میں سیلِ اشک　　پونچھے ہوں گے دامنِ کہسار سے
کیوں کر نجات آتشِ ہجراں سے ہو کہ مرگ　　آئی تو دور ہی تب و تاب بدن سے ہے
ہو گئی ساری زمین صرف حروفِ نو رقم　　اک جہاں ویران ہے میرے نامہ کی تحریر سے
سیکھے ہیں مجھ سے نالۂ نہ آسماں شکن　　صیاد اب قفس میں عنادل کو تھامنا

تو وہ اپنی بڑھی ہوئی حس کا ثبوت نہیں دیتے بلکہ مضحکہ خیز قسم کی مبالغہ آرائی میں اپنے کمال کا اظہار کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ ایک سیدھی سی بات ہے جس کو منطقی پیتروں سے غلط ثابت کرنے کی کوشش بے سود ہے۔

اوپر کی سطروں میں میں نے مومن کی نازک خیالی اور معنی آفرینی کے متعلق جو خیالات ظاہر کئے ہیں ان کا ماحصل یہ ہے کہ جن اشعار میں بے تکی خیال آرائیاں ہوں، بے بات کی بات (بات سے بات پیدا کرنا حسن ہے) پیدا کی گئی ہو، دور از کار

مبالغے سے کام لیا گیا ہو، کسی لغو دعوے کو لغو تر دلیل سے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہو ان پر نازک خیالی اور مضمون آفرینی کا لیبل نہیں لگانا چاہئے۔ ان اصطلاحات کا اطلاق ان اشعار پر ہونا چاہئے جو حسن تعبیر، حسن توجیہ، حسن تمثیل سے عبارت ہوں جو خیال کی نزاکتوں پر مبنی ہونے کے باوجود ذہنی ورزش کے نتائج نہ ہوں، جن میں کوئی ایسی بات کہی گئی ہو جو حیرت انگیز ہونے کے باوجود غیر فطری نہ ہو، جو انوکھی ہونے کے باوصف ہر شخص کو اپنے دل کی بات محسوس ہو اور دل کی بات محسوس ہوتے ہوئے بھی انوکھی نظر آئے۔ مثال کے طور پر غالب کے اس شعر کو لیجئے ؎

شنیدہ کہ بہ آتش نہ سوخت ابراہیم　　ببیں کہ بے شرر و شعلہ می توانم سوخت

اس میں تخیل کی نزاکت، فکر کی بداعت، اور نکتہ آفرینی بدرجہ اتم موجود ہے۔ روایت کی رو سے پہلے مصرعہ کی واقعیت میں کوئی شک ہی نہیں۔ دوسرا مصرعہ بڑا چونکانے والا ہے پھر بھی اصلیت سے بیگانہ نہیں۔ انسان شعلہ و شرر کے بغیر بھی جلتا ہے، جذبات و محسوسات میں بھی سوز و تپش کی کیفیت ہوتی ہے۔ یہ ہر شخص کے تجربہ کی بات ہے لیکن غالب نے اس آفاقی تجربے کو اپنے انداز بیان سے ایک انوکھی چیز بنا دیا ہے۔

تعبیرات و تمثیلات کی شاعری میں نازک خیالی اور مضمون آفرینی کے بڑے پاکیزہ نمونے ملتے ہیں مثال کے طور پر غالب کے دو فارسی شعر ملاحظہ ہوں ؎

نازم فروغ بادہ ز عکس جمال دوست　　گوئی فشردہ اند بجام آفتاب را
سرگرمی خیال توام از نالہ باز داشت　　دل پارہ آتشے ست کہ دودش نماندہ است

پہلے شعر میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ روئے محبوب کے عکس سے شراب کی تابش ایسی معلوم ہوتی ہے گویا پیالے میں آفتاب نچوڑ کر رکھ دیا گیا ہے۔

دوسرے شعر کا مفہوم یہ ہے کہ تیرے خیال کی محویت نے مجھے نالہ و فغاں سے باز رکھا۔ گویا دل آگ کا ایک ٹکڑا ہے جس سے دھواں نہیں نکلتا۔

سچ پوچھئے تو نازک خیالی اور معنی آفرینی کے الفاظ ان ہی اشعار پر بجتے ہیں۔ اس قسم کے اشعار کے لئے متذکرہ اصطلاحات استعمال کرتے وقت محسوس ہوتا ہے کہ یہ اصطلاحات لفظی حیثیت سے جس قدر حسین اور خوش آہنگ ہیں۔ معنوی اعتبار سے بھی اتنی ہی لطیف و دلکش ہیں۔

نازک خیالی اور مضمون آفرینی کی ایک اچھی مثال غالب کا یہ اردو شعر بھی ہے ؎

آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا　　ہر کوئی درماندگی میں نالہ سے ناچار ہے

ایک معقول دعوے کے لئے ایک شاعرانہ دلیل پیش کی گئی ہے لیکن وہ بھی معقولیت سے خالی نہیں۔

نازک خیالی اور معنی آفرینی کی اور بھی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ غالب کا ایک شعر ہے ؎

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد
ہزار بار برو صد ہزار بار بیا

یہاں دوسرے مصرعہ میں صرف لفظ "صد" کے استعمال نے شعر کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اسے کہتے ہیں تخیل کی نزاکت اور نکتہ آفرینی۔ غالب ہی کا ایک اور شعر یاد آیا ؎

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوف قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

نازک خیالی اور معنی آفرینی کا کتنا دلکش مرقع ہے! اس میں تخیل کی جو لطافتیں پوشیدہ ہیں وہ تشریح کی متحمل نہیں ہو سکتیں۔

یہاں غالب کے اشعار پیش کرنے سے میرا مقصود غالب اور مومن کا موازنہ نہیں بلکہ نازک خیالی اور معنی آفرینی کے صحیح مفہوم کی وضاحت کرنی ہے۔ مومن کے کلام میں ایسے اشعار جو نازک خیالی اور معنی آفرینی کے صحیح معیار پر پورے اترتے ہوں نایاب نہیں لیکن کمیاب ضرور ہیں اور جو کچھ ہیں ان کو مومن کے پرستاروں نے لائق التفات نہیں سمجھا۔ یہاں میں صرف دو تین مثالیں پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں ؎

ناصح کہاں تلک تری باتیں اٹھا سکوں　　سچ ہے کہ مجھ میں طاقت جور و ستم نہیں
شبنم خراب مہر دکتاں سینہ چاک ماہ　　لو اور بھی ستم زدہ روزگار ہیں
دونوں کا ایک حال ہے یہ مدعا کا ہو شش　　وہ ہی خط اس نے بھیج دیا کیوں جواب میں

جس طرح دیوان مومن کے زیادہ تر اشعار خیالات و مضامین کے اعتبار سے صحیح رنگِ تغزل کے آئینہ دار نہیں اسی طرح مومن کا انداز بیان بھی غزل کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتا، غزل کی لطافت طریق اظہار کے پیچ و خم اور آورد و تصنع کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ لیکن مومن کے طرز ادا کی سب سے نمایاں خصوصیت یہی ہے کہ وہ پر تکلف ہونے کے ساتھ ساتھ اس قدر پیچیدہ ہے کہ بقول پروفیسر ضیاؔ کے "تقریباً ہر غزل کے نصف اشعار محتاج شرح ہیں" کیا ان کا اسلوب اس وجہ سے پیچیدہ اور تصنع آمیز ہے کہ ان کے خیالات بہت ہی نازک اور گہرے ہیں ؟ یا اس لئے کہ انھوں نے اپنے پیچیدہ اور پر تکلف اسلوب سے سچے اور گہرے جذبات و محسوسات کی خانہ پری کی ہے ؟ یا پھر کوئی اور سبب ہے ؟ پروفیسر ضیاؔ کے خیال میں اس کی وجہ "ان کی منفرد شخصیت ہے۔ جو کبھی روش عام پر چلنا گوارا نہیں کرتی...... مومن ایک genius یا نابغہ تھے اور نابغہ مخصوص فوق العادہ ذہنی اور تخلیقی صلاحیت کا مالک ہوتا ہے۔ اس بنا پر اگر انھوں نے اپنے مطالب کے ادا کرنے کے لئے ایک نیا اور غیر متعارف پیرایہ ایجاد کیا تو کیا تعجب ہے۔ اس کے علاوہ سب جانتے ہیں کہ ان کا عشق حقیقی نہیں مجازی ہے۔ مجاز بھی وہ جس سے ہوس پرستی اور کوچہ گردی کی بو آتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے عشق میں برشتگی اور نامرادی، ربودگی اور خود فراموشی کا کیا کام وہاں تو عاشق یہ چاہتا ہے کہ تھوڑے سے تھوڑے ایثار کے سہارے معشوق سے زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کیا جائے۔ عجب نہیں کہ اس داؤ پیچ کے کاروبار نے ان کو متصنع اور پیچ دار باتوں کا خوگر بنا دیا ہو۔ پروفیسر کلیمؔ نے سوداؔ کی نسبت کہا ہے کہ وہ مصنوعی خیالات کو اصل کر دکھاتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ مومنؔ اصلی جذبات کو مصنوعی انداز میں پیش کرتے ہیں"

پروفیسر موصوف کی معصومانہ توجیہہ جس قدر دلچسپ ہے اسی قدر غلط بھی ہے اس باب میں انھوں نے عشق مجازی کو خواہ مخواہ بدنام کیا ہے۔ آخر جرأت کا عشق بھی تو مجازی ہی تھا اور ویسا ہی مجاز جیسا مومنؔ کے یہاں پایا جاتا ہے۔ پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ ایک کے اسلوب میں تو قابلِ رشک سادگی اور بے ساختگی ہے مگر دوسرے کے انداز بیان میں۔ بیزار کن الجھاؤ اور بناوٹ۔ دوسرے یہ کہ مومنؔ کے اشعار میں جو پر تصنع اور پیچ دار باتیں ہیں ان کو اس داؤ پیچ سے دور کا بھی تعلق نہیں جس سے ایک ہوس پرست کام لے سکتا ہے یا کام لیا کرتا ہے۔ یہ خیال بھی صحیح نہیں کہ مومنؔ اصلی جذبات کو مصنوعی انداز میں پیش کرتے

ہیں۔ مومن اپنے مصنوعی انداز میں جو چیزیں پیش کرتے ہیں ...... وہ اور جو کچھ بھی ہوں جذبات یقیناً نہیں ہوتے۔ حقیقت یہ ہے کہ مومن کے اسلوب میں تکلف اور پیچ و خم کئی وجہوں سے پیدا ہوئے۔ اول تو اس لئے کہ ان کے اکثر پیچیدہ اشعار حد درجہ لایعنی مضامین پر مبنی ہیں اسی لئے وہ پڑھنے والے کو پیچ دار اور اُلجھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ دوسرے اس لئے کہ مومن بعض اوقات بہت وسیع مضمون کو ایک شعر میں ادا کر دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب کسی وسیع مضمون کو دو مصرعوں کے پیمانے میں ادا کرنے کی کوشش کی جائے گی تو اس کے بعض اجزا کو لازمی طور پر چھوڑ دینا پڑے گا۔ اب چونکہ مومن کے مضامین زیادہ تر تخیلی اور مفروضاتی ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کے چھوڑے ہوئے اجزا و مشکل سے سامع کے ذہن میں آتے ہیں۔ نتیجتاً شعر پیچیدار بن جاتا ہے۔ تیسرے اس لئے کہ لبا اوقات مومن کے اشعار ایہام پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے بھی مطلب بہ یک نظر سمجھ میں نہیں آتا۔ چوتھے اس لئے کہ مومن کے زیادہ تر اشعار کی بنیاد روایتی مضامین پر ہے۔ ان میں ندرت و تازگی پیدا کرنے کیلئے ضروری سمجھا گیا کہ وہ سیدھے سادے پیرایہ میں بیان نہ کئے جائیں۔ پانچواں سبب یہ ہے کہ مومن کے بعض اشعار کا سمجھنا بعض باتوں کے جاننے پر منحصر ہے اب جو کوئی ان باتوں سے ناواقف ہے اس کو مومن کا اسلوب قدرتی طور پر پیچیدہ معلوم ہوتا ہے۔

ان خیالات کی تصدیق کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

سرگرم مدح غیر دم شعلہ زن سے ہے　　　دوزخ کو کیا جلن مرے دل کی جلن سے ہے

اس شعر میں پیچیدگی کے دو سبب کا اجتماع ہے۔ اول تو نفس مضمون ہی اس قدر مہمل ہے کہ اس تک سامع کا ذہن آسانی سے نہیں پہنچ سکتا۔ دوم یہ کہ شعر میں نفس مضمون کے بعض اجزا محذوف ہیں اور چونکہ مضمون سرتاسر خیالی اور مفروضاتی ہے اس لئے محذوفات کی طرف خیال فوراً منتقل نہیں ہوتا۔ اس شعر کا جو مطلب الفاظ سے نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ دوزخ اپنے شعلوں کی لپٹ سے رقیب کی مدح میں سرگرم تو اس کا سبب یہ ہے کہ دوزخ کو میرے دل کی جلن پر رشک آتا ہے۔ یہ مطلب سن کر آپ یقیناً حیران ہوں گے کہ آخر بات کیا ہوئی۔ عاشق اور رقیب کا دوزخ سے کیا تعلق پھر یہ کہ دوزخ کے شعلے رقیب کی تعریف میں کیوں سرگرم ہیں اور ان کو عاشق صادق یعنی حضرت مومن کے دل کی جلن پر رشک کیوں ہے یہ تو خیر مومن ہی بتا سکتے تھے کہ دوزخ کے شعلے ان سے اور ان کے رقیب سے کیوں دلچسپی لینے لگے اور بالفرض ایسا ہوا بھی تو اس کی اطلاع مومن تک کیونکر پہنچی، یعنی جہاں تک دوسرے سوال کا تعلق ہے۔ اس کا جواب شعر کے محذوفات میں مل جاتا ہے۔ محذوفات کے ساتھ شعر کا مطلب یہ ہے کہ "دوزخ اپنے شعلوں کی لپٹوں سے رقیب کی مدح میں سرگرم ہے اور میرے سوز دل کی (جو دوزخ سے کہیں زیادہ ہے) تعریف نہیں کرتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو میرے دل کی جلن پر رشک آتا ہے۔ یعنی چونکہ وہ سوز میں مجھ سے کمتر ہے اس لئے مجھ پر حسد کرتا ہے اور میرے جلانے کے لئے رقیب کی تعریفیں کرتا ہے جو سوز عشق سے خالی ہے"[1]

مومن :-　کچھ بھی کیا نہ یار کی سنگیں دلی کا پاس　　سب کاوش رقیب بجا کوہکن سے ہے

یہ شعر بھی اسلوب کے اعتبار سے پیچیدہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہاں بھی پیچیدگی کا اصل سبب نفس مضمون کی لغویت ہے شعر کا مفہوم پروفیسر ضیاء کے الفاظ میں یہ ہے کہ "کوہکن نے پتھر کو کاٹ کر نہر نکالی اور اپنی محبوبہ کی سنگ دلی کا پاس نہ کیا، یعنی پاس ادب کا تقاضا تو یہ تھا کہ پتھر کو دلِ یار سے مشابہ سمجھ کر اس کا احترام کرتا۔ مگر نہ کیا۔ اس لئے خسرو کی دشمنی اس سے بالکل حق بجانب ہے"

---

[1] یہ مطلب "دیوان مومن" مرتبہ پروفیسر ضیاء سے نقل کیا گیا۔

اول تو یہی سمجھ میں نہیں آتا کہ کوہکن یعنی فرہاد کی روداد محبت سے مضمون پیدا کرتے وقت مومن نے اس کی محبوبہ یعنی شیریں کی سنگ دلی کا تذکرہ کیوں کیا جب کہ وہ سنگدل ہرگز نہ تھی۔ شاید مومن نے اس باب میں دادِ تحقیق دینے کی بھی کوشش کی ہے۔ خیر مانا کہ شیریں سنگ دل تھی اور ایک عاشقِ صادق پر محبوب کی ہر اچھائی برائی کا احترام واجب سہی لیکن اس کا یہ مطلب لینا کیا معنی کہ اگر محبوب سنگ دل واقع ہوا ہے تو عاشق کو چاہئے کہ دنیا میں جتنی بھی سنگین چیزیں ہیں مثلاً پہاڑ، کنکر، پتھر ان سب کو احترام و محبت کی نگاہ سے دیکھے۔ دو مصرعوں میں مومن نے جتنی لغوتیں بھر دی ہیں ان کو کہاں تک واضح کیا جائے۔ ان لغویات کی طرف اشارہ کرنے سے میرا مقصود صرف یہ ہے کہ مومن کے اسلوب کی پیچیدگی اور بناوٹ بڑی حد تک ان کے لایعنی خیالات کا نتیجہ ہے۔ کہ بقول پروفیسر ضیا اصلی جذبات کو مصنوعی انداز میں پیش کرنے کا ۔ جیسا کہ میں نے ابھی ظاہر کیا مومن کے اسلوب میں پیچیدگی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ان کے بہت سے اشعار ایہام پر مبنی ہوتے ہیں ۔ دو ایک مثالیں ملاحظہ ہوں۔

گر بہائے خون عاشق ہے وصال　　　انتقامِ زحمت جلاد کیا؟

اس شعر کا مطلب اثر لکھنوی کے الفاظ میں سنئے ۔ لکھتے ہیں یہ اس شعر میں ایہام ہے ۔ وصال کے معنی وصل کے بھی ہیں اور مرنے کے بھی ۔ پہلے مصرعہ میں ایک زبردست نظریہ قایم کیا ہے کہ وصال قتل عاشق کا معاوضہ ہے ۔ مگر دوسرے مصرعہ میں اس کو غلط ثابت کیا ہے کہ وصال بہائے خونِ عاشق نہیں ہے (اب لفظ وصال بمعنی مرگ لینا ہوگا) بلکہ اس زحمت کا انتقام ہے جو جلاد کو قتل کرنے میں پیش آئی اگر ایسا نہیں ہے تو اس زحمت کا بدلہ کیا ہے "

اثر صاحب کی اس تشریح سے یہ بات تو واضح ہو ہی گئی کہ اس شعر کی عمارت ایہام پر مبنی ہے ۔ لیکن مجھے اتنا اشارہ اور کرنا ہے کہ اس شعر کو گورکھ دھندا بنانے میں ایہام کے علاوہ نفس مضمون کی لغویت کو بھی بڑا دخل ہے ۔

مومن :۔　　کیوں کہا تھا یہ کہ بکتے بکتے سر پھرنے لگا　　اب تو باندھوں گا میں ناصح اس کو بھی زنجیر سے

اس شعر کے الفاظ سادہ ہیں لیکن شعر پیچیدہ ہے اور اس پیچیدگی کا سرچشمہ " سر پھرنے لگا " کا ٹکڑا ہے ۔ پروفیسر ضیا کے الفاظ میں شعر کا مطلب یہ ہے یہ ناصح نے کہیں کہہ دیا کہ تجھے نصیحت کرتے کرتے میرا سر پھرنے لگا مگر تجھ پر اثر نہیں ہوتا ۔ عاشق دیوانہ جواب دیتا ہے کہ جب میں آوارہ پھرتا تھا تو میرے پاؤں میں زنجیر ڈالی گئی تھی ۔ اب تیرا سر پھرتا ہے تو اس کو میں زنجیر سے باندھوں گا "

اس شعر کے نفس مضمون کے متعلق اتنا کہنا کافی ہے کہ اس سے اس طالب علم کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جس نے " میرا سر چکر کھا رہا ہے " کا انگریزی ترجمہ یوں کیا تھا ۔ My head is eating circle

مومن :۔　　ذکر کر بیٹھے برائی سے ہی شاید میرا　　اب وہ اغیار کی صحبت سے عذر کرتا ہے

کہنا یہ مقصود ہے کہ " ذکر میرا بہ بدی بھی اسے منظور نہیں " اس خیال میں نہ کوئی گہرائی ہے نہ تازگی ۔ لیکن شعر پھر بھی پیچیدہ ہے اور یہ پیچیدگی انداز بیان میں صرف اس لئے پیدا کی گئی کہ ایک فرسودہ خیال میں تازگی سی آجائے ۔

مومن :۔　　حیرت حسن سے یہ شکل بنی　　کہ وہ آئینہ دکھاتے ہیں مجھے

اس شعر کو سمجھنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ جب کسی کی موت کے متعلق پورا یقین کرنا ہوتا ہے تو اس کے منہ کے قریب آئینہ لے جاتے ہیں کہ اگر ذرا بھی سانس ہوگی تو آئینہ پر نم پیدا ہو جائے گا جو شخص اس امر سے ناواقف ہے اس کو مومن کا مندرجہ بالا شعر قدرتی طور پر پیچیدہ معلوم ہوگا ۔

جس طرح غزل کے اسلوب کا پرپیچ اور تکلف آمیز ہونا ایک عیب ہے اسی طرح غزل میں علمی اصطلاحات کا استعمال بھی مستحسن نہیں۔ غزل میں علمی اصطلاحات کا استعمال ایسا ہی ہے جیسے ریشم کے کپڑے میں ٹاٹ کی پیوندکاری۔ لیکن پروفیسر ضیاء کی پرستارانہ عقیدت کلام مومن کے اس بدنما داغ کا اعتراف کیونکر کرتی۔ چنانچہ انھوں نے اس عیب کو خوبی میں تبدیل کرنے کے لئے بڑی حسین دلیل پیش کی ہے۔ فرماتے ہیں۔ "حکیم صاحب کی مستجمع الصفات ذات متعدد علوم و فنون کی سرمایہ داری تھی اس لئے کلام میں علمی اصطلاحات کا بلاقصد آجانا ناگزیر تھا۔ قصاید میں تو اس سے چارہ نہیں، ان کی غزلیات میں بھی کہیں کہیں یہ رنگ جھلکتا ہے مگر خوبی یہ کہ تغزل کی شان بدستور قائم رہتی ہے اور ان علمی مسائل کی حیثیت ثانوی رہ جاتی ہے۔" پروفیسر ضیاء نے اپنے اس دعوے کی تائید میں چند اشعار بھی پیش کئے ہیں ان میں سے دو تین شعر آپ بھی ملاحظہ فرمائیں اور موصوف کے ذوق سلیم کی داد دیں کہ اس کی بدولت ان اشعار کی تغزلانہ شان ہم لوگوں پر منکشف ہوئی ہے۔

صبح دم آنے کو تھا وہ کہ گواہی دے ہے　　رجعت قہقہری شمس و قمر آخر شب
دشمن سگ کوچہ نہ ہو اس شوخ آہو چشم کا　　نادم ہوں کعب گرگ پائے نامہ بر سے باندھ کر
قران انجم سیارہ برج آبی میں　　ڈبوئے گی مری چشم ستارہ بار مجھے

شعریت کے فقدان کی بنا پر اول تو ان اشعار کو اشعار کہنا ہی غلط ہے چہ جائیکہ ان کو غزل کے اشعار تسلیم کر لینا اور ان میں شان تغزل کو جلوہ گر پانا۔

مومن کے اسلوب کو پرپیچ اور تصنع آمیز قرار دیتے وقت مجھے اس حقیقت سے انکار نہیں کہ دیوانِ مومن میں ایسے اشعار بھی پائے جاتے ہیں جن میں سادگی اور بے ساختگی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ لیکن چونکہ ان کی تعداد نسبتاً بہت کم ہے اس لئے ان کو مومن کے مخصوص رنگ سے علیحدہ سمجھنا نامناسب نہ ہوگا اور اسی بنا پر مجھے یہ خیال آتا رہا ہے کہ جہاں مومن نے تغزل کا حق ادا کیا ہے وہاں وہ اپنے انفرادی اسلوب کو قائم نہیں رکھ سکے اور جن اشعار میں انھوں نے اپنے مخصوص پیرایۂ بیان سے کام لیا ہے ان میں تغزل کے مطالبات کہیں کہیں پورے ہو سکے ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا کہ میں نے اپنے اس خیال کا اظہار پروفیسر حامد حسن قادری صاحب کے نام ایک خط میں کیا تھا۔ انھوں نے مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے لکھا۔

"آپ کا خیال صحیح ہے کہ مومن خاں سے مخصوص رنگ اور تغزل ساتھ ساتھ نہیں نبھتے اور نبھ بھی نہیں سکتے۔ پیچ پیچ میں بے ساختگی کہاں۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ جب وہ دور کی کوڑی لاتے ہیں تو اکثر پورا شعر اور سارا مضمون بے لطف ہو جاتا ہے۔ لیکن کہیں کہیں بات خوبصورت اور دلچسپ بھی نکل آتی ہے۔"

نیاز فتحپوری نے مومن کی نفسیاتی ژرف بینی پر زور دیتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ "میرے خیال میں مومن ہی ایک ایسا شاعر ہے جو نفسیاتی رموز کو سمجھ کر شاعری کرتا ہے اور ایسی معنوی نزاکتیں پیدا کرتا ہے کہ غور سے تجزیہ کرنے کے بعد ان کا پتہ چلتا ہے" جہاں تک مومن کی شاعری کا تعلق ہے معنوی نزاکتوں کا تو ذکر ہی کیا معمولی بات کا بھی اس وقت تک پتہ نہیں چلتا جب تک غور و تامل اور دماغ سوزی سے کام نہ لیا جائے البتہ ان کی شاعری میں نفسیاتی رموز کی موجودگی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہ کوئی ایسی خصوصیت نہیں جو صرف مومن ہی کے حصہ میں آئی ہو۔ اگر دیانت کے ساتھ مطالعہ کیا جائے تو ہر غزل گو شاعر کے یہاں کسی نہ کسی مقدار میں ایسے اشعار ضرور ملیں گے جو نفسیاتی رموز کے حامل ہوں گے۔

نفسیاتی رموز کو مومن کی خصوصیت خاصہ قرار دینا انتقادی دیانتداری سے بعید ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی شخص غزل جیسی

داخلی صنف میں شاعری کرے اور فطرت انسانی کی نفسیات سے بیگانہ رہ کر ایک بڑا شاعر بن جائے۔ یہ اور بات ہے کہ غزل کے اچھے اور برے شاعروں میں بعض کے نفسیاتی رموز کم ہیں اور بعض کے یہاں زیادہ ۔

فراق گورکھپوری نے اپنے مقالہ "حسرت موہانی" میں مومن کے متعلق کئی جگہ اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ انھوں نے فارسی ترکیبوں کے ذریعہ سے حسن و عشق کی نفسیاتی و داخلی کیفیتوں کی عکاسی کی ہے۔ میں تو نہیں کہوں گا کہ فراق صاحب کا خیال غلط ہے لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہ آسکی کہ انھوں نے مومن کے کلام میں نفسیاتی و داخلی کیفیتوں کی عکاسی کا ذریعہ خصوصیت کے ساتھ فارسی تراکیب کو کیوں قرار دیا۔ جب کسی شعر میں کوئی نفسیاتی یا داخلی کیفیت ظاہر کی جائے گی تو اس کے لئے سادہ الفاظ بھی اتنا ہی کام آسکتے ہیں جتنا کہ فارسی تراکیب۔ اب یہ شاعر کے اختیار میں ہے کہ وہ حسب موقع شعر میں سادہ الفاظ استعمال کرے یا فارسی تراکیب۔ چنانچہ مومن نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ ان کے کلام میں فارسی تراکیب کا استعمال اور نفسیاتی و داخلی کیفیات کا اظہار لازم و ملزوم کی حیثیت نہیں رکھتے۔ ان کے یہاں ایسے اشعار کی تعداد کافی ہے جو فارسی تراکیب کے باوجود کسی نفسیاتی یا داخلی کیفیت کی ترجمانی نہیں کرتے (اور کرتے کیسے جب کہ ان اشعار کا موضوع کوئی نفسیاتی یا داخلی کیفیت ہے ہی نہیں) اس کے برعکس مومن کے یہاں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن میں زبان و بیان کی سادگی کے باوصف محبت کی نفسیات اور داخلی کیفیات کی بڑی اچھی مصوری کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر چند شعر ملاحظہ ہوں :-

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا ۔۔۔ جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
یاس دیکھو کہ غیر سے کہہ دی ۔۔۔ بات اپنی امیدواری کی
مجھے چپ لگی مدعا کہتے کہتے ۔۔۔ رکے ہیں وہ کیا جانے کیا کہتے کہتے
کہنا پڑا درست کہ اتنا رہے لحاظ ۔۔۔ ہر چند وصل غیر کا انکار ہے غلط
ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم ۔۔۔ منھ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بیکسی سے ہم

پرستاران مومن کی ایک دلچسپ ادا یہ ہے کہ وہ کلام مومن کی تقریباً ہر خوبی کو صیغہ "افضل التفصیل" میں بیان کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ چنانچہ پروفیسر ضیاء اور پروفیسر وقار عظیم نے مومن کی طنز نگاری کا ذکر بھی اسی انداز میں کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مومن کے یہاں طنز کی بڑی پاکیزہ مثالیں ملتی ہیں لیکن پروفیسر ضیاء کا یہ کہنا کہ "اساتذۂ اردو میں مومن سے زیادہ طنز کا استعمال کسی نے نہیں کیا" اور پروفیسر وقار عظیم کی یہ رائے کہ "طنز ادبی فن کا ایک ایسا حربہ ہے جسے اردو کے غزل گو شاعروں میں سے کسی نے بھی اتنے سلیقہ اور لطافت سے استعمال نہیں کیا جیسے مومن نے" مبالغے سے خالی نہیں۔ اردو شعراء میں کم از کم میر اور غالب کے یہاں طنز کا استعمال مومن سے زیادہ نہ سہی لیکن کم بھی نہیں ہے۔ پھر یہ کہ ان دونوں کے طنزیات میں بھی وہی لطافت اور نشتریت پائی جاتی ہے جو مومن کے طنزیہ اشعار کی خصوصیت بتائی گئی ہے۔ ثبوت کے لئے میں یہاں مومن، میر اور غالب کے چند بہترین طنزیہ اشعار پیش کرتا ہوں اور فیصلہ قارئین پر چھوڑتا ہوں ؎

مومن :-

واقعی سجدۂ در ایسی ہی تقصیر ہے اب ۔۔۔ جور جو بندہ پہ ہوتا ہے بجا ہوتا ہے
ہوں سزاوار ستم میں نے کیا ہے جرم عشق ۔۔۔ بوالہوس ہیں بے گنہ پھر کیوں ڈریں لعزیر سے
رشک دشمن بہانہ تھا سچ ہے ۔۔۔ میں نے ہی تم سے بے وفائی کی
مجھ پہ بعد امتحاں بھی جور کم کیوں کر کریں ۔۔۔ وہ ستائیں غیر کو ایسا ستم کیونکر کریں

گر نہ کھیلیں جان پر ، جی ہار دیں — عشق بازی سیکھئے اغیار سے

میرؔ:- کیوں کر نہ ہو تم ۔ میرؔ کے آزار کے دُبلے — یہ جرم ہے اس کا کہ تمھیں پیار کرے ہے

یاں شہرِ حسن میں تو کہیں ذکر بھی نہیں — کیا جانیے کہ مہر و وفا ہے کہاں کی بات

ہاں مہر تھی وفا تھی ، واں جور تھے ستم تھے — پھر نکلے بھی تو میرے ہی یہ گناہ نکلے

حال بد گفتنی نہیں میرا — تم نے پوچھا تو مہربانی کی

غالبؔ:- یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے — ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر سے ملنے میں رسوائی — بجا کہتے ہو، سچ کہتے ہو، پھر کہئے کہ ہاں کیوں ہو

رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی — تو کس اُمید پہ کہئے کہ آرزو کیا ہے ؟

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم — میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ — ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

کیا وہ بھی بے گنہ کش و حق ناشناس ہیں — مانا کہ تم بشر نہیں خورشید و ماہ ہو

مومنؔ کے اکثر طنزیہ اشعار کا ایک نقص یہ ہے کہ انھوں نے "حسبِ عادت" ان میں لایعنی مضامین باندھے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ جن لوگوں کا ذوق ان لایعنی مضامین سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا ہو وہ ان اشعار کے طنزیہ پہلو سے کیونکر لطف اندوز ہو سکیں گے ۔ مثلاً ؎

غیر عیادت سے برا مانتے — قتل کیا آن کے اچھا کیا

دیکھ مضطر کیوں نہ پھیرے دشنہ پھر — یار ہے وہ کچھ تماشائی نہیں !

مٹی نہ دی مزار تلک آ کے اس پہ بھی — کہتے ہیں لوگ خاک میں اس نے ملا دیا

مومنؔ کے کلام میں خمریاتی اشعار کی تعداد بہت کم ہے اور اگر اس خصوصیت کو بھی اُن کے امتیازات میں شمار کیا جائے تو بیجا نہ ہوگا ۔ لیکن اس باب میں جناب متجز سہسوانی کا یہ کہنا کہ مومنؔ نے "غزل کا دامن مضامینِ شراب سے آلودہ نہ ہونے دیا اور جہاں کہیں بضرورتِ قافیہ ذکر کیا ہے وہاں اپنی ذات کو بادہ نوشی سے محفوظ رکھا ہے اور اس طرح بچایا ہے کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے" نہ صرف مبالغہ آمیز ہے بلکہ مضحکہ خیز اور تبسم انگیز بھی ۔ اول تو خمریاتی اشعار میں اپنی ذات کو بادہ نوشی سے محفوظ رکھنا یا دکھانا کوئی ایسی ادبی تعریف بات نہیں جس کو اُجاگر کرنا اور جس کی داد دینا ضروری ہو ۔ لیکن اگر ہم اسے تھوڑی دیر کے لئے قابلِ ستائش مان لیں ......... جب بھی مومنؔ داد کے مستحق اس لئے نہیں کہ ان کے یہاں ایسے اشعار بھی پائے جاتے ہیں جن میں وہ اپنے آپ کو رند و بادہ خوار کی حیثیت سے پیش کرتے نظر آتے ہیں ۔ مثال کے طور پر دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

مجھ سے میکش کی طرف محتسب آ ہی تو گئے — ایک قطرہ بھی سبو و خم و ساغر میں نہیں

پس شکستن خم ، ز جبر محتسب معذور — گناہ گار نے سمجھا گناہ گار مجھے

مومنؔ کے بعض نقادوں نے جہاں اور بہت سی دلچسپ اور بصیرت افروز باتیں کہی ہیں وہاں اُردو شعرا میں میرؔ، غالبؔ اور جراَتؔ سے اُن کا موازنہ بھی کیا ہے اور اس قدر انصاف کے ساتھ ہر ایک کے مقابلہ میں مومنؔ ہی کو بہتر اور برتر دکھایا گیا ہے ۔ سب سے پہلے جراَتؔ اور مومنؔ کا ٹکراؤ دیکھئے ۔ ان دونوں کے موازنہ کی بنیاد معاملہ بندی ہے جسے وقوعہ گوئی بھی کہتے ہیں ، اس با

میں جرأت کی عریاں نگاری اور مومن کی متانت و سنجیدگی پر بہت زور دیا گیا ہے۔ پروفیسر ضیاء تذکرہ جلوہ خضر کی رائے کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جرأت بہ سبب کم علمی کے بہت کھل گئے تھے۔ اس کے برخلاف مومن نے ہر جگہ دہلی کی متانت کو بتایا ہے اور دائرہ تہذیب میں رہ کر جذبات عشق کو ادا کیا ہے۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ جب جرأت کے یہاں بھی سنجیدہ معاملہ بندی اور مومن کے یہاں بھی متبذل و توعہ گوئی کی مثالیں دال میں نمک کے برابر نہیں بلکہ خاصی تعداد میں موجود ہیں تو پھر ان دونوں کا موازنہ کرتے وقت اول الذکر کی عریانی اور موخر الذکر کی متانت کو کیوں نمایاں کیا جاتا ہے۔ کیا نقد صحیح کا تقاضا یہی ہے کہ جب دو شاعروں کا موازنہ کیا جائے تو ایک کے صرف بلند کلام کو سامنے رکھا جائے اور دوسرے کے صرف پست کلام کو؟ دیانتداری کا اقتضا تو یہ تھا کہ معاملہ بندی میں جرأت و مومن کے صرف متین و شایستہ کلام کا موازنہ کر کے دونوں کے فرق کو واضح اور مرتبے کو متعین کیا جاتا لیکن پروفیسر ضیا صرف یہ کہہ کر الگ ہو رہے کہ جرأت دائرہ تہذیب سے متجاوز ہو گئے اور مومن نے دہلی کی متانت کا رشتہ ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ ایک جگہ اسی قسم کی "تنقیدی سیاست" کو اپناتے ہوئے نیاز فتحپوری لکھتے ہیں "مومن کا محبوب بھی جرأت و انشا کی طرح بازاری ہی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ جرأت و انشار کا عشق بھی بازاری ہے اور مومن بہت بلندی سے دیکھتے ہیں اور اسی بلند فضا تک محبوب کو بھی لے جانا چاہتے ہیں۔ جرأت و انشار اگر اپنی تمنا میں کامیاب نہیں ہوتے تو وہ ترک محبت کے لئے بھی آمادہ ہو جاتے لیکن مومن کی پاکیزگی ذوق کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنی اُمید کو بھی اس عالمِ آب و گل سے جدا قرار دے کر ایک غیر فانی چیز بنا دیتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی محبت کی فضا محبوب و جلوہ محبوب سے بھی بے نیاز ہو جاتی ہے۔ چنانچہ کہتا ہے ؎

قطع امید سے سر کاٹنے کو کیا نسبت　　مجھ میں وہ دم ہے ابھی جو تیرے خنجر میں نہیں

میں یہاں انشار کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ لیکن جہاں تک جرأت کا تعلق ہے اگر ان کی شاعری کے عامیانہ حصے سے قطع نظر کر لیجئے تو پھر نہ تو اس کا محبوب ہی بازاری ہے اور نہ ہی ان کی محبت ہی سوقیانہ ہے۔ ثبوت اس کا یہ ہے کہ اگر جرأت کا محبوب سر تا سر بازاری ہوتا تو ان کے ہاں اس قسم کے اشعار نہ ملتے ؎

کوچۂ جاناں سے جاتے ہیں پر جا سکتے نہیں　　گو اٹھاتے ہیں قدم پر دل اٹھا سکتے نہیں
کیا ہوئے وہ دن جو یہ پیغام آتے تھے ہمیں　　اب تو درد ہجر کی ایذا اٹھا سکتے نہیں
صورت اپنی تم کسی صورت دکھا جاؤ ہمیں　　ہیں پرائے بس میں ہم لاچار آ سکتے نہیں
وہ سوز دل سے بھر لاتا تھا اشک سرخ آنکھوں میں　　اگر ہم جی کی بے چینی سے آہ سرد بھرتے تھے
سُنا ہے وہ خدا ناکردہ ہے بیمار کیا کیجے　　عیادت کو بھی جانا ہے ہمیں دشوار کیا کیجے

اور اگر جرأت کا عشق بازاری ہوتا تو وہ اس قسم کے دل گداز اشعار ہرگز نہ کہہ پاتے ؎

ترے بن دیکھے جرأت کی یہ حالت ہو گئی غم سے　　کہ اپنے سے تو اس کو بھر نظر دیکھا نہیں جاتا
دیکھ اس گل کو جو شعلہ سا جگر سے چمکا　　کیا مرا داغ کہن پھر سے نئے سر سے چمکا
آج کیا جانے کیا ہوا ہم کو　　کل تک ایسا تو جی نڈھال نہ تھا
کریں واں قصد کیوں کر اضطراب دل جتانے کا　　کسی صورت نہ ہو مقدور جب جا لب ہلانے کا
کیا کہئے، وصل ہوئے پھر بھی زباں سے اپنے　　حرف مطلب نہ کوئی منہ سے ہمارے نکلا

روٹھے ہے بات بات پر جرأت ہے گرفتار یہ کہیں نہ کہیں

بھلا دیکھو تو ہم تم ایک ہی بستی میں بستے ہیں سو تس پر یہ غضب ہے دیکھنے کو بھی ترستے ہیں

سختیاں درد و محبت کی نہ پوچھو ہے ہے جی ہی جانے ہے جو کچھ دل نے اذیت پائی

یہ نہ کہہ یاد آئی کس کی جو کلیجے پر مرے سانس کے لینے میں اک برچھی سی لگ جانے لگی۔

اختصار کی غرض سے اتنی ہی مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں ورنہ اس قسم کے تیر و نشتر جرأت کے یہاں بہت ہیں اور ایسا تو نہیں ہے کہ جرأت کے یہ اور اسی قسم کے دوسرے اشعار نیاز صاحب کی نظر سے نہیں گزرے لیکن اس کا کیا علاج کہ ان کی مومن پرستی جرأت کے ساتھ انصاف کرنے کی روادار بھی ہی نہیں اور اسی لئے جرأت کے صرف عامیانہ اشعار کو سامنے رکھ کر جتنی پست رائے قائم کی جا سکتی تھی وہ اس کا اظہار کر گئے اور اس ضمن میں انھوں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ جن تیروں سے وہ جرأت کو مجروح کر رہے ہیں ان کا نشانہ مومن کو بھی بنایا جا سکتا ہے مثلاً انھوں نے مومن کی پاکیزگی ذوق کا جو قصیدہ لکھا ہے اس کی تشبیب میں یہ فرما گئے کہ "جرأت و انشا اگر اپنی تمنا میں کامیاب نہیں ہوتے تو وہ ترک محبت کے لئے بھی آمادہ ہو جاتے ہیں۔" لیکن کیا اس جرم کے گنہگار مومن نہیں ہیں ؟۔ آخر نیاز صاحب مومن کا یہ شعر کیوں بھول گئے ؎

معشوق سے بھی ہم نے نبھائی برابری واں لطف کم ہوا تو یہاں پیار کم ہوا

جرأت کا پست کلام بغایت پست سہی لیکن جہاں انھوں نے صحیح اور پاکیزہ رنگ کی شاعری کی ہے وہاں جذبات کی متانت شائستگی اور بلندی، تجربات کے خلوص اور واقعیت، اور انداز بیان کی روانی - سلاست اور حلاوت کے اعتبار سے وہ کہیں کہیں مومن کے ہمسر اور اکثر جگہ برتر نظر آتے ہیں علاوہ ازیں جرأت کے یہاں لسانیاتی شاعری کے بھی بعض پر کیف نمونے ملتے ہیں اور یہ وہ عنصر ہے جس سے مومن کا کلام بالکل خالی ہے ۔

اب غالب اور مومن کے موازنہ پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے۔ جناب آسی میرٹھی جنھوں نے "غالب و مومن" کے عنوان سے رسالہ نگار کے مومن نمبر میں ایک مقالہ لکھا ہے اس میں انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ تغزل کے اعتبار سے مجموعی طور پر ان دونوں میں کون کس سے بہتر ہے۔ انھوں نے دونوں کے ہمقافیہ اور ہم مضمون اشعار کا موازنہ کرتے ہوئے کہیں غالب کے شعر کو بہتر قرار دیا ہے کہیں مومن کے شعر کو برتر ٹھہرایا۔ جناب معجز سہسوانی نے بھی اپنی کتاب "مومن و غالب" میں موازنہ کا یہی طریقہ (ہم قافیہ و ہم مضمون اشعار کا موازنہ) اختیار کیا ہے۔ لیکن انھوں نے نازک خیالی اور معنی آفرینی اور زبان و بیان کی خوبیوں کے اعتبار سے برتری کا تاج مومن کے سر پر رکھا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ آخر میں یہاں تک فرما گئے کہ "شعر اردو کا اعلیٰ سرمایہ مومن کے سوا کہیں نہیں مل سکتا...... خود میر کی حالت یہ ہے کہ ان کے چھ دیوانوں میں ٹھکانے کے شعر سو سوا سو سے زیادہ نہیں ہیں" معجز صاحب نے مومن و غالب کے تقابلی مطالعہ کا جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ موازنہ کا کوئی صحیح معیار نہیں ہے تاہم اگر وہ پوری غیر جانبداری سے کام لیتے تو غالب کی شاعری کو اس قدر فروتر نہ پاتے جس قدر کہ انھوں نے اسے پایا۔ یہ صحیح ہے کہ بقول حالی، مومن نزاکت خیال میں غالب سے سبقت لے گئے ہیں لیکن اب زمانہ یا زمانہ کا ذوق سلیم بتا رہا ہے کہ مومن کی وہی سبقت ان کے شاعرانہ مرتبے کے حق میں کس درجہ مہنگی پڑ رہی ہے اور یہ کتنا اچھا ہوا کہ غالب نے اپنے جوہر اندیشہ کی اس گرمی کا زیادہ مظاہرہ نہیں کیا جو ان سے اس قسم کی شاعری کرانے کا باعث ہوئی ۔ ع

کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

غالب کے فلسفیانہ انداز کے اشعار کو دکھا پھیکا کہنا مومن کے تغزل کی مدح سرائی کا جزو اور مومن پرستوں کا مستقل شیوہ بن گیا ہے۔ چنانچہ معجز صاحب بھی اس "سنت" کے ادا کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ معجز صاحب سے مومن کے کلام میں فلسفہ و تصوف کا فقدان دیکھا نہ جا سکا۔ چنانچہ اپنی تسکین کے لئے انھوں نے یہ بھی ثابت کر دکھایا کہ مومن کے یہاں فلسفہ و تصوّف کی بھی کمی نہیں ہے بلکہ مومن کو غالب پر یہ فوقیت بھی حاصل ہے کہ وہ فلسفہ لکھ جاتے ہیں اور غزل کی رنگینی میں ذرا بھی فرق نہیں آتا۔" اس باب میں معجز صاحب نے جو مثالیں پیش کی ہیں اُن سے آپ بھی لطف اندوز ہوتے چلیں ؎

| | |
|---|---|
| دیکھ کر یہ مجمع امڈا کیا ہی ابر اشک آہ! | حلقۂ اغیار اس کے گرد مہ کا ہالہ تھا |
| تاثیر سوزِ دل کرۂ نار ہے مگر، | اس شعلہ رو کو سینہ سے میرے لگا دیا |
| لئے آب اشک آتشِ عنصر ہے دیکھنا | جی ہی گیا اگر نفس شعلہ زا گئے |

معجز صاحب کی اس معجزانہ کاوش کے متعلق میری رائے سے پہلے پروفیسر ضیاء کی رائے سُن لیجئے۔ موصوف لکھتے ہیں: "غالب کے مقابلہ میں بعض اہلِ قلم مثلاً جناب معجز سہسوانی نے کھینچ تان کر فلسفہ و تصوف کے مضامین مومن کے یہاں تلاش کئے ہیں مگر یہ سعی مشکور نہیں معلوم ہوتی۔"

اگر معجز صاحب کی یہ سعی مشکور بھی ہو جب بھی اس میں کیا شبہ کہ مومن کے مندرجۂ بالا اشعار غالب کے فلسفیانہ اشعار کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔

غالب کے بعض فلسفیانہ اشعار میں دل کے تاروں کو چھو لینے والی جو کیفیت پائی جاتی ہے وہ بعض اوقات مومن کے تغزل میں بھی محسوس نہیں ہوتی اور یہی وجہ ہے کہ غالب کے بعض فلسفیانہ اشعار مومن کے تغزلانہ اشعار سے زیادہ مشہور و مقبول ہیں حالانکہ ان دونوں کا مفہوم و مقصود ایک ہی ہے۔ مثلاً:-

| | | |
|---|---|---|
| غالب:- | قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں | موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں |
| مومن:- | چھٹ کر کہاں اسیرِ محبت کی زندگی | ناصح یہ بندِ غم نہیں قیدِ حیات ہے |
| غالب:- | رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج | مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں |
| مومن:- | منظور ہو تو وصل سے بہتر ستم نہیں | اتنا رہا ہوں دور کہ ہجراں کا غم نہیں |

غالب کے یہ اشعار تغزل کے دائرے سے باہر سہی لیکن ان میں غزلیت کی روح کارفرما ہے۔ ان میں وہی تعمیم، وہی آفاقیت وہی خلوص اور وہی صداقت اور لب و لہجہ کی وہی نرمی موجود ہے جو ہر اچھی غزل یا غزل کے ہر اچھے شعر میں پائی جاتی ہے۔ ان اشعار کو خشک فلسفہ کہہ کر گزر جانا تعصب کے لئے آسان سہی لیکن انصاف کے بس کی بات ہرگز نہیں۔ معجز صاحب کا یہ کہنا بھی کھلی ہوئی ناانصافی ہے کہ غالب کے زیادہ تر اشعار ایسے ہیں جن کو نہ فارسی کہا جا سکتا ہے اور نہ اُردو بلکہ اکثر شعر معمے اور چیستان ہیں۔ فصاحت سے بیگانہ غیر متعارف ترکیبوں سے مملو اور معانی کے لحاظ سے بھی کوہ کندن و کاہ برآوردن کے مصداق ہیں۔ شارحین کا جگر خون ہوا اور کچھ ہاتھ نہ آیا۔"

غالب کے دیوان میں ایسے اشعار جن میں مغلق الفاظ اور ثقیل تراکیب استعمال کئے گئے ہیں، جو مفہوم و معنی کے اعتبار سے پیچیدہ اور گنجلک ہیں ان کی تعداد ان اشعار کے مقابلہ میں کم ہے جو معنوی خوبیوں سے قطع نظر زبان و بیان کے اعتبار سے بھی

صفائی و شستگی، تناسب و توازن، ایجاز و اختصار کے دلکش نمونے ہیں۔ البتہ میرؔ کے سے سادہ اور سلیس اشعار ان کے یہاں بہت کم ملتے ہیں۔ لیکن غالبؔ کی زیادہ تر غزلوں میں، جو زبان استعمال کی گئی ہے وہ ایسی نہیں کہ اُسے اُردو کہنے کے لئے کھینچ تان کی ضرورت ہو اور رعایت سے کام لینا پڑے۔ میرؔ کی سی ٹھیٹھ اردو خود مومن کے کلام میں کہیں کہیں نظر آتی ہے ان کی زبان میں بھی فارسی کا عمل دخل غالبؔ سے کچھ کم نہیں، وہ اس باب میں جس طرح غالبؔ ہر جگہ حد اعتدال کے اندر نہ رہ سکے اسی طرح مومنؔ بھی متعدد مقامات پر بے اعتدالی کے شکار ہو گئے۔ چنانچہ غالبؔ کی طرح مومنؔ کے یہاں بھی کچھ ایسے اشعار پائے جاتے ہیں جن میں سے ایک آدھ لفظ ہٹا دیا جائے تو مصرع یا شعر فارسی کا ہو جائے۔ مثلاً ؎

اشک دا زدو نہ اثر باعثِ صد جوش ہوا
ہچکیوں سے میں یہ سمجھا کہ فراموش ہوا

از لبسکہ تھی وصال میں غیروں سے ہمسری
عیش و سرور باعث رنج و تعب ہوا

وقت جوش بحر گریہ میں جو گرم نالہ تھا
حلقۂ گرداب رشک شعلۂ جوالہ تھا

آگ کیا ہم کو لگائی ابر نے تیرے بغیر
وقت بارش اخگر خورشید تف ہر ژالہ تھا

پس شکستن خم زجر محتسب معقول
گناہگار نے سمجھا گناہگار مجھے

پھر سینہ سوز داغ غم شعلہ فام ہے
پھر گرم جوشی دل و سودائے خام ہے

یاد آگیا زبس کوئی مہ روے مہر وش
امید داغ تازہ سپہر کہن سے ہے

لیکن جس طرح یہ کہنا غلط ہے کہ مومنؔ کے کلام کی عام زبان یہی ہے اُسی طرح غالبؔ پر بھی یہ الزام رکھنا درست نہیں کہ ان کے زیادہ تر اشعار کی زبان وہ ہے جسے نہ اُردو کہہ سکتے ہیں اور نہ فارسی، اُردو اور فارسی کے خوشگوار امتزاج سے جو زبان وجود میں آسکتی تھی اس کی پہلی اور دلکش مثال غالبؔ کے یہاں ملتی ہے جہاں تک انداز بیان کا تعلق ہے۔ فصاحت بلاغت اور ایجاز و اختصار کے لحاظ سے بھی غالبؔ مومنؔ سے پیچھے نہیں بلکہ روانی اور ترنم کے اعتبار سے خود مومنؔ کو بہت پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ رہا یہ الزام کہ غالبؔ کے زیادہ تر اشعار کوہ کندن و کاہ برآوردن کے مصداق ہیں سو اس بارے میں اتنا کہنا کافی ہے کہ اگر غالبؔ کے مختصر سے دیوان کے زیادہ تر اشعار ایسے ہی ہوتے تو کم از کم موجودہ دور انھیں فراموش کر چکا ہوتا۔ غالبؔ کی مقبولیت اور عظمت ان کے پرستاروں کے زور قلم کا صدقہ یا اس دور کی بے بصری کا نتیجہ نہیں ہے اُن کے یہاں کوہ کندن و کاہ برآوردن کے مصداق گنتی کے چند شعر نکلیں گے۔ دراصل یہ خوبی یا خامی زیادہ تر مومنؔ ہی کے اشعار میں پائی جاتی ہے بشرطیکہ ان کے منظوم خرافات و مہملات کو نازک خیالی اور مضمون آفرینی سے تعبیر نہ کیا جائے۔

متجز صاحب نے غالبؔ و مومنؔ کا موازنہ کرنے سے پیشتر غالبؔ کی لسانی اور فنی غلطیوں کے چند نمونے پیش کئے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ وہ نمونے غالبؔ کی لغزشوں کے آئینہ دار ہیں۔ لیکن اس باب میں متجز صاحب کا ایک اعتراض ایسا ہے جو اگر ان کی کم سوادی کا تقاضا نہیں تو ناانصافی کا نتیجہ یقیناً ہے۔ وہ غالبؔ کے اس شعر پر ؎

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں "اُردو غزل کا یہ مسلمہ ضابطہ ہے کہ معشوق کو مذکر لکھا جاتا ہے فعل اور ضمیر سب مذکر لاتے ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا چاہیے تھا کہ اگر یہی پری زاد وہاں حوریں ہو گئے" مجھے یقین ہے کہ اگر مندرجہ بالا شعر غالبؔ کی بجائے مومنؔ کا ہوتا تو متجز صاحب اسے مومنؔ کے اجتہادات میں شمار کرتے ہوئے کہتے کہ دیکھئے جس طرح مومنؔ نے صنف لطیف کو اپنا محبوب بنا کر امرد پرستی کی مذموم

روایت سے اپنا دامن بچایا ہے اسی طرح محبوب کے لئے صیغہ "تانیث" استعمال کر کے انھوں نے اپنی صحت مذاق کا ثبوت دیا ہے لیکن چونکہ وہ شعر غالب کا ہے اس لئے اس کی سب سے بڑی خوبی کو سب سے بڑی خامی ثابت کرنے کے لئے انھوں نے غزل کے ایک ایسے ضابطے کا سہارا لینے میں تامل نہ کیا جو ایک غیر صحت مند روایت سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا اور اگر یہ بات "ناانصافی" پر مبنی نہیں تو معجز صاحب کی بدمذاقی کی دلیل ضرور ہے کہ وہ پری زادوں اور حوروں کے لئے صیغۂ "تذکیر" کے استعمال پر مصر ہیں۔

معجز صاحب غالب کے کلام میں زبان و بیان کی چند لغزشوں کی طرف اشارہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں: "ہم نے غالب کے سقطات کا استیعاب نہیں کیا۔ نہ ہمارا یہ مقصد ہے کہ مرزا پر طعن و اعتراض کر کے ان کی کسر شان کریں بلکہ باوجود ان کمزوریوں کے ان کی شاعری کا پایہ ہماری نظر میں بہت سے مشاہیر سخنوروں سے بلند ہے اور ہم کو ان کے کمال کا دل سے اعتراف ہے۔ لیکن بنائے عصر کی کوتاہیٔ نظر پر تعجب ہوتا ہے کہ انھوں نے مرزا غالب کے کمال کا نمونہ ان کی اردو شاعری کو قرار دے کر ان کے بلند مرتبہ کو پست کرنے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ مرزا صاحب نے اپنے اردو کلام کی بابت خود ہی فرمایا ہے:۔

بگزر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است

اس میں شک نہیں کہ اگر معجز صاحب غالب کی غلطیوں کا استیعاب کرتے تو وہ مزید مثالیں پیش کر سکتے تھے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا وہ غلطیاں غالب کو مومن سے فروتر ثابت کرنے میں ہو سکتی تھیں۔ یہ بات تو جبھی ممکن تھی کہ خود مومن کا کلام اغلاط سے پاک ہوتا مگر افسوس کہ ایسا نہیں ہے اور اس امر کا اعتراف پروفیسر ضیا جیسے مومن پرست تک کو ہے کہ "مومن اپنی وارستہ مزاجی سے صحت زبان اور صفائی بندش کی پروا نہیں کرتے" یہاں اس کا محل نہیں کہ زبان و بیان کے معاملہ میں کلام مومن کی خامیوں سے گفتگو کی جائے ورنہ میں اپنی علمی کم مایگی کے باوجود مومن کی لغزشوں کے متعدد نمونے پیش کر سکتا ہوں۔ ایک شاعر کو دوسرے شاعر سے برتر ثابت کرنے کے لئے ایک کی خامیوں اور دوسرے کی خوبیوں کو پیش کرنا نہ تو صحیح منطق ہے اور نہ صحیح تنقید۔ رہا معجز صاحب کا یہ دعویٰ کہ غالب کی غلطیوں کی طرف اشارہ کرنے سے ان کا مقصود غالب کی کسر شان نہیں سو ان کی یہ نیک نیتی اپنی ترجمانی آپ کر رہی ہے۔ انھوں نے غالب کے اردو کلام کو بے حقیقت ثابت کرنے کے لئے خود غالب کا یہ قول کہ "بگزر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است۔ اس انداز سے دہرایا ہے کہ پڑھنے والے کہہ اٹھیں۔ جادو وہ جو سر چڑھ کے بولے۔ میں غالب کے قول کی تردید نہیں کرنا چاہتا اور نہ کر سکتا ہوں لیکن اس سے یہ کیونکر لازم آتا ہے کہ اگر ان کا اردو کلام ان کے فارسی کلام کے مقابلے میں بے رنگ ہے تو کلام مومن کے مقابلہ میں بھی اس کا بے رنگ ہونا یقینی ہے۔ غالب کی اردو شاعری ان کی فارسی شاعری سے ہزار پست سہی لیکن وہ بھی اپنے اندر اتنا دم خم رکھتی ہے کہ منصف اردو کے بڑے شاعروں سے ٹکر لے سکتی ہے بلکہ ان میں سے بعض کو شکست بھی دے سکتی ہے اور مومن انھیں شاعروں میں سے ہیں۔ جن کا کلام گہرائی اور گیرائی کے اعتبار سے غالب کے اردو کلام کا مدمقابل تک نہیں کہا جا سکتا۔ نیاز فتحپوری نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "غالب کے یہاں مومن کی سی وہ حقیقت نگاری نہیں جو سینے میں نشتر پر نشتر توڑتی چلی جاتی ہے" اور غالباً اسی خیال کو حسرت موہانی نے ایک جگہ یوں ظاہر کیا ہے کہ "مومن کا کلام درد و تاثیر کے لحاظ سے غالب سے افضل ہے" میں سمجھتا ہوں کہ اس باب میں بھی مومن کو غالب سے برتر قرار دینا صحیح نہیں۔ غالب کے یہاں بھی ایسے اشعار خاصی تعداد میں ملتے ہیں جن کی تاب لانا ایک درد مند دل کے لئے آسان بات نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ مومن و غالب کے کلام میں جو نشتریت پائی جاتی ہے وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے یکساں نہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ مومن کے پر درد اشعار میں رو پڑنے والا انداز نمایاں ہے اور غالب کے ناخن بر جگر اشعار آہوں اور آنسوؤں کو پی جانے والی

کیفیت کے حامل ہیں۔ اس خیال کی تائید و توضیح کے لئے مومن و غالب کے چند ایسے اشعار ملاحظہ ہوں جن میں درد و تاثیر بدرجۂ اتم موجود ہے ؎

مومن :-

کیا کہوں کیونکر رکوں ناصح رُکا جاتا ہے دل　　پیش کیا چلتی ہے اُس سے جس پہ آجاتا ہے دل
تڑپنے لوٹنے رونے کا باعث تجھ پہ بھی کھلتا　　ترے دل کو بھی میری سی اگر اے بے وفا لگتی
حال دل کیونکر کہوں میں کس سے بولا جائے ہے　　سر اُٹھے بالیں سے کیا کچھ جی ہی بیٹھا جائے ہے
اب گریہ میں ڈوب جائیں گے ہم　　یوں آتش دل بجھائیں گے ہم
دم بدم رونا ہمیں، چاروں طرف تکنا ہمیں　　یا کہیں عاشق ہوئے یا ہوگیا سودا ہمیں
چارۂ دل سوائے صبر نہیں　　سو تمھارے سوا نہیں ہوتا

غالب :-

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز　　پھر ترا وقت سفر یاد آیا
ہوگئی ہے غیر کی شیریں بیانی کارگر　　عشق کا اس کو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں
نیند اسکی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اسکی ہیں　　تیری زلفیں جس کے بازو پہ پریشاں ہوگئیں
منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید　　نا امیدی اس کی دیکھا چاہیئے،
زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ　　ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے
نالہ پابند نے نہیں ہے　　فریاد کی کوئی لے نہیں ہے
سوزشِ باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں　　دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

• مندرجۂ بالا مثالوں سے مومن کا گریۂ بے اختیار اور غالب کا صبر و تمکیں نمایاں ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ مومن عشق کی آگ میں جل رہے ہیں اور رو رہے ہیں۔ غالب تپ رہے ہیں مگر جذبات کی حشر سامانیوں کو فریاد و فغاں میں تبدیل نہیں ہونے دیتے یہی وجہ ہے کہ بادی النظر میں مومن کے اشعار غالب سے زیادہ پُر اثر معلوم ہوتے ہیں لیکن ذرا غور کیجئے تو پتا چلتا ہے کہ غالب کے اشعار بھی انتہائی درد و کرب میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

مومن کو غالب سے برتر ثابت کرنے کے سلسلے میں پروفیسر ضیا بھی غالب کے متعلق ایک ایسی بات کہہ گئے جو بالکل عامیانہ ہے، فرماتے ہیں: "یہ طرز (ناسخ و نصیر کا طرز) جس کی بڑی خصوصیت آورد تھی زیادہ عرصہ تک قایم نہ رہی اور دونوں استادوں (غالب و مومن) کے ذوقِ سلیم نے اس کو نباہنے سے ابا کیا۔ آخر غالب نے رنگ میرؔ اختیار کیا اور مومن اپنے ذاتی طرز پر آگئے اس سلسلہ میں یہ بات غور کرنے کے قابل ہے کہ ان کے ہم عصروں میں ذوق و غالب دونوں مقلد ہیں۔ یعنی ایک کے کلام میں سوداؔ، نصیر معروف۔ مصحفی۔ انشاؔ۔ جرأت کا تتبع پایا جاتا ہے اور دوسرے کے یہاں بیدلؔ و میرؔ کا۔ صرف ایک مومن ہیں جن کو مجتہد فن کہا جاسکتا ہے"

مومن کا صاحب طرز ہونا تسلیم۔ لیکن اس کے لئے غالب کو محض بیدل و میر کا مقلد قرار دینا اگر ناانصافی نہیں تو بے بصری یقیناً ہے۔ اس میں شک نہیں کہ غالب اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں بیدل سے اور آخری دور میں میرؔ سے متاثر ہوئے پھر بھی جس چیز نے غالب کو غالب بنایا وہ ان کی اپنی شخصیت اور انفرادیت ہے جو ان کے اسلوب اور معنی دونوں میں کارفرما نظر آتی ہے دنیا میں کوئی ادیب یا شاعر محض مقلد کی حیثیت سے زندہ نہیں رہ سکتا چہ جائیکہ وہ اس عظمت و مقبولیت کا مالک بھی ہو جو غالب کو

حاصل ہے۔

غالب کی طرح ذوق بھی محض مقلد نہیں۔ بلکہ ایک مخصوص طرز و منفرد رنگ کے مالک ہیں۔ تغزل کے اعتبار سے ان کے کلام کا مرتبہ جو کچھ بھی ہو لیکن ان کے کلام کی انفرادیت سے انکار کرنا حقیقت سے روگردانی کے مترادف ہے۔ ان کی انفرادیت کا تعلق اندازِ فکر سے اتنا نہیں جتنا کہ انداز بیان سے ہے اور ان کا انداز بیان اپنی صحت و صفائی، پختگی و مضبوطی کے اعتبار سے کلاسیکل حیثیت رکھتا ہے۔

دنیا میں کوئی شاعر ایسا نہیں جو اپنے بعض پیشرو یا معاصرین سے متاثر نہ ہوا ہو۔ چنانچہ مومن بھی اس باب میں استثنائی حیثیت نہیں رکھتے خود پروفیسر ضیا کو اعتراف ہے کہ مومن کے کلام میں سودا، میر، ناسخ۔ جرأت، امانت اور غالب کے رنگ کے اشعار پائے جاتے ہیں۔ لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ وہ مومن کے کلام میں ان اساتذہ کے رنگ کو صرف اثرات سے تعبیر کرتے ہیں لیکن غالب کے معاملہ میں دوسروں کے اثرات کی بنا پر ان کو سرتاسر مقلد قرار دیتے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی دریافت طلب ہے کہ جب غالب کا اپنا کوئی رنگ نہیں ہے تو پھر مومن کے متعلق یہ اعتراف کرنا کیا معنی کہ ان کے کلام میں غالب کے رنگ کے اشعار بھی پائے جاتے ہیں صرف اتنا ہی کہنا کافی تھا کہ مومن کے کلام میں کہیں کہیں میر کا رنگ بھی جلوہ گر ہے کیونکہ بقول پروفیسر موصوف "آخر غالب نے رنگ میر اختیار کیا۔" حقیقت تو یہ ہے کہ غالب کے یہاں میر کا رنگ صحیح معنی میں ہے ہی نہیں۔ البتہ میر کی سی سادگی ایک حد تک پائی جاتی ہے لیکن صرف زبان کی سادگی کو میر کا رنگ یا طرز نہیں کہا جا سکتا۔ میر کا رنگ جن عناصر سے مرکب ہے ان میں زبان کی سادگی، بیان کی نرمی، لب و لہجہ کا دھیما پن۔ ان کے جذبات کی خستگی و برشتگی سبھی کچھ شامل ہے۔ میر کے ہر اچھے شعر میں یہ تمام عناصر بیک وقت موجود ہوتے ہیں اور ان عناصر کے اجتماع سے جو فضا پیدا ہوتی ہے وہ کم از کم غالب کے یہاں نہیں ملتی۔ غالب کی دنیا میر کی دنیا سے بالکل مختلف نظر آتی ہے۔ غالب کی سادگی میں بھی ایک تہہ داری ہوتی ہے جو میر کے یہاں نہیں مل سکتی پھر ان کے جذبات و تجربات میں بھی میر کی جھلک تک نظر نہیں آتی بلکہ ایک انوکھی شخصیت اور منفرد مزاج کا احساس ہوتا ہے ایک ایسی شخصیت اور ایک ایسا مزاج جو میر کی طرح غم کوش و حسرت پرست نہ ہونے کے باوجود زندگی کے المیہ پہلوؤں کا رازداں ہے، جو غم جاناں کی لذتوں سے آشنا ہونے کے باوصف غم دوراں کی تلخیوں کو فراموش نہیں کر پاتا۔ جو عشق و محبت کے معاملات میں محض پرستار ہونے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ اپنے آپ کو طلبگار کی حیثیت سے بھی پیش کرتا ہے۔ اب آپ غالب کے چند ایسے اشعار ملاحظہ فرمائیں جو میرے نزدیک ان کے مخصوص رنگ کے آئینہ دار ہیں اور جن سے مذکورۂ بالا خیالات کی تصدیق ہوگی ؎

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ بچیں کہاں کہ دل ہے　　غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

درماندگی میں غالب کچھ بن پڑے تو جانوں　　جب رشتہ بے گرہ تھا ناخن گرہ کشا تھا

گو میں رہا رہینِ ستمہائے روزگار　　لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

غمِ زمانہ نے جھاڑی نشاطِ عشق کی مستی　　وگرنہ ہم بھی اٹھاتے تھے لذتِ الم آگے

تری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں　　تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی　　موت آتی ہے پر نہیں آتی

عجز و نیاز سے تو وہ آیا نہ راہ پر　　دامن کو آج اس کے حریفانہ کھینچئے

ان اشعار سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ غالب کے مخصوص رنگ کی جلوہ گری ان کے متفرق اشعار تک محدود ہے۔ ان کے یہاں

ایسی غزلیں کافی تعداد میں ملتی ہیں جس کا ہر شعر ان کے مخصوص رنگ کا حامل ہے۔ میں مثال کے طور پر چند مطلع کے حوالے دینے پر اکتفا کرتا ہوں ؎

کسی کو دے کے دل کوئی نواسنجِ فغاں کیوں ہو | نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو
دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں | روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں
مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے | جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے
عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی | میری وحشت تری شہرت ہی سہی
گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیونکر ہو | کہے سے کچھ نہ ہوا پھر کہو تو کیوں کر ہو
وہ فراق اور وہ وصال کہاں | وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں
آہ کو چاہئے اک عمر اثر ہونے تک | کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک
دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی | دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

تو یہ ہے غالب کا مخصوص رنگ جس کو میر کے طرز سے اتنی بھی نسبت نہیں ہے جتنی کہ بتوں کو کعبے سے رہی ہے یہی نہیں بلکہ غالب اپنے اس رنگ کے لئے کسی بھی اردو شاعر کے مرہونِ منت نہیں ہیں۔ اس کے باوجود غالب کو صاحب طرز ماننے سے انکار کرنا ہٹ دھرمی کے سوا اور کیا ہے۔ یہاں اس کا محل نہیں کہ غالب کے مخصوص رنگ پر تفصیل کے ساتھ بحث کی جائے۔ کیونکہ اس مقالہ کا اصل موضوع مومن کا تغزل ہے۔

میر سے مومن کا باقاعدہ اور تفصیلی موازنہ تو کسی نے نہیں کیا لیکن مومن کے بعض امتی ان کے مرتبے کی تعیین کے سلسلے میں دو تین جملے ایسے لکھ گئے ہیں جو میر و مومن کے طویل سے طویل موازنے پر بھاری ہیں۔ مثلاً متجز صاحب کا یہ جملہ آپ کی نظر سے گزر ہی چکا ہے کہ شعراردو کا اعلیٰ سرمایہ مومن کے سوا کہیں نہیں مل سکتا۔ مرزا غالب نے آخر میں کچھ غزلیں میر کے انداز میں کہیں اور زبان کی سلاست کو مدنظر رکھا لیکن کسی نے ان کو میر کا ہم پلہ تسلیم نہیں کیا۔ حالانکہ خود میر کی یہ حالت ہے کہ ان کے چھ دیوانوں میں ٹھکانے کے شعر سوسوا سو سے زیادہ نہیں ہیں۔ باقی تمام ذخیرہ فحش و ہزل اور انتہا درجہ کا پست کلام ہے۔" تقریباً اتنے ہی ہولناک جملے پروفیسر ضیاء نے بھی لکھے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے " اردو شعرا میں مومن نفس تغزل کے اعتبار سے جس نقطۂ عروج تک پہنچ گئے ہیں دوسروں کو اس کا عشرِ عشیر بھی حاصل نہیں " ایک اور جملہ ملاحظہ ہو۔" مجھے شعرائے اردو میں مومن سے غیر معمولی شغف رہا ہے۔ اور میں (میر کو چھوڑ کر) کسی تغزل میں کسی کو ان کا ہم پایہ نہیں سمجھتا " ستم بالائے ستم یہ ہے کہ متجز صاحب اور پروفیسر ضیاء نے اتنے بلند آہنگ دعووں کے اثبات میں ایک بھی دلیل پیش نہیں کی۔ گویا یہ دعوے کھلے ہوئے حقائق ہیں جن کی صحت میں کسی کو شبہ ہو ہی نہیں سکتا۔ عیاں را چہ بیاں یا آفتاب آمد دلیل آفتاب، اول تو متجز صاحب کا یہ اندازہ ہی غلط ہے کہ میر کے چھ دیوانوں میں ٹھکانے کے شعر سوسوا سو سے زیادہ نہیں ہیں۔ میر کے کلام کا کتنا ہی سخت انتخاب کیوں نہ کیا جائے اچھے اشعار تین چار سو کی تعداد میں ضرور ہی نکلیں گے۔ تھوڑی دیر کے لئے مانے لیتا ہوں کہ میر کے یہاں ٹھکانے کے شعر سوسوا سو سے زائد نہیں لیکن اس کا کیا علاج کہ ان اشعار نے تغزل کا جو معیار قائم کر دیا ہے وہاں تک، اردو کے چند بہترین متغزلین میں سے کوئی بھی نہیں پہونچتا اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس پر میر کے زمانے سے لیکر عہد حاضر تک کے ارباب نظر متفق ہیں۔ کاش متجز صاحب محسوس کر سکتے کہ میر پر خاک ڈال کر مومن کو میر سے برتر ثابت کرنا تو ممکن نہیں البتہ اپنے

ذوق و نغز کو رسوا کرنا آسان ہے۔ پروفیسر ضیا کے پہلے جملے سے نہ صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مومن اردو کے بہترین غزل گو ہیں بلکہ یہ بھی کہ دیگر بلند پایہ متغزلین ان سے بہ مدارج فروتر ہیں۔ پروفیسر موصوف نے دوسرا جملہ کسی قدر سنبھل کر لکھا ہے۔ لیکن اس سے بھی میر کے مقابلہ میں مومن ہی کی برتری کا پہلو نکلتا ہے۔ ان بلند دعووں کو سن کر ممکن ہے خاقانی اور ظہیر فاریابی کی روحیں خوش ہوگئی ہوں کہ اردو شعر میں ان کا ایک جانشین پیدا ہوا۔ لیکن ان دعووں کو صحیح تنقید سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ کاش پروفیسر ضیا کو معلوم ہوتا کہ حد سے گزری ہوئی عقیدت خود صاحب عقیدت کی مٹی پلید کر ڈالتی ہے۔ نیاز فتحپوری نے مومن کو نہ تو میر سے برتر قرار دیا ہے نہ ان کا ہمسر ٹھہرایا ہے۔ لیکن اس کے بعد بھی ان کے نزدیک مومن کا جو درجہ ہے وہ بحث طلب ضرور ہے۔ نیاز صاحب لکھتے ہیں: "اگر میرے سامنے اردو کے تمام شعرائے متقدمین و متاخرین کا کلام رکھ کر (بہ استثنائے میر) مجھ کو صرف ایک دیوان حاصل کرنے کی اجازت دی جائے تو میں بلا تامل کہدوں گا کہ مجھے کلیات مومن دیدو اور باقی سب اٹھالے جاؤ۔" نیاز صاحب کے ان جملوں سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اردو کے شعرائے متاخرین تک تغزل کے اعتبار سے میر کے بعد سب سے بڑا شاعر کون ہے۔ جہاں تک نیاز صاحب کا تعلق ہے ان کا جواب بھی ان ہی جملوں میں پوشیدہ ہے یعنی ان کے نزدیک میر کے بعد غزل کے سب سے بڑے شاعر مومن ہیں۔ لیکن ارباب نظر کے درمیان مومن کا یہ مرتبہ بھی متفق علیہ نہیں ہے۔ چنانچہ یہاں اس امر کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جب میں نے حضرت وحشت کلکتوی سے متذکرہ سوال کیا تو انھوں نے جواب میں مومن کی بجائے داغ کا نام لیا اور جب اس باب میں میں نے اپنے بعض سخن فہم احباب کی رائے دریافت کی تو ان میں کسی نے میر کے بعد مصحفی کو بہترین غزل گو قرار دیا اور کسی نے آتش کو۔ پھر جب میں نے پروفیسر حامد حسن قادری سے رجوع کیا تو انھوں نے یہ لکھا کہ "اس سوال کا ایسی آسانی سے جواب دینے سے معذور ہوں کہ خالص تغزل میں کسی ایک شاعر کو بہترین بنا دوں۔ شاعری میں میرے نزدیک یہ دیکھنا کافی نہیں کہ کیا کہا اور کتنا کہا۔ بلکہ یہ دیکھنا ہے کہ کس طرح کہا۔ مجازی عشق و محبت کی شاعری میں جذبات، معاملات، ادائیں، شانیں سبھی نے لکھیں مگر کثرت و وسعت سے قطع نظر کر کے کہنے کی تازگی اور خوبی میں میر کے بعد مصحفی، غالب، مومن، داغ اور ریاض کے نام لئے جا سکتے ہیں (میں غالب کو مجازی شاعر بھی سمجھتا ہوں اور ریاض کو داغ کا ہمعصر مانتا ہوں۔ امیر مینائی کا شاگرد نہیں) اس خمسہ کے ارکان اپنی انفرادی خوبیوں میں ایک دوسرے سے اس قدر الگ اور ممتاز ہیں کہ ایک کا انتخاب کرنے سے دوسرے کی خوبیاں رہ جاتی ہیں مثلاً مومن کو لے لیجئے تو مصحفی کا لوچ، غالب کی فکر، داغ و ریاض کی زبان اور شوخی رہی جاتی ہے۔ لیکن اگر کسی ایک ہی کو لینا ہو تو ریاض بہتر رہیں گے۔ میں اپنی پسند سے تو عشقیہ شاعری ہو یا فکریہ، غالب ہی کو بہترین سمجھتا ہوں۔"

جب میں نے ان سطور کے جواب میں اپنے سوال کی وضاحت کرتے ہوئے قادری صاحب سے دوبارہ پوچھا کہ آپ کے نزدیک عشقیہ جذبات و محسوسات کی گہرائی کے اعتبار سے میر کے بعد اردو کا بہترین غزل گو کون ہے تو انھوں نے لکھا کہ:-

"بہترین غزل گو کے مسئلے میں آپ نے جذبات و محسوسات کے "گہرے" "اچھے" ہونے کی شرط نہیں لگائی تھی، اعلیٰ عشقیہ شاعری کی اصل روح کا سوال ہو تو میر و غالب کو چھوڑ کر اللہ کا نام ہے۔ میں نے ریاض کو اور دوسروں نے آتش، مومن، داغ کو صرف حسن و عشق کے جذبات و معاملات کی کثرت و وسعت رنگینی اور رنگا رنگی کے سبب سے تجویز کیا ہے۔ اس سے بحث نہیں کہاں میں گہرائی۔ یا آفاقیت ہے یا نہیں۔ یہ اوصاف اگر ملیں گے تو یا چوٹ کھائے ہوئے دلوں میں ملیں گے یا فطرت انسانی اور فطرت عالم سے ہمدردی رکھنے والے ذہنوں میں ملیں گے۔ آتش کے لکھنوی رنگ میں صناعی اور تصنع بے حد ہے۔ مومن اور داغ شاہد باز ہیں۔ ریاض

سستے جذبات سے کھیلنے والے ہیں۔ ان میں اعلیٰ عشقیہ شاعری کو ڈھونڈنا عبث ہے۔ یوں دس دس بیس شعر مل جائیں گے۔ یہ بات مصحفی کے دور تک ملتی ہے خود مصحفی میں ملتی ہے، پھر داغ کے دور میں حالی جیسوں میں ملتی ہے۔ حالی کی غزلوں کا بالاستیعاب مطالعہ کیجئے۔ بہت ہی خوب غزل گو ہے۔"

مندرجہ بالا مختلف رایوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جس طرح میر کے امام المتغزلین ہونے پر تمام اہل نظر کا اتفاق ہے ویسا اتفاق میر کے بعد کسی دوسرے غزل گو کے متعلق ممکن نہیں۔ اس باب میں میں اپنی ذاتی رائے کا اظہار بھی صرف اس لئے نہیں کرنا چاہتا کہ اسے بھی ایک شخص کی "ذاتی پسند" سے زیادہ اہمیت نہیں دی جائے گی۔ ساتھ ہی یہ خیال بھی مانع ہے کہ اس قسم کے پیچیدہ اور نازک مسئلہ میں صرف اپنی رائے ظاہر کر کے الگ ہو رہنا یا آگے بڑھ جانا کوئی معنی بھی نہیں رکھتا۔ اس قسم کی رائے تفصیل کے ساتھ اظہار خیال چاہتی ہے اور اس تفصیل کے لئے ایک علیحدہ مقالہ کی ضرورت ہے۔ اس لئے میں زیرِ نظر بحث کو آئندہ کے لئے اٹھائے رکھتا ہوں۔

مومن کی غزلیہ شاعری کے بنیادی اور اہم پہلوؤں پر دوسرے ارباب قلم کے جن خیالات سے مجھے اختلاف رہا ہے وہ معرض بحث میں آچکے ہیں لیکن یہاں تک جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے میرا مقصود نہ تو مومن کے نقادوں کی تنقیص ہے اور نہ خود مومن کی تحقیر۔ ممکن ہے کہ دوسروں کے خیالات کی تردید میں میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ بھی غلطیوں سے خالی نہ ہو۔

اس مقالہ میں میں نے کئی جگہ مومن کی شاعری کے ناقص پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے لیکن اس سے میرا مقصد مومن کی تضحیک و تحقیر ہرگز نہیں، میں مومن کے تغزل کا قایل ہوں۔ اس مقالہ میں جا بجا ان کے تغزل کے محاسن کا اعتراف کیا گیا ہے۔ اب آپ اُن کی غزلیہ شاعری کے اس حصہ کو ملاحظہ فرمائیں۔ جس کا حُسن اور لطف میرے نزدیک کسی دور میں ختم ہونے کا نہیں کیونکہ اسکی بنیاد خلوص پر ہے اور بقول شخصے اس میں "سچی سچی باتیں ہیں پوری پوری حالت ہے۔"

مومن کا یہ شعر کس نے نہ سنا ہوگا ؎

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا  جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

مومن کے پرستار پروفیسر ضیا نے اپنے مضامین میں جہاں جہاں اس شعر کا حوالہ دیا ہے وہاں اس کے متعلق غالب کا یہ جملہ بھی لکھا ہے ۔ "کاش مومن خاں میرا سارا دیوان لے لیتا اور صرف یہ شعر مجھ کو دیدیتا" اس میں شک نہیں کہ یہ شعر مومن کے بہترین اشعار میں سے ہے۔ لیکن اسی زمین میں مومن کے اور بھی جواہر ریزے ہیں جن کی طرف عموماً توجہ نہیں کی جاتی ؎

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے  ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا
آہ طول امل ہے روز افزوں  گرچہ اک مدعا نہیں ہوتا
دامن اس کا جو ہے دراز تو ہو  دستِ عاشق رسا نہیں ہوتا
چارۂ دل سوائے صبر نہیں  سو تمھارے سوا نہیں ہوتا

مومن کی شاعری میں ناصح اور رقیب کا عمل دخل بہت زیادہ ہے یوں بھی اردو شاعری میں ناصح اور رقیب کا ذکر اتنی کثرت سے کیا گیا ہے کہ ان دونوں کا نام لیتے وقت ذہن میں صرف ایک روایت کا خیال آتا ہے اور بس۔ اور اس میں شک نہیں کہ ہماری شاعری میں ناصح اور رقیب سے متعلق جو مضامین باندھے گئے ہیں وہ زیادہ تر رسمی اور روایتی ہیں۔ بایں ہمہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایک عاشق کی راہ میں ناصح اور رقیب بھی آتے ہیں لہٰذا اگر کسی کی عشقیہ شاعری میں ان دونوں سے

متعلق اچھے اشعار ملیں تو اُن کو نظر انداز کرنا مناسب نہیں ۔ ناصح سے متعلق مومن کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

کہنا پڑا مجھے پئے الزام پند کو — وہ ماجرا جو لائق شرح و بیاں نہیں
اے ناصحو آہی گیا وہ فتنۂ ایام لو — ہم کو تو کہتے تھے بھلا اب تم تو دل کو تھام لو
چھوٹ کر کہاں اسیر محبت کی زندگی — ناصح یہ بند غم نہیں قید حیات ہے
ہوش گئے یاں دل سے پہلے ہوش سے سمجھ تو سمجھیں بات — یہ تو سمجھے حضرت ناصح آپ کسے سمجھاتے ہیں
تو نہ جانے عشق بازی اور ہم ناداں ہوں — بے سمجھ کہتا ہے ناصح تو نے کیا سمجھا ہیں
کیا کروں کیونکر رکوں ناصح رکا جاتا ہے دل — پیش کیا چلتی ہے اُس سے جس پہ آجاتا ہے دل
اس وسعت کلام سے جی تنگ آگیا — ناصح تو میری جان نہ لے دل گیا گیا
ناصح یہ گلہ کیا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا — تو کب مری سنتا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

عام طور پر ناصح سے متعلق اشعار اپنے اندر چاشنی لئے ہوتے ہیں جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ محض تفنن طبع کے طور پر کہے گئے ہیں لیکن مومن کے مندرجہ بالا اشعار کا انداز ان سے قطعی مختلف ہے ان سے یہ بات واضح طور پر مترشح ہے کہ یہ اشعار ان جذبات و تاثرات کی ترجمانی کے لئے کہے گئے ہیں جو عشق و محبت سے بعض آنے کی نصیحتیں سن کر ایک عاشق کے دل میں پیدا ہوتے ہیں ۔ ان اشعار میں ناصح کی تضحیک کہیں نہیں کی گئی البتہ اس کو محبت آشنا دل کی مجبوریاں سمجھانے کی کوشش ضرور کی گئی ہے اور وہ بھی ایسے پیرائے میں کہ ان اشعار کو پڑھتے وقت عاشق کی دل سوزیوں میں شریک ہونے کے باوجود ناصح سے نفرت نہیں پیدا ہوتی البتہ اُس پر رحم ضرور آتا ہے ۔

رقیب سے متعلق بھی مومن کے دو تین شعر سن لیجئے :-

جان نہ کھا وصل عدو سچ ہی سہی پر کیا کروں — جب گلہ کرتا ہوں ہمدم وہ قسم کھا جائے ہے
یاس دیکھو کہ غیر سے کہہ دی — بات اپنی امیدواری کی

جن لوگوں نے اردو شاعری کے دواوین کا مطالعہ کیا ہے وہ ان دواوین کے صفحات پر ایسے عاشقوں سے دوچار ہوئے ہوں گے جو محبوب کے جور و ستم ناز و غرور، بے التفاتی و بے وفائی، کم نگاہی و کج ادائی، ان تمام چیزوں کو شربت کی طرح پی جاتے ہیں ۔ اور ان کے خلاف لب کشائی کو شان عاشقی کے منافی گردانتے ہیں، حالانکہ ایک گوشت پوست کے بنے ہوئے عاشق کے لئے تسلیم و رضا کا مجسمہ بن جانا ممکن نہیں ۔ چنانچہ محبت میں ایسے لمحات بھی آتے ہیں جبکہ عاشق اپنی تمام چاہت اور محبت کے باوجود محبوب سے روٹھ جاتا ہے، اس سے رشتۂ محبت منقطع کر لینے پر آمادہ ہو جاتا ہے ۔ اس کو سخت و سُست باتیں کہہ دیتا ہے ۔ اس کو منانے کی بجائے خود منائے جانے کا آرزو مند ہوتا ہے ۔ یہ اور بات ہے کہ اس قسم کے جذبات ہنگامی ہوتے ہیں رنجش اور خفگی کے عالم میں عاشق جن باتوں کا ارادہ کر لیتا ہے ان کو عمل میں لانے پر قادر نہیں ہوتا ۔ اور کچھ ہی دیر میں اپنے دل کے ہاتھوں اس شعر کا مصداق بن جاتا ہے ؎

پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں — پھر وہی زندگی ہماری ہے

چونکہ مومن کا عشق بھی ایک گوشت پوست کے انسان کا عشق ہے لہٰذا وہ بھی اپنے عشق کے باوجود محبوب کے سامنے ہمیشہ سر تسلیم خم کئے نظر نہیں آتے ۔ بلکہ خاموش شکایت سے لے کر برملا طعن و طنز تک تمام مرحلوں سے گزرتے دکھائی

دیتے ہیں - چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

مت پوچھ کہ کس واسطے چپ لگ گئی ظالم		بس کیا کہوں میں کیا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
کچھ سن کے جو میں چپ ہوں تو تم کہتے ہو بولو		سمجھو تو یہ تھوڑا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
بے وفا کہنے کی شکایت ہے		تو بھی وعدہ وفا نہیں ہوتا
جن سے منظور وفا ہے، ہو جفا بھی ان پر		مجھ سے کچھ کام نہیں ہے تو ستلئے کیوں ہو
تڑپنے لوٹنے رونے کا باعث تجھ پہ بھی کھلتا		ترے دل کو بھی میری سی اگر اے بیوفا لگتی
عیش میں بھی تو نہ جاگے کبھی تم کیا جانو		کہ شب غم کوئی کس طور بسر کرتا ہے
بخت بد نے یہ ڈرایا ہے کہ کانپ اٹھتا ہوں		تو کبھی لطف کی باتیں بھی اگر کرتا ہے
ٹھانی تھی دل پہ اب نہ ملیں گے کسی سے ہم		پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم
آپ کی کونسی بڑھی عزت		میں اگر بزم میں ذلیل ہوا

جب دل میں جذبات کا طوفان برپا ہوتا ہے تو انسان اظہار تمنا اور عرض مدعا سے قاصر رہتا ہے اور اگر کچھ کہنے کی کوشش کرتا بھی ہے تو الفاظ ساتھ نہیں دیتے - بلکہ وفور جذبات کے باعث لبوں سے الفاظ نکلنے کے بجائے آنکھوں سے صرف آنسو نکلتے ہیں - مومن نے اس کیفیت کی کتنی عمدہ تصویر کھینچی ہے :-

نالہ ہی نکلے ہے گو ہم مدعا کہنے کو ہیں		لب نہیں کھلنے میں اب کیا جانے کیا کہنے کو ہیں

مومن نے اس زمین میں اور بھی کئی عمدہ شعر کہے ہیں ؎

دوست کرتے ہیں ملامت غیر کرتے ہیں گلہ		کیا قیامت ہے مجھی کو سب برا کہنے کو ہیں
ترجمان التماس شوق ہے تغیرِ رنگ		جوں زبانِ شمع عاشق بے صدا کہنے کو ہیں
شکوہ حرف تلخ کا یا شور بختی کا گلہ		ہم جو کچھ کہنے کو ہیں سو بے مزا کہنے کو ہیں
غیر سے سرگوشیاں کیجئے پھر ہم بھی کچھ		آرزو ہائے دل رشک آشنا کہنے کو ہیں

محبوب نے عاشق کے چشم شوق پر افشائے محبت کا الزام عاید کیا - عاشق الزام کی تردید میں کہتا ہے کہ خود تمہاری محجوب نگاہی نے راز محبت کو فاش کرنے میں کونسا دقیقہ اٹھا رکھا تھا جو چشم شوق کو ملزم ٹھہراؤں ؎

میں اپنی چشم شوق کو الزام خاک دوں		تیری نگاہ شرم سے کیا کچھ عیاں نہیں

دیوان مومن میں کئی جگہ مسلسل غزلیں ملتی ہیں ایک غزل میں اس خیال کا اظہار کیا گیا ہے کہ اگر ہم دام محبت میں گرفتار نہ ہوتے تو روح و قلب کی کن اذیتوں سے محفوظ رہتے - دو چار شعر سے قطع نظر پوری غزل مرصع ہے اور ہر شعر درد و حسرت کا مرقع - ملاحظہ ہو ؎

جو پہلے دن ہی سے دل کا کہا نہ کرتے ہم		تو اب یہ لوگوں کی باتیں سنا نہ کرتے ہم
اگر نہ ہاتھ میں اس دلربا کے دل دیتے		تو دل پہ ہاتھ سدا دھر لیا نہ کرتے ہم
اگر نہ دام میں زلف سیہ کے آجاتے		تو یوں خراب و پریشاں رہا نہ کرتے ہم
اگر نہ لگتی چپ اس بدگماں کی شوخی سے		تو بات بات میں مضطر ہوا نہ کرتے ہم

اگر جلاتے نہ اس شعلہ رو کے عشق میں جی　　تو سوزِ آتشِ غم سے جلا نہ کرتے ہم
نہ جاتے اس بت ہر جائی کی گلی میں اگر　　تو دوڑے دوڑے قلق سے پھرا نہ کرتے ہم
اس آفتِ دل و جاں پر اگر نہ مر جاتے　　تو اپنے مرنے کی ہر دم دعا نہ کرتے ہم
نہ بھرتے دم جو کسی شعلہ رو کی خواہش کا　　تو ٹھنڈی سانس ہمیشہ بھرا نہ کرتے ہم
اگر نہ آنکھ تغافل شعار سے لگتی　　تو بیٹھے بیٹھے ہی یوں چونک اٹھا نہ کرتے ہم
نہ ہوش کھوتے اگر اس پری کی باتوں پر　　تو آپ ہی آپ یہ باتیں کیا نہ کرتے ہم
اگر نہ ہنسنا ہنسانا کسی کا بھا جاتا　　تو بات بات پر یوں رو دیا نہ کرتے ہم
اگر نہ دیکھتے وہ پیاری پیاری صورت آہ　　تو ایک ایک کے منہ کو تکا نہ کرتے ہم

نظیریِ نیشاپوری کی ایک مسلسل غزل ہے ؎

چشمش براہے میرو مژگانِ تمناکش فگر　　در سینہ دارد آتشے پیراہنِ چاکش نگر

جیسا کہ مطلع سے ظاہر ہے اس غزل میں نظیری نے یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ اس کا محبوب خود کسی اور کا والہ و شیدا ہو گیا ہے پوری غزل اُن واقعات کی ایک دلکش تصویر ہے جو ایسی حالت میں محبوب کو پیش آسکتے ہیں۔ غالباً اسی غزل سے متاثر ہو کر غالب نے بھی اسی زمین میں اسی مفہوم کی غزل لکھی ہے جس کا مطلع یہ ہے :۔

در گریہ از بس نازکی رخ ماندہ برخاکش نگر　　واں سینہ سودن از تپش برخاک تمناکش نگر

کیفیتِ تغزل کے اعتبار سے نظیری کی غزل غالب سے بدرجہا بلند ہے۔ اُردو میں اس انداز اور اس معیار کی غزل جہاں تک مجھے علم ہے مومن کے سوا کسی اور نے نہیں لکھی۔ نظیری کی طرح مومن کی غزل بھی غالب سے برتر و بہتر ہے۔ مجھے اس غزل کے مطلع کا پہلا مصرع اور ایک شعر (سرمہ دینے لگتے ہو جس وقت رونا آئے ہے) کیونکہ میرے خیال میں مطلع کا پہلا مصرع "محض برائے بیت" کہا گیا ہے اور متذکرہ شعر کا مضمون غزل کے دوسرے اشعار سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ اب آپ پوری غزل ملاحظہ فرمائیں اور اس پر مومن کے نقادوں کی خاموشی کا جس قدر ماتم کر سکیں کر لیں ؎

کیوں بنی خوں نالہ نوشی بادہ خواری آپکی　　کس لئے ہے بے خودی، غفلت شعاری آپکی
کیوں دمِ جانانہ کے بدلے ہے از خود رفتگی　　کس لئے شوخی ہوئی ہے بیقراری آپ کی
مشتعل سازِ دمِ ناہید نغمے کیا ہوئے　　کیوں گزرتی ہے فلک سے آہ و زاری آپکی
آشنا سے ہو گئے بیگانگی جاتی رہی　　ہو گئی کس آشتی دشمن سے یاری آپ کی
بوئے گل سے ہو مکدر کس کی بو آتی ہے یاد　　خاک اُڑانے کیوں لگی بادِ بہاری آپ کی
عشقِ مہ رو میں تڑپتے ہو نہیں تو کس لئے　　جوں کتاں ہر شب قبا ٹکڑے ہے ساری آپ کی
مجھ کو حیراں دیکھ کر حیراں رہ جاتے ہو کیوں　　ایسی مجھ یاس ہے امیدواری آپ کی
جی جلا جاتا ہے کیوں ہر لحظہ کس پر دل گیا　　لے گئی قابو سے جاں بے اختیاری آپ کی
کیوں ہے رنگ زرد پر گلگونۂ اشک سرخ کا　　کس لئے ملنے لگی رنگت ہماری آپ کی
ہائے کیا بیتاب ہو کر دھر لیا سینے پہ ہاتھ　　کھل گئی بیہوش کہے سے دلفگاری آپ کی

سرمہ دیتے تھکتے ہو جس وقت رونا آئے ہے
بلے ہے اب تک تو باقی شرمساری آپ کی

دل گیا دم پر بنی آنکھیں لڑیں کھٹکا ہے دل
بیقراری، آہ و زاری، اشکباری آپ کی

کس صنم کی بندگی میں بت پرستی چھوڑ دی
ہو گئی مومن کی سی کیوں دینداری آپ کی

مومن کی ایک مسلسل غزل ہے جس میں انھوں نے عاشقانہ مجبوریوں اور والہانہ بے اختیاریوں کی طرف بڑے دلکش پیرایہ میں اشارا کیا ہے ۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

توبہ ہے کہ ہم عشق بتوں کا نہ کریں گے
وہ کرتے ہیں اب جو نہ کیا تھا نہ کریں گے

ٹھہری ہے کہ ٹھہرائیں گے زنجیر سے دل کو
پر برہمی زلف کا سودا نہ کریں گے

گرآ۔ نہ سکے وصل نے بیمار کیا تو
پرہیز کریں گے پہ مداوا نہ کریں گے

رکھیویں گے پتھر گراں سنگ دلوں کو
چھاتی سے لگانے کی تمنا نہ کریں گے

گر حسن گلو سوز نے پھر آگ لگائی
کیوں آب دم تیغ سے ٹھنڈا نہ کریں گے

جوں قبلہ نما گرچہ تڑپتے ہی کٹے عمر
پر منھ سوئے دیر صنم آرا نہ کریں گے

اے حضرت مومن یہ مسلم جو ہے ارشاد
بھولے سے بھی اب ذکر بتوں کا نہ کریں گے

لیکن جو بتوں نے ہی بھلا آپ سے کی بات
پھر آپ ہی فرمائیں کہ کیا کیا نہ کریں گے

اسی زمین میں مومن کی ایک اور غزل ہے جو مسلسل نہیں ہے ۔ اس غزل کا ایک شعر ہے :-

کیونکر یہ کہیں منت اعدا نہ کریں گے
کیا کیا نہ کیا عشق میں کیا کیا نہ کریں گے

نفسیاتِ محبت کا کتنا صحیح مطالعہ ہے اور اس کے اظہار میں کس قدر صداقت سے کام لیا گیا ہے ۔

مومن کی ایک اور مسلسل غزل ملاحظہ ہو جو نہ صرف ان کی مسلسل غزلوں بلکہ تمام غزلوں میں سب سے زیادہ مشہور و مقبول ہے ۔ مومن کے متذکرہ نقادوں نے اپنے مضامین میں اس غزل کے متعلق کچھ کہنا تو درکنار کسی عنوان سے اس کا حوالہ اور اقتباس تک نہیں دیا ۔ حالانکہ اس میں شک نہیں کہ یہ غزل مقبول عام ہونے کے ساتھ ساتھ مقبول خواص بھی ہوگی اور مومن کے نقاد بھی اس سے لطف اندوز ہوئے ہوں گے ۔ اس غزل کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کی بنیاد مومن کے فلک پیما تخیل پر نہیں بلکہ ان تجربات پر ہے جو ان کی محبت میں پیش آئے یا جو محبت میں کسی کو بھی پیش آسکتے ہیں معاملہ بندی کا اس قدر دل آویز نمونہ دوسرے شعرا کے یہاں مشکل سے مل سکے گا ؎

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ جو لطف مجھ پہ تھے بیشتر وہ کرم کہ تھا مرے حال پر
مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ نئے گلے وہ شکایتیں، وہ مزے مزے کی حکایتیں
وہ ہر ایک بات پہ روٹھنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی بیٹھے سب میں جو روبرو تو اشارتوں ہی سے گفتگو
وہ بیان شوق کا برملا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ہوئے اتفاق سے گر بہم تو وفا جتانے کو دم بدم
گلۂ ملامت اقربا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کوئی بات ایسی اگر ہوئی کہ تمھارے جی کو بری لگی
تو بیاں سے پہلے ہی بھولنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

سنو ذکر ہے کئی سال کا کہ کیا اک آپ نے وعدہ تھا
سو نباہنے کا تو ذکر کیا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ بگڑنا وصل کی رات کا وہ نہ ماننا کسی بات کا
وہ نہیں نہیں کی ہر آں صدا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جسے آپ گنتے تھے آشنا جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومن مبتلا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

اب کچھ اور اشعار بغیر کسی تمہید و تشریح کے سنئے اور لطف اٹھائیے ؎

دل لگانے کے تو اٹھائے مزے
جی بلا سے رہا نہ رہا

شب غم فرقت ہمیں کیا کیا مزے دکھلائے تھا
دم رکے تھا سینے میں کم بخت جی گھبرائے تھا

یا تو دم دیتا تھا وہ یا نامہ بر بہکائے تھا
تھے غلط پیغام سارے کون یاں تک آئے تھا

ہو گئی دو روز کی الفت میں کیا حالت ابھی
مومن وحشی کو دیکھا اس طرف سے جائے تھا

کیا خجل ہوں اب علاج بے قراری کیا کروں
دھر دیا ہاتھ اس نے دل پہ تو بھی دل دھڑکا کیا

یہ عذر امتحان جذب دل کیسا نکل آیا
میں الزام اس کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

کس دن تھی اس کے دل میں محبت جو اب نہیں
سچ ہے کہ تو عدو سے خفا بے سبب ہوا

یہ کسی سے ہو کہ ان کے طعنوں پہ گستاخی نہ ہو
غیر ہم سا کب ہوا ہر چند ہم سا ہو گیا

شعلۂ دل کو ناز تابش ہے
اپنا جلوہ ذرا دکھا جانا

آنکھیں جو ڈھونڈتی ہیں نگہ ہائے التفات
گم ہونا دل کا وہ مری نظروں سے پا گیا

بے جائے واں بنے ہے نہ بن جائے چین ہے
کیا کیجئے ہمیں تو ہے مشکل سبھی طرح

اے دل وہ شوخ ستمگر تو یک طرف
پیغام لے کے بھی کوئی آیا نہیں ہنوز

کیا دکھ نہ دیکھے عشق میں کیا کیا نہ پائے داغ
زخموں پہ زخم جھیلے ہیں داغوں پہ کھائے داغ

لے شب وصل غیر بھی کاٹی
تو مجھے آزمائے گا کب تک

ڈوبا جو کوئی آہ کنارے پر آگیا
طغیان بحر عشق ہے ساحل کے آس پاس

ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے
صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں

کہتے ہیں تم کو ہوش نہیں اضطراب میں
سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں

ہے منتوں کا وقت شکایت رہی وہی
آئے تو ہیں منانے کو پر وہ عتاب میں

اے حشر جلد کر تہ و بالا جہان کو
یوں کچھ نہ ہو امید تو ہے انقلاب میں

اُس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا چمک جائے ہے آواز تو دیکھو

صبح عشرت وہ نہ شام وصال
ہائے کیا ہو گیا زمانے کو

عابد فریب شوخی و رغبت فزا نگاہ
میں کیا کسی سے صبر تجھے دیکھ کر نہ ہو

اعجاز سے زیادہ ہے سحر اس کے ناز کا
آنکھیں وہ کہہ رہی ہیں جو لب سے بیاں نہ ہو

اک لحظہ نہیں قرار جی کو
موت آئے بس ایسی زندگی کو

یارب وصال یار میں کیوں کر ہو زندگی
نکلی ہی جان جاتی ہے ہر ہر ادا کے ساتھ

دستِ جنوں نے میرا گریباں سمجھ لیا — اُلجھا ہے ان سے شوخ کے بندِ قبا کے ساتھ

حال دل کیونکر کہوں میں کس سے بولا جائے ہے — سر اُٹھے بالیں سے کیا کچھ جی ہی بیٹھا جائے ہے

کہیں تو کیا کہیں اور بن کہے کیونکر دوا ہو دے — بڑی مشکل پڑی کیا چارۂ دردِ نہاں کیجے

ہو کے آزردہ پشیماں ہو کہ میں جس سے کہوں — وہی کہدے کوئی ایسے سے خفا ہوتا ہے

رشکِ دشمن بہانہ تھا سچ ہے — میں نے ہی تم سے بے وفائی کی

گھر تو اس ماہ وش کا دور نہ تھا — لیک طالع نے نارسائی کی

شب تم جو بزمِ غیر میں آنکھیں چرا گئے — کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے

کیا کیا جواب شکوہ میں باتیں بنا گیا — تو اب بھی دل درست اُسی دلشکن سے ہے

میں بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے — تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

یہ حالت ہے تو کیا حاصل بیاں سے — کہوں کچھ اور کچھ نکلے زباں سے

اردو کی عشقیہ شاعری کی ایک نمایاں خصوصیت یہ رہی ہے کہ اس میں عاشق اور محبوب دو الگ الگ خانوں میں بٹے ہوئے نظر آتے ہیں۔ عاشق صرف عاشق ہے اور معشوق صرف معشوق۔ حالانکہ واقعات کی دنیا میں ایسا نہیں ہوتا۔ جو عاشق ہے وہ محبوب بھی ہوتا ہے اور جو محبوب ہے وہ عاشق بھی۔ مومن کا یہ شعر اسی حقیقت کا اظہار ہے ؎

ہیں اسیر اس کے جو ہے اپنا اسیر — ہم نہ سمجھے صید کیا صیاد کیا

لیکن افسوس یہ ہے کہ اُردو کے دوسرے شعرا کی طرح مومن کی شاعری بھی عاشق اور محبوب کے درمیان اسی فرق کی آئینہ دار ہے جو صید و صیاد کے مابین پایا جاتا ہے۔ ان کی شاعری کے مطالعہ سے اس نتیجہ تک پہنچنا ممکن نہیں کہ مومن صرف صید نہ تھے صیاد بھی تھے اور اُن کا محبوب محض صیاد نہ تھا صید بھی تھا۔ جب میں دیکھتا ہوں کہ انھوں نے اپنے محبوب کے مرثیے میں اس قسم کے اشعار بھی کہے ہیں ؎

افسوس کوئی پردہ نشیں پردہ در نہیں — وہ حُسن جس سے عشق ہو رسوا نہیں رہا

دل میں جگہ نہ ہونے کا کس سے گلہ کروں — وہ قدر دانِ شکوۂ بے جا نہیں رہا

تو میرے دل میں بے اختیار یہ تمنا پیدا ہوتی ہے کہ کاش! مومن نے اپنی غزلیہ شاعری میں بھی اپنے محبوب کی وہی تصویر پیش کی ہوتی جو مندرجۂ بالا دو شعروں کے آئینے میں نظر آ رہی ہے۔ اگر انھوں نے ایسا کیا ہوتا تو وہ اردو کی غزلیہ شاعری میں ایک زبردست انقلاب اور روایت کے بانی ہوتے۔

بہر حال مومن اردو شاعری کے غیر صحت مندانہ روایت کا شکار ہونے کے باوجود جس حد تک صالح تغزل کا حق ادا کر سکے وہ ان کو اردو کے چند بڑے غزل گو شعرا کی فہرست میں شامل کرنے کے لئے کافی ہے۔ اُردو شاعری میں ان کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ ان کے کلام سے ان کے بعد کے کئی شاعر متاثر ہوئے۔ حسرت موہانی، اصغر گونڈوی فراق گورکھپوری وغیرہ کی شاعری مومن کے فیضان سے انکار نہیں کر سکتی۔

# مومن کی ہنر بندیاں

(نیاز فتحپوری)

کلام مومن کے متعلق ملک کے مختلف نقادوں اور تبصرہ نگاروں کی رائیں آپ کی نظر سے گزر چکی ہوں گی۔ اب خود مومن نے اپنی غزلگوئی پر جو تبصرہ کیا ہے وہ بھی سن لیجئے۔ کہتے ہیں :۔

مومن سے اچھی ہو غزل تھا اس لئے یہ زور شور — کیا کیا مضامیں لائے ہیں کس کس ہنر سے باندھ کر

دوسرے ادیبوں اور نقادوں نے مومن کے جس ابداع و اختراع، جس نزاکتِ تخیل و جدتِ بیان کا ذکر مختلف عنوانات کے تحت کیا ہے ان کو مومن نے صرف ایک لفظ ہنر بندی سے ظاہر کر دیا ہے۔

اس میں شک نہیں ہنر بندی بڑی وسیع اصطلاح ہے اور اس میں وہ سب کچھ شامل ہے جو محاسن کلام مومن کے سلسلہ میں کہا جا سکتا ہے۔ لیکن غالباً مومن نے اس کو زیادہ وسیع مفہوم میں استعمال نہیں کیا، بلکہ اس کو محدود کر دیا ہے صرف اس شاعرانہ تعبیر و تعلیل تک جو اپنی جگہ یقیناً کتنی ہی عجیب و نادر کیوں نہ ہو لیکن تغزل سے اسے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ کس قدر عجیب بات ہے کہ مومن جس چیز کو ہنر بندی قرار دیتے ہیں، ہمارے نزدیک وہی ان کی سب سے زیادہ بے اعتدالی ہے۔

ظاہر ہے جس غزل کا یہ مقطع ہے اس میں مومن نے یقیناً بڑی ہنر بندی سے کام لیا ہوگا۔ لیکن کس قدر مایوسی ہوتی ہے۔ یہ دیکھ کر کہ مقطع کو چھوڑ کر اشعار کی اس غزل میں کوئی ایک شعر بھی ایسا نہیں جسے ہم صحیح معنی میں غزل کا شعر کہہ سکیں۔ مطلع اور حسن مطلع جس میں انھوں نے ہنر بندی سے کام نہیں لیا، وہ بھی کچھ نہیں ہیں، لیکن بعض کچھ اشعار جن میں مومن نے ہنر بندی سے کام لیا ہے وہ کچھ نہیں سے بھی زیادہ منفیت اپنے اندر رکھتے ہیں۔

اے تند خو جا کہیں تیغا کمر سے باندھ کر — کن مدتوں سے ہم کفن پھرتے ہیں سر سے باندھ کر

یا وہ ڈبوئے گا زمیں، یا ہم ڈبوئیں گے فلک — آجائے لو روتے ہیں ہم شرط ابرِ تر سے باندھ کر

یہ ہیں غزل کے ابتدائی دو شعر جن کو پڑھ کر اگر تنفض پیدا نہ ہو تو بھی ان میں کوئی بات ایسی نہیں جسے مومن ہنر بندی کہہ سکیں یا ان کو سن کر کوئی فنی و معنوی لطف حاصل ہو سکے۔ تیغا مردہ لفظ ہے لیکن چونکہ تیغ نظم نہ ہو سکتا تھا اس لئے اس میں "ا" کا اضافہ کر دیا۔ "کن مدتوں سے" کہنا بھی فصیح اندازِ بیان نہیں۔

دوسرے شعر کے پہلے مصرعہ میں تقابل صحیح نہیں۔ مقابلہ زمین کے ڈبونے میں ہے اس لئے فلک کا ذکر بے محل ہے۔ مصرعہ یوں ہونا چاہیے تھا

یا وہ ڈبوئے گا زمیں یا ہم ڈبوئیں گے اسے

"اور اگر فلک کی غرقابی کا ذکر کر کے اپنی برتری ثابت کرنا مقصود تھا تو پہلا مصرع یوں ہونا چاہیے تھا۔

گر وہ ڈبوئے گا زمیں، تو ہم ڈبوئیں گے فلک

لیکن خیر چونکہ ان اشعار کا تعلق ہنر بندی سے نہیں ہے اس لئے ان کے متعلق مزید جرح و قدح کا موقع نہیں۔ اب باقی چھ اشعار دیکھئے جن میں واقعی ہنر بندی سے کام لیا گیا ہے اور حیرت کیجئے مومن پر جو بانے مقطع میں اس ہنر بندی کی داد بھی چاہتا ہے۔ تیسرا شعر ہے۔

خط میں تو لکھ سکتا نہیں، احوالِ سوزِ دل لے
پر بھیجدوں جی میں ہے پروانے کے پر سے باندھ کر

شعر کا مفہوم یہ ہے کہ خط میں تو سوزِ دل کا حال لکھنا ممکن نہیں، اس لئے جی چاہتا ہے کہ خط پروانے کے پر سے باندھ کر بھیجدوں۔ تاکہ پروانے کو دیکھ کر محبوب میرے سوزِ دل کا اندازہ کر سکے۔ اب غور کیجئے کہ مومن نے اپنی ہنر بندی کے زعم پر کتنے غلط مفروضات سے کام لیا ہے۔ اول تو پروانے کے پر سے خط باندھا جانا ممکن نہیں (کبوتر کے پر سے البتہ باندھا جا سکتا ہے) دوسرے یہ کہ پروانہ کوئی پرندہ نہیں جو اُڑ کر محبوب تک جا سکے۔ اسلئے ظاہر ہے کہ مومن نے امرِ واقعی کی صورت سے نہیں بلکہ محض تمنا کے انداز میں یہ اندازِ بیان اختیار کیا ہے اور اس سے مقصود صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ "میرے سوزِ دل کا بھی وہی عالم ہے جو پروانے کا ہے" لیکن، ہنر بندی نے اس مفہوم کو جو بجائے خود واقعی کافی اثر انگیز ہے۔ بالکل بے اثر کر دیا۔ علاوہ اس کے دوسرے مصرع میں "شکست" کا عیب بھی پیدا ہو گیا اور تقطیع میں پروانے کے دو ٹکڑے ہو گئے جن کو ملا کر ایک ساتھ نہیں پڑھا جا سکتا۔ ہر چند یہ عیب اکثر اساتذہ کے کلام میں پایا جاتا ہے لیکن ہے بہر حال قابلِ احتراز۔ چنانچہ جہانگیر کے سامنے ایک شاعر نے "اے تاج دولت بر سرت" پڑھا تو جہانگیر کے تیور بگڑ گئے۔ کیونکہ تقطیع میں دولت کے دو ٹکڑے ہو کر دوسرا ٹکڑا "لت بر سرت" ہو جاتا ہے۔ جو بڑی توہین کی بات ہے۔

چوتھا شعر ہے:۔

دشمن سگِ کوچہ نہ ہو، اس شوخ آہو چشم کا
نادم ہوں کعبِ گرگ پائے نامہ بر سے باندھ کر

مومن محبوب کی طرف ایک نامہ بھیجتے ہیں اور اس کے پاؤں میں بھیڑیئے کے ٹخنے کی ہڈی باندھ دیتے ہیں کیونکہ (کہا جاتا ہے) اس ہڈی کے باندھنے سے سفر کی صعوبت کم ہو جاتی ہے۔ لیکن پھر یہ خیال آتا ہے کہ کہیں کوچہ محبوب کا کتا اس کا دشمن نہ ہو جائے۔ (کتے اور بھیڑیئے کی دشمنی مشہور ہے) اس لئے وہ اپنے کئے پر اظہارِ ندامت کرتے ہیں۔

اس شعر میں مومن کی ہنر بندی صرف اس پر موقوف ہے کہ انھوں نے کتا، بھیڑیا اور ہرن تین جانوروں کو اکٹھا کر دیا ہے۔ نفسِ مضمون یکسر تغزل سے خالی ہے اور مبالغہ کی نہایت نامطبوع مثال ...... دوسرے مصرع میں بھی شکست کا عیب ہے کیونکہ پائے کے دو ٹکڑے تقطیع میں ہو جاتے ہیں۔

ہے سرخ ٹیکا اور خونِ غیر میں رنگا ہوا
کیا قتل پر میرے کمر نکلے ہو گھر سے باندھ کر

مصرعِ اول میں خونِ غیر کی تخصیص غیر ضروری ہے۔ اگر ٹیکا خونِ غیر میں رنگا ہوا نہ ہوتا تو کیا وہ مومن کے قتل کرنے کے لئے گھر سے نہ نکلتا۔ رنگا ہوا کا گاف بھی مشدد نظم ہوا ہے جو یقیناً ٹکسال باہر بات ہے۔ پہلا مصرع اگر یوں ہوتا کہ:۔

ہے سرخ ٹیکا اور وہ بھی خون سے رنگین ہے

مصرعِ ثانی میں، کمر اور باندھ کر کے درمیان ایک پورا فقرہ "...... نکلے ہو گھر سے" بڑی معیوب تعقید ہے۔ مفہوم کے لحاظ سے شعر تغزل سے معرّا ہے۔

چھٹا شعر ہے:۔

آ جھانک تو بھی تو کہیں بے دید کیسی ٹکٹکی
بیٹھے ہوئے ہیں روزنِ دیوار دو سے باندھ کر

بے دید مومن نے بے مروت کے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ محبوب سے خطاب کر کے کہتے ہیں کہ اے بے مروت تو کبھی تو کبھی جھانک کر دیکھ لے کہ ہم روزنِ دیوار دور سے کیسی ٹکٹکی باندھ کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ٹکٹکی پہلے مصرع میں ہے اور باندھ کر دوسرے مصرع کے آخر میں، اور اس قسم کی تعقیدات مومن کے یہاں اکثر پائی جاتی ہیں۔

ساتواں شعر ہے:۔
جراح کیا سوچتا کیا رنگ دیکھا کیا ہوا
کیوں کھول دی پٹی مرے زخمِ جگر سے باندھ کر

اس شعر میں مومن نے کسی ہنربندی سے کام نہیں لیا اور دوسرے مصرعہ کا یہ کنائی مفہوم کہ زخمِ جگر لا علاج ہے بہت پرلطف ہے۔

آٹھواں شعر ہے:۔
دیوانۂ نازک ہوں میں فصادِ مژگاں نیشتر
لے فصد میرے ہاتھ کو تارِ نظر سے باندھ کر

اس شعر میں "فصادِ مژگاں نیشتر" کی ترکیب یقیناً مومن کی ہنربندی کی بڑی اچھی مثال ہے۔ اس فقرہ میں فصاد یا محبوب سے خطاب ہے جس کی صفت "مژگانِ نیشتر" ظاہر کی گئی ہے۔ یعنی وہ فصاد جو اپنی مژگان سے نیشتر کا کام لیتا ہے۔ شعر کا مفہوم یہ ہے کہ میں بڑا نازک طبع دیوانہ ہوں اس لئے اے فصاد اگر تو نیشترِ مژگاں سے فصد کھولنا چاہتا ہے تو پہلے میرے ہاتھ کو تارِ نظر سے باندھ دے (قاعدہ ہے کہ فصد لینے سے پہلے ہاتھ پر پٹی باندھ دیتے ہیں)

اس شعر میں مومن صرف یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ میری دیوانگی کا علاج صرف محبوب کی توجہ نظر ہے۔ لیکن اس کو ایک خاص ہنربندی سے ظاہر کیا ہے جو مکروہ و معیوب تو نہیں لیکن ایک حد تک دور از کار ضرور ہے۔

یہ تھی وہ غزل جس کے مقطع میں انھوں نے اپنی ہنربندی کا اظہار بڑے زور شور سے کیا ہے اور اسے واقعی بڑی حد تک نبھایا بھی ہے۔ لیکن اس غزل سے قطع نظر یوں بھی ان کے کلام میں ہنربندیوں کی مثالیں بکثرت نظر آتی ہیں، علی الخصوص ان غزلوں میں جہاں وہ قصیدہ گوئی کی مشکلات میں پھنس گئے ہیں۔ اس قسم کی غزلوں میں ان کی سب سے پہلی غزل جو حمد و نعت سے تعلق رکھتی ہے اسکے بعض اشعار ہنربندی کی بڑی واضح مثال ہیں۔

۱۔ بچاؤں آبلہ پائی کو کیونکر خار ماہی سے … کہ بامِ عرش سے پھسلا ہے یارب پاؤں وقت کا

یعنی حمد کے سلسلے میں میری فکر نہ سنجھ کا پاؤں عرش سے پھسلا ہے اسلئے میں اپنی آبلہ پائی کو خار ماہی سے کیونکر بچا سکتا ہوں۔

اس شعر کا حقیقی مفہوم سمجھنے کے لئے پہلے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ عرش اتنی بلندی پر واقع ہے کہ اس سے زیادہ بلندی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرے اس اساطیری روایت کو سامنے رکھنا ہوگا کہ زمین تحت الثریٰ میں مچھلی کی پیٹھ پر قائم ہے کیونکہ شعر کی بنیاد یہی دونوں تصورات ہیں۔

مومن نے یہ شعر حمد میں لکھا ہے اور کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ تیری حمد و توصیف میرے امکان سے باہر ہے۔ لیکن اس کا اظہار انھوں نے اس طرح کیا ہے کہ ہر چند میرا پائے فکر بامِ عرش تک پہنچ گیا تھا۔ لیکن آخر کار وہاں جم نہ سکا اور جب وہاں سے پھسل کر نیچے آیا تو تحت الثریٰ میں پشتِ ماہی تک پہنچ گیا اور اس کے کانٹوں سے اپنی آبلہ پائی کو نہ بچا سکا۔

عرفی نے بھی بہ سلسلۂ حمد اپنی فکر کی نارسائی کا ذکر ایک جگہ اس انداز سے کیا ہے:۔

من کہ باشم عقلِ کل را نادکِ انداز ادب … مرغِ اوصافِ تو از اوجِ بیاں انداختہ

اور ممکن ہے کہ مومن نے اسی سے متاثر ہو کر یہ شعر لکھا ہو۔ پھر اس میں شک نہیں کہ عرفی نے بھی انتہائی مبالغہ سے کام لیا ہے۔ لیکن اس مبالغے کے بوجھ کو فارسی زبان سنبھال لے گئی اور مومن کا مبالغہ حدِ درجہ تکلف و آورد ہو کر رہ گیا۔ کیونکہ اردو زبان اس اندازِ بیان کی متحمل نہ ہو سکتی تھی۔

اس غزل کے چند اور اشعار اسی انداز کے ملاحظہ ہوں:۔

سرشکِ اعترافِ عجز نے الماس ریزی کی … جگر صد پارہ ہے اندیشۂ خوں گشتہ طاقت کا

"اندیشۂ خوں گشتہ طاقت" یعنی فکر و خیال کی وہ قوت جو سعی حمد میں خون ہو چکی ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ اعترافِ عجز کے آنسوؤں نے الماس ریزی کر کے میرے جگر کو اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

نہ یہ دستِ جنوں ہے اور نہ وہ جیبِ جنوں کیشاں … کہ ہو دستِ مژہ سے چاک پردہ چشمِ حیرت کا

یعنی نہ دستِ مژہ، دستِ جنوں ہے اور نہ پردۂ چشمِ حیرت جیبِ جنوں کیشاں، اس لئے میری حیرت کا پردہ چاک ہونا ممکن نہیں اور میری

حیرانی کبھی دور نہیں ہو سکتی ۔

گلوئے خامہ میں سرمہ مداد دودۂ دل سے          مگر لکھنا ہے وصفِ خاتمہ جلدِ رسالت کا

مداد دودۂ دل (دل کے دھوئیں کی سیاہی) دودہ عربی میں چھوٹے کیڑے کو کہتے ہیں ۔ فارسی میں دود دخان یا دھوئیں کو کہتے ہیں ۔ مومن نے دود کی جگہ دودہ لکھا ہے جس میں غالباً ہائے ہوز زائد ہے ۔ وصف خاتمہ جلدِ رسالت (خاتم الانبیاء کا وصف) مفہوم یہ ہے کہ وصف خاتم الانبیاء لکھنے سے میں عاجز ہوں ۔ کیونکہ میرے دل کے دھوئیں کی سیاہی گلوئے خامہ کے لئے سرمہ ہو گئی ہے اور اب اس سے کوئی آواز پیدا نہیں ہو سکتی (سرمہ کھا لینے سے گلا بیٹھ جاتا ہے)

---

نہ پوچھو گرمیٔ شوقِ ثنا کی آتش افروزی          بنا جاتا ہے دستِ عجز شعلہ شمع فکرت کا

اظہارِ شوقِ ثنا کی آتش افروزی کا یہ عالم ہے کہ میرا دستِ عجز شمع فکر کا شعلہ ہو کر رہ گیا ہے ۔ یعنی اس خیال نے کہ میں حمد و ثنا سے عاجز ہوں مجھے آتش بجاں کر رکھا ہے ۔ تکلف و آورد کی بڑی نامطبوع مثال ہے ۔

---

نمک تھا بختِ شورِ فکر خوانِ مدح شیریں پر          کہ دندانِ طمع نے خوں کیا ہے دستِ حسرت کا

دستِ حسرت ، مدح کے خوانِ شیریں تک نہ پہنچ سکا جس پر میری فکر نمک شور کی حیثیت رکھتی تھی اور اس نارسائی پر دندانِ طمع نے کاٹ کاٹ کر دستِ حسرت کا خون کر دیا (حسرت و تاسف میں دانتوں سے ہاتھ کاٹنا بہت معروف بات ہے) مقصود صرف یہ ظاہر کرنا تھا کہ مدح کی ناکام کوشش نے میری حسرتوں کا خون کر دیا ۔

آپ نے دیکھا کہ ان تمام اشعار میں تقریباً ایک ہی خیال کو ظاہر کیا گیا ہے ۔ یعنی یہ کہ میں حمد و نعت کے فرض سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا اور اس احساس نے مجھے حد درجہ مایوس و مضطرب کر رکھا ہے ۔ لیکن اس کو ظاہر کیا ہے ایسے ناپسندیدہ مبالغہ کے ساتھ جس کا جذبہ و تاثر سے کوئی تعلق نہیں اور اشعار محض الفاظ کی بازیگری ہو کر رہ گئے ۔ !

چونکہ مومن کے عہد میں شاعری نے ایک ایسے فن کی صورت اختیار کر لی تھی جس کا مقصود زیادہ تر فارسی دانی اور جودت ذہن کا اظہار تھا ، اور سادگی سے کوئی بات کہہ دینا خلاف شان سمجھا جاتا تھا ، اس لئے قصیدہ کے ساتھ ساتھ جو اس کا اظہار شخصیت کے لئے مخصوص تھا ، غزل گوئی بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی ۔ پھر چونکہ مومن و غالب دونوں اس عہد کے بہت پڑھے لکھے اور غیر معمولی ذہن رسا رکھنے والے شاعر تھے ۔ اس لئے ممکن نہ تھا کہ اپنی بلندی فکر ظاہر کرنے کے لئے قصائد کے ساتھ ساتھ وہ غزلوں میں بھی یہی رنگ شامل نہ کرتے جس نے بعض اشعار کو بالکل معمہ و چیستاں بنا دیا ۔

سچ پوچھئے تو اس نوع کے اشعار کا تعلق شاعری سے تھا ہی نہیں بلکہ محض بازیگری سے تھا اور وہ بھی گھٹیا قسم کی جو کوہ کندن و کاہ برآوردن سے زیادہ کوئی حیثیت نہ رکھتی تھی ۔

اس وقت میرا مقصود مومن کے اس رنگِ شاعری پر کوئی تفصیلی گفتگو کرنا نہیں ہے بلکہ اجمالاً صرف یہ ظاہر کرنا تھا کہ جو رنگ ان کی نظر میں داخل "ہنر بندی" ہے وہ میری نظر میں یکسر "ناہنر مندی" ہے ۔

میں مومن کے تغزل کا بڑا معترف ہوں ۔ لیکن اس کا تعلق ہنر والے مومن سے نہیں بلکہ اس بے ہنر مومن سے ہے جس نے غزل کو ان نغموں سے مالا مال کیا ۔

پامال اک نظر میں قرار و ثبات ہے          اس کا نہ دیکھنا نگہ التفات ہے
کثرتِ سجدہ سے وہ نقشِ قدم          کہیں پامالِ سر نہ ہو جائے

---

ہے نگاہ لطف دشمن پر تو بند جائے ہے          یہ ستم اے بے مروت کس سے دیکھا جائے ہے
جاں نہ کھا وصل عدو سچ ہی سہی پر کیا کروں          جب گلہ کرتا ہوں ہمدم وہ قسم کھا جائے ہے

---

# کلامِ مومن پر ایک نظر

غلام ربّانی عزیز

مومن تجھے تو دہب ہے مومن ہی وہ نہیں
جو معتقد نہیں تری طبع سلیم کا

میرے تعجب اور حیرت کی انتہا نہیں رہتی۔ جب دیکھتا ہوں کہ ہمارے سخن فہموں نے جو کچھ کرنا تھا وہ تو نہ کیا اور جو نہ کرنا تھا کر بیٹھے۔ ذوق کی خوش ذہنی اور آتش کی آتش بیانی کے ثبوت میں ایسی ایسی زبردست تقریریں اور ایسے ایسے پرجوش مظاہرے ہوئے کہ اگر خود اس وقت آتش اور ذوق موجود ہوتے تو ان نادان دوستوں سے یقیناً برآت و بیزاری کا اعلان کر دیتے۔ مرحوم مرزا نوشہ کے حق میں ان مدعیان سخن فہمی نے جس سرد مہری اور ناقدر شناسی کا ثبوت دیا، وہ کچھ کم نہ تھا۔ مگر کلیجہ منھ کو آتا ہے جب ہم ذرا آگے بڑھتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ہماری بدمذاقی اور کج فہمی کا یہ عالم ہے کہ کئی ایک استادانِ فن کے شاہکار ہمارے ہاں موجود ہیں مگر کوئی ایسا نہیں جو ان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھے اور پھر ان لوگوں سے روشناس کرائے جو فطرتاً دوسروں کے زلہ ربا واقع ہوئے ہیں انھیں قابلِ فخر ہستیوں میں سے مومن مرحوم بھی ہیں جن کے کمالات اور خوبیوں پر آج ہم ایک سرسری نگاہ ڈالنا چاہتے ہیں۔

مومن کی کلیات طبع ہو چکی ہیں۔ جو مثنویات، رباعیات، قطعات، قصائد، غزلیات اور نہ معلوم کن کن اصنافِ سخن پر مشتمل ہیں، مگر سردست ہمیں صرف ان کی غزلیات سے بحث کرنا مقصود ہے باقی اصنافِ سخن ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔ کیوں کہ ہمارے یہاں صرف غزل ہی ایک ایسی چیز ہے جس پر کوئی شاعر بجا طور پر فخر کرنے کا مجاز ہو سکتا ہے اور یہی اس کا وہ کارنامہ ہے جس کے مطابق اسے مولانا آزاد کے دربارِ بقائے دوام میں نشست ملتی ہے باقی اصنافِ سخن کو ہم بجا طور پر اس لائق خیال نہیں کرتے کہ ایک شاعر کے لئے باعث فخر و مباہات ہوں، ہاں ممکن ہے کہ ایک ناظم کے لئے وہ ناقابلِ فنا کارنامہ ہو مگر ناظم اور شاعر میں جو فرق ہے وہ اہلِ نظر اور اہلِ ذوق سے مخفی نہیں۔

مومن نے لمبی اور چھوٹی ہر قسم کی بحروں میں طبع آزمائی کی ہے جس سے ان کی استادی اور قادر الکلامی کا پتہ چلتا ہے، بہرکیف اشعار جس طرح چھوٹی بحروں کی غزلیات میں پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح لمبی بحروں کی غزلیات میں بھی۔ مگر چھوٹی بحروں میں جس طرح ان کو پر لطف مضامین نباہنے میں ید طولیٰ حاصل ہے، لمبی بحروں میں نہیں ہے۔ لمبی بحروں میں جو غزلیں لکھی گئی ہیں وہاں یہ عالم ہے کہ غزلوں پہ غزلیں پڑھتے چلے جاؤ مگر کوئی ایسا شعر نہ ملے گا جسے حقیقی معنوں میں شعر کہا جا سکے بلکہ اشعار میں نظم کا سا رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ ہاں اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض غزلیات بہت ہی پر لطف اور بامزہ ہیں لیکن چھوٹی بحروں میں جو غزلیات لکھی گئی ہیں ان میں مشکل سے ہی کوئی غزل ایسی ہوگی جس میں دو چار تڑپا دینے والے اشعار نہ ہوں۔ گو اس قسم کی غزلیات بہ نسبت

اولی الذکر کے کم ہیں۔ لیکن انتخاب سے واضح ہو جائے گا کہ یہی تمام دیوان کا نچوڑ ہے اور یہی مومن کا وہ کارنامہ ہے جس کے لئے ہم نے قلم اٹھایا ہے۔

ہر زمانے کی ایک مخصوص ادبی فضا ہوتی ہے جس سے ہر چھوٹا بڑا انسان متاثر ہوتا ہے۔ ذوق، غالب، مومن معاصر تھے اور تینوں کی ادبی فضا مشترک تھی۔ ان کے کلام کے باقاعدہ پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح ان کے خیالات باہمی ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں یہی قدرت کا عام عطیہ ہے جس میں ہر ایک تقریباً برابر کا حصہ دار ہوتا ہے۔ بعض دوسری چیزیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کی بنا پر وہ اپنے معاصرین سے ممتاز ہوتا ہے اور جس کا تعلق

"دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر"

سے ہے۔

مومن دونوں فضاؤں (عمومی و خصوصی) میں ایک خاص انداز سے سرگرم پرواز نظر آتے ہیں۔ بعض اوقات وہ اس قدر بلند اُڑتے ہیں کہ غالب ایسے عرش آشیاں اور سدرہ نشیں کے بال و پر وہاں جلنے لگتے ہیں اور بعض اوقات اتنے بھدے اُڑتے ہیں کہ زاغ و زغن بھی ان سے بازی لے جاتے ہیں۔ مومن کی زبان نہایت پاکیزہ و شستہ ہے گو بعض نقادانِ فن کے یہاں ذوق کی زبان اپنے تمام معاصرین سے سلیس اور لطیف سمجھی جاتی ہے مگر میرے نزدیک مومن کی زبان اپنے معاصر سے کہیں زیادہ صاف ہے۔ صنائع لفظی کا التزام جس بے تکلفی سے مومن کے یہاں ہے کہیں نظر نہیں آتا۔ محاورہ کی آمیزش بھی کچھ کم پر لطف نہیں۔ بعض اوقات انھیں صنائع لفظی کے پیچ میں ایسے لطیف مضامین ادا کر جاتے ہیں کہ انسان دنگ رہ جاتا ہے۔

آنکھ نہ لگنے سے سب احباب نے
آنکھ کے لگ جانے کا چرچا کیا

"آنکھ نہ لگنا" شب بیداری کے معنوں میں آتا ہے اور "آنکھ کا لگ جانا" محبت کرنے کے معنی دیتا ہے۔ ہر دو محاوروں کے بیساختہ استعمال نے کتنا اخلاقِ کیف مضمون پیدا کر دیا ہے۔

شب ہجر کی تکالیف کم بخت عاشق کے لیے جس مصیبت اور بلا کا پیش خیمہ ہوتا ہے وہ وہی خوب جانتے ہیں جنھیں کبھی اس بلائے بے درماں سے واسطہ پڑا ہو یہ آپ نے سنا ہی ہوگا کہ شب ہجر طلوعِ سحر سے نا آشنا ہی رہی ہے۔ عاشق انھیں ناقابلِ برداشت تکالیف کے مقابلہ کی تاب نہ لا کر موت کے دامن میں پناہ لیتا ہے۔ موت جسے ہادم اللذات کہتے ہیں اس کی تمام تکالیف کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ مومن موت کی اس مسیحائی کی پوری مدح سرائی فرماتے ہیں۔

زندگیِ ہجر بھی ایک موت تھی
مرگ نے کیا کارِ مسیحا کیا

موت اور زندگی کی صفتِ تضاد نے شعر کو کتنا بلند کر دیا ہے۔

ایک ایسی محفل جس میں ہر خاص و عام محبوب کی شمع حسن سے دیدہ افروز ہو، عاشق کے آنے سے محبوب کا پردہ کے پیچھے چھپ جانا آپ جانتے ہیں راز عشق کی کتنی بڑی غمازی ہے۔ مومن اسی مضمون کو صنائع لفظی کے ہیر پھیر میں کس پُر لطف انداز سے بیان فرماتے ہیں:۔

تیرے پردہ نے کی یہ پردہ دری
تیرے چھپتے ہی کچھ چھپا نہ رہا

سرو قامت معشوق کی زلفہائے پُر شکن کی درازی و طوالت کی تعریف اس قدر بیساختہ انداز میں تقریباً ناممکن ہے۔

پاؤں تک پہنچی وہ زلف خم بخم
سرو کو اب باندھ کے آزاد کیا

کمبخت عاشق کی سخت جانی، دم قتل اسے بسمل ہونے سے محروم کر دیتی ہے۔ اسے اپنا بسمل ہونا اتنا مرغوب خاطر ہے کہ وہ خود خنجر سے اپنا گلا کاٹ کر آپ خنجر سے اس پیاس کو بجھاتا ہے۔ قتلِ عاشق جو محبوب کے لئے اتنا مشکل تھا۔ اس کڑی منزل کو اتنا آسان کر دیتا ہے۔

خود گلا کاٹ مرا جبکہ میں بسمل نہ ہوا ان کو آسان نہ ہوا، جو مجھے مشکل نہ ہوا

عاشق کی بے سرو سامانی اور خستہ حالی سے منجم اس امر کا اندازہ لگا کر کہ وہ معشوق جس کے عاشق کی اس کے ہجر میں یہ حالت ہے، خدا جانے کس بلا کا ماہ پارہ ہو گا۔ نادیدہ عاشق رقیبوں کی فہرست میں ایک اور کا اضافہ ہوتا دیکھ کر اپنے طالع ناسازگی ناسازگاری پر سر پیٹ لیتا ہے۔

دیکھ اپنا حالِ زار منجم ہوا رقیب تھا سازگار، طالعِ ناساز دیکھنا!

عشاق کے یہاں رقیب ہی تمام مصائب اور تکالیف کا سبب ہوتا ہے۔ اس کی زندگی ناکامی اور نامرادی کے مرادف قرار دی جاتی ہے اور عاشق کو یقین ہوتا ہے کہ جب تک یہ روسیہ زندہ رہے گا۔ اس وقت تک وصل کا ہونا معلوم۔ ہاں اگر رقیب کی زندگی اختتام آشنا ہو تو پھر البتہ شاید مقصد سے ہمکنار ہونے کا بہت کچھ امکان ہے۔ اسی آس و یاس کی کشمکش کو مومن اپنے انداز میں یوں بیان فرماتے ہیں۔

وہ ہے خالی، تو یہ خالی، یہ بھری تو وہ بھری کاسۂ عمرِ عدو حلقہ آغوش ہوا

بسنت کی تقریب پر معشوق زرد پوش ہے اور عاشق سیاہ روزگار غم ہجراں میں گھل گھل کر زرد رنگ ہو گیا ہے۔ عاشق زرد رنگی کو ان کے زرد پوشی سے جو بظاہر ہنگامی مطابقت پیدا ہو گئی ہے۔ مومن اس کو یوں بیان فرماتے ہیں۔

واں تو ہے زرد پوش، یہاں میں ہوا زرد رنگ واں تیرے گھر بسنت ہے یاں میرے گھر بسنت

---

اس سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں کہ گو مومن کے زمانے تک زبان بہت کچھ صاف ہو گئی تھی مگر بعض الفاظ ان کے یہاں ایسے بچے تلے ہیں جو اس وقت کی زبان اور روزمرہ کے مطابق نہیں۔ مومن کے یہاں اس قسم کی فروگذاشتیں معدودے چند ہیں لیکن ہیں ضرور۔ چنانچہ ذیل کے شعر میں مومن نے "مرے" کو "موئے" باندھا ہے۔

موئے نہ عشق میں جبتک وہ مہرباں نہوا بلائے جان ہے وہ دل جو بلائے جاں نہوا

اسی پر بس نہیں۔ بلکہ یہ لفظ جہاں بھی باندھا گیا ہے اسی صورت سے باندھا گیا ہے۔

اسی طرح افغان۔ جھٹا، اور کبھو، فغان، جھڑا، اور کبھی کی جگہ باندھے گئے ہیں۔

حیرت ہے کہ مومن جیسے سلیم الفطرت انسان کی طبعِ نازک پر یہ الفاظ کیوں گراں نہیں گزرے۔

معشوق۔ محبوب۔ کی بجائے انھوں نے پردہ نشیں کا لفظ پسند فرمایا ہے اور تمام دیوان میں تقریباً بیس پچیس دفعہ استعمال کیا ہے۔ اول تو یہ لفظ، ماہ پارہ۔ غیرتِ ناہید۔ رشک آفتاب، آفتاب حسن وغیرہ الفاظ کے مقابلے میں جو معشوق کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں اتنے چست اور فصیح نہیں لیکن پھر بھی اگر اس لفظ کو باندھ کر مومن کوئی خاص مضمون ادا فرماتے۔ جب بھی کوئی بات تھی مگر نہ معلوم انھوں نے کیوں ایک غیر فصیح لفظ کو فصیح لفظ پر ترجیح دے کر اس کی گردان کی۔

بعض مضامین ایسے ہیں جو انھوں نے متعدد بار مختلف طریقوں سے باندھے ہیں۔ لیکن اگر ان تمام اشعار کو سلسلہ وار سامنے

دکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسلوب بیان اور طرز ادا کے لحاظ سے ان میں کوئی فرق نہیں اور ان میں کوئی جدت نہ پیدا کر سکے کہیں کہیں توالی اضافات بھی ہے۔ جس سے کہیں شعر کی حیثیت بہت بلند ہو جاتی ہے اور کہیں بہت پست۔ مگر اس قسم کے اشعار سے مومن کی آمد اور سلاست کی تحقیر ہوتی ہے یہ اشعار ان کے کلام میں اس طرح معلوم ہوتے ہیں جس طرح ایک فرنگی نژاد اور خاندان سے ایک سیاہ فام حبشی:۔

سر شکِ اعترافِ عجز نے الماس ریزی کی　　مگر صد پارہ ہے اندیشۂ خوں گشتہ طاقت کا
گر یہی گرمیِ مضمونِ شرر ریزی رہی　　رشتۂ شمع سے شیرازۂ دیواں ہوگا

ابتذال اور سوقیانہ پن ان کے کلام میں تقریباً ناپید ہے۔ اگر ان کا مقابلہ ذوق اور داغ سے کیا جائے تو ان کا کلام تمام ان لغویتوں اور بے ہودگیوں سے پاک نظر آتا ہے جن میں خصوصیت سے داغ بہت بدنام ہیں۔

مومن کے متعلق یہ امر زبان زد خاص و عوام ہے کہ وہ جس خوبی سے اپنا تخلص نباہ سکتے ہیں اور کسی شاعر سے ایسا نہیں بن پڑتا۔ یہ بالکل درست ہے مگر اس کی وجہ ہرگز یہ نہیں کہ مومن بحیثیت ایک شاعر ہونے کے اس کمال کی تحسین کا مستحق ہے بلکہ ان کے تخلص میں یہ خوبی اور صلاحیت پائی جاتی ہے کہ وہ خود بخود اچھی طرح نبھنے کے لئے تیار ہے۔ اگر مومن کا تخلص بجائے لفظ "مومن" کے اور کچھ ہوتا تو وہ شاید اس نباہ پر اتنے قادر نہ ہوتے۔ مومن کافر۔ مسجد۔ بت خانہ۔ تسبیح۔ زنار۔ ایسے الفاظ ہیں جو ہر شعر میں باندھے جا سکتے ہیں اور اچھی طرح نباہے بھی جا سکتے ہیں۔

اگر بالفرض یہ مومن کا ہی کمال تسلیم کر لیا جائے کہ ان میں اپنے تخلص کے نباہ کا مخصوص ملکہ تھا تاہم یہ کوئی ایسا کمال نہیں کہ جس سے ان کی شاعرانہ حیثیت میں کوئی نمایاں اضافہ ہو سکے۔ چنانچہ ذیل کے چند امثلہ سے یہ امر واضح ہو جائے گا۔

دوستی اس صنمِ آفتِ ایماں سے کرے　　مومن ایسا بھی کوئی دشمنِ ایماں ہوگا
مر گیا جس پہ نہیں گھر میں رسائی اس کے　　تھا تو مومن ہی دے خلد میں داخل نہوا
ربطِ بتانِ دشمنِ دین اہتمام ہے　　ایسا گناہ حضرتِ مومن سے کب ہوا
جا کے کعبہ میں بھی مومن نہ گئی دیر کی یاد　　جائے لبیک صدا ہائے صنم کرتے ہیں

یہی تخلص کا وہ نباہ ہے۔ جو مومن کی تمام خوبیوں اور کمالات پر چھا گیا ہے اور دنیا یہ سمجھ بیٹھی ہے کہ مومن میں سوائے اسکے کہ وہ تخلص کا نباہ اچھا جانتا ہے اور کوئی کمال نہیں اور یہ بھی اس تغافل اور بے پرواہی کی وجہ ہے جو ادبی حلقوں میں مومن کے متعلق پیدا ہو گئی ہے اور اس پہ ستم ظریفی یہ کہ کوئی بھی اس امر کی توثیق کے لئے اتنی تکلیف بھی گوارا نہیں کرتا کہ کم از کم دیوانِ مومن کی ورق گردانی ہی کرے۔

## الم دوستی

ایشیا کے خمیر میں یہ کیفیت داخل ہو چکی ہے کہ وہ اپنے آپ کو سخت مصیبت زدہ اور خرمن برباد خیال کرے چونکہ اسی مسموم عام فضا میں شاعر بھی سانس لینے پر مجبور ہوتا ہے اس لئے اس کے منہ سے بھی وہی کچھ نکلتا ہے جو اس کے اندر سوسائٹی، آب و ہوا اور ملکی رسم و رواج سے راسخ ہو چکتا ہے۔ یورپ کا ایک شاعر مناظر فطرت کی دل فریبیوں اور رنگینیوں سے اس قدر بدمست ہو جاتا ہے کہ تمام عالم اسے کیف بار اور بادہ آفریں دکھائی دیتا ہے۔ آسمان اور سمندر کی دلفریب نیلگوں، سبزہ زاروں اور مرغزاروں کی دیدہ فروز سبزی اور گلاب کا لالہ بدوش پھول اس کے لئے سراپا مسرت اور ابتہاج ہوتا ہے۔ انھیں اشیاء کو مشرقی دنیا کا شاعر دیکھتا ہے آسمان اور سمندر کو وہ نیلی قبا پوش کا خطاب دے کر

عشق جاناں میں ماتم کناں ظاہر کرتا ہے۔ سبزہ و نالہ کی مسرت بار خاموشی اور سنسناہٹ کو ویرانی سے تعبیر کرتا ہے۔ گلاب کے پھول کی رنگین پنکھڑیاں اور شراب پاش رنگینی کو خونی لباس قرار دیتا ہے۔ مشرق و مغرب کی ذہنیت کا یہ فرق ہر جگہ صاف اور نمایاں ہے اور یہی وہ ذہنیت ہے جو معاشرت، اخلاق، علوم و فنون اور ہمارے رگ و پے میں ساری ہو چکی ہے۔

یہ کس طرح ممکن تھا کہ مومن مشرق میں پیدا ہو کر سوسائٹی اور آب و ہوا کے اثرات سے محفوظ رہتے اور پھر شاعرانہ رنگ میں اپنے آپ کو ناکام، مصیبت زدہ اور فریب خوردہ ظاہر کرتے۔

اس کے علاوہ عشق جو شاعری (غزل کی روح رواں ہے) ہمارے شعراکو بہت ہی کم اس سے پالا پڑا ہے۔ اور شاعر بحیثیت عاشق ہونے کے جو کچھ واردات قلبی یا حالی بیان کرتا ہے۔ اسے "آپ بیتی" نہیں کہا جا سکتا۔ وہ غزل لکھتے وقت اپنے آپ کو عاشق فرض کرتا ہے اور پھر ان جذبات کو اپنے دل میں پیدا کرتا ہے جو عاشق کے دل میں پیدا ہونا چاہئیں۔ چونکہ یہ اس کی آپ بیتی کہانی نہیں ہوتی اس واسطے اس کے کلام میں آورد کا رنگ غالب ہو جاتا ہے اور یہ سوانگ بھرنا فطری نہیں معلوم ہوتا۔ مومن کے ہاں ناکامی، حسرت و ارماں۔ یاس و ناامیدی کے تمام مضامین موجود ہیں۔ چونکہ یہ آپ بیتی نہیں اس واسطے پڑھنے والے کے دل پر کوئی خاص اثر نہیں ہوتا بلکہ وہ اسے سراپا مکاری اور عیاری خیال کرتا ہے اور اسی لئے ان کے کلام میں وہ سوز و گداز نہیں جو میر تقی اور غالب کے کلام میں ہے۔

ہاں مومن کے اس قسم کے کلام میں جو شاعرانہ کمال ہے وہ یہ ہے کہ ان کا اسلوب بیان۔ طرز ادا، بندش کی چستی، محاورات کا نباہ اور تخیل کی رفعت بہت ہی جاذب توجہ ہے اور یہی انکی شاعری کا کمال ہے۔ اس لحاظ سے ان کی شاعری کو جاہلیہ شاعری کے نام سے نہیں پکارا جا سکتا۔

## عیش پرستی

خوشی و مسرت انسان میں فطری جذبات ہیں۔ رنج و اندوہ، غم و الم، غیر طبعی ہیں۔ انسان فطرتاً خوش و خرم رہنا پسند کرتا ہے۔ مومن مرحوم بھی اسی جذبے کے ماتحت شاعر ہو کر بھی کبھی کبھی خوشی و مسرت، عیش و انبساط کے تذکرے کرنے لگ جاتے ہیں۔ گو ایک مشرقی شاعر سے یہ چیزیں بالکل نئی معلوم ہوتی ہیں لیکن چونکہ یہ جذبات فطری ہیں اس لئے ضرور ان کا اظہار ہو کر ہی رہتا ہے۔ یہی کمبختی ہے کہ آج مشرقی شاعری غیر ممالک میں بدنام ہے کہ اس میں سوائے عشق و محبت کے افسانوں کے اور کچھ بھی نہیں۔

بہار مستی ریز ہے۔ ابر بہار در پاش ہے۔ مستیوں اور رنگینیوں کی بارشیں ہو رہی ہیں۔ ساغر و مینا بادہ آفریں ہیں۔ ایسی حالت میں عاشقِ جان باز سے توبہ کی استدعا کرنا کس قدر بے موقع اور بے محل ہے۔ حافظ مرحوم نے کیا خوب کہا ہے۔

بعزم توبہ سحر گفتم استخارہ کنم　　بہارِ توبہ شکن می رسد چہ چارہ کنم

مومن مرحوم اس دلکش منظر کی موجودگی میں بیہودگی کے ارتکاب کو یوں سراپائے استغفار سے ٹھکراتے ہیں۔

چرخ و زمین میں توبہ کا ملتا نہیں سراغ　　ہنگامۂ بہار و ہجوم سحاب میں

چونکہ دنیا کی گرم بازاری سر تا پا ہنگامی اور وقتی ہے اس لئے اہلِ دنیا دو فرقوں میں منقسم ہو گئے ہیں ایک وہ گروہ ہے جو دنیا کی ہر زہ تازی اور ہنگامہ آرائی کو پر کاہ سے زیادہ وقعت نہیں دیتے اور دنیا سے متنفر ہو کر فکرِ آخرت میں مبتلا ہو گئے ہیں دوسری وہ جماعت ہے۔ جو اس وقتی اور ہنگامی خوشی و مسرت سے بھی فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں۔ اس گروہ کی قیادت خیام اور حافظ نے کی۔ مومن مرحوم بھی اسی جماعت کی اقتدا میں عیش و عشرت کے ہنگامے گرم رکھنا چاہتے ہیں۔ چونکہ انھیں اچھی طرح علم ہے کہ دنیا کی تمام گرم بازاریوں کا انجام سرد بازاری ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

فکر مآل سے مے و شاہد رہے عزیز          پیری میں موت یاد تھی پیری شباب میں

مے نوشی اور شاہد پرستی کی وجہ بیان فرماتے ہیں کہ شباب میں پیری کے ڈراؤنے اور ہیبت ناک مناظر ہمیشہ میرے سامنے رہے اور بڑھاپے میں موت کی بھیانک تصویر میری آنکھوں کے سامنے منڈلاتی رہی۔ جب شباب کی انتہا بڑھاپا ہے، بڑھاپے کی انتہا موت اور موت و بڑھاپے کی تکالیف و مصائب کسی سے مخفی نہیں اس لئے کیوں نہ ہم مے نوشی اور شاہد پرستی کو عزیز خیال کریں اور لطف اُٹھائیں۔

مشرق کا بے ننگ و نام عاشق شب ماہتاب میں ہر ایک حیا سوز منظر کو دیکھنا اور اس سے فائدہ اُٹھانا جائز خیال کرتا ہے۔ غالب شراب سے توبہ کر چکنے کے بعد بھی شب ماہتاب میں ایک دو گھونٹ پینے سے نہیں جھجکتے اور شب ماہتاب کی خنکی اور آتش سیال کی گرمی سے بہم لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں۔ مومن بھی شب ماہتاب دیکھ کر اپنے فطری جذبے کو نہیں دبا سکتے اور کہہ اُٹھتے ہیں۔

کیا جلوے یاد آگئے کہ اپنی خبر نہیں          بے بادہ مست ہوں میں شب ماہتاب میں

جذبات نگاری کا دوسرا نام شاعری ہے۔ چونکہ حالات کے ماتحت شاعر کے دل میں مختلف جذبات پیدا ہوتے ہیں اور پھر انھیں مختلف طریقوں سے ادا کیا جاتا ہے۔ اس لئے شاعر کا ہر خیال دوسرے خیال سے تقریباً بالکل مختلف ہوتا ہے اور پھر وقائع نگار، اور نقاد کے لئے سخت مشکل ہوتی ہے کہ وہ کوئی عام عنوان قائم کرے اور ان اشعار کو اس عنوان کے ماتحت لکھ سکے۔ حقیقتاً تذکرہ نگاری اور تنقید کا حق جب ہی ادا ہوتا ہے کہ ہر شعر کے لئے مختلف عنوان قائم کر کے اس پر بحث کی جائے اور اس کی خوبیوں کو بیان کیا جائے۔ تاہم علماء نے غزل کے جو دو اہم عنوان قائم کئے ہیں ہم بھی مومن کے کلام پر بغرض سہولت اسی لحاظ سے بحث کریں گے۔

## محاکات

کسی چیز یا حالت کی تعریف اس طرح بیان کرنا کہ اس شے کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھنچ جائے محاکات کہلاتی ہے۔ رقیب کی رقابت۔ اندوہ ہجراں۔ غم عشق، وعدۂ وصل امید وفا وغیرہ سیکڑوں قسم کے واقعات ہیں جو عاشق کو عشق میں پیش آتے ہیں۔ ان واردات کو شعر کے لباس میں بیان کرنا اور اس طرح بیان کرنا کہ سننے والے کے دل میں وہی جذبات موجزن ہونے لگیں۔ شاعری کا بہت بڑا کارنامہ ہے ورنہ رقابت۔ شب ہجراں کی مصیبت۔ غم عشق کی جانکاہی وعدۂ وصل میں انتظار وغیرہ فی نفسہ کوئی ایسے واقعات نہیں جو کسی کو نہ پیش آتے ہوں۔ اس لئے ایک ہی چیز کا وقوع اتنا عام ہو۔ اس میں کوئی خاص جاذبیت نہیں پیدا ہو سکتی۔ مگر شاعر اپنے جوش بیان اور طرز ادا سے اسے اس قدر لطیف اور پُرکیف بنا دیتا ہے کہ اس کا لطف کئی گنا زیادہ ہو جاتا ہے۔ سننے والے سنتے ہیں اور سر دھنتے ہیں۔ جس قدر شاعر کا تخیل زبردست ہوگا اسی قدر اس کی شاعری کیف بار اور نشہ آور ہوگی اور تخیل ہی وہ چیز ہے جس پر شاعری کے قصر کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ ورنہ اگر شاعری سے تخیل کو علیحدہ کر دیا جائے تو یہ شاعری چند مجبر باتوں کا ایک مجموعہ ہے۔

معشوق کو شراب نوشی کا چسکا ہے اور وہ شب و روز اسی شغل میں بسر کرتا ہے۔ شراب ایک گرم چیز ہے جس سے خون کا دورہ تیز ہو جاتا ہے۔ شراب کی گرمی اور اس کی آتش بار رنگینی یار کے لب ہائے نازک سرخ ہو جاتے ہیں اور اس کی شراب حسن دو آتشہ سہ آتشہ ہو جاتی ہے جس سے اس کی دلفریبی کا معیار بلند ہو جاتا ہے۔ عاشق بیمار کی اس بادہ پیمائی کو اپنی تمام سیہ بختیوں کا پیش خیمہ خیال کرتے ہوئے یوں لب کشادہ ہوتا ہے۔

لب مے گوں پہ جان دیتے ہیں　　ہمیں شوقِ شراب نے مارا

اب اگر شاعرانہ تخیل کو علیحدہ کر دیا جائے۔ تو شعر کی حیثیت نہایت ہی پست ہو جائے گی اور یہ خیال ایک مضحکہ خیز مجذوب کی بڑ ہوگی جسے کوئی ذی فہم انسان سننا بھی گوارا نہ کرے گا۔

عاشق کی خوش بختی سے یار کی بزم خاص میں باریابی کا موقع مل جاتا ہے۔ کسی تقریب میں وہ عاشق ہی سے دریافت فرماتے ہیں۔ کہ تمھیں کس کا عشق ہے۔ تم گھلے جا رہے ہو۔ اب وہ اس خوش تقریبی کا جتنا شکریہ ادا کرے تھوڑا ہے کہ وہ اور محبوب کا اس سے یہ سوال خدا ساز بات ہے۔ گو اسے اپنے عرض مدعا کا ایک زریں موقع نصیب ہوا ہے لیکن اسے اس کی فکر کھائے جا رہی ہے کہ وہ جواب دے تو کس پیرائے میں دے کہ اصل مدعا بھی حل ہو جائے اور محبوب کو بھی کسی قسم کی رنجش کا موقع نہ ملے۔

کس پہ مرتے ہو آپ پوچھتے ہیں　　مجھے فکرِ جواب نے مارا

آپ پوچھتے ہیں، کسی قدر طنزیہ پیرائے میں ادا ہوا ہے اور پھر "فکر جواب نے مارا" نے شعر میں جان ڈال دی ہے، اب اگر شاعر کے تخیل کو شعر سے علیحدہ کر دیا جائے تو شعر کی کیا حیثیت رہ جائے گی۔

**تخئیل** تخئیل اس قوت کا نام ہے جو غیر مرئی اشیاء کو ہماری آنکھوں کے سامنے پیش کر دے۔ گویا اختراع کا دوسرا نام تخیل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ شعر کی ترکیب دو عناصر (محاکات اور تخیل) سے ہے۔ لیکن تخیل ہی ایسی چیز ہے جسے شعر کی روح رواں کہا جا سکتا ہے اور یہی مومن کا وہ کمال ہے جو ان کو عوام سے نکال کر خواص کی جماعت میں جگہ دیتا ہے۔ مومن قدرت کی طرف سے ایک نہایت زبردست اور بلند پرواز تخیل لائے ہیں وہ اپنی خصوصی فضا میں اُڑتے ہیں اور نہایت بلند اڑتے ہیں اور یہ ان کا نہایت ہی اعلیٰ کمال ہے۔ ذوق وغیرہ آج تعلیم یافتہ طبقہ کی نگاہوں سے گر رہے ہیں اور محض اسی لئے گر رہے ہیں کہ ان میں قوت اختراع تقریباً ناپید ہے۔ میں نے ان کا دیوان کئی مرتبہ دیکھا ہے۔ لیکن میری رائے ہمیشہ ان کے حق میں وہی رہی ہے جو پہلی مرتبہ مطالعہ کے بعد قائم ہوئی تھی مجھے حیرت ہوتی ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ ہمارے دوست پھر ہمیں متوجہ کر رہے ہیں کہ ہم ذوق کا مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ یہاں کیا کیا جواہر ریزے موجود ہیں۔

جذبۂ دل نے محبوب کو عاشق کے گلے لگا دیا۔ موقع گزر گیا مگر حضرت عاشق ہیں کہ شب و روز ان کی آنکھوں کے سامنے یہ منظر ہے اور حسرت و ارمان کے لاکھوں طوفان اس کے دل میں اٹھتے ہیں اور مٹتے ہیں آخر جذبۂ دل کو محسوس فرض کر کے اس سے خطاب کرتا ہے کہ میں کیوں نہ تم کو چھاتی سے لگاؤں اور پیار کروں۔ کیونکہ تمھاری اور صرف تمھاری ہی وجہ سے محبوب میرے گلے لگا تھا۔

جذبۂ دل کو نہ چھاتی سے لگاؤں کیونکر　　آپ وہ میرے گلے دوڑ کے اک بار لگا

"مرگ انبوہ جشنے دارد" کا ایک حسرت ناک منظر ملاحظہ ہو۔

کیا اس نے قتل جہاں اک نظر میں　　کسی نے نہ دیکھا تماشا کسی کا

عشق میں عاشق کو جن مصائب سے دوچار ہونا پڑتا ہے اُس کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں کہ میرا دل شعلۂ جوالہ کی مانند سراپا اضطراب و سوز ہے۔ شعلۂ جوالہ میں سوز و اضطراب دونوں باتیں موجود ہوتی ہیں جب دل جل جل کر خاکستر ہو گیا تو مجھے آرام ہو گیا یعنی رنج والم عشق سے مجھے نجات جب ہوئی جب میں نے سرحد فنا میں قدم رکھا۔

جی تھا برنگ شعلۂ جوالہ بے قرار دل خاک ہوگیا مجھے آرام جب ہوا

ہجر کی وہ سر تا پا مصائب طویل راہیں جس سے عاشق کو دوچار ہونا پڑتا ہے ایسی ڈراؤنی اور ہیبت ناک راتوں کی تنہائی کو وہ یوں آباد کرتا ہے۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

قادر الکلام شعراء کے اشعار دو قسم کے ہوا کرتے ہیں ان کے خاص اور چیدہ اشعار سے عوام اور خواص دونوں برابر متاثر ہوتے ہیں لیکن بعض خاص حالات کے ماتحت ان کے عام اشعار بھی خواص کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ مرحوم مومن کا متذکرہ بالا شعر آخر الذکر اشعار کے قبیل سے ہے۔ مرزا نوشہ کو نہ معلوم اس کی کونسی ادا پسند آگئی تھی کہ وہ بیسیوں دفعہ اس کو پڑھتے اور سر دھنتے۔ اسی قسم کا ذوق کا ایک شعر بھی ہے جو مرحوم مرزا کو بہت ہی مرغوب خاطر تھا۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

یہ دو شعر ہم بھی پڑھتے ہیں اور دنیا بھی پڑھتی ہوگی لیکن چونکہ ہمارے حالات شعر کی اس حالت سے جس حالت میں یہ شعر کہا گیا تھا سازگار نہیں ہوتے۔ اس واسطے نہ ہم متاثر ہوتے ہیں اور نہ ہمارے جذبات میں کوئی خاص جنبش پیدا ہوتی ہے۔

ہوس اور عشق میں یہی فرق ہے کہ ہوس پرست ہرجائی ہوتا ہے اور عاشق یکجائی۔ گو نفعہ کسی ماہ رو سے عشق کرنا جائز نہیں لیکن جب یہ تعلقات کسی ایک محبوب سے قائم ہو چکیں تو پھر انھیں تعلقات کی تجدید کسی اور رشکِ ناہید سے کرنا مذہب عشق میں قطعاً حرام ہے۔

ہر غنچہ رو سے عشق کا اظہار ہے غلط اس مبحث صحیح کی تکرار ہے غلط

عشق جو ایک روحانی کوفت ہے، عشاق کا خیال ہے کہ اس روحانی کوفت سے دل پر داغ پڑ جاتا ہے۔ چونکہ یہ داغ محبوب کے عشق کی نشانی ہے اس لئے عاشق بے خانماں اپنے سیلابِ گریہ کو یوں ہدایت کرتا ہے کہ ذرا احتیاط سے کام لینا کہ کہیں میرا داغ دل بھر نہ جائے اور ہم بیٹھے لکیر پیٹا کریں۔

شب وعدہ کی تلخی اور جانکاہیِ انتظار بہت ہی تکلیف دہ ہوا کرتی ہے۔ عاشق موت سے دوچار ہونا پسند کرے گا لیکن انتظار کی معیبت میں پھنسا ہوا ہے وہ موت کی تمنا کرتا ہے تاکہ ان تمام رنج ہائے انتظار کا خاتمہ ہو جائے لیکن موت آئے تو جبکہ زندگی اختتام آشنا ہو چکے۔ عاشق گھبرا کر بغیر موت کے مر جاتا ہے اور ان مصائب سے پیچھا چھڑا کر زندگی کے باقی دن قبر میں بسر کرتا ہے۔

بس کہ بن آئے مر گئے ہم شب انتظار میں دن جو رہے تھے عمر کے جیتے رہے مزار میں

شعر گو ان نیچرل ہے مگر تخیل کی بلند پروازی نے شعر کو عرش نشیمن کر دیا۔

ہر شعلہ رو پر دنیا پروانوں کی طرح گرتی ہے اور عشاق کی بیتابی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ تِل دھرنے کو جگہ نہیں ملتی اگر اسی جان برکف نہادہ جماعت سے ایسے لوگوں کی تلاش کی جائے جو صحیح معنوں میں سرفروش کہلائے جا سکیں تو شاید کوئی ایک آدھ ہی نکلے۔

سرفروشوں کے اگر آپ خریدار ہوئے تو گراں ہو دے گی وہ جنس جو کمیاب نہیں

عشق اور شوق جاناں دو ایسے جذبے ہیں کہ جن کے بغیر عشاق کی زندگی محال ہوتی ہے لیکن یہی اس کے دو محبوب ترین

جذبے ایسے ہیں جو اس کی جان کھائے جا رہے ہیں۔ عشق نے اس کا جگر کباب کر دیا ہے اور شوق کے ہاتھوں جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں انھیں دو مار آستین دوستوں کا وہ یوں شکوہ سنج ہوتا ہے۔

عشق کیوں درپے جاں، شوق ہے کیوں سینہ شگاف　　دشمنی دل شکنی شیوۂ احباب نہیں

ننگ و نام بر باد دعویٰ عشاق کو اس سے کیا غرض کہ عشق خانہ خراب کے ہاتھوں ان کو کیا کیا دکھ جھیلنے پڑیں گے، رسوائی بدنامی اور الزام تراشی کا وہ کو نسا حربہ ہوگا جو ان کے برخلاف نہ استعمال کیا جائے گا۔ یہ سب کچھ ہے اور ضروری ہے لیکن انھیں تو اس سے غرض ہی نہیں کہ خود ان پر کیا گزرے گی۔ ان کی زندگی کا مقصد یہ اور صرف یہ ہے کہ ان کے دم سے گرم بازاری عشق قائم رہے۔

سودا ہے مجھ کو گرمی بازار عشق کا　　اس کا کہاں خیال کہ اپنا ضرر نہ ہو

فراق یار جتنا پُر مصائب ہوا کرتا ہے۔ عاشق کے لئے وصال یار بھی کچھ کم باعث تکلیف نہیں ہوتا۔ تپ فراق یار میں اگر اسے رنج و محن سے تنگ آکر جان بحق ہونا پڑتا ہے تو شب وصال میں بھی اس کو یار کی ہر ہر ادا پر نقد جان نثار کرنا پڑتا ہے۔

. یارب وصالِ یار میں کیونکر ہو زندگی　　نکلی ہی جان جاتی ہے ہر ہر ادا کے ساتھ

عاشق کی رشک بازی نے خون کی ندیاں بہا دی ہیں۔ معشوق اس خیال سے کہ اس کا دامن خون سے آلودہ نہ ہو۔ دامن اٹھائے عاشق کی مزاج پرسی کے لئے آتا ہے۔ مگر اس کی یہ ادا کچھ اس غضب کی دلفریب واقع ہوتی ہے کہ دنیا پروانوں کی طرح تڑپ تڑپ کر فدا ہو رہی ہے۔ عاشق ناکام اس مرگ عالم گیر کا ذمہ دار اپنے اشک خون کو قرار دیتا ہے جس نے یار کو اس خرام ناز پر مجبور کیا۔

ہے ایک خلق کا خوں سر پہ اشک خوں کے مرے　　سکھائی طرز اسے دامن اٹھا کے آنے کی

جاناں کے پر پیچ و خم زلف کے تصور میں عاشق از خود رفتہ ہو جاتا ہے۔ اس خود رفتگی کے عالم میں اسے تمام ان مصائب سے لطف اندوز ہونے کا موقع نہیں ملتا جن سے ہونا چاہتے تھا۔ زلف برہم کے تصور سے جو خود رفتگی اس پر طاری ہوئی اس نے تمام تکالیف کا احساس سلب کر لیا۔ اپنی سیہ روز گاری کا یوں مرثیہ پڑھتا ہے۔

خیال زلف میں خود رفتگی نے قہر کیا　　امید تھی مجھے کیا کیا بلا کے آنے کی

بلبل جسے شمع گل کا پروانہ کہا جاتا ہے۔ موسم خزاں کی نکہت اور نحوست میں گرفتار ہے مومن کے یہاں عشق اور بدبختی مترادف ہیں۔ لہٰذا باغ میں خزاں کا تسلط اس لئے نہیں کہ خزاں اور بہار کوئی فطری موسم ہیں بلکہ باغ میں بلبل کا وجود ہی خزاں کا سبب ہے اگر اب وہ باغ سے علیحدہ ہو جائے۔ تو فوراً ہی بہار خیمہ افگن ہے۔

نام بدبختی عشاق خزاں ہے بلبل　　تو اگر نکلے چمن سے تو بہار آجائے

خوں رو رو کر عاشق کا دامن سبد گل فروش ہو چکا ہے محبوب کو یہ خیال نہ تھا کہ عشقِ خانہ خراب کی نوبت یہانتک پہونچ چکی ہے اتفاقاً اس کی نگاہ خوں آلودہ دامن پر پڑ جاتی ہے اور وہ آئینہ دار آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنے لگ جاتا ہے،

داغ خون سے وہ میرے حیران ہوا　　دامن الجھا ہے گل بے خار سے

داغ خون کو گل بے خار سے اور محبوب کے حیران ہو کر کھڑا ہونے کو. دامن اُلجھنے سے تعبیر کرنا بہت ہی پر لطف اور اچھوتا طرز بیان ہے وحشت شباب پر ہے چارہ گر کو تشخیص مرض، اور تجویز دوا کے لئے مدعو کیا جاتا ہے۔ مگر عاشق خود ہی اپنے

مرض کو بیان کر کے نسخہ تجویز کرتا ہے اور طنزیہ لہجہ میں حکیم سے درخواست کرتا ہے کہ آؤ! اور میری وحشت کے علاج کے لئے بازار سے ایک جنگل خرید کر لادو۔

گر علاجِ جوشِ وحشت چارہ گر　　　لادے اک جنگل مجھے بازار سے

عاشق غمہائے ہجراں سے کچھ اس طرح مانوس ہو چکا ہے کہ اس کی تنہائی اسے ایک نظر نہیں بھاتی اسے یہ معلوم ہے کہ وہ اندوہ ہجراں سے جاں بر نہ ہو سکے گا۔ لیکن اسے یہ فکر دامن گیر ہو رہی ہے کہ کل میرے بغیر شب ہجراں اپنا دل بہلانے کیلئے کس کو تلاش کرے گی۔

تو کہاں جائے گی، کچھ اور ٹھکانا کر لے　　　ہم تو کل خواب عدم میں شب ہجراں ہوں گے

محبوب تک نامہ بری کے لئے ایک پیغامبر کی تلاش کی گئی ہے اور اسے محبوب کے یہاں بھیجنے کو تیار کیا جا رہا ہے لیکن عاشق کو یہ فکر لاحق ہو رہی ہے کہ مبادا آتشِ رشک بھڑک اٹھے اور وہ بھی قاصد کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔

رشکِ پیغام ہے عنان کش دل　　　نامہ برراہ بر نہ ہو جائے

عاشق ایک مہ پارہ کی تیغ ابرو کا شکار ہو چکا ہے۔ لیکن اس خیال سے وہ ہمیشہ بے چین رہتا ہے کہ اگر وہ یونہی زندہ رہا تو یہ زندگی اس کے تمام رازوں کو طشت از بام کر دے گی۔ کیونکہ موت سے یہ تمام سلسلے یک قلم ختم ہو جاتے ہیں اور بہت سے رازہائے سربستہ ہمیشہ کے لئے کنج عدم میں دفن کر دئے جاتے ہیں۔

ہجر پردہ نشیں میں مرتے ہیں　　　زندگی پردہ در نہ ہو جائے

خرام یار کو شعراء فتنۂ محشر سے تشبیہ دیا کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسا پامال مضمون ہے کہ کوئی معمولی شاعر بھی ایسا نہ ہو گا جس نے اس مضمون کو مختلف طریقے سے نہ باندھا ہو۔ مومنؔ کے یہاں بھی یہ مضمون کئی طریقوں سے باندھا گیا ہے مگر خصوصیت سے ذیل کا شعر کچھ اتنا دلآویز واقع ہوا ہے کہ داد دئے بغیر نہیں رہا جاتا۔

چلنا تو دیکھنا کہ قیامت نے بھی قدم　　　طرز خرام شوخی رفتار کے لئے

یعنی خرام یار کچھ اس طرح محشر بار، اور حشر خیز واقع ہوا ہے کہ قیامت کا عظیم الشان فتنہ بھی اس کے سامنے گرد ہو گیا ہے اور دنیا اس سے زیادہ ہولناک سماں سے دوچار ہے جس کا وجود دامان قیامت سے وابستہ ہے۔

عشاق تنگی دل کے ہمیشہ شاکی رہے ہیں۔ اس گرہ کشائی کے لئے وہ ناخن یار کا تصور باندھتا ہے۔ لیکن دل خون ہو کر آنکھوں کے راستے بہ جاتا ہے۔ عاشق ناخن یار سے یوں خطاب کرتا ہے۔

دل ہوا خوں، خیال ناخن یار　　　تو نے اچھی گرہ کشائی کی

گرہ کشائی کے لئے عام طور پر ناخنوں سے امداد لی جاتی ہے اور پھر دل کا خوں ہو جانا اس لحاظ سے اور زیادہ دلآویز ہے کہ محبوب کے ناخن اس سے رنگے جائیں گے۔

مقتل میں جب وہ شمشیر بدست آتے ہیں اور عاشق پر وار کرتے ہیں تو اس سے ہوا میں جو چمک پیدا ہوتی ہے مومنؔ اس کو برق سے تشبیہ دیتے ہیں اور عاشق کے خولیش وا قارب کے رونے کو بارش سے۔

کیوں نہ ٹپکے آب، جب ٹپکے لہو　　　برق کٹتی ہے تری شمشیر سے

بارش کا برسنا دو لحاظ سے جاذب توجہ ہے (۱) چونکہ تلوار کے وار سے ہوا میں بجلی کے چمکنے کا سماں بندھ جاتا ہے اور

بارش لازم و ملزوم ہیں (۲) ناکام عاشق کا قتل ایسا حسرت ناک منظر پیش کرتا ہے کہ اب آسماں ستم شعار بھی اس پر بغیر آنسو بہائے نہیں رہ سکتا۔ عاشق قریب الموت ہے۔ جب وہ زندگی کی تلخ کاموں اور ناکامیابیوں پر ایک مجمل نگاہ ڈالتا ہے تو اسکے دل میں غم و اندوہ کا ایک طوفان اُٹھتا ہے وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر چلاتا ہے گریبان چاک کر دیتا ہے۔ ہائے وہو، غم و الم۔ چیخ و پکار اور شور و شغب سے تمام دنیا کو تہ و بالا کر دیتا ہے۔ آسمانوں کی دھجیاں اڑا دیتا ہے۔ نظام شمسی کے پرخچے اڑ جاتے ہیں اور خدا کی خدائی میں ایسا زلزلہ آتا ہے کہ تمام دنیا موت کی نیند سو جاتی ہے۔

قیامت مرتے دم آئی فغاں سے ۔ جہاں لے کر چلے ہیں ہم جہاں سے

ہم نے رفعت و بلند پروازی تخیل کی متعدد مثالیں پیش کی ہیں۔ آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ مومن کس قدر بلند پرداز ہیں اور اپنے اکثر معاصرین اور عام شعرائے زبان اردو سے کتنے ممتاز ہیں۔ ذیل میں محاکات کی متعدد امثلہ لکھی جاتی ہیں تاکہ واضح ہو جائے کہ ایک معمولی اور سادہ خیال کو مومن اپنے زور دار تخیل کے بل پر کہاں سے کہاں لے جاتے ہیں۔

## جذبۂ دل

جذبۂ دل کی تاثیر کے مختلف مناظر جس طرح عشق کے باب میں دیکھنے میں آتے ہیں اور کہیں نہیں اس مضمون کو مختلف طریقوں سے ادا کیا جاتا ہے اور شاید ہی کوئی شاعر ہو جس نے اس پر خامہ فرسائی کی تکلیف نہ گوارا کی ہو۔ مومن نے بھی اس باب میں طبع آزمائی کی ہے۔ اور خوب جولانیاں دکھائی ہیں۔

عاشق فرطِ شوق سے مجبور ہو کر محبوب کی محفل میں جا پہنچا ہے اور محبت کے ثبوت میں یہ پیش کرتا ہے کہ اس کی الفت اُسے وہاں کشاں کشاں لائی۔ اگر محبوب کے دل میں بھی عاشق کی الفت ہوتی تو کوئی وجہ نہ تھی کہ اس کے یہاں نہ جاتا۔ اس سے عیاں ہے کہ انھیں اس سے کوئی تعلق نہیں یہ سن کر محبوب فوراً کہہ اٹھتا ہے کہ تمھاری دلیل بجائے اس کے کہ تمھارے لئے مفید ہو میری موید مقصد ہے۔ تمھارا میرے ہاں یوں بے تاب ہو کر آنا میرے جذبۂ دل کی قوت کا نتیجہ ہے۔ اگر تم میں بھی یہ جذبہ کارفرما ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ میں تمھارے ہاں کھنچا کھنچا نہ چلا آتا اور کوئی وجہ نہ تھی کہ اگر تمھارا جذبۂ دل قوی تر ہوتا تو مجھے اپنی طرف نہ کھینچ لیتا گویا تمھارے جذبۂ دل کی کمیت کا یہ امتحان تھا جس میں تم ناکامیاب رہے اتنے مبسوط مضمون کو مومن ایک شعر میں ادا کر کے کس خوبی سے دریا کو کوزے میں بند فرماتے ہیں۔

یہ عذر امتحان جذب دل کیسا نکل آیا ۔ میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

محبوب غیر پسند ہو چکا ہے اور ہر وقت اغیار کی محفل میں رہتا ہے۔ عاشق کبھی اس باصرہ افروز منظر سے مستفید ہونے کے لئے وہیں پڑا رہتا ہے کبھی کبھی جذبۂ خودداری اسے مجبور کرتا ہے کہ وہ کیوں اغیار کے یہاں یوں ذلیل ہو رہا ہے تو معاً اُسے یہ خیال بھی آتا ہے کہ اگر جذبۂ دل اُسے کھینچ لائے بھی تو کہاں لائے کہ غیر کا گھر ہی اپنا مسکن ہو چکا ہے۔ اگر اپنا گھر ہوتا تو شاید ہم کبھی جذبۂ دل کا امتحان لیتے۔

جذبِ دل اسے کھینچ کے لائے تو کہاں لائے ۔ جو غیر کا گھر ہے وہی مسکن ہے ہمارا

مشہور عوام ہے اور اصولاً صحیح بھی ہے کہ رونے سے دل کا اضطراب اور قلق کم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ ہچکیوں کا آنا کسی عزیز ترین دوست کے یاد کرنے کی نشانی ہے لیکن عاشق سیہ روزگار جوں جوں روتا ہے اسکی بےچینی بڑھتی جاتی ہے اور جوں جوں اسے ہچکیاں آتی ہیں اسے خیال پیدا ہوتا ہے کہ اب وہ بالکل بھلایا جا رہا ہے۔

رشک داڑ ورنہ اثر باعثِ صد جوش ہوا ۔ ہچکیوں سے میں یہ سمجھا کہ فراموش ہوا

## جلوہ فروشی

یار کی جلوہ فروشی اور عشاق کی نظر بازی کتاب عشق کا ایک دلچسپ ترین باب ہے۔ مومن نے اس حدیثِ پرکیف کو مختلف انداز سے بیان کیا ہے اور اپنی بلند پردازی اور رفعت تخیل کے ناقابلِ تردید ثبوت پیش کئے ہیں۔

شب وصل محبوب نے اپنے گلِ رُخ کی آب و تاب بڑھانے کے لئے مے نوشی کی۔ عاشق میں بھلا کہاں تاب کہ روئے جاناں کی دید کی تاب لاسکے۔ اس لئے وہ اس کے حسنِ بے نقاب کی شراب سہ آتشہ سے بیہوش پڑا ہے۔ لیکن جب کبھی وہ کچھ وقت کے لئے ہوش میں آتا ہے تو محبوب شراب سے مخمور ہو کر مدہوش ہو جاتا ہے اس دلفریب منظر کو مومن یوں بیان فرماتے ہیں۔

جلوہ افزائی رُخ کے لئے مے نوش ہوا    میں کبھی ہوش میں آیا تو وہ بیہوش ہوا

عاشق کے دل پر جو داغ پڑ گیا ہے۔ اسے یار کے رُخ روشن سے ہمسری کا دعویٰ ہے بلکہ وہ اپنی تابانی کو مایۂ ناز خیال کرتا ہے عاشق سے کب برداشت ہو سکتا ہے کہ وہ اس قدر لاف و گزاف کرے اس لئے روئے جاناں سے یوں خطاب کرتا ہے۔

شعلۂ دل کو ناز تابش ہے    اپنا جلوہ ذرا دکھا جانا

محبوب جلوہ افروز ہے مگر عاشق کی یہ حالت ہے کہ جب سامنے جاتا ہے تو آنکھیں جھپک جاتی ہیں اور محبوب کے جلوۂ مسرت ساماں سے بہرہ ور نہیں ہو سکتا۔

کیا کیجئے کہ طاقت نظارہ ہی نہیں    جتنے وہ بے حجاب ہیں ہم شرمسار ہیں

شب ماہتاب سے لطف اندوز ہونے کے لئے محبوب سیر کے لئے نکلتا ہے۔ عاشق یوں گویا ہوتا ہے کہ اگر تم نے قدم رنجہ فرمایا تو آفتاب بھی شوق ملاقات۔ کے لئے نکلیگا تاکہ تمھاری تجلی سے بہرہ مند ہو اور یہ اجتماع مہر و ماہ اپنی نوعیت میں کتنا عجیب ہوگا

تم بہر سیر نکلے تو نکلے گا مہر بھی    ہووے گا اجتماع شب ماہتاب میں

محبوب عاشق کو صبر کی تلقین کرتا ہے کہ تم مجھے دیکھ کر اتنے مضطرب کیوں ہو جاتے ہو۔ کیا تم نے اپنے جذبات پر قابو نہیں پایا۔ وہ جواباً عرض کرتا ہے کہ تمھاری دلربا شوخی اور دلفریب نگاہ ایسی نہیں کہ میں تو کیا کسی سے بھی صبر ہو سکے۔

عابد فریب شوخی و رغبت فزا نگاہ    میں کیا کسی سے صبر تجھے دیکھ کر نہ ہو

محبوب آئینہ دیکھنے کی تمنا کرتا ہے مگر عاشق بایں خیال مانع ہوتا ہے کہ وہ اپنا عکس رُخ دیکھ کر سراپا حیرت ہو جائیں گے اور یہ دلربا ادا خدا جانے اس کے دلِ زار پر کیا غضب ڈھائے گی۔ جب وہ حیرت سے تصویر بنے کھڑے ہوں گے۔

تاب نظارہ نہیں آئینہ کیا دیکھنے دوں    اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہوں گے

## رقیب رقابت

عربی میں تو یہ لفظ ان دو باتوں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جو مستورات کی حفاظت اور نگہبانی کیا کرتے ہیں۔ مگر اردو نے فارسی شاعری کی متابعت میں اغیار، اعدا، بوالہوس تمام کے لئے استعمال کیا ہے کیونکہ اردو شاعری نیچرل شاعری نہیں کہلاتی اور یہ وارداتیں تمام کی تمام قوت متخیلہ کی پیداوار ہوتی ہیں۔ اس لئے فرضی عاشق ہمیشہ فرضی رقیب کے ہاتھوں جاں بلب رہتا ہے۔ مصائب اور تکالیف کا نشانہ بنتا ہے اور رسوائی و ملامت کے بے پناہ تیروں کا آماجگاہ۔ وہ سب کچھ کہتا ہے مگر شاذ و نادر ہی نعمت وصل سے تمتع اٹھا سکتا ہے۔ وہ راندۂ درگاہ خیال کیا جاتا ہے اور انھیں ناکامیوں اور تلخ کامیوں میں آپ کو گھرا ہوا پاکر موت کے دامن میں پناہ لیتا ہے۔ مگر رقیب

بوالہوس ہو کر بھی وصلِ یار سے خوش کام رہتا ہے۔ اس کا دن عید اور رات شب برات ہوتی ہے۔ اور اسی چہل پہل میں زندگی بسر کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان فرضی افسانوں نے شاعری کے باب میں ایک نئی فصل کا اضافہ کر دیا۔ ہمارے شعرائے بلند خیال نے اس میدان میں بھی خوب جولانیاں دکھائیں اور مومن نے بھی اس موضوع پہ قلم اٹھایا ہے لیکن حق یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔

جہاں محبوب کا نقش قدم پڑتا ہے عاشق وہیں سر جھکا دیتا ہے اور سجدہ کرتا ہے جو عشاق کے یہاں سب سے بڑی عبادت ہے کوچہ رقیب میں بھی چونکہ جاناں کی آمد و رفت رہتی ہے۔ عاشق کو وہاں کبھی جبہہ سائی کے متعدد مواقع پیش آتے ہیں مگر رقیب کی گلی میں سر کے بل جانا اسے جذبۂ خودداری کی صریح تحقیر معلوم ہوتی ہے جسے وہ یوں بیان کرتا ہے۔

اس نقشِ پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل　　　میں کوچہ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

مضمون اور بندش الفاظ کے لحاظ سے شعر بہت بلند پایہ ہے مگر "کیا" کے تواتر نے ثقل پیدا کر دیا ہے۔ مومن کے ہاں اس قسم کے بہت سے اشعار ہیں جنھیں ایک لفظ کو کئی کئی دفعہ استعمال کیا ہے۔ ایک اور شعر سن لیجئے:۔

ضبط فغاں گو کہ اثر تھا کیا　　　حوصلہ کیا کیا، نہ کیا کیا کیا

اغیار کو اکثر یہ خدمت بھی انجام دینا پڑتی ہے کہ عاشق کے زخمہائے دل و جگر پر نمک پاشی کریں عشاق کو نمک پاشی اور زخم تراشی میں جو لطف آتا ہے وہ مرہم اور دوا میں نہیں آتا وہ چاہتے ہیں کہ ان کا جگر خون، آنکھیں پرنم، اور گریبان چاک رہے۔ وہ اپنے زخمہائے دل پر نمک پاشی کے متمنی ہوتے ہیں لیکن وہ یہ گوارا نہیں کر سکتے کہ نمک پاشی، اغیار کے ہاتھوں ہو کیونکہ عشاق کی عشق بازی کا مقصد ہی یہی ہوتا ہے کہ اور نہیں تو زخمہائے دل پر یار کے ہاتھوں نمک پاشی کا موقع تو نصیب ہوگا لیکن اس صحبت میں کیا لطف جب رقیب اس خدمت کو انجام دے۔

غیر چھڑکے ہے زخمِ دل پہ نمک　　　شور الفت میں بھی مزا نہ رہا

محبوب کبھی عاشق کے قتل کے بجائے رقیب پر بھی اقدام کرتے ہیں جس سے عشاق کی ترغیب یا ترہیب مقصود ہوتی ہے۔ کبھی رقیب کے ارادہ قتل سے وہ مقتل میں آتے ہیں مگر کسی حیلہ و بہانہ سے رقیب کو قتل نہیں کیا جاتا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ تساہل کی کوئی وجہ نہیں ملتی اور رقیب کے خون سے ہاتھ رنگنا پڑتے ہیں۔ اسی قسم کے ایک منظر کو مومن یوں بیان فرماتے ہیں:۔

عاشق نہ ہو کہیں کہ انھیں قتل غیر میں　　　مشکل ہی کچھ ایسی تساہل نہ ہو سکا

رقیب ہی تمام مصائب کا سبب ہے جب تک وہ زندہ ہے عاشق کو ذرا امید نہیں کہ وصال یار ہو۔ ہاں اسے یہ امید واثق ہے کہ اگر وہ فنا ہو جائے تو پھر شاید مقصود سے ہمکنار ہونے کا بہت کچھ امکان ہے۔ امید و یاس کے اس پہلو کو یوں بیان فرماتے ہیں۔

وہ ہے خالی، تو یہ خالی، یہ بھری تو وہ بھری　　　کاسۂ عمر عدو حلقۂ آغوش ہوا

عشاق کو دق کرنے کے لئے محبوب اغیار سے میل ملاپ بڑھایا کرتے ہیں تاکہ عاشق آتشِ رشک میں جلا کرے۔ ہر چیز عادت کے بعد بے کیف ہو جاتی ہے۔ عشاق اس رنج سے خود بھی خوگر ہو جاتا ہے اور محبوب سے مخاطب ہوتا ہے کہ میں اس رنج سے مانوس ہو چکا ہوں۔ اب کوئی اور صورت پیدا کیجئے کہ مجھے تکلیف ہوا کرے۔

خو رنجِ رشکِ غیر کی بھی ہم کو ہو گئی　　　اب اور کچھ نکالئے آزار کی طرح

محبوب غیر سے بے پرواہی برتتا ہے۔ گویا یہ اس کے عشق کا امتحان ہے مگر بوالہوس سے یہ جور و ستم نہیں سہا جاتا۔ اور محبوب سے بگڑ جاتا ہے۔ عاشق کو بھی اس کا علم ہوتا ہے تو محبوب سے خطاب کر کے یوں لب کشا ہوتا ہے کہ اس کم ظرف میں اس کی کہاں تاب کہ تمہاری لاپرواہی اور اغراض کو برداشت کر سکے انھیں اپنے مطلب سے مطلب ہے۔ جب ذرا ان کی چلتی گاڑی میں روڑا اٹکا وہ رفوچکر ہوئے۔

تاب کم ظرف کو کہاں، تم نے دشمنی کی عدو سے چاہ نہ کی

منجم، عاشق کے یہاں اسکی سازگاری طالع کے لئے آتا ہے تاکہ زائچہ دیکھ کر سعد و نحس کے مطابق علاج تجویز کرے عاشق کی خستہ حالی بے سر و سامانی سے وہ اندازہ لگاتا ہے کہ جس محبوب کے عشق میں عاشق کی یہ حالت ہو۔ خدا جانے وہ کیسا غیرت یوسف ہوگا نادیدہ عاشق ہو جاتا ہے عاشق تب روزگار اپنے طالع کی ناسازگاری پر ماتم کرتے ہوئے یوں گریاں ہوتا ہے۔

دیکھ اپنا حالِ زار منجم ہوا رقیب تھا سازگار طالع ناساز دیکھنا

دوسرا مصرعہ ذو معنیں ہے (۱) منجم بھی نادیدہ عاشق ہو گیا۔ یہ صاحب سازگار ہو کر آئے تھے۔ اپنے ناسازگاری طالع کا کیا کہوں کہ ایک اور رقیب پیدا ہو گیا ہے (۲) منجم بھی عاشق ہو گیا۔ اس کے طالع ناساز کی ناسازگاری تو دیکھو۔ یہ سازگار ہو کر آیا تھا کہ اپنی ہی قسمت بگاڑ بیٹھا۔

## موت

شب ہجراں اور اندوہ عشق سے تنگ ہو کر عشاق موت کی تمنا کیا کرتے ہیں۔ اور اس جانکاہ مصیبت کا ان کے ہاں یہی واحد علاج ہے کہ وہ فنا کی نیند سو جائیں اور دنیا ان کے افسانوں کو یک قلم بھول جائے ہر مشرقی شاعر کو چونکہ التزاماً عاشق بھی بننا پڑتا ہے اور اس حالت میں اسے تکلیفوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے جو عشق میں عشاق کو پیش آتی ہیں۔ مومن نے بھی اس مضمون کو . . . . مختلف انداز سے باندھا ہے اور اپنے تخیل کے بل بوتے پر اس پامال مضمون کو کہیں سے کہیں لے گئے ہیں۔

انسانی تدابیر کی ناکامیابی انتہائے یاس اور ناامیدی ہے۔ یہ وہ لاعلاج مرض ہے جس کا علاج سوائے امید کے کچھ نہیں۔ عاشق شب ہجراں کی تکالیف سے دوچار ہے اور اسے زندگی دوبھر ہو رہی ہے اور یقین ہے کہ وہ فنا ہو جائے گا لیکن تب ہجراں کی تکالیف سے وہ یوں جانبر ہوتا ہے کہ اسے موت کی امید بندھ گئی ہے اور موت کی آس کے دامن میں پناہ لے کر موت کے قابو سے بچ نکلا ہے۔

آخر امید سے ہی چارۂ حرماں ہوگا مرگ کی آس پہ جینا شبِ ہجراں ہوگا

یار کے لب ہائے جاں بخش پر جان دے کر عاشق نے مصائب ہجر سے نجات حاصل کر لی اور کسی چارہ گر کے علاج کا ممنون بھی نہ ہونا پڑا۔

مر گئے اس کے لب جاں بخش پر ہم نے علاج آپ ہی اپنا کیا

لب جاں بخش پر مرنا زندگی کے مرادف ہے اس لحاظ سے عاشق نے موت سے ہم آغوش ہو کر زندگی حاصل کر لی۔ مسیح تمام بیماروں کا واحد علاج تسلیم کیا جاتا ہے۔ ہجر کی زندگی ہزار دفعہ مرنے سے بھی کہیں زیادہ تلخ تھی۔ عاشق نے مر کر اپنی تمام تکالیف کا علاج موت سے کرا لیا۔

زندگی ہجر بھی ایک موت تھی　　مرگ نے کیا کارِ مسیحا کیا

عاشق جلاد کے حوالے کیا جاتا ہے اپنی بے گناہی اور معصومیت کا یقین ہے اس لئے وہ چاہتا ہے کہ جلاد کے پاؤں پڑ کر اپنی جان بچالے مگر اس پر اقدام نہیں کرتا کہ مبادا جلاد کو معشوق کے سامنے لاجواب ہو کر خجالت اٹھانا پڑے اور عاشق کی مروّت اسے جائز نہیں رکھتی ۔

تھے بیگناہ جرأت پابوس تھی ضرور　　کیا کرتے وہم خجلت جلاد آگیا

محبوب عشاق کی محفل میں جلوہ فروش ہے حسب معمول وہ محفل سے اٹھ کر کھڑا ہوتا ہے ۔ محبوب کا اٹھنا تھا کہ عاشق جاں بحق ہو جاتا ہے ۔ مومن اس مضمون کو یوں دلآویز انداز میں بیان فرماتے ہیں ۔

اس کے اٹھتے ہی ہم جہاں سے اٹھے　　کیا قیامت ہے دل کا آجانا

مرض عشق بڑھتے بڑھتے اتنا لاعلاج ہو جاتا ہے کہ اس بلا کے بے درماں کا علاج موت سے بھی نہیں ہو سکتا ۔ عاشق اس سیہ بختی کا یوں ماتم کرتا ہے ۔

اب کوئی کیا کرے علاج افسوس　　موت نے بھی دیا جواب ہمیں

عاشق موت کا اتنا شیدائی ہے کہ وہ رقیب کو غیرت دلا کر اپنی موت کے سامان بہم پہنچانے کی کوشش کرتا ہے کہ اس کے آتشِ رشک بھڑک اٹھے اور اس بہانے سے اس کا خاتمہ کر دیا جائے ۔

اے کاش عدو کو غیرت آئے　　میں منتظر اپنی موت کا ہوں

## وصل وہجر

کتاب عشق میں یہ بات بہت اہم ہے ۔ عشق و محبت کی بہت سے واردات اس سے وابستہ ہیں وصل وہجر میں مختلف جذبات ابھرتے ہیں اور شاعر ان کو نظم کرتا ہے ۔ وصل وہجر کی کہانیاں چونکہ عامۃ الوقوع ہیں اس لئے ہر انسان کو ان کا کچھ نہ کچھ تجربہ ضرور ہوتا ہے انھیں عام جذبات کو خاص انداز سے اس طرح بیان کرنا کہ ہر کس و ناکس لطف اندوز ہو شاعرانہ کمالات کے تحت میں ہے ۔ بدبختی سے چونکہ مشرقی دنیا کے عاشق کی ہستی نہایت بدبخت ہوتی ہے ۔ اس لئے ہمیشہ ہی ہجر آشنا رہنا پڑتا ہے اور اگر کبھی موصلت کا موقع بھی نصیب ہو جائے تو اس کے مصائب بھی کمّاً و کیفاً مصائب ہجر سے کم نہیں ہیں ۔ اس لئے قدرتی طور پر ان کے کلام میں تفرع اور درد کا رنگ آجاتا ہے ۔ انسان کی فطری حالت خوشی و مسرت ہے ۔ کیا یہ خلاف فطرت نہیں کہ انسان ہر وقت مبتلائے غم فردا ہے اور حالات اصلاح کے بعد بھی بدستور غیر موافق رہیں ۔ مغرب اور عرب کی شاعری چونکہ حالیہ شاعری ہوتی ہے اس لئے ان کا کلام سراپا سوز و گداز ہوتا ہے ۔ مجنوں کی اس غزل کا آخری شعر جو اس نے ایک الزام کے جواب میں کہی ہے ۔ ایک دنیائے سوز و گداز ہے ۔

فانِ تک لیلےٰ بالعراق مریضۃ　　اگر بالفرض لیلےٰ عراق میں بیمار ہے تو
فانی لفی البحر العتوف غریق　　میں بھی تو موت کے دریا میں غوطے کھا رہا ہوں

مرغ نے اذان کہی ۔ اور محبوب عاشق کے پہلو سے اُٹھ کر گھر چلا گیا ۔ لیکن اس کے بعد جو کچھ عاشق پر گزری اس نے حشر کا نقشہ پیش کر دیا ۔ مومن اور مرغ صبح کو صورِ قیامت قرار دے کر اس فتنہ کو فتنۂ محشر سے تشبیہ دیتے ہیں ۔

صور تھی منقارِ مرغ صبح پہلو سے مرے　　وہ قیامت قد جو اٹھا حشر برپا ہو گیا

نومیدی نے شوقِ وصال کی متاعِ بے بہا کو بھی غارت کر ڈالا اور سرمایۂ اندوہ ہجراں کو بھی تباہ کر دیا۔ جب شوق وصال کا لطف یاد آتا ہے تو یاس و ناکامی کا گلہ کیا جاتا ہے۔ لیکن جب ادھر نظر پڑتی ہے کہ درد ہجراں کی تلخ کامیوں کا بھی خاتمہ ہوگیا تو نومیدی کی جان کو دعائیں دی جاتی ہیں۔

ناکامیوں کا گاہ گلہ گاہ شکر ہے　　شوقِ وصال و اندوہِ ہجراں نہیں رہا

شب وصال ہے عاشق نے شکوہ، شکایت کے دفتر کھول رکھے ہیں اور محبوب ہے کہ طعنوں کے تیر برسا برسا کر عاشق کے دل کو زخمی کر رہا ہے۔ اس پر لطف منظر کو یوں فرماتے ہیں۔

واں طعنہ تیر بار، یہاں شکوہ زخم ریز　　باہم تھی کس مزے کی لڑائی تمام شب

ہجراں کی تکلیف سے عاشق کا جینا دوبھر ہو چکا ہے۔ وہ موت سے لپٹ کر اس بے سود زندگی کا خاتمہ کرنا چاہتا ہے، مگر زندگی ہے کہ گلے کا ہار ہو چکی ہے اور ختم ہونے کو نہیں آتی۔

اُمید وعدہ بھی تو نہیں روز ہجر میں　　ہم سے وفائے زندگیِ بیوفا عبث

جس غم سے جاں بلب ہو کر عاشق نے موت کے دامن میں پناہ لی تھی زندگی کا سر رشتہ ہاتھ سے چھوٹنے کے بعد اس غم کا بھی خاتمہ ہوگیا۔۔ مرنے کے بعد عاشق پر یہ حقیقت کھلی کہ غم ہجر میں جینا کس قدر عبث اور بیکار ہے"

جس غم میں مر رہے تھے وہ غم ہی نہیں رہا　　افسوس مر کے دیکھا کہ جینا ہے کیا عبث

عاشق قریب مرگ ہے اور آج ہی وعدۂ ملاقات پورا ہونا ہے۔ ادھر یہ ڈر ہے سانس آئے یا نہ آئے ادھر یہ فکر دامنگیر کہ کہیں حسب دستور آج بھی وہ نہ آئیں۔ اس عالم کشمکش کو یوں بیان کرتے ہیں۔

نزع ہے اور روز وعدۂ وصل　　ہے بہر طور دم شماری آج

عاشق قریب الموت ہے اور بیساختہ اس کے منہ سے دعائیں نکل رہی ہیں کہ اے خدا مجھے محبوب سے ملا دے لیکن جب عاشق کو ان دعاؤں کا احساس ہوتا ہے تو وہ دعاؤں کو منع کرتا ہے کہ خواہ مخواہ استجابت کے لئے اتنی بے قرار نہ ہوں اس لئے کہ اگر انھیں قبولیت کا درجہ بھی عطا کر دیا گیا جب بھی وہ شام سے پہلے آ نہیں سکتے اور شام تک میری روح ہوا ہو جائے گی اس لئے خواہ مخواہ انھیں یہ احسان اپنے سر نہ لینا چاہیئے۔

ہم تو بچتے نہیں تا شام وہ آئیں بھی تو کیا　　اے دعائے سحری منت تاثیر نہ کھینچ

محبوب عاشق سے دریافت کرتا ہے کہ عشق کیا چیز ہے۔ اس کے جواب کے لئے عاشق اثرِ غم سے فرمائش کرتا ہے کہ ذرا وہ عشق کی حقیقت آپ پر واضح کر دے۔

اثرِ غم ذرا بتا دینا　　وہ بہت پوچھتے ہیں کیا ہے عشق

درازی شب ہجراں کی تلخی کسی سے مخفی نہیں مگر عاشق محض اس لئے شب ہجراں کی اس درازی میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں چاہتا کہ محبوب اچھی طرح آسودۂ خواب ہو جائے فرماتے ہیں۔

تا نہ پڑے خلل کہیں آپ کے خوابِ ناز میں　　ہم نہیں چاہتے کمی اپنی شب دراز میں

محبوب شام ہجراں کی محض عاشق کو چھیڑنے کے لئے مدح سرائی کرتا ہے تاکہ عاشق خوب جلے۔ مومن اپنی حماقت پر افسوس کرتے ہیں کہ میں نے کیوں اس کو چھیڑا، اور یہ گفتگو سُنی۔

ہے طعن سے مدحِ شامِ ہجراں　　میں کیسی بلا کو چھیڑتا ہوں

عاشق آئے دن کی تکالیف اور روزمرہ کے حوادث سے تنگ ہے۔

حسرتیں میرے نصیبوں میں لکھی ہیں کیا کیا　　اتنے دفتر ہیں کہیں فصل نہیں باب نہیں

حفظِ سرِ عشق میں نہایت ضروری ہے مگر عاشق نے اپنا راز کسی سے کہہ دیا ہے۔ جب ہوش میں آتا ہے تو اسے اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے کہ کیوں میں نے اس جرم کا ارتکاب کیا۔

باتیں وہ تیری ہوش ربا ہیں کہ کیا کہوں　　جو کوئی راز داں ہے مرا راز داں نہیں

غمِ ہجراں میں عاشق کے روحانی اضطراب کا پارہ بہت بلند ہو جاتا ہے۔ اس اضطراب کی کیفیت کو وہ یوں بیان کرتا ہے کہ دل پاش پاش ہو چکا ہے اور دل کی قاشیں اس کی آنکھوں اور منہ سے جھڑ رہی ہیں۔

بے نالہ منہ سے جھڑتے ہیں، بے گریہ آنکھ سے　　اجزائے دل کا حال نہ پوچھ اضطراب میں

کوئے یار میں عشاق کا ایک جمگھٹا رہتا ہے۔ یار کے حسنِ جہاں تاب کا یہ عالم ہے کہ تمام دنیا اس کی شیدائی ہے اس لئے گھر چھوڑ چھوڑ کر دنیا اس کی گلی میں جمع رہتی ہے گویا تمام دنیا میں صرف یار کی گلی ہی آباد پائی جاتی ہے۔

رہتے ہیں جمع کوچۂ جاناں میں خاص و عام　　آباد ایک گھر ہے جہانِ خراب میں

شبِ وعدہ ہے اور محبوب حسبِ وعدہ آنے کی تکلیف گوارا نہیں کرنا چاہتا۔ عاشق کو جس کرب و بلا کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ مومن اس کو یوں بیان کرتا ہے۔

کیا کہوں تم جو نہ آئے کیا قیامت آ گئی　　میہماں تھا میرے گھر میں روزِ محشر رات کو

یہ تو معلوم ہی ہے کہ عشاق کی دعائیں کبھی بھی اثر ساماں نہیں ہوئیں۔ اور جب متعدد بار ایک فعل پر ایک ہی اثر مترتب ہو اور وہ اثر پسندِ خاطر نہ ہو۔ تو انسان اس کی ضد سے اس اثر کی ضد کی تمنا کرتا ہے۔ جب ہزاروں بار وصل کی دعائیں نامقبول ہوئیں تو عاشق نے ناچار ہو کر ارادہ کر لیا کہ اس کے بعد ہجرِ یار کی دعا مانگا کریں گے تاکہ اس دعا کا بھی حسبِ معمول الٹا اثر پڑے اور وصالِ یار نصیب ہو۔

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجرِ یار کی　　آخر تو دشمنی ہے دُعا کو اثر کے ساتھ

حسرتِ دیدار سے عاشق کی جان پر بنی ہے، آخر گھبرا کر جان دے دیتا ہے اور خوش ہوتا ہے کہ بہت اچھا ہوا اور اس مردنِ دشوار سے بہت آسانی سے نجات ہو گئی۔

کچھ نہ سوجھا حسرتِ دیدار سے　　سہل چھوٹے مردنِ دشوار سے

عاشق نے شبِ ہجراں کی تکلیف سے نجات پانے کی ہرچند کوشش کی مگر جانبر نہ ہو سکا اور جاں بحق ہو گیا۔ اپنی شکست کا یوں اقرار کرتا ہے۔

نہ کٹی مجھ سے شبِ جدائی کی　　کتنی ہی طاقت آزمائی کی

غمِ ہجراں سے گھبرا کر عاشق یار کی تلاش میں نکلتا ہے اتفاقاً کوچۂ غیر میں یار سے دوچار ہوتا ہے اپنی اس ہرزہ تازی کی یوں مدح سرائی کرتا ہے۔

کوچۂ غیر میں ملا وہ ہمیں　　ہرزہ تازی نے رہنمائی کی

**ناصح** ناصح کا وجود عشق کی ضروریات میں شمار ہوتا ہے۔ شعراء نے اس پر خوب طبع آزمائیاں کی ہیں۔ مومن کا ایک شعر بہت مشہور ہے ہم اس کو لکھ کر مضمون ختم کرتے ہیں۔ آئے دن کی ذلتوں اور روز مرہ کی تکالیف سے ناصح کو کوفت محسوس ہوتی ہے۔ وہ عاشق سے استدعا کرتا ہے کہ خدا کے لئے اس عشق خانہ برانداز سے دست کش ہو جاؤ۔ مگر عاشق کے رگ و پے میں عشق کا زہر غم سرائیت کر چکا ہے۔ اسے اپنی زیست کا سامان نظر آتا ہے۔

چھٹ کر کہاں اسیرِ محبت کی زندگی
ناصح یہ بندِ غم نہیں قیدِ حیات ہے

# مثنوی "قولِ غمیں"

اور

## مومن کی دوسری مثنویاں

(وقار احمد رضوی)

مثنوی "قولِ غمیں" کی اہمیت یہ ہے کہ یہ لکھنؤ کی ایک خاتون اُمتُ الفاطمہ بیگم کے نام سے منسوب ہے جو شعر و شاعری میں مومن خاں کی شاگرد تھیں اور صاحب تخلص کرتی تھیں۔ شیفتہ نے اپنے تذکرے میں اُن کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:۔

"صاحب تخلص، نامش اُمتہ الفاطمہ بیگم، مشہور بہ صاحب جی کہ ماہِ آسمانِ نکوئی است۔ آفتاب صفت از مشرق بجانب مغرب آمدہ، بتقریبِ مداوا با مومن خاں کارش افتاد۔ ماہے چند کار با درد و دوا بود۔ سالہا است کہ باز بہ لکھنؤ رفت۔ مثنوی قولِ غمیں نام کہ از مصنفاتِ خان معزّی الیہ است۔ شرحِ نسخۂ حُسن و جمالِ ہماں موزوں قد است"

(گلشنِ بیخار، صفحہ ۱۲۳، مطبوعہ نولکشور)

مومن کے دیوان میں ایک پوری غزل صاحب کی ردیف میں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ غزل، صاحب جی سے متعلق ہو۔ اور مومن کے ہاں بار بار جو پردہ نشین کا ذکر آتا ہے وہ یہی ہوں۔ مثنوی منظوم خط (دوم) میں مومن نے ایک جگہ اپنی محبوبہ کے ہاشمی نسب ہونے کی طرف بھی اشارہ کیا ہے ؎

تو جو ہے ہاشمی نسب اے جاں!
ہے محبت تری مرا ایماں!

اس بات کی توثیق چند دوسری مثنویات کے اشعار سے بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ "آہ و زاریِ مظلوم" میں محبوبہ کا تعارف کرتے ہوئے لکھا ہے ؎

الٰہی کیا کروں خود کام ہے وہ — بتِ غارت گرِ اسلام ہے وہ
نرالا سب سے اس کا کیش و آئین — محب اہل بیت و دشمن دیں
طلسم شیفتگی۔ جادو کلامی — صفت میری جو ہو تو نیک نامی

مری الفت چھپائے مجھ سے بیدین تقیہ فرض جانے ، مستحب کیں

ایامِ عزا آتے ہیں تو شاعر کا دل بپاسِ خاطرِ محبوب ، غم سے نڈھال ہو جاتا ہے ۔ وہ گلابی ہونٹوں کو مرجھاتا دیکھ کر ، افسردہ ہو جاتا ہے ۔ اور محبوبہ کو رونے دھونے سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے ۔ مبادا رونے سے محبوبہ کے پھول جیسے رخسار کمھلا جائیں اور نیل پڑ جائیں ؎

یعنی از بس محرم آیا ہنگامِ وفورِ ماتم آیا
ہے غم ترا دل کو ناگوارا اس فکر نے مجھ کو جان مارا
ہر چند غمِ امام ہوئے پر تجھ کو نہ غم سے کام ہوئے
ہر شب تجھے عشرتِ دل افروز ہر روز ہو تیرے گھر میں نوروز

مثنوی "قولِ غمیں" کی داستانِ عشق کا خلاصہ صرف اتنا ہے کہ مومن ، طبیب کی حیثیت سے مریضہ کو دیکھنے کے لئے بلائے جاتے ہیں اور دل دے بیٹھتے ہیں ۔ محبوبہ خوفِ رسوائی سے ، عشق و عاشقی سے باز رہنے کی تلقین کرتی ہے ۔ لیکن دل کی چاہ اور عشق کی آگ دونوں طرف بڑھ جاتی ہے ۔ اس طرح ملاقاتوں اور طرب کی محفلوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے ۔ یکایک فلکِ ناہنجار کو یہ عیش کے دن نہیں بھاتے ، چین کی گھڑیاں چھن جاتی ہیں ۔ اور محبوبہ اپنے وطن کوچ کر جاتی ہے ۔ اس موقع پر آخری ملاقات کا جو منظر دکھایا گیا ہے ۔ وہ اس مثنوی کی جان ہے ۔ آخری ملاقات ہے ۔ وقت گزر رہا ہے اور زبان نہیں کھلتی ۔ ایک دوسرے کو حسرت زدہ ہو کر دیکھتے ہیں اور روتے ہیں ۔ ملاحظہ فرمائیے ۔

بل کے حسرت زدگانِ بے کس دور بیٹھے ہوئے روتے رہے بس
خونفشاں لب پہ وہ آہیں باہم حسرت آلودہ نگاہیں باہم
کہ یہ کیا حال ہے کیوں روتے ہو مفت کس واسطے جی کھوتے ہو
اب تم اوروں سے لگا لیجو جی نہ ہوئے ہم تو کوئی اور سہی
کہہ کے یہ اُٹھ گئی ، جی کھوتی ہوئی ہچکیاں لیتی ہوئی ، روتی ہوئی
ہم بھی روتے ہوئے اپنے گھر آئے بادلِ مضطرب و مضطر آئے

ان اشعار میں فطرتِ نسوانی کے ایک لطیف پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے ۔ اس مثنوی کی بحر ۔ بحرِ رمل مسدس مخبون ، محذوف مسکن ہے ۔ صدر و ابتدا سالم کے ساتھ ۔ فاعلاتن فعلاتن فعلن ۔ (بسکونِ عین دوبار)

اس مثنوی کو ایک قطعہ ، پانچ غزلوں اور چار مختلف عنوانوں پر منظوم کیا گیا ہے ۔ "قولِ غمیں" میں محبوبہ سے ملنے کے لئے شاعر کی بے قراری ملاحظہ فرمائیے ۔

شوق فرمائے کہ ہاں پھر چلئے جی میں یہ آئے کہ واں پھر چلئے
دل جو بے تاب تھا پھر تھام لیا بے قراری ہی میں آرام لیا

مثنوی قولِ غمیں (۱۲۳۶ھ) کے علاوہ مومن کی دوسری پانچ مثنویوں کے نام یہ ہیں ۔ ۱ ۔ شکایتِ ستم (سنہ ۱۲۴۰ھ) ۔ (۲) قصۂ غم ۱۲۳۵ھ ۔ (۳) تفِ آتشیں ۱۲۴۱ھ (۴) حنینِ مغموم ۱۲۴۴ھ ۔ (۵) آہ و زاریٔ مظلوم ۱۲۴۶ھ ۔ اِن مثنویوں کے علاوہ "دو منظوم خط" ۔ "ایک مثنوی ناتمام" ۔ "ایک مثنوی دیگر اور ایک مثنوی جہادیہ ہے" ۔

مثنوی "شکایت ستم" میں، جو ۲۰ سال کی عمر میں لکھی گئی ہے۔ مومن نے اپنی حیات معاشقہ کا آغاز چھوٹی عمر سے بتایا ہے۔ اس مثنوی میں، مومن نے محبوبہ سے ایک اتفاقی ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ جو عشق و محبت کا بہانہ بن جاتی ہے۔ یہاں تک کہ بے حجابی کے تعلقات بڑھ جاتے ہیں۔ رقیبوں کو خبر ہوتی ہے اور محبوبہ کو ہمیشہ کے لئے عاشق سے جدا کر دیتے ہیں۔ "قولِ غمیں" کی طرح اس مثنوی میں بھی مومن کی نازک خیالی اور وقت پسندی کی اچھی مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً :-

دیکھتا کیا ہوں سارا گھر ہے غمیں　　جو نظر آئے ہے سو جیں بہ جبیں
گریہ رہ رہ کے بار بار آیا　　جھوم جھوم ابرِ نوبہار آیا
نفس تیز تیز کو روکا　　نالۂ شعلہ ریز کو روکا
لذتیں شور شوں میں آتی ہیں　　حسرتیں جان کھائے جاتی ہیں
بھوک بھی گر لگے تو غم کھاؤں　　تشنگی ہو تو اشک پی جاؤں

یہ مثنوی بحرِ خفیف مسدس مخبون محذوف مسکّن میں ہے۔ مگر اس میں عَرُوضُ وضَرْبُ مخبون مسکّن مقصور بھی ہیں ـــ
فاعلاتن ۔ مفاعلُن ، فَعْلَان ۔ (بہ سکون عین دو بار)

مومن کی دوسری مثنوی "قصۂ غم"[1] میں کوئی نادر واقعہ نہیں ہے۔ البتہ "تفِ آتشیں" میں طالع خفتہ کی شکایت اور اپنی حرماں نصیبی کا گلہ ہے۔ "تفِ آتشیں" میں محبوبہ کا سراپا بڑے اچھے انداز میں کھینچا گیا ہے۔ ایک روز محبوبہ شاعر کے دوست کے ہاں مہمان بن کر آتی ہے۔ شاعر کو رشک آتا ہے۔ محبوبہ شاعر کا خط پاکر نہ ملنے کی دھمکی دیتی ہے۔ اس مثنوی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

کھولیو ساقی منہ کو سبو کے　　پیتے ہیں کب سے گھونٹ لہو کے
پڑ گئے لاکھوں پاؤں میں چھالے　　جوشِ جنوں نے پاؤں نکالے
یار نہیں ہیں اپنے ڈھب کے　　آئے ہے وحشت ملنے سے سب کے
سیرِ گلستاں خار لگے ہے　　موج رواں تلوار لگے ہے

اس مثنوی میں شکوے کے شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

گرمیٔ شوق و سوزِ نہانی　　آہِ سحر کی شعلہ فشانی
چشمِ سحر آلودہ کا شکوہ　　بختِ بخواب آسودہ کا شکوہ

یہ مثنوی بحرِ متقارب مثمن اثرم سالم الاخر میں ہے۔ جس کو بحرِ متقارب مثمن اثلم مقبوض سالم الاخر بھی کہہ سکتے ہیں، فَعْلُ فعولن فعلُ فعولن یا فاعُ فعولن فاعُ فعولن ۔ اس مثنوی کی تقطیع اخفش کی رکضِ الخیل سے بھی ہو سکتی ہے اس صورت میں عروض و ضرب مُرفّل ہوں گے۔ اس لحاظ سے "تفِ آتشیں" ذو بحرین ہے۔

مومن کی پانچویں مثنوی۔ مثنوی "حنینِ مغموم" ہے۔ جو بحرِ رمل مسدس محذوف میں ہے۔ (فاعلاتن فاعلاتن فاعلن)

---

[1] مثنوی "قصۂ غم" بحرِ ہزج مسدس اخرب مقبوض محذوف الآخر ہے۔ مفعولُ مَفاعلن فعُولُن۔ (گلزارِ نسیم والی بحر) اگر حرفِ آخر بوجہ ثانی ساکن کے نہ گرایا جائے تو عروض و ضرب مقصور الآخر ہوں گے۔

اس مثنوی میں مومن نے ایک نئی "پردہ نشیں" کا ذکر کیا ہے۔ کہتے ہیں ؎

جامۂ سالم کبھی پہنا نہیں　　پردہ در تھی ایک نئی پردہ نشیں

مثنوی "حنین مغموم" میں مومن نے جہاں اپنے شاگردوں کا ذکر کیا ہے۔ وہاں خود کو "وحشیان عشق" کا "سرخیل" بتایا ہے اور محبوبہ سے احتراز اور اپنی آشفتہ مزاجی کا عذر اس طرح کیا ہے ؎

کیا کہوں تجھ سے کہ مجھ پر کیا بنی　　دل گیا کس طرح، کیسی آبنی
شرم آتی ہے مگر معذور ہوں　　اختیار اس میں نہ تھا مجبور ہوں
اک پری وش۔ سبز رنگ و سبز پوش　　جس کے آگے حور کے اُڑ جائیں ہوش
پیش چلتی کچھ نہ تھی مجبور تھا　　دل نہ دیتا اس کو، میں معذور تھا

اس لحاظ سے یہ مثنوی "اجتماعِ احترازِ وشوقِ آہ" کی مثنوی ہے۔ اس کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اسمیں دو مختلف چہیتیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ جن میں سے ایک شعبدہ باز کا رول ادا کرتی ہے اور عاشق و محبوبہ کے تعلقات میں تفرقہ ڈال دیتی ہے اس مثنوی کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

دل نے پائی جرمِ الفت کی سزا　　جاں نے چکھا تلخ کامی کا مزا
پھر ہوا ہے ناخنِ غم جاں خراش　　پارہ پارہ دل، جگر ہے پاش پاش
کچھ نہیں کھلتی ہے وجہ احتراز　　پاکدامن ہے وہ تو میں پاکباز
دونوں وہم و بدگمانی سے خفا　　مجھ سے وہ میں سخت جانی سے خفا

مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ مومن کی تمام مثنویوں کے نام جس طرح تاریخی ہیں، وہاں اُن میں ہر مثنوی کی داخلی کیفیت کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "شکایت ستم" میں ستم ایجاد کے ظلم و جور کی شکایتیں، "تفِ آتشیں" میں لفظوں کی رعایت سے عشق کی جلن کا اظہار "حنین مغموم" میں رونا دھونا اور مثنوی "آہ وزاریِ مظلوم"[1] میں اپنی مظلومیت اور معصومیت کا اظہار کیا ہے اور خدا سے نالوں میں اثر کرنے کی دُعا کی ہے۔

ان مثنویوں کے بعد، محبوبہ کے نام دو منظوم[2] خط ہیں، جو ہمدردی سے بھرے ہوئے ہیں۔

آخر کی تین مثنویاں، میر حسن کی مثنوی بدرِ منیر کی طرز پر، بحر متقارب مثمن مقصور یا محذوف میں ہیں ——— (فعولن فعولن فعولن فَعَلْ یا فعول)

ان میں سے پہلی مثنوی، عشقیہ مناجات ہے۔ اُن میں عروض و ضرب مقصور الآخر ہیں۔ دوسری مثنوی میں حمد و نعت کے مضامین ہیں۔ اس میں عروض و ضرب محذوف الآخر ہیں اور آخری مثنوی جہادیہ ہے۔ اس میں عروض و ضرب مقصور الآخر ہیں۔

تیرھویں صدی ہجری کے نصف اول میں حضرت سید احمد بریلوی نے ایک نیم سیاسی اور مذہبی تحریک چلائی تھی جس کا مقصد

---

[1] "آہ وزاریِ مظلوم"، مثنوی خواجہ حسن کی طرز پر، بحر ہزج مسدس محذوف میں ہے۔ مفاعیلن مفاعیلن فعولن۔

[2] نامۂ اول۔ بحر ہزج اخرب مقبوض مقصور الآخر ہے۔ مفعولُ مفاعلن مفاعیل۔
نامۂ دوم۔ بحر خفیف مسدس مخبون محذوف مسکن ہے۔ فاعلاتن مفاعلن فعلن (بسکون عین)۔ صدر و ابتدا وسالم۔

فرنگیوں کا استیصال اور ملک کو خوش حالی کی طرف لے جانا تھا۔ حکیم مومن خاں، سید صاحب سے بیعت تھے۔ مومن خاں اگرچہ عملاً اس تحریک میں شریک نہ ہو سکے، لیکن آخری وقت تک وہ اس تحریک کے حامی رہے۔ مومن نے اسی جذبۂ حریت اور جمیتِ قومی کے جذبے میں مثنوی جہادیہ لکھی۔ اس کو پڑھ کر مومن کے عقائد کی پختگی اور مذہبی غلو کا اندازہ ہوتا ہے۔ شروع کی چھ مثنویوں میں اُن کا رنگ عشقیہ ہے اور آخر کی تین مثنویاں مذہبی جذبات سے بھرپور ہیں۔

شروع کی مثنویات کو پڑھ کر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مومن کی توبہ اور بیعت کا زمانہ ایک نہیں ہے۔ کیونکہ آخری دو مثنویاں یعنی "حنینِ مغموم" اور "آہ و زاری مظلوم" بالترتیب ۱۲۴۴ھ اور ۱۲۴۶ھ میں لکھی گئی ہیں۔ جب کہ سید صاحب کی تحریک ۱۲۴۶ھ میں ختم ہو جاتی ہے۔

حُسنِ ترتیب، واقعہ نگاری اور کردار مثنوی کی خصوصیات ہیں۔ مثنوی کے فن کے اس اصلاحی معیار پر اگر مثنویاتِ مومن کا تجزیہ کیا جائے تو وہ پوری نہیں اترتیں۔ کیونکہ ان مثنویوں میں نہ مظاہرِ فطرت کی نقاشی کی گئی ہے اور نہ ان میں موضوع کا ترکیبی ارتقاء ہے۔ ان میں نہ رزم ہے نہ بزم ہے۔ نہ تصوف ہے نہ فلسفہ۔ ایک شاعر رنگین مزاج کے عشق کی منظوم آپ بیتیاں ہیں۔ ان میں اثر ہے پلاٹ نہیں۔ ان میں قصہ ہے اجتماعی نہیں بلکہ شخصی۔

متقدمین کی مثنویوں سے مومن کی مثنویاں اس لحاظ سے مختلف ہیں کہ ان میں من گھڑت قصے، جادو اور ٹوٹکے کے مضامین نہیں ہیں۔ یہ مومن کا امتیازی نشان ہے کہ انھوں نے مثنوی کو طلسمی دائروں سے نکال کر حقایق کے دامن سے وابستہ کیا اور مثنوی کے فن کو داخلی کیفیت عطا کی۔ یہ دوسری بات ہے کہ یہ داخلی کیفیت کیسی اور کس نوع کی ہے۔ انکی مثنویوں میں داخلی رنگ غالب ہے۔ ان میں غزل کی دلگدازی اور طربیہ مثنویوں کی شگفتگی پائی جاتی ہے۔ ان مثنویوں میں استعاروں کی ندرت اور جذبے کی کارفرمائی ہے۔ یہ نازک خیالی، معنی آفرینی اور لفظی صناعی کے عمدہ نمونے ہیں۔ ان مثنویوں میں خارجی عناصر کو تلاش کرنا بے سود ہے۔ ایک منچلے کے جلے پھپھولے ہیں اور بس۔

مثنوی کے مقابلے میں غزل کا آرٹ غنائی ہوتا ہے۔ اور مثنوی میں توضیح و تشریح سے کام لیا جاتا ہے۔ مومن نے تغزل کو مثنوی میں سمونے کی کوشش کی ہے۔ ان کے اسلوب میں ادبی لطافتیں اور طرزِ بیان میں شعری نزاکتیں ہیں۔ جو مثنوی کی بڑی خوبیاں سمجھی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر اس رنگ کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:۔

سرمۂ دیدۂ خورشید ہوں میں — خاک میں کس نے ملایا مجھکو
ہائے کس شوخ پہ جی لوٹے ہے — تپشِ دل نے ستایا مجھکو
نہ کچھ آشفتہ سری نے مارا — کہ مجھے چارہ گری نے مارا (قولِ غمیں)

تنگیٔ دہر وحشت افزا تھی — تپشِ دل قیامت آرا تھی
کیا جگر سوز حرفِ بے ادبی — برقِ گل، خندہ ہائے زیرِ لبی (شکایتِ ستم)

چارہ و تدبیر کا امکاں نہیں — درد اپنا قابلِ درماں نہیں
ہو شگاف سینہ کا کیونکر رفو — چاک پردہ سے نہ جھانکے وہ کبھو
دردِ دل کا چارہ یاس انگیز ہے — نرگسِ بیمار کو پرہیز ہے (حنینِ مغموم)

مثنوی کا ایک بہت بڑا وصف اسی کا اسلوب ہے، کیونکہ اس سے صناع کی طاقتِ بیان اور قوتِ متخیلہ کا اندازہ ہوتا ہے

اس روشنی میں اگر مثنویاتِ مومن کو پرکھا جائے تو ان میں یہ وصف بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے ۔ اور ان مثنویوں کو پڑھ کر مومن کی جولانیٔ طبع اور قادر الکلامی کو تسلیم کرنا پڑتا ہے ۔ لیکن ان میں فلسفہ یا تصوف کے مسائل نہیں ہیں ۔ کیونکہ مومن عقیدۃً اہلِ حدیث تھے اور تصوف کو عقل کے ارتقاء میں رکاوٹ سمجھتے تھے ۔ فلسفہ سے ان کی طبیعت کو کوئی لگاؤ نہ تھا ۔ اس لئے ان مثنویوں کا ایک ہی مقصد باقی رہ جاتا ہے اور وہ ہے حکایتِ غم ؎

نہیں اشعار یہ ہیں نالے کئی
سوزشِ غم کے ہیں تب خالے کئی　　(قولِ غمیں)

متقدمین میں ان مثنویوں کے بعض مناظر سراج اورنگ آبادی سے ملتے ہیں ۔ مثلاً مومن کی مثنوی " حنین مغموم "[۱] کا وہ منظر جہاں کریہہ الشکل محبوبہ ، مومن کو کسی غزالِ رعنا سے ملنے سے یہ کہہ کر روکتی ہے کہ وہ تو تم کو چاہتی ہی نہیں تم کیوں اپنی جان کو اس کے لئے برباد کرتے ہو ۔ مجھ سے محبت کرو ۔ مجھ میں ایسی کونسی کمی ہے ؎

لیک یہ تو کہئے کس کو دل دیا　　میں بھی دیکھوں اس کو جس کو دل دیا
دیکھوں کیا ہے اس میں جو مجھ میں نہیں　　کیا ادا اس میں ہے جو مجھ میں نہیں　　(حنین مغموم)

یہ بوستانِ خیال کے اس منظر سے بہت مشابہ ہے جہاں ایک سردار زادے نے دوسرے حسینوں کی طرح سراج کو اپنی طرف کھینچنا چاہا ہے اور کہا کہ جس بیوفا کے لئے تم اس قدر بے تاب ہو اس کو تمھاری پروا بھی نہیں ۔ مناسب یہی ہے کہ اس کا خیال چھوڑ دو ، اور مجھ سے مراسم محبت بڑھاؤ ۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ سراج فطری جذبات رکھتے تھے ، فطرتاً عاشق مزاج تھے ۔ فرق صرف اتنا ہے کہ " بوستانِ خیال " کو تصوف کے اخلاقی نتائج پر ختم کیا گیا ہے ، اور مثنویاتِ مومن میں مومن کی حیات معاشقہ ہے ۔

جرأت کے مقابلہ میں مومن کے ہاں میر کی سادگی و سوز و گداز ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مومن کی مثنویاں اُنکی اپنی آواز اور قلبی کیفیات کے خاکے ہیں ۔ خواجہ حسن کا عشق ایک طوائف سے تھا ۔ مومن کا عشق پھر بھی کسی " پردہ نشین " کسی " ہاشمی نسب " سے ہے ۔

مثنوی " سحر البیان " اور " گلزار نسیم " کے سامنے مومن کا رنگ پھیکا نظر آتا ہے ۔ اس لئے مومن کا مقابلہ میر حسن اور دیا شنکر نسیم سے نہیں کیا جا سکتا ۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ مومن کے معاصرین ، ذوق و غالب میں سے کوئی بھی مثنوی کی صنف میں مومن کا حریف نہیں ۔ حالانکہ ذوق کا اسلوب مثنوی سے مناسبت رکھتا ہے ۔

یہ بات ایک حد تک درست ہے کہ مثنویاتِ مومن میں بعض جگہ معاملاتِ حسن و عشق کا اظہار عریاں طور پر کیا گیا ہے لیکن اس میں شاعر کے ذہن سے زیادہ ، سماج کا جبری نظام مجرم ہے ۔ ہمارے سماج میں آج تک عشق کو جرم سمجھا جاتا ہے ۔ حسن اور معنی کا مفہوم معاشرے کی پستی سے تعبیر کیا جاتا ہے اور عاشق کو اخلاقی مجرم ۔ حالانکہ یہ بات نظامِ فطرت کے بالکل خلاف ہے ۔ روح کا تعلق انسان کے بطون سے ہے اور جذبے کا تعلق خارجی دنیا سے ۔ ان میں سے ہر ایک کو پھلنے اور پھولنے کے مواقع ملنا چاہئیں ۔ جذبہ اگر دب کر رہ جائے تو روح کی بالیدگی ختم ہو جاتی ہے جسے رہبانیت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے ۔ مومن کا

---

[۱] جیسا کہ اوپر کسی جگہ لکھا جا چکا ہے کہ حسنین مغموم میں مومن نے دو عورتیں کا ذکر کیا ہے ۔ جن میں سے ایک مومن کی معتوب ہے ۔ اس کی ہجو میں مومن نے اسی مثنوی میں جو اشعار لکھے ہیں وہ بہت مزیدار ہیں ۔ اسی کو مومن نے " کریہہ الشکل مردودِ جہاں " کہا ہے ۔

ماحول بھی کچھ اسی قسم کا تھا۔ ان کا گھرانا عالمانہ اور صوفیانہ گھرانا تھا۔ وہ شاہ عبدالعزیز کے صحبت یافتہ اور شاہ عبدالقادر کے شاگرد تھے ان کی شادی بھی میر درد کے خاندان میں (درد کے نواسے خواجہ محمد نصیر کی لڑکی سے) ہوئی تھی۔ ظاہر ہے ایسے پاکیزہ ماحول میں عشق بازی کیسے ہو سکتی تھی۔ مگر چونکہ مومن فطرتاً رنگین طبیعت رکھتے تھے۔ اس لئے اس جذبے کو نہ روک سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ترک و اختیار کی کشمکش میں مبتلا رہے اور چوری چھپے اختیار کی راہوں پر چل نکلے ؎

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

جہاں چشمِ نگہدار، پرسشِ احباب، اور بزرگوں کی سرزنش ہو وہاں اس کے علاوہ اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔ چنانچہ "شکایتِ ستم" میں ماں باپ کی سرزنش ملاحظہ فرمائیے ؎

| | |
|---|---|
| ہم کو بدنام کر دیا تو نے | اے زبوں کار کیا کیا تو نے |
| کہیں کس منہ سے جائیں گے اب ہم | ہائے کیا منہ دکھائیں گے اب ہم |
| تجھ سے بے ننگ و نام کو کیا عیب | دل لگا کر ہمیں لگایا عیب |
| کیوں نہ آنکھیں لڑاتے آئی حیا | تیری آنکھوں سے یہ لحاظ گیا |
| باعثِ عبرتِ جہاں تو ہوا | ہائے کیا ننگِ خانماں تو ہوا |
| تیرے جینے سے جیسے دل تھا شاد | اب خوشی موت کی ہے اے ناشاد |

اگر غور سے دیکھا جائے تو اُردو مثنویوں میں عریاں مضامین کی کمی نہیں۔ خود خواجہ میر اثر جو بڑے صوفی اور صوفی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے، اس سے نہ بچ سکے۔ چنانچہ۔ خواب و خیال کا وہ منظر جہاں اختلاط کا بیان آیا ہے وہاں خواجہ صاحب کے شانوں سے بھی متانت اور سنجیدگی کی قبا کھسکتی نظر آتی ہے[1]

میر اثر کی مثنوی میں سراپا معرکے کی چیز سمجھا جاتا ہے۔ محبوب کی کمر اور کاکل پیچاں کا وصف سنئے ؎

| | |
|---|---|
| کہی جاتی نہیں کمر کی لچک | پائی چیتے کے کب یہ ایسی لپک |
| زلف ہے یا کوئی تماشا ہے | دامِ جاں یا کمندِ دلہا ہے |
| مانگ موتی بھری وہ دے ہے بہار | جیسے بگلوں کی بدلی میں ہو قطار |

مومن نے بھی اپنی مثنوی "تف آتشیں" میں محبوبہ کا سراپا کھینچا ہے اس کو پڑھیے اور مومن کی قادرالکلامی کی داد دیجئے ؎

| | |
|---|---|
| قامتِ رعنا آہ ستم کش | تابِ جبیں یا شعلۂ آتش |
| زلفِ مسلسل، سلسلہ جنباں | حلقۂ کاکل یا در زنداں |

---

| | |
|---|---|
| پہلے سو بار ادھر اُدھر دیکھا | تب تجھے ڈر کے یک نظر دیکھا |
| دیکھ میری طرف تو اب نہ دھڑک | ساتھ مل بیٹھ اس قدر نہ بھڑک |
| لوگ تیرے جو پاس آتے ہیں | سن کے میرے حواس جاتے ہیں |
| ران پر جب کہ ران پڑتی ہے | جسم میں اور ہی جان پڑتی ہے |

تیغ شکاری، جنبش ابرو — چشم کی گردش، شوخیٔ آہو
کشتۂ مژگاں، ترکِ نگاہاں — سرمہ فشاں جوں تیغ صفاہاں
رنگِ صبا گلریز تبسم — خندۂ گلبن، طورِ تبسم
لبکہ وہ شکلِ پردہ نشیں ہے — دل سے زباں تک آتی نہیں ہے

عریانی کی بحث میں ایک بنیادی بات یہ ہے کہ غزل رمز و کنایہ کی صنف ہے اور مثنوی میں بات کو زیادہ کھل کر کہنے کی گنجائش ہوتی ہے۔ مومن نے غزل کی ایمائی شاعری کے بعد اسی ذوقِ شعر کی تشنگی کو بجھایا۔

ان کی مثنویوں میں طبیبِ حاذق کی زیرک شناسی اور حدیثِ شوق کی سرگزشت ہے۔ اُن کی اختر شناسی، وصلِ یار کا مژدہ سناتی ہے۔ وہ رازدانِ سیرِ انجم ہیں اور اپنی تیرہ اختری کی تلخ حقیقتوں سے جلد ہی واقف ہو جاتے ہیں۔ وہ زائچوں کی مدد سے اپنے لئے مہربان ستاروں کا سراغ لگا لیتے ہیں۔ اور مستقبل میں وصالِ یار کی خوشخبری سے دل کو تسکین دے لیتے ہیں۔

مثنویاتِ مومن، اسلوب کے لحاظ سے اچھی ہیں، ان میں نہ مرقع نگاری ہے اور نہ واقعات کو ڈرامائی انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایک عاشقِ جانباز کی حکایات ہیں۔ سیدھے سادے عشق کے سچے افسانے ہیں۔ غم کی کہانی اور حزن و ملال کی شاعری ہے اور ان کو اسی لحاظ سے دیکھنا چاہیئے۔

# مومن و کلامِ مومن

## کیفی چریاکوٹی

**تمہید** جس طرح شہرت "دلیل کمال" نہیں، اسی طرح "گمنامی" نقص کا ثبوت نہیں بن سکتی۔ شہرت کے کئی اسباب ہوتے ہیں۔ مثلاً:-

۱۔ طالب شہرت ایسے ذرائع اور تدابیر اختیار کرے کہ وہ مشہور ہو جائے چاہے حقیقتاً مؤید شہرت ہو یا نہ ہو جیسا کہ آج کل عام طور پر ہو رہا ہے۔

۲۔ حلقۂ شہرت کے نزدیک وجہ شہرت فضل و کمال نہ ہو بلکہ روایات اور پروپیگنڈا ہوں، اس کے افراد میں نقد و تنقید کی صلاحیت نہ ہو۔ انہیں کے لئے "العوام کالانعام" کا حکم ہے۔

۳۔ کسی کی شہرت یا گمنامی کسی خاص خیال اور غرض کے تحت میں ہو۔

۴۔ فضل و کمال کی بنیاد پر "شہرت" ہو، یہ اس وقت ممکن ہے جب "حلقۂ شہرت" میں فرق اور امتیاز جانچنے کا مادہ ہو۔

یہ جس طرح آج مفقود ہے، زمانہ سابق میں بھی کمیاب تھا، فرق صرف اسقدر ہے کہ آج بیشتر وہ لوگ مشہور ہیں جو پہلی اور دوسری دفعہ میں آتے ہیں، پہلے اہل فضل و کمال بھی مشہور ہوتے تھے لیکن کم، ایک زمانہ ایسا بھی ماننا پڑے گا جو صرف اہل فضل و کمال کا مؤید تھا۔ ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شہرت اور گمنامی کی بنیاد اگر حقیقت پر نہ ہو تو اس کا وزن کہاں تک قابل ذکر ہے؟ مبصرین اور عقلا کے نزدیک اس کی کچھ حقیقت نہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ ۲ و ۳ صورتوں نے بہترین فضل و کمال کا گلا گھونٹ کر ان لوگوں کو روشناس کیا ہے جن کی چمک بالو کے ذروں سے کم نہیں، ایسے مواقع کے لئے کہا گیا ہے "(All that glitters is not gold) ہر چمکنے والی چیز سونا نہیں ہوتی"۔

جب کبھی قوم یا کسی ملک میں خیرہ نظری کی یہ صورت رونما ہو جائے کہ ہر چمکنے والی چیز سونا، چاندی، اور جواہرات سے تعبیر ہو تو سمجھنا چاہیئے کہ اس کے دن اچھے نہیں زمانے نے جن لوگوں کو باوجود "فضل و کمال" اُبھرنے نہ دیا ان میں حکیم مومن خاں "مومن" بھی ہیں، حکیم مومن خاں کو علوم و فنون کے ساتھ شاعری میں جس درجہ کمال تھا اسی قدر وہ محروم شہرت تھے اسباب گمنامی پر تذکرہ نویسوں اور نقادوں نے جسقدر تحقیق کی ہے بیشتر ناتمام اور تشنہ رہ گئی ہے، اس وقت تفصیل کے ساتھ اس پر بحث کرنے کی ضرورت ہے۔ جس طرح "آفتاب بہت دنوں تک بادل میں نہیں رہتا" اسی طرح "کمال" پردے میں رہنے کی تاب نہیں لاتا ملک میں ایسی ہستیاں بھی پیدا ہو گئیں جو غالب اور ذوق کے نقارخانۂ شہرت میں مومن کے کمال کے لئے آواز طوطی بن گئیں۔

عرصہ سے مجھ کو خیال تھا کہ مومن کے کمال کو روشناس کرنا اُردو شاعری پر بہت بڑا احسان ہے۔ مومن کا کلام اب تک جو محروم شہرت رہا اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ مومن اور اکثر شعرا کی طرح علوم و فنون سے بے بہرہ نہ تھے بلکہ اہل فضل و کمال شعرا میں ان کا درجہ اکثر سے بلند ہے انہوں نے

شاعری کے جام میں علوم و فنون کو اس طرح بھر دیا کہ دیکھنے اور سمجھنے والے چیستان سمجھنے لگے مثلاً کہیں نجوم ہے، کہیں جفر، کہیں ریاضی ہے کہیں فلسفہ، معانی و بیان کے اکثر مسائل کا ان کی غزلیں مرقع ہیں اس طرح کہ اگر ان کے اشعار ترتیب کے ساتھ یکجا کئے جائیں تو یہ تمام مسائل مسلسل منضبط نظر آئیں، معانی و بیان کے اعتبار سے ان کے کلام میں جو جواہر ہیں ان کی تفصیل ملاحظہ فرمائیے اور "مومن" کے فضل و کمال اور اعجاز شاعری کو تسلیم کیجئے۔

# تفصیل و تشریح

مثلاً کہتے ہیں؟

۱۔ ہر جا ہے تیرا جلوہ لیکن — دیکھا تو کہیں نظر نہ آیا
تو واحد و بے نظیر و ہمتا — تو حاکم و خالقِ برایا
تجھ کو بھی نہ کہہ سکیں ترا مثل — یاں تک نقش دوئی مٹایا

پہلے دو شعر علم معانی کے مسئلہ "اسناد حقیقی عقلی" کے حامل ہیں اسناد حقیقی عقلی کی چار قسمیں ہوتی ہیں ان میں سے ایک وہ ہے جو واقعہ اور اعتقاد دونوں کے مطابق ہو۔ اوصاف مذکورہ پر اسلامی نقطۂ خیال سے اعتقاد بھی ہے اور ان کی حقیقت بھی ہے، تیسرے شعر میں علم کلام کا مسلم مسئلہ بیان کیا ہے کہ خدا کا مثل نہیں "قل ھو اللہ" کی اس آیت کی طرف تلمیح ہے وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ (اس کا کوئی مثل نہیں) اس مسئلۂ خشک کو غزل کی رنگینی میں بیان کرنا "مومن" کا کمال ہے۔ اس کو بھی سمجھ لینا چاہئے، کہ مومن کٹر مسلمان تھے۔

۲۔ مسندالیہ کی تعریف علمیت کے ساتھ اس طرح کہ اظہار تعظیم کے لئے نظیر ہو

تری غلامی کی دولت سے خاک پائے ہلال — سفیدۂ رُخِ فغفور چین و قیصر روس

یہ شعر نعت میں ہے، انصاف کیجئے نعت کا یہ مضمون آقائے دو عالم کے غلام کی شان کہاں پہونچاتا ہے۔

۳۔ اظہار علمیت سے علم کا کنایہ اصلی معنی کی طرف بھی ہوتا ہے:۔

آج ہوتا کمال تو کہتا — اب تخلص مرا ہے نقصانی

کمال شاعر ایرانی کا تخلص ہے، یہاں اصلی معنی میں استعمال ہوا۔

گر ترے کوچہ سے دی کعبہ کو نسبت کیا گناہ — مومن آخر تھے کبھی اے بندۂ اسلام ہم

اس قسم کی رعایت "مومن" کے اکثر مقطعوں میں ہے۔

تیسرا شعر دیکھئے۔

لے نام آرزو کا تو دل کو نکال دیں — مومن نہ ہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

اکثر جگہ مومن نے ایک ایک شعر میں مختلف اور متعدد مسائل بیان کئے ہیں، معانی و بیان بھی، فلسفہ و کلام بھی، لفظی رعایت بھی معنوی خوبی بھی، پھر لطف یہ کہ روانی اور تغزل کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

۴۔ کبھی علم کا اظہار اس سے ہوتا ہے کہ سامع کے دل میں رحم آجائے ؎

کہ ترے صدقے مری جان مومن — جانِ مومن ترے قربان مومن

دوسرا شعر ہے، ؎

مومن زار کہ تھا گرم بیاں — سوزشِ سینہ سے تھا شعلہ فشاں

۵۔ مسندالیہ کی تعریف موصول بناکر ہو اس کے ایک قسم میں اشارہ ہوتا ہے کہ فلاں خبر ایسی ہوگی ؎

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو — وہی وعدہ یعنی نباہ کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

۶۔ مسندالیہ نکرہ ہوتا ہے اور تنکیر سے تحدید مقصود ہوتی ہے ؎

کوئی کہتا ہے حاشا ہے یہ گرمی خب خالص کی، — اسی جاں سوز شعلے نے دھواں دل کا اُڑایا ہے

کوئی کہتا ہے ترکیب اور غالب خلط بلغم ہے — رطوبت گر نہیں تو کیوں پسینے میں نہایا ہے

پہلے شعر میں بیان مسئلہ کے ساتھ الفاظ کی نشست اور معنوی تناسب کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے، دوسرے شعر میں طب کا معرکۃ الآرا مسئلہ بیان کرکے تشریح مزاجِ انسانی بھی کی ہے۔

۷۔ مسندالیہ موصوف ہوتا ہے اور صفت اس کی توضیح کرتی ہے ؎

اڑتے ہی رنگ رخ مرا نظروں سے تھا نہاں — اس مرغ پر شکستہ کی پرواز دیکھنا

مرغ کی صفت پر شکستہ اس لئے ذکر کی ہے کہ بیان پرواز میں ندرت ہو۔

۸۔ مسندالیہ کے عطف سے حصر پیدا ہوتا ہے، کوئی دوسرا تیسرا سمجھا نہیں جاتا ؎

عشق کے دیکھے ہیں ہم نے عالم — عشق جانے ہمیں اور عشق کو ہم

۹۔ معطوف اور معطوف الیہ میں التزام ہوتا ہے ؎

بعد یک چندے گر خدا چاہے — میں ہوں اور تیرے در کی دربانی

۱۰۔ مسندالیہ کے عطف سے تعجب اور حیرت کا اظہار ہوتا ہے ؎

مومن اور عشق بتاں اے پیر و مرشد خیر ہے — یہ ذکر اور مُنہ آپ کا صاحب خدا کا نام لو

دوسرا شعر دیکھئے ؎

درِ بُت خانہ و عشق بتاں اور آپ اے مومن — یہ حضرت آگئی اک بار کیا طبعِ مقدس میں

۱۱۔ مسندالیہ پر اس لئے عطف کیا جاتا ہے کہ مخاطب راہِ خطا سے صواب کی طرف پھیرا جائے ؎

قابلِ ترک تھی خوئے ستم آرا نہ کہ میں — لائق سہو تھی یہ رنجش بے جا نہ کہ میں

۱۲۔ حکم شک میں ہوتا ہے اس وجہ سے عطف کیا جاتا ہے کہ مخاطب کو شک ہو جائے ؎

نکتہ سنجوں سے جی میں ہے پوچھوں — کہ میں شہری ہوں یا بیابانی

۱۳۔ صنعتِ التفات میں تکلم سے خطاب کی طرف التفات عام طور پر اور شعراء نے بھی استعمال کیا ہے لیکن مومن کا رنگ بالکل جداگانہ ہے، یہ صنعت قرآن پاک میں بہت ہے ؎

رکھے مجھ کو جیسا میں اس کو عزیز — نہ معشوق و عاشق میں ہووے تمیز

نہیں اب چپ کر مومن دعا ہو چکی — بہت زاری و التجا ہو چکی

مثنوی کے اشعار ہیں

۱۴۔ خطاب سے غیبت کی طرف التفات

مومن اب ختم کر دعا پہ سخن — تا کجا لا نہایئے طولانی

۱۵۔ ایک غزل میں خطاب، تکلم، غیبت اور تکلم دونوں ؎

غیر کو سینہ کبھے سے سیم بر دکھلا دیا — تم نے کیا کچھ کس کو اتنی بات پر دکھلا دیا
زرد منہ دکھلا دیا غم کا اثر دکھلا دیا — آج ہم نے اس کو اپنا زور و زرد دکھلا دیا
صبح سے تعریف ہو صبر و سکونِ غیر کی — کس نے شب مجھ کو تڑپتے پیشِ درد دکھلا دیا
موت کے صدقے کہ وہ بے پردہ آئے لاش پر — جو نہ دیکھا تھا تماشا عمر بھر دکھلا دیا

پہلے شعر میں خطاب دوسرے تیسرے میں تکلم ہے چوتھے میں تکلم اور غیبت دونوں

۱۶۔ اضمار قبل ذکر کبھی ناپسندیدگی اور کراہیت کی بنیاد پر ہوتا ہے:۔

وہ ہے خالی تو یہ خالی یہ بھرے تو وہ بھرے — کاسۂ عمر عدو حلقۂ آغوش ہوا

۱۷۔ تقیید مسند فعلی یا شرط کبھی تجاہل عارفانہ کے ساتھ ہوتی ہے ؎

نچوڑیں گے ہم اپنا دامن تر — جہنم میں ہے اے واعظ اگر آگ

۱۸۔ مخاطب کے اعتقاد کے مطابق کلام کیا جاتا ہے۔

گر دیتی ہوں اس میں دم میں تجھ کو — ہو تیغِ علی کی مار مجھ کو ؎

## مومن کی مثنوی کا شعر ہے

۱۹۔ ماضی و حال کے ساتھ اگر مسند فعلی ذی تقیید شرط کے ساتھ ہو تو اس سے یقین مراد ہوتا ہے

جب سے گئے وہ ادھر نہیں یاد کیا — پوچھی نہیں کچھ خبر نہیں یاد کیا

۲۰۔ نکتۂ بدیعی کی وجہ سے شرط کے بعد جزا میں صیغۂ ماضی استعمال کیا جاتا ہے۔

بالطبع گر کرم ہو تو مفلس بھی ہو کریم — ہوتا ہے سائے کو شجرِ بے ثمر سے فیض

۲۱۔ ذکر شرط سے تفاول منظور ہوتا ہے ؎

ہو حق وفا او قضا نے چاہا — کعبہ کا سفر بخت رسا نے چاہا
ہے ترک علاج ان بتوں کا مومن — دیکھو چاہیں گے گر خدا نے چاہا

ایک مسلمان کو ہر دم انشاء اللہ کہنا چاہیے، مومن نے اس مسئلہ کا بھی ذکر کر دیا ہے۔

۲۲۔ مقام تعظیم میں مسند کا صرف ؎

اللہ رے تیری بے نیازی — یعقوب کو مدتوں رُلایا،

۲۳۔ تنکیر مسند میں مقصود یا تمثیل سائل ہوتا ہو مگر سائل کا حصر مسند الیہ پر منظور نہیں ہوتا اور نہ سائل کا تعین مقصود ہوتا، اس کی صورت یہ ہوتی ہے ؎

کب تلک چشم سے خون ہو جاری — کب تلک درد کرے دل داری

۲۴۔ کبھی تفخیم کا فائدہ ہوتا ہے ؎

سچ ہے کہ یہ ایک بے وفا ہیں — جتنے ہیں حسین بُری بلا ہیں

۲۵۔ تقدیم مسند اہمیت کی وجہ سے ؎

بیٹھیں نہ اسے یہ کھول کر بال　　　　رو دیں نہ یہ منہ پہ دھر کے رومال

۲۶۔ کبھی اس لئے تقدیم ہوتی ہے کہ بُرائی کے اظہار میں عجلت ہو۔

کوئی اس دَور میں جیے کیونکر　　　　ملک الموت ہے ہر ایک بشر

۲۷۔ متعلقاتِ فعل میں مفعول کی شان کا اہتمام اس طرح مدنظر ہوتا ہے۔

تجھ کو بھی نہ کہہ سکیں ترا مثل　　　　یاں تک نقشِ دوئی مٹایا

یہ شعر ایک جگہ اور دوسری خصوصیات کے ساتھ ذکر ہو چکا ہے۔

۲۸۔ موصوف پر صفت کا قصد۔

لائقِ جور و جفا ہے وہ نہیں　　　　مفتری فتنہ بلا ہے وہ نہیں

۲۹۔ قصر کی ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ اس سے اعتقاد باطل ہو جائے تو

نہ وہ خالق ہے گر ہے اثر باعثِ خلق　　　　نہ وہ رازق ہے مگر قاسمِ رزقِ مقسوم

اس صفت میں انکار سے اقرار کا ثبوت ہوتا ہے۔

۳۰۔ قصر کے لئے الفاظ معین ہیں ان میں ایک 'تنہا' بھی ہے

تھا میں اس گھات میں کر گر اک آن　　　　لے تنہا وہ راحتِ دل و جان

## بیانِ انشا

۳۱۔ انشا میں ایک چیز تمنا ہوتی ہے تمنا چاہے ممکن الحصول شے کی ہو یا محال عقلی کی ؎

گر پہونچتے واں تو اس پردہ نشیں کو دیکھتے　　　　کاش ہوتے چشمِ نرگس دیدۂ بادام ہم

۳۲۔ استفہام کے لئے الفاظ "کیوں" "کس لئے" بھی آتے ہیں

کہوں گر غیر سے مت مل تو کہے طعن سے رُک کر　　　　یہ کیوں؟ کس واسطے؟ ہم ایسے تیرے ہو گئے بس میں

۳۳۔ استفہام سے تعینِ زمانہ اس طرح ہوتا ہے۔

عمرِ رفتہ کی جستجو کب تک　　　　اپنے مرنے کی آرزو کب تک

۳۴۔ استفہام سے تعریف و تحسین مطلوب ہوتی ہے ؎

کیا تن تیرہ خاک۔ اشہ اشد　　　　کیا صورت پاک اشہ اشد

۳۵۔ استفہام سے تفصیل مطلوب ہوتی ہے ؎

کیا کروں اللہ سب ہیں بے اثر　　　　ولولہ کیا نالہ کیا فریاد کیا

۳۶۔ استفہام سے حسرت و افسوس مراد ہوتا ہے ؎

کہاں وہ ربطِ بتاں اب کہ اس کو تو مومن　　　　ہزاروں سال ہوئے سیکڑوں برس گزرے

۳۷۔ صیغۂ امر دعا کے لئے ؎

خدایا لشکرِ اسلام تک پہونچا کہ آ پہونچا　　　　لبوں پہ دم بلا ہے جوشِ خوں شوقِ شہادت کا

۳۸۔ فصل و وصل کے سلسلے میں معطوف اور معطوف علیہ کی صورت۔

نالہ اک دم میں اُڑا ڈالے دھوئیں چرخ کیا اور چرخ کی بنیاد کیا

۳۹۔ کمال اتصال ؎

کہا اس بت سے، جب، مرتا ہے مومن کہا میں کیا کروں مرضی خدا کی

۴۰۔ جملہ حالیہ میں ایک جملہ میں ثبوت اور دوسرے میں تجدد مقصود

کب گل کھلے گا دیکھئے ہے فصلِ گل سے دور اور سوئے دشت بھاگتے ہیں کچھ ابھی سے ہم

## ایجاز و اطناب

۴۱۔ مساوات ؎ تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

۴۲۔ تطویل ؎ نہ جاؤں گا کبھی جنت میں میں نہ جاؤں گا اگر نہ ہووے گا نقشہ تمہارے گھر کا سا

۴۳۔ اطناب بہ شکل اعتراض تہدید کے لئے ؎

ہم نکالیں گے سُن اے موجِ ہوا بل تیرا اس کی زلفوں کے اگر بال پریشاں ہونگے

## علم بیان

۴۴۔ مشبہ اور مشبہ بہ حسی جس کا تعلق حس سامعہ سے ہے ؎

دمِ مصاف ترے دشمنوں کے لشکر میں صدائے نوحہ و شیون ہے شور و غلغل کوس

۴۵۔ مشبہ اور مشبہ بہ حس ذائقہ کے متعلق ؎

جھوٹی شراب اپنی مجھے مرتے دم تو دے یہ آبِ تلخ شربت قند و نبات ہے

۴۶۔ مشبہ حسی اور مشبہ بہ عقلی ؎

بات کرنے میں رقیبوں سے ابھی ٹوٹ گیا دل بھی شاید اسی بدعہد کا پیماں ہوگا

۴۷۔ مشبہ عقلی اور مشبہ بہ حسی

رنگینی بزم کا بندھا دھیان جوں بوئے گل اُڑ گئے سب اوسان

۴۸۔ وجہ شبہ واحد حسی ؎ بادہ کش ایسی تلخ کام کرے کفِ مارِ سیہ مئے احمر

۴۹۔ مشبہ اور مشبہ بہ عقلی ؎ رکھے مجھ کو جیسا میں اس کو عزیز نہ معشوق و عاشق میں ہوئے تمیز

دوسرا شعر ؎ عیش وطن اندوہِ غریباں دستِ جنوں سے چاک گریباں

۵۰۔ وجہ شبہ متعدد ؎ بار انداز ہوا روزِ سفید نکلی وہ گھر سے کہ نکلا خورشید

۵۱۔ غرض تشبیہ ؎ اک داغِ سیاہ خال سا تھا یہ لطفِ فغاں شعلہ زا تھا

۵۲۔ غرض تشبیہ سے لاغری مقصود ہے۔ ؎

یہ حالتِ قامتِ خمیدہ جیسے شجرِ خزاں رسیدہ

۵۳۔ شبہ سے غرض ہجو نقش اجل تصویر وبا تھی، صورتِ فتنہ شکل بلا تھی

بات میں وہ آواز مسلسل صور کا جیسے نفخۂ اوّل

۵۴۔ تشبیہ سے مشبہ بہ کی شان ظاہر کی جاتی ہے اس کو اظہار مطلوب کہتے ہیں ؎

صورت وہی عظمت وہی گردش وہی گیتی　　حیراں ہے کہ یہ چرخ ہے یا آبلہ پا

۵۵۔ حرف تشبیہ "جوں" سے مشبہ اور مشبہ بہ ایک دوسرے کے مین سمجھے جاتے ہیں

گاہ آواز خوشس سُنا دینا　　جوں سحرگاہ مُسکرا دینا

۵۶۔ تشبیہ قریب　　لبریز بہار صد جنوں تھا،　　ہر سنگِ ہاں کا بے ستوں تھا

۵۷۔ تشبیہ مفصل۔　　دُرد شراب و سختی قاتل　　تلخ سخن مانند ہلاہل

۵۸۔ تشبیہ مجمل　　داغ اس کے زبس مثال گل تھے　　تھے ہاتھ کہاں نہالِ گل تھے

۵۹۔ وجہ شبہ پوشیدہ　　ہے رگِ خواب سے غفلت محسوس　　ہو گئی طرز تجاہل کا بوس

۶۰۔ صرف وصف مشبہ مذکور ہو۔　　تھی پشت خمیدہ یا کماں تھی　　تھا تیر کہ آہِ خونچکاں تھی'

۶۱۔ تشبیہ کنایہ　　ابر رحمت تپ عذاب الیم　　سایہ نادر احتراق جحیم

## استعارہ

۶۲۔ استعارہ غیر متعارف　　دشمن مومن رہے یہ بت سدا　　مجھ سے مرے نام نے یہ کیا کیا

۶۳۔ وجہ جامع　　درنایاب تو کیا خاک سے بھی مُنہ نہ بھرے　　جس کے در پہ میں کروں لولوے شاداب نثار

۶۴۔ طرفین (مستعار اور مستعار لہ کا حسی ہونا

ہے مجھے بھی خیال طوف حرم　　خضر رہ گر ہو فضل رحمانی

۶۵۔ مستعار لہ اور مستعار منہ حسّی

اے غارتِ جان و جانِ مومن　　اے آفت خان و مانِ مومن

۶۶۔ شبہ فعل میں استعارہ

خندہ زن کس کا ہوا زخمِ دروں　　شدتِ گریۂ پنہاں کیوں ہے

۶۷۔ کبھی مضاف الیہ سے استعارے کا فائدہ حاصل ہوتا ہے

ساقیا زہر پلا دے مجھ کو　　شربتِ مرگ چکھا دے مجھ کو

۶۸۔ آنکھ کا استعارہ نرگس سے کر کے آنکھ کے مناسب مستی اور بیخودی کا ذکر کیا ہے

اقرار ہے صاف آپ کے انکار سے ظاہر　　بے مستی شبِ نرگس میخوار سے ظاہر

۶۹۔ استعارہ بالکنایہ ؎

لطف سے اس کے زمیں غیرتِ باغِ فردوس　　خلق سے اس کے زماں رشکِ دکانِ عطار

۷۰۔ استعارہ تخییلیہ ؎

ہاں جوشِ تپش چھیڑ چلی جائے کہ پر تو　　جھڑ جائیں گے فرسودہ اگر دام نہ ہو گا

۷۱۔ مجازِ مرسل میں جو لفظ سبب کے واسطے موضوع ہو اس کو سبب پر استعمال کریں۔

ساقیا دے چک آبِ آتش رنگ　　گرم و سردِ زمانہ سے ہوں بتنگ

۷۲۔ کنایہ کی تصریح ؎

چاک پردہ سے یہ غمزے ہیں تو اے پردہ نشیں — ایک میں کیا کہ سبھی چاک گریباں ہوں گے

۷۳۔ خون کے میرے ارادہ سے ہوا ذابح سعد — قتل پر میرے کمر باندھے ہے بشکل جبّار

سعد ذابح سے قمر کی بائیسویں منزل مراد ہے ۔

۷۴۔ وہ قہرمان فلک توسن و نجوم حشم — کہ ترکِ چرخ غلام اس کا مہر چاکر ہے

بترکِ چرخ مریخ سے کنایہ ہے ۔

۷۵۔ کنایہ قریب ۔

موسفیدی کے قریب اور ہے غفلت مومن — نیند آتی ہے بہ آرام مگر آخرِ شب

۷۶۔ تعریض ۔ میں ہی تو رِند ہوں کہیں شب سرخوش و خرم — میں نے ہی تو کی بادہ کشی غیر سے باہم

۷۷۔ رمز ۔ بیٹھیں لبِ آب جو پہ اک دم — پہونچائیں سبو سبو پہ اک دم

## علم بدیع

۷۸۔ تجنیس تام مماثل ۔

یوسف سے عزیز کو کئی سال — زندانِ عزیز میں پھنسایا ؟

۷۹۔ تجنیس مرکب مفروق ۔

واں سے جواب صاف ہی لائی — بات بنائی پر نہ بن آئی

۸۰۔ تجنیس زائد و ناقص ۔

ہم نکالیں گے سن اے موجِ ہوا بل تیرا — اس کی زلفوں کے اگر بال پریشاں ہونگے

۸۱۔ تجنیس مضارع ۔

بن ترے بزم سور میں ہیں یہ قیامتیں کہ ہے — نفخ صور کا اثر نغمہ نے نواز میں

صور اور سور میں تجنیس مضارع ہے ۔

۸۲۔ تجنیس لاحق ۔

سرمۂ تسخیر سے ہم خود مسخر کیوں نہ ہوں — آنکھ کی پتلی جو تھی جادو کا پتلا بن گیا

۸۳۔ صنعت شبہ استقاق ۔

کیا کیا جلی ہے بزم میں تجھ بن نہ جب پھرے — پروانے شمع شعلہ شمائل کے آس پاس

۸۴۔ رد العجز علی الصدر مع تکرار ۔

دل ایک بار ہوا ایسی بے جگہ مائل — کہ جان کو بھی ٹھکانے لگا رکھے گا دل

۸۵۔ رد العجز علی الحشو مع الاشتقاق

ہے طبع میں ہر روز فزوں رنج فزائی — اپنے میں سماتے نہیں کیا دل میں سمائی

۸۶۔ صنعت سیاق الاعداد ۔

جز نہ سپہر ہیں مرے دشمن تو اور بھی — لیکن بڑے غضب ہی دو تین چار ہیں

۸۷۔ صنعت معما ؎ کیفیتِ وصال بس اب کچھ نہیں رہی — کیونکر نہ ہوں طول میں شب کچھ نہیں رہی

شب کے معنے رات کے ہیں عربی میں لیل کہتے ہیں، الفاظ طول میں سے لیل نکالا مومن رہ گیا۔

۸۸۔ صنعتِ نعزہ ؎ نہ بولے وہ جب تک کہ کوئی بُلا ے — نہ لفظ اور معنی سمجھ میں کچھ آئے
شب و روز غوغا مچایا کرے — اسی طرح سے مار کھایا کرے

اس نعز یا پہیلی سے گھڑیال مراد ہے

## صنائع معنوی

۸۹۔ طباق ایجابی ؎ جب تلک باعثِ نشاط و ملال — ہے وصال و فراق جانانی

۹۰۔ طباق سلبی ؎ بات اپنی وہاں نہ جمنے دی — اپنے تقنے جمائے لوگوں نے

۹۱۔ صنعت تشابہ الاطراف ؎
زبان گنگ ہو عشق میں گوش کر ہے — بُرا سُنتے سُنتے بھلا کہتے کہتے

۹۲۔ صنعتِ ارصاد ؎ غیر بےمروت ہو آنکھ وہ دکھا دیکھیں — زہر چشم دکھلائیں پھر ذرا مزا دیکھیں
کچھ نظر نہیں آتا آنکھ لگتے ہی ناصح — گر یقیں نہیں حضرت آپ بھی لگا دیکھیں

۹۳۔ صنعت تجرید ؎ سوزِ غضب سے ہے کُرۂ نار سینے میں — اک مشتِ خاک اور یہ کیں آفلاک دریغ

۹۴۔ صنعت مقابلہ ؎ میں ہیں سیہ روز کہ وہ شمع رو — شام کو آیا تھا سحر کر گیا

۹۵۔ صنعت تجاہل عارفانہ ؎ تارے آنکھیں جھپک رہے تھے، — تھا بام پہ کون جلوہ گر رات

۹۶۔ صنعت جمع و تفریق ؎ آئینہ ہے صفا سے دل میرا — کیا ہوا اگر نہیں ہے حیرانی
دوست کرتے ہیں، ملامت غیر کرتے ہیں گلہ — کیا قیامت ہے مجھی کو سب بُرا کہنے کو ہیں

۹۷۔ صنعت رجوع ؎ خنجر تھا الٰہی یار یاں تھی — خنجر سے زیادہ تر رواں تھی

۹۸۔ حسن التعلیل ؎ خمیدہ کس لئے نو آسماں بنے تھے بھلا — نہ تھا ازل سے جو مدنظر ترا پابوس

۹۹۔ احتجاج بدلیل ؎ شبہ کیا عصمتِ لختِ جگر احمد میں — جب مسلم ہے کہ معصوم ہے جز و معصوم

۱۰۰۔ صنعتِ ادماج ؎ تیرا اقبال روز افزوں ہو، — جیسے مومن پہ فضلِ رحمانی

۱۰۱۔ تبلیغ ؎ ہم معاف ترے دشمنوں کے لشکر میں — صدائے نوحہ و شیون ہے شورِ غلغلِ کوس

۱۰۲۔ اغراق۔ (مبالغۂ قریب العقل بعید العادت کا نام ہے) ؎
گرگ نے دورِ عدل میں اس کے — سیکھ لی راہ و رسمِ چوپانی

۱۰۳۔ صنعتِ تعجب ؎ زخم کھایا زہر کھایا تو بھی کچھ ہوتا نہیں — دیر گزری مرگ کو کیا جانئے کیا ہو گیا

۱۰۴۔ صنعتِ تلمیح ؎ ہر آہ کہ لب پہ ہے شرر ریز — دیپک کا ہے نغمۂ جنوں خیز

---

اس تفصیلی بیان کے سلسلے میں یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ "مومن" نے اُن صنائع و بدائع لفظی و معنوی کو لیا ہے جو فصاحت اور بلاغت کے اعتبار سے مستحسن اور پسندیدہ ہیں اور غیر پسندیدہ صنائع سے سخت احتراز کیا ہے۔ یہ صنائع اور بدائع وہ ہیں جو روانی کلام میں خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔

## پیدائش اور خاندان

مومن خاں ۱۲۱۵ھ مطابق ۱۸۰۰ء میں، محلہ کوچہ چیلاں دہلی میں پیدا ہوئے، ان کے والد کا نام غلام نبی خاں تھا جو مشہور طبیب تھے، حکیم غلام نبی خاں کے والد نامدار خاں کشمیر کے رہنے والے تھے، قسمت آزمانے کے لئے ترک وطن کر کے دہلی آئے یہ زمانہ "شاہ عالم" کی حکومت کا تھا، طالع نے یاوری کی شاہی طبیبوں میں داخل ہو گئے خدمات طبابت کے صلے میں بادشاہ کی طرف سے پرگنہ نارنول کے کچھ مواضعات بطور جاگیر عطا ہوئے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے جب جھجر کی ریاست نواب فیض طلب خاں کو دی تو اس میں پرگنہ نارنول بھی تھا نواب صاحب نے نامدار خاں کے ورثا کو ایک ہزار روپیہ سالانہ پنشن دی اس میں حکیم مومن خاں بھی شامل تھے، ایسٹ انڈیا کمپنی نے بھی مومن کو ۲۵ روپیہ ماہوار وظیفہ دیا تھا مومن کے والد حضرت عبدالعزیز صاحبؒ کے معتقد تھے اس لئے جب مومن پیدا ہوئے تو شاہ صاحب نے ان کے کانوں میں اذان دی، اور "مومن" نام رکھا جو نگین شہرت بنا۔

## تعلیم و تربیت

مومن نے اول اول گھر پر تعلیم اور تربیت پائی، اس کے بعد حضرت شاہ عبدالقادرؒ اور حضرت شاہ عبدالعزیزؒ ایسے جید علماء سے فیض حاصل کیا، درسیات ختم کر کے اپنے خاندان میں طب کی تکمیل کی، دیں عرصہ تک نسخہ نویسی کرتے رہے۔

علم طب کو شاعری سے براہ راست بہ ظاہر کوئی تعلق اور مناسبت نہیں لیکن "مومن" نے ان کو دونوں کا ڈانڈا ملا دیا ہے اکثر غزلوں کے اشعار میں اس کے مسائل اس طرح بیان کیے ہیں کہ شعر میں لطف پیدا ہو گیا ہے۔

جذبات شاعری کے ساتھ علم الابدان، اور تشریح اعضاء مزاج انسانی کا پیوند ایسا ملایا ہے کہ ان کی شاعری کے لئے ایک میدان نکل آیا۔

طبابت کے علاوہ نجوم، اور جفر میں بھی ایسی مہارت حاصل کی کہ اس فن کے ماہرین ان کو استاد تسلیم کرتے تھے، شطرنج میں بڑے بڑے شاطر ان کے کمال کے معترف تھے، "مومن" نے ان علوم کو بیکار رہنے نہ دیا بلکہ اپنی شاعری میں اس طرح ممزوج کیا کہ اگر کوئی ماہر چاہے تو ان کی شاعری سے ان علوم کے اکثر مسائل کا پتا لگا سکتا ہے۔ اس کمال اور ندرت میں "مومن" نہ صرف اردو شعراء میں یگانہ دکھتا ہیں بلکہ فارسی شاعری میں بھی ان کی طبیعت کے شاعر مشکل سے ملیں گے۔

## لباس اور حلیہ

مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی نے رسالہ اردو اورنگ آباد میں ۱۲۶۱ھ میں دہلی کا ایک مشاعرہ" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے اس میں حکیم مومن خاں کا حلیہ اور لباس، وجاہت، خوش پوشاکی کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:۔

"حکیم مومن خاں کی عمر تقریباً ۴۰ سال کی تھی، کشیدہ قامت، سرخ و سفید رنگ تھا جس میں سبزی جھلکتی تھی، بڑی بڑی روشن آنکھیں، لمبی لمبی پلکیں، کھنچی ہوئی بھویں لمبی ستواں ناک، پتلے پتلے ہونٹ ان پر پان کا لاکھا جما ہوا، مسی آلودہ دانت ہلکی ہلکی مونچھیں، خشخاشی داڑھی، بھرے بھرے ڈنڈ، پتلی کمر، چوڑا سینہ، لمبی انگلیاں، گھونگر والے بال، لمبے لمبے کاکلوں کی شکل میں کچھ تو پشت پر اور کچھ کندھوں پر پڑے، بدن پر شربتی ململ کا نیچی چولی کا انگرکھا لیکن اس کے نیچے کرتا ندارد، جسم کا کچھ حصہ انگرکھے کے پردے سے دکھائی دیتا تھا، گلے میں سیاہ رنگ کا فیتہ، اس میں چھوٹا سا سنہرا تعویذ، کاکریزی رنگ کے دوپٹہ کو بن دیکر کمر میں لپیٹ لیا تھا اور اس کے دونوں کونے سامنے پڑے ہوئے تھے، ہاتھ میں پتلا سا خار پشت، پاؤں میں سرخ گلبدن کا پاجامہ جو پیروں سے تنگ اور اوپر ڈھیلا، پاجامے کا کپڑا ہمیشہ ریشمی اور قیمتی ہوتا تھا، جوڑا سرخ نیفہ، انگرکھے کی آستین آگے سے کٹی ہوئیں، کبھی لٹکتی رہتی تھیں، کبھی پلٹ کر چڑھا لیتے تھے، سر پر گلشن کی بڑی دو پلڑی ٹوپی، اس کے کنارے پر باریک بیس، ٹوپی اتنی بڑی کہ سر پر منڈھ کر آ گئی تھی، اندر سے مانگ اور ماتھے کا کچھ حصہ اور بال صاف جھلکتے تھے۔"

جس زمانے کی یہ وضع اور لباس تھا اس وقت اس میں تکلف اور شوقینی کی انتہا ہو گئی تھی، مومن کی متانت اور سنجیدگی مزاج، وضعداری، تہذیب اس کے گواہ ہیں کہ یہ وضع شرفا کی تھی، اب اگر اس وضع میں کوئی شخص رہے تو تماشہ بننے کے علاوہ غنڈوں میں شمار ہو "ہر کھلے دہر رہے" کے سوا

"ہر قرنے را ہر رنگے" بھی صحیح اور درست ہے۔

اسی اکردو نے "مومن" کی جو تصویر شائع کی ہے (اور جو نگار میں بھی نکل چکی ہے) اس سے "مومن" کی ذہانت، مغرور خود منی، فکر اور تعمق کا پورا پتا چلتا ہے، علم الابدان اور علم قیافہ کو جہاں تک دخل ہے اس سے واضح ہے کہ مومن کے ایسے حلیہ کا آدمی کبھی معمولی اور عامی نہیں ہوتا۔

## حالات وسوانح

"مومن" رنگین مزاج ضرور تھے لیکن اوباش فطرت نہ تھے، طبیعت میں درد، سوز و گداز، عاشقانہ ادائیں موجود تھیں، لیکن غیر محتاط نہ تھے، جن تذکرہ نویسوں نے ان کی ظاہری شکل و صورت، وضع و لباس پر ان کی وارستہ مزاجی، آزادی (بقول بعض) اوباشی قیاس کی ہے وہ مع الفارق ہے، یہ ثابت ہے کہ "مومن" نے ابتدائے جوانی میں شاہ سید احمدؒ کے ہاتھ پر بیعت کرلی اور آخر وقت تک اس بیعت کو نبھایا۔

رسالہ "نگار" جنوری ۳۶ء صفحہ ۱۳ پر یہ عبارت ہے کہ

"مومن کی شاعری پر شاہ سید احمد کی تعلیمات کا اثر تھا۔"

شاہ سید احمدؒ صوفی اور درویش کامل تھے، ان کی تعلیم مقامات تصوف "ہمہ اوست"، فنا و بقا، دنیا کا عالم مثال ہونا، وحدت وجود پر مشتمل ہوتی ہے جس کے لوازم طبیعت کا گداز، خودداری، توکل، عاشقانہ رنگ "آہ سرد و رنگ زرد و چشم تر" ہیں۔

"مومن" کے کلام میں شروع سے اخیر تک تصوف موجود ہے اس کی تفصیل آتی ہے اس جگہ اصولی طور پر ایک امر ذہن نشین کرلینا چاہئے کہ "عشق مجازی" کے جو لوازم ہیں وہ عشق حقیقی کا عکس ہیں، اگر مومن کی شاعری اور غزلیات میں عشق، درد، جذبات سوز و گداز موجود ہے تو رموز تصوف سے انکار نہیں کیا جاسکتا، درآنحالیکہ یہ ثابت ہوچکا ہے کہ "مومن" ایک پیر طریقت کے مرید اور خمخانہ تصوف کے میکش اور سرشار تھے۔

"مومن" پر جس قسم کے اتہامات لگائے گئے ہیں ان کی شکل ان الزامات سے ملتی جلتی ہے جو شیخ سعدیؒ ایسے بزرگ پر تراشے گئے ہیں۔

## شیخ سعدیؒ اور مومن

شیخ سعدیؒ کے جذبات تغزل کا بعض واقعات رسمی کی بنیاد پر "امرد پرستی" سے منسوب کرنا بالکل بے اصل اور بے حقیقت ہے اس سلسلے میں اس کا اجمالی بیان نامناسب نہ ہوگا۔

فارسی تغزل کی بنیاد "امرد پرستی" ظاہر کی جاتی ہے شیخ سعدی فارسی "تغزل" کے امام یا موجد تھے اس لئے ظاہر ہے کہ یہ جدت، اور اس میں رنگِ تغزل کی بلندی بالکل نئی چیز تھی اس لئے شیخ کا دامن "امرد پرستی" کے واقعات خود ساختہ سے ملوث کیا گیا۔

یہ بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ اس قسم کے لغو الزامات شیخ سعدی کے زمانے میں ایران کے اندر ان کے ہم منزلوں اور ہم خیالوں کی طرف سے عائد نہیں کیے گئے، بلکہ اغیار کی طرف سے ان کے وطن سے باہر ان کے زمانے کے بہت بعد لگائے گئے ہیں، اس لئے حقیقت ظاہر ہے۔

شیخ کے متعلق ایک واقعہ گلستاں کی ایک حکایت کے بیان کے مطابق یہ بیان کیا جاتا ہے کہ "انھوں نے ایک نوعمر سبزہ آغاز شخص کے بوسے لیے تھے" استغفر اللہ کجا شیخ سعدی کجا یہ الزام "صورت حقیقت یہ ہے کہ ایران میں یہ رواج پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے کہ رخصت ہونے یا رخصت کرنے کے وقت فریقین ایک دوسرے کے سر اور پیشانی چومتے تھے، کبھی ایک ہی فریق کی طرف سے یہ اظہار گرمجوشی ہوتا تھا اس میں عمر اور قدر کی کوئی قید نہیں، الزام دینے والوں نے صرف اس رسم کو سامنے رکھ کر الزام کا پہاڑ بنالیا۔

شیخ سعدیؒ عالم متبحر، متورع، پارسا، ابوالفرج ابن جوزی ایسے سخت متشرع پیر کے مرید تھے جن کے نزدیک "سماع" تک احتیاط کے خلاف تھا شیخ سعدیؒ ان کے پیرو تھے، تہجد گزار، متعدد حج پا پیادہ کئے تھے، ان کی نسبت اس قسم کا خیال صرف راویوں کی اُپج ہے یا تعصب، اس کے سوا کچھ نہیں۔

جذبات تغزل کی بنیاد پر اس الزام کی صورت اس لطیفے سے ملتی جلتی ہے کہ "کسی نے کسی سے پوچھا کہ مجاہد کون ہے؟ اس نے جواب دیا کہ جس کے لمبی داڑھی ہو۔"

"مومن" غریب پر بھی یہ الزام بالکل یہی نوعیت رکھتا ہے" جس طرح شیخ سعدی کی غزلیں واقعات امرد پرستی بن گئیں اسی طرح مومن کی مثنوی، واسوخت، ان کی آزادی، وارستہ مزاجی اور اوباشی کا خط وخال بن گئیں۔

مومن کی طرف سے جن الزامات کی تردید کی گئی ہے اس پر مزید برہان اور حجت کی ضرورت ہو تو ان کے حالات اور خصائل پر نظر کیجئے"

"مومن" طبعاً نہایت غیور اور خوددار تھے ان کا دوش احسان کے معمولی بوجھ سے بھی کبھی آشنا نہ ہوا۔

قناعت اور توکل ان کی گھٹی میں تھے، وطن پرستی ان کے ایمان کا جز تھا انہیں وجوہ سے اپنے ہی آستانے پر پڑے رہے دہلی سے باہر کبھی نہیں گئے۔

راجہ کپور تھلہ نے ان کو دہلی سے طلب کیا ساڑھے تین سو روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر کی، سفر خرچ بھی بھیجا، مومن کو راجہ صاحب کی قدردانی کا پورا علم تھا، جانے پر آمادہ ہو گئے لیکن جب معلوم ہوا کہ ریاست میں ایک گانے والے کی بھی یہی تنخواہ ہے تو اپنا ارادہ فسخ کر دیا۔

۱۸۴۲ء میں ان کو کالج کی پروفیسری پیش کی گئی اس سے بھی انکار کیا

مومن کے پیر بھائی والئی ٹونک نے ان کو بلانے اور اپنے ساتھ قیام کرنے کی کوشش کی، مگر معذرت کر دی اور نہ گئے۔ چار یا پانچ بار ان کو وطن چھوڑ کر رام پور، بدایوں، سہسوان، سہارنپور، جہانگیر آباد جانا پڑا اور ان کے مذاق اور طبیعت کے مطابق آرام بھی تھا عزت بھی تھی لیکن قبلۂ وطن دہلی ان کے دل کا ہمیشہ قبلہ نما بنا رہا۔

"حب الوطن من الایمان" کو اپنے عمل سے صحیح ثابت کر دیا، مسٹر رام بابو سکسینہ اس خصوصیت کو اپنے الفاظ میں اس طرح ادا کرتے ہیں "انہوں نے پانچ بار دہلی کو چھوڑا، لیکن وطن کی محبت نے ہمیشہ ان کو اپنی طرف کھینچ لیا۔" راجہ اجیت سنگھ رئیس پٹیالہ دہلی میں رہتے تھے، سخاوت میں مشہور تھے، مومن خاں کو قیمتی ہودج کے ساتھ ہتھنی دی، خانصاحب نے اظہار شکریہ میں قصیدہ کہا جس کا مطلع یہ ہے۔ ~

صبح ہوئی تو کیا ہوا ہے وہی تیرہ اختری ۔۔۔ کثرت دود سے سیاہ شعلۂ شمع خاوری

پورے قصیدے کو دیکھئے اس میں مومن خاں کی شان کہیں کم نہیں ہوئی ہے اور ممدوح کو غلط اوصاف سے متصف کر کے نامناسب اور ناجائز مبالغے سے متہم نہیں بنایا ہے۔

آزاد کی رائے ہے کہ سوا اس قصیدے کے کوئی اور مدح کسی دنیادار کی صلہ کے توقع پر نہیں لکھی

"مومن نے اس قصیدے کو قصیدہ کے پورے معیار پر لکھا ہے اس کی تفصیل موقع پر آتی ہے۔

"مومن" میں خدا نے ذہانت اور ذکاوت کے ساتھ غیر معمولی قوت حافظہ عطا کی تھی، دنیا میں ایسے لوگ غیر معمولی کہے جاتے ہیں جن میں یہ دونوں قوتیں ہوتی ہیں۔

ان دونوں قوتوں سے مالامال ہستیوں نے جو کچھ کیا ہے وہی "مومن" نے بھی کیا۔

شیخ بوعلی سینا نے فلسفہ اور دوسرے علوم کے ساتھ جو کچھ کیا ہے وہی مومن نے، شاعری میں جوہر دکھائے ہیں۔ اگر ان کی شاعری کی حقیقت سمجھی نہ گئی تو مومن کا کیا قصور ہے۔

"مومن" خوددار منزہ تھے لیکن مغرور و متکبر نہ تھے، وہ کسی کی مدح یا ذم اپنی طبیعت کے خلاف کبھی گوارا نہ کرتے تھے، لیکن اظہار حقیقت میں ان کو کبھی عار نہ تھا۔

جن تذکرہ نویسوں نے یہ لکھا ہے کہ "وہ کسی کے کمال کا اعتراف نہ کرتے تھے" مومن پر بہتان اور ان کے وصف "اعتراف حقیقت" کی پردہ پوشی ہے۔

رسالہ اُردو اکتوبر ۱۹۲۶ء کے صفحہ ۵۹۲ پر مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضمون کی یہ عبارت دیکھئے "مومن نے غالب کے متعلق یہ الفاظ کہے ہیں:

"غالب کے رنگ میں شعر کہنا تو کیا وہ یا ان کے اُستاد پہلے مرزا نوشہ کے شعروں کو سمجھ تو لیں۔"

یہ الفاظ مومن نے ہدہد الشعرا اور ان کے اُستاد کے متعلق کہے تھے، "مومن نے پیشہ طبابت پر رزق کا انحصار نہیں کیا تو شاعری، نجوم، رمل و جفر سے کیا کسب زر کرتے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ "مومن" خود دار، وطن پرست، متوکل، انصاف پسند، ذہین وذکی، قوی الحافظہ، سوز و گداز اور درد عشق کی تصویر تھے۔

## خصوصیات کلام

"مومن" کے تمام اصنافِ سخن پر بحث اور تبصرہ کرنے سے پہلے "غزل" پر اظہار خیال ضروری ہے کیونکہ "غزل" ہی کے میدان میں "مومن" آفتاب بن کر چکے اور اصناف اس آفتاب کی کرنیں ہیں، مومن اپنے کمال اور خداداد جبارت کے اعتبار سے جو مشہور نہ ہوئے اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے عام روش سے علیحدہ اپنا راستہ بنایا تھا اس راستے کو کسی نے "بدعت" کسی نے "تماشا" کسی نے "چیستاں" کسی نے "معما" کہا۔ حالانکہ وہ اپنی شاعری بالخصوص تغزل کے اعتبار سے جتنی بلندی پر ہیں وہاں تک نظر پہنچنا بھی مشکل ہے، اس لئے جو لوگ یہ سب کچھ کہتے ہیں ان کی خطائے نظر ہے" ہسٹری آف اُردو لٹریچر" صفحہ ۱۵۰ میں رام بابو سکسینہ نے بلیغ الفاظ میں "مومن" کے امتیاز کو نمایاں کیا ہے لکھتے ہیں کہ:-

"مومن اپنے خیالات کی بلندی اور بلند پردازی کی ندرت میں سب سے الگ اور ممتاز نظر آتے ہیں، ان کے تشبیہات اور استعارے معمولی سطح سے اسقدر بلند ہیں کہ ان کے اشعار ان خصوصیات میں بالکل نمایاں ہیں، مومن نے خیالات بلند اور الفاظ شاندار کو اپنی شاعری میں یکجا کر دیا ہے۔ وہ عاشق تن، شاعر ہیں لیکن ان کے عشق کا ذریعہ اظہار غزل ان کے کمالات کی وجہ سے غیر معمولی ہے۔"

تعجب ہے کہ جس فرض کو مدعیان اُردو تذکرہ نویسوں نے ادا نہیں کیا اس کو رام بابو نے چند الفاظ میں ادا کر دیا۔ مومن کے اوصاف شاعری کی تفصیل کی جائے تو یہی الفاظ ہونگے جو رام بابو نے اختیار کیے ہیں۔

یہ کیسی بوالعجبی اور افسوسناک حیرت ہے کہ "مومن" کا کمال بعض غلط بیں نگاہوں میں عیب اور نقص ہے۔

میں نے اپنے ماہانہ رسالہ "تعلیم" اور "عجان" میں ایک لطیفہ درج کیا تھا ایک صاحب ادعا، مدعی سخن فہمی نے مجھ سے بھی شاعروں کے تذکرے پر کہا کہ "مومن" کا کلام بیشتر مہمل ہوتا ہے، میں نے تعجب سے پوچھا کہ کوئی مہمل شعر پڑھئے، حضرت نے یہ شعر پڑھا ؎

کر علاج دردِ وحشت چارہ گر　　لا دے اک جنگل مجھے بازار سے

میں نے پوچھا اس شعر پر کیا اعتراض ہے؟ جواب ملا کہ جنگل کہیں بازار میں ملا کرتا ہے؟

میں نے کہا اس شعر میں "مومن" نے کمال بیان کی قدرت دکھائی ہے اس شعر میں ایک طرف فصاحت دوسری طرف بلاغت ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ جس طرح بازار میں جنگل نہیں ملتا (کیونکہ یہ کوئی سودا نہیں) اسی طرح دردِ وحشت کا علاج ناممکن ہے۔ طریقۂ بیان نے مضمون کے سونے کو سکہ بنا کر اقلیم سخن میں جاری کیا ہے۔

اہلِ فن جانتے ہیں کہ بلاغت کا یہ انداز "اعجاز" کا مرتبہ رکھتا ہے جو "مومن" کے سوا کسی کو نصیب نہیں۔

لفظی شکوہ میں معنوی طلسم کا انتظام جادو بن گیا ہے، اگر مہمل گوئی کا یہی معیار ہے تو "موضوع گوئی" کو کیا کہا جائے، اس کی مثال بالکل اس اعتراض سے ملتی جلتی ہے کہ "عربی۔ فارسی۔ اُردو اس لئے بہتر زبان نہیں ہیں کہ سیدھی طرف سے لکھی جاتی ہیں؟

یورپ کے ایک فلسفی نے اپنی ایک تقریر میں یہی درفشانی کی تھی جب دعویٰ اور دلیل کی یہ صورتیں ہوں تو اہلِ تحقیق کو قلم رکھ دینے کے سوا چارہ نہیں۔

اس ضمنی بحث کے بعد اصل موضوع سے پہلے حقیقت شعر اور تغزل پر نقد و بحث کی حاجت ہے۔

ایک شاعر جب شعر کہتا ہے تو فضا، آب و ہوا، زمانہ، اپنے علم و فضل، واقعات، و حالات سے متاثر ہوتا ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ شاعر کی طبیعت اثرات مذکورہ بالا سے متاثر ہوتی ہے اور شعر اس کی طبیعت کا خاکہ ہوتا ہے دونوں بیانوں کا حاصل ایک ہے، شاعر کا یہ کمال ہے کہ وہ جس قسم کے خیالات ظاہر کرنا چاہتا ہے اسی اعتبار سے "الفاظ" "ترکیب" "بندش" کو پیش نظر رکھتا ہے نہ یہ کہ ہر قسم کے خیالات، مسائل فلسفہ و طبیعات علوم و فنون کو مقررہ زبان یا ترکیب میں ادا کر سکتا ہے، کیونکہ یہ امر بغیر کسی دلیل کے مسلم ہے کہ تمام خیالات ایک زبان اور ایک لہجہ میں ادا نہیں ہو سکتے۔

اصنافِ سخن پر نظر کیجئے قصیدہ۔ غزل۔ مثنوی۔ مرثیہ۔ واسوخت، ہجو، رباعی۔ بند، علٰحدہ علٰحدہ اسلوب سے بیان کیئے جاتے ہیں غور سے دیکھئے تو ان کی زبان اور الفاظ میں بھی بیّن فرق ہوتا ہے۔

اس پر یہ دلیل قائم ہوتی ہے کہ "اگر معنی کے تابع ہے، معنی الفاظ کے تابع"

جب مرثیہ کا اثر قصیدے سے علٰحدہ تسلیم کیا جا سکتا ہے تو اسی دلیل سے مرثیہ کے الفاظ و طرز ادا کا قصیدہ سے علٰحدہ ہونا مسلم ہے

ایسَ جانسن، لایوز آف دی پوئٹس میں لکھتے ہیں:۔

"الفاظ و تراکیب کے اُس انتخاب پر بہت کم توجہ کی جاتی ہے جو نظم کو نثر سے علٰحدہ کر دیتے ہیں"

اسی سلسلہ میں آگے لکھتے ہیں:۔

"نہ تو گل خار سے علٰحدہ کیئے گئے اور نہ مختلف رنگ باہم اس طرح ملائے گئے کہ ہر رنگ میں جان پڑ جاتی۔"

ای۔ ایس ڈیلاس کی رائے ہے کہ:۔

"الفاظ، خیالات کے اظہار کا ذریعہ ہوتے ہیں اور ہر فن کے لئے مخصوص زبان ہوتی ہے"

اس کا مطلب یہ ہے کہ "اگر داستان غم اور مضمون رنج بیان کرنا ہے تو اسی مناسبت سے الفاظ لانا چاہئے، خوشی اور مسرت کے اظہار میں اسی قسم کے الفاظ استعمال کیئے جائیں، یہی شاعر کا کمال ہے، جو شاعر اس اعتبار سے جس قدر کامیاب ہے، اسی قدر باکمال سمجھا جاتا ہے۔

"شکسپیر" اپنے اسی کمال کی وجہ سے مشہور ہے، وہ فطرت نگار ہے طبائع پر اس کو عبور ہے، جس کا کیریکٹر بیان کرتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس پر وہ حالت خود طاری ہو رہی ہے، فارسی میں فردوسی، کا شاہنامہ اردو میں مراثی انیس و دبیر اردو ڈراموں میں آغا حشر کے ڈرامے ان خصوصیات کی وجہ سے مشہور ہیں۔

خاقانی اور ذوق نے فارسی اور اردو میں قصیدہ گوئی کا معیار قائم کیا اور اس کے مطابق الفاظ لائے، اس لئے ان کا درجہ بہت بلند ہے عربی میں یہی خصوصیات اس مرتبہ کمال پر پہنچ جاتی ہیں کہ بالآخر معجزہ بن جاتی ہیں، انسان کو اس کے مثل کہنے کا یارا نہیں رہ جاتا۔

اس کا نام قرآن ہے۔

ہندی (بھاشا) شاعری میں اصطلاح معین کے بموجب، رس، خاص چیز ہے، اس کے اصلی معنی ذائقہ کے ہیں، اصطلاح میں اظہار جذبات کا نام ہے،

اس کی نو ۹ قسمیں ہیں

۱۔ شرنگار۔ اس کے ذریعہ سے خواہش نفسانی کا اظہار ہوتا ہے اس کے مطابق الفاظ لاتے ہیں

۲۔ ہاسی۔ آواز یا حرکت کی وجہ سے تاثر

۳- کرونترا۔ ہجو وغیرہ کے جذبات
۴- راودر۔ غصہ کے جذبات
۵- ویررس۔ اس میں جوش کے جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔
۶- بھیانک رس۔ خوف کے جذبات ظاہر کیۓ جاتے ہیں
۷- وحبت رس۔ اظہار توہین کے جذبات
۸- ادبھت۔ حیرت اور استعجاب کا اظہار ہوتا ہے
۹- شانت۔ خدا کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہوجانا یا اس قسم کی تاثیر کا اظہار

ہندی شاعری میں الفاظ کے اعتبار سے ترنم بھی ہوتا ہے اس ترنم کے لحاظ سے راگ اور راگنی وسیع علم بن گیا ہے جس کا جواب ہندوستان کے باہر نہیں ملتا۔

ہندی میں ایک ایک رس کی متعدد قسمیں ہیں ان سب کو یکجا کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ رس کی شاعری نے انسانی جذبات کو کس طرح سمجھا ہے؟

موضوع بحث کو مسلسل کرنے اور ترتیب مقدمات کے بعد نتیجہ نکالنے کے لئے فصاحت اور بلاغت کا ذکر بھی ضروری ہے۔

یورپ میں ایساکریس علم معانی وبیان کا معلم اول ہے اس نے فصاحت کی تعریف ان الفاظ میں کی کہ " وہ فن ترغیب و تحریص ہے"

ابن سنان کے نزدیک فصاحت کا مدار ذیل کے اصولوں پر ہے:-

۱- لفظ مانوس، یعنی اہل زبان استعمال کرتے ہوں' زبانوں پر رواں ہو' اسی کی بناوٹ میں کوئی غرابت نہ ہو اوضاع لغوی سے خارج نہ ہو (یعنی دریا کہہ کر پہاڑ' زمین کہکر آسمان مراد نہ لیں)۔
۲- لفظ آسانی سے زبان پر جاری ہو سکے' سُننے میں دلکش ہو
۳- بحیثیت استعمال لفظ سہل ہو' اور معناً دل نشین ہو۔
۴- سختی اور نرمی میں حسب موقع کار آمد ہو' غصہ کے موقع پر اظہار غصہ ہو سکے' صبر اور حلم کی جگہ اس کا اظہار ہوتا ہو۔

معنوی خصوصیات یا مفہوم اور مطلب کا اظہار اس طرح ہو کہ ادراک اور احساس کو اس سے لذت ہو ایک لفظ کثیر معانی پر دال ہو مومن کا ایک شعر ہے:-

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا	جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

لفظ "گویا" اس جگہ اس قدر بلیغ ہے کہ اس سے زیادہ کوئی لفظ اس مفہوم کو ادا کرنے والا مشکل سے ملے گا۔

ائمۂ فن نے اس پر مبسوط بحثیں کی ہیں اس جگہ ان کا ذکر موضوع اور مضمون کو ناگوار و طویل بنا دے گا،

یہاں ضمنی طور پر یہ بحث پیدا ہوتی ہے کہ خوبی عبارت کو لفظ سے تعلق ہے یا معنی سے

ایک گروہ کا دعویٰ ہے کہ اس کا تعلق الفاظ سے ہے دوسرا فریق معنی کو کہتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ تنہا نہ تو لفظ ہی مقصد کو پورا کرتا ہے اور نہ تنہا معنی بلکہ دونوں سے معانی مطلوب پیدا ہوتے ہیں۔ تنہا نہ تو کوئی لفظ فصیح ہو اور نہ بلیغ۔ بعض وقت غیر فصیح الفاظ ترتیب سے آکر فصیح ہو جاتے ہیں۔ مثلاً عربی میں ضیزیٰ" کا لفظ ہے' ایک لفظ میں "ض" اور "ز" کا اس طرح جمع ہونا فصاحت کے خلاف ہے لیکن قرآن میں جہاں یہ لفظ استعمال ہوا ہے نہایت فصیح ہے " تلک اذا قسمۃ ضیزیٰ"

لفظ بمبوق، لیغو بخول، "ڈگڈمبر" بہ ظاہر غیر فصیح ہیں لیکن ان سے اگر مذاق مراد ہو اور ترتیب میں یہ معنی پیدا ہوں تو اپنی جگہ بہت فصیح ہیں۔

مومن نے اپنے اشعار میں الفاظ کی فصاحت، معانی کی بلاغت، ترتیب کی خوبی زبان کی سلاست، بندش کی بیساختگی کا یکجا اس طرح اہتمام کیا ہے کہ کہیں دوسری جگہ نظیر نہیں ملتی۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ شاعری میں مومن کا مرتبہ مجتہد اور امام کا ہے ہمارے دعاوی کی دلائل بھی اس جگہ دیکھ لیجئے ؎

۱۔ تم مرے پاس ہوتے ہو گویا  جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

لفظ "گویا" کی "فصاحت" پر ایک طرف نظر کیجئے اور اس کی معنوی بلاغت پر دوسری طرف نگاہ رکھئے، ترکیب، میں "گویا" جہاں واقع ہے اس پر بھی نظر کیجئے پھر پورے شعر کی بندش اور سلاست پیش نظر رکھئے کیا یہ مثال دوسری جگہ مل سکتی ہے؟

لفظ "گویا" اگر دوسری جگہ رکھ دیا جائے یا شعر کے الفاظ میں کچھ تغیر کر دیا جائے تو یہ تناسب اور یہ لطافت قائم نہیں رہ سکتی یہ مومن کے کمال اور ہمارے دعوٰی کی کھلی ہوئی دلیل ہے۔

فصاحت الفاظ:۔ ؎

۲۔ پھوڑا تھا دل نہ تھا یہ موئے پر خلل گیا  جب ٹھیس سانس کی لگی دم بھی نکل گیا

اس شعر میں الفاظ ٹھیس، پھوڑا، سانس، دم کی فصاحت لفظی دیکھیے۔

مومن نے چونکہ پہلے مصرعہ میں لفظ پھوڑا استعمال کیا ہے اس لئے دوسرے مصرعہ میں "ٹھیس" لگنا کہا ہے، پھوڑے، میں ٹھیس لگتی ہے اس کے لئے اس جگہ دوسرا لفظ موزوں نہیں ہو سکتا، اس طرح "ٹھیس" کے لئے پھوڑا لازم تھا، ٹھیس لگنا نازک سے نازک تر چیز کے لئے استعمال ہوتا ہے، اس جگہ اس لفظ نے بتا دیا ہے کہ پھوڑے کی حالت نازک سے نازک تر تھی۔

"سانس" کا لفظ چونکہ آ چکا تھا اس لئے "دم" سے زیادہ کوئی لفظ موزوں اور مناسب نہ تھا۔

اب معنوی بلاغت دیکھیے:۔

دل کو پھوڑا، کہا اس لئے کہ اس کی صورت اس سے ملتی ہوتی ہے پھوڑا مواد سے بھرا ہوتا ہے، دل کا بھرنا اور بھر آنا بھرا ہوا ہونا وہ صفتیں یا مصادر ہیں جو مستعمل ہیں۔ لہذا معنوی حیثیت سے اس کے تناسب کا اعجاز ملاحظہ فرمایئے

"دم" کے دوسرے معنی "خون" کے ہیں، اب دم نکل جانے کی خوبی بلاغت دیکھئے جس طرح پھوڑے سے مواد خون اور ریم نکلتا ہے، اسی طرح سانس کی ٹھیس لگنے سے دم یا جان یا خونِ دل نکل گیا، خونِ دل بھی جان ہی ہے، اس جگہ "مومن" نے اپنی حکمت وطبابت کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

پھوڑے میں ہر چیز سے ٹھیس لگتی ہے لیکن دل کی ایسی نازک چیز میں سانس کی ٹھیس کافی نہیں ضروری ہے

پھر دل۔ سانس۔ دم۔ کی مناسبت نے معنوی خوبیوں کے نگینے شعر کی انگشتری میں مناسب اور موزوں ترین مقامات پر جڑ دیے ہیں نزاکت، اور تلاش نے ایک طرف سلاست، زبان اور بندش نے دوسری طرف اس شعر کو بے مثال کر دیا ہے۔

اس شعر کا کمال دیکھئے کہ اس کا کوئی لفظ بدل دیجئے یا ترکیب اور ترتیب میں رد و بدل کیجئے تو شعر بدل جائے گا اور یہ خوبی باقی نہ رہیگی "مومن" کے اعتراف کمال کے لئے یہ کافی ہے

دوسرا شعر حمد کے سلسلے میں مناجات کا ہے۔

۳- خدایا ہاتھ اُٹھاؤں عرضِ مطلب سے بھلا کیونکر / کہ ہے دستِ دعا میں گوشہ دامانِ اجابت کا

اس شعر کے اجزائے ضروری ہاتھ اُٹھانا۔ دستِ دعا۔ دامانِ اجابت "مومن چونکہ دعا کر رہا ہے (مومن کی مناسبت معنوی کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے) اس لئے ہاتھ نہیں اُٹھا سکتا یعنی ناامید نہیں ہو سکتا۔

ہاتھ اُٹھانے کے دوسرے معنی بھی ہوتے ہیں اس کو اس مضمون سے مقید کر لیا ہے کہ دستِ دعا میں چونکہ دامانِ اجابت کا گوشہ ہے اس لئے نہیں اُٹھا سکتا مبادا وہ چھوٹ جائے جو عین مدعا ہے۔

پہلے مصرعہ میں ہاتھ اُٹھانا دوسرے میں دستِ دعا ہے بہ ظاہر لفظاً تکرار ہے لیکن معنوی اعتبار سے ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ ہے مقصود دعا اور اجابت کے لئے ان الفاظ سے زیادہ اگر کوئی موزوں الفاظ ہو سکتے ہیں تو ان کو لا کر دیکھئے کہ شعر کی یہ خوبی باقی رہتی ہے؟

۴- درد ہے جان کے عوض ہر رگ و پے میں ساری / چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہو گا

یہ شعر لفظی خصوصیات کے اعتبار سے زیادہ معنوی خصوصیات کی شان رکھتا ہے۔ الفاظ دردؔ۔ جانؔ۔ چارہ گر۔ درماںؔ اس انگشتری کے نگینے ہیں جو اپنی جگہ پر موزوں تر ہیں۔

معنوی بلاغت دیکھئے کہ "مومن" کہتا ہے کہ اب "درد" طبیعت اور خون بن گیا ہے جو جسم کے ہر حصہ میں موجود ہے جس طرح جان جسم میں ہر جگہ موجود ہے (یہ مسئلہ بھی مومن کے فلسفہ طب کو آشکار کرتا ہے) لہٰذا اس کا علاج نہیں ہو سکتا علاج کے معنی یہ ہیں کہ مرض دفع ہو اور وہ جان بن گیا ہے، لہٰذا درماں سے درد کی جگہ "جان" کا دفعیہ ہو گا، جب جان جسم میں باقی نہ رہی تو انسان زندہ نہ رہا، اس زندہ رہنے کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ ہم نہیں ہونے کے، اس سے بہتر طرزِ بیان ہونا خیال میں نہیں آتا۔

اس ترکیب کی دوسری خوبی ملاحظہ فرمایئے، متکلمین اور علمائے فلسفہ کے نزدیک "انسان" مجموعہ جسم و جان کا نام ہے یعنی ان میں سے اک کوئی جزو نہ ہو تو انسان مکمل نہیں۔ "مومن" نے اس مسئلہ کو سامنے رکھ کے بلیغ الفاظ استعمال کیے ہیں "ہم نہیں ہونے کے"۔

"مومن" نے "جان کے عوض" کہہ کر درد ہی کو جان بنا دیا ہے "جان کی طرح" اگر کہتے تو دوسرے مصرعہ میں یہ خوبیاں پیدا نہ ہو سکتی تھیں معنوی اعجاز کے علاوہ "زبان" کی کرامت کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔ "ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہو گا" یعنی اگر درماں ہو گا تو ہم نہ ہوں گے دوسرے الفاظ میں یا تو درماں ہو، یا ہم ہوں، کیسا محاورہ اور کیسی زبان ہے۔

۵- چارہ گر جنت میں اس کے آستاں سے لے گئے / ایک بھی میری نہ مانی لاکھ سر پٹکا کیا

اس شعر کے اجزائے ضروری جنتؔ۔ آستاںؔ۔ سر پٹکا کیاؔ۔ لے گئےؔ۔ میریؔ نہ مانی ہیں

لفظی تناسب اور اعتبار سے پہلے مصرعہ میں چونکہ "آستاں" کہا ہے اس لئے دوسرے مصرعہ میں "پٹکنا" استعمال کیا ہو آستانِ معشوق پر عاشق سر پٹکتا ہے یہ مضمون عام ہے قریب قریب اکثر شاعروں نے لکھا ہے "مومن" کی تلاش اور انداز اس کا پابند کیوں رہتا۔؟

وہ کہتا ہے کہ:۔

"چارہ گر آستانِ یار سے جنت میں علاجِ عشق کے لئے لے گئے، لیکن عاشق کو جنت سے کیا کام اس لئے آستانِ یار کا چھوڑنا گوارا کیونکر ہوتا، اس ناگواری کو سر پٹکنے سے ظاہر کیا ہے، ایک بھی میری نہ مانی، محاورہ اور زبان کی بے ساختگی ہے اس سے اور چار چاند لگا دیئے ہیں۔ "لاکھ سر پٹکا کیا؟ بلاغت کی روح ہے"۔

۶- لاش کس کی ہے یہ عدو سے نہ پوچھ / میں ہوں کشتہ ترے تجاہل کا

اجزائے شعر لاشؔ۔ کشتہؔ ہیں لفظی اعتبار سے لاش کے ساتھ کشتہ، کا ذکر ضروری تھا معنوی خوبی دیکھئے کہ:۔

"معشوق، رقیب سے عاشق کی لاش کو دیکھ کر پوچھتا ہے کہ یہ کس کی لاش ہے' (حالانکہ وہ جانتا پہچانتا ہے) عاشق زبانِ حال سے کہتا ہے کہ یہ عدو یا رقیب سے پوچھنے کی بات نہیں' یہ تو مجھ سے پوچھو کہ میں کون ہوں؟ میں تمھارے ناز تجاہل کا مارا ہوا ہوں۔ یہ "تجاہل" پہلے معشوق کا عام انداز ہو یا اس وقت خاص کا میں ہوں کشتہ ترے تجاہل کا "کیسا دلپذیر لہجہ ہے زبان نے اس کو چمکا کر آفتاب بنا دیا ہے"!

---

"مومن کے دیوان میں شروع سے آخر تک یہ کمالات اور کرامات شاعری موجود ہیں' جن کا وجود ابتدا سے اب تک کہیں نہیں ملتا۔

## حاصل کلام

یہ ہے کہ "مومن" نے اپنے تمام کلام بالخصوص غزلیات میں' الفاظ کی فصاحت معانی کی بلاغت، ترکیب کی خوبی ترتیب کی موزونی زبان کی سلاست جذبات کے نشتر، بندش کی بیساختگی مضمون کی بلندی۔ تلاش طرز ادا کیجا کر دیئے ہیں پھر کمال یہ ہے کہ اس اہتمام سے ان کا تمام دیوان شروع سے آخر تک بھرا پڑا ہے۔

سب سے زیادہ عجیب و غریب خصوصیت "مومن" کی یہ ہے کہ آورد کے اہتمام میں انداز بیان سے "آمد" کی بیخودی اور دلیری پیدا ہو گئی ہے' مومن اپنی اس صفت میں دنیائے شاعری میں منفرد اور اکیلے ہیں۔

---

یوروپ کے اہل قلم "شکسپیر" کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "اس نے اپنی گرامر اور زبان علٰحدہ کر لی ہے' ان لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ یہ کسی کے کمال کی تعریف نہیں ہو سکتی' عام راستہ سے الگ راہ تیار کر کے ہر شخص چلنے کی مقدرت رکھتا ہے' کمال اس کا نام ہے کہ اس راہ پر اس طرح چلے کہ نظروں کے ساتھ انگلیاں بھی اٹھنے لگیں۔

"مومن" نے اپنے اسی کمال کا اظہار کیا ہے۔ وہ قواعد مقررہ' عام زبان یا لغات و محاورات بعینہٖ میں اسی انداز سے کہتا ہے کہ نئی بات معلوم ہوتی ہے۔

## خصوصیات شعر

ابو الہلال عسکری امام بلاغت اپنی مشہور کتاب "صناعتیں" میں لکھتے ہیں کہ "کلام نثر ہو یا نظم اس میں سہولت۔ سلاست بہتر الفاظ، عمدہ معانی' اچھی ترکیب۔ موزوں نشستِ الفاظ ہونا ضروری ہے"۔

شعر کی تعریف میں لکھتے ہیں کہ "شعر کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ایسے الفاظ استعمال کیئے جائیں جو معانی کثیرہ پر حاوی ہوں' جن کو سُن کر سُننے والا خود بخود لطف حاصل کرے' سہل ہو' قلیل النظیر ہو۔

امام یحیٰی بن علی یمنی نے اس مسئلہ پر طویل بحث کی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ناظم اور ناثر کو علوم ضروریہ پیش نظر رکھ کر کلام کو مرتب کرنا چاہیئے یعنی کہاں مبتدا کو ہونا چاہیئے کہاں خبر کو' کہاں مقدم ہونا ضروری ہے کہاں مؤخر' اسی طرح جملہ فعلیہ میں یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ فاعل کہاں ہونا چاہیئے اور مفعول کی کونسی جگہ ہے' کس قسم کا فعل لانا مناسب ہے' ضمائر میں بھی مناسبت اور عدم مناسبت کا پیش نظر رکھنا لازم ہے' منشائے بیان یہ ہے کہ اگر اشعار قواعد مقررہ (نحویہ و صرفیہ) کے مطابق ہیں تو اس قابل ہیں کہ سند میں پیش کئے جائیں' ان کی صحت کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ناگزیر ہوتا ہے۔

جہاں یہ امر مسلم ہے وہیں یہ بھی مان لینا پڑے گا کہ اس قسم کے اشعار آمد کے درد اور بیساختگی کے نشتر بن نہیں سکتے۔ یہ بہت مشکل ہے کہ کوئی شخص ان قیود کے ساتھ آمد کا رنگ پیدا کرے۔ اگر ایسا کوئی شاعر نظر آئے تو اس کے اشعار زورِ تخیل کا نتیجہ نہ ہوں گے بلکہ کرامت کی دلیل۔

حکیم مومن' اسی قسم کے شاعر ہیں کہ پابندیوں کے اندر وہ اس طرح آزاد ہیں کہ نظر کو دھوکا ہوتا ہے' یہی سبب ہے کہ اعتراض کرنے والے اعتراض کرتے ہیں لیکن ان کو اس کی صحت اور عدم صحت کا احساس بھی نہیں ہوتا۔

علامہ قلقشندی 'صبح الاعشیٰ' کی جلد دوم میں صفحہ ۲۸۴ پر خصوصیات شعر کے متعلق نہایت محقق اور دلچسپ بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ شعر کی خوبی کے سات مدارج ہیں :-

۱۔ کسی شعر کا ہر مصرعہ بجائے خود مستقل ہو، مثلاً امرئ القیس کا شعر ہے :-

افاطم مهلا بعض هذا التدلل — وان كنت قد ازمعت هجري فاجمل

اس شعر کا ہر مصرعہ اپنی جگہ پر مستقل ہے۔ شعر کا یہ درجۂ اعلیٰ ہے۔

۲۔ دونوں مصرعے مستقل بھی ہوں اور ایک دوسرے سے مربوط بھی ہوں، مثلاً امرئ القیس کا یہ شعر :-

قفا نبك من ذكرى حبيب ومنزل — بسقط اللوى بين الدخول فحومل

اس شعر کا پہلا مصرعہ بجائے خود مستقل ہے، لیکن جب دوسرا مصرعہ ملا دیا گیا تو اس کا درجہ بڑھ گیا۔

۳۔ شاعر اپنے کسی شعر کے دونوں مصرعوں کو جس جگہ چاہے رکھ دے لیکن معنی میں فرق نہ آئے۔ اس کا نام تصریع موجہ ہے مثلاً ابن حجاج کا یہ شعر :-

من منروط الصبوح في المرجان — خفة الشرب مع خلو المكان

۴۔ پہلا مصرعہ غیر مستقل ہو لیکن جب دوسرا مصرعہ ملا یا جائے تو شعر پورا ہو جائے۔ اس کا نام تصریع ناقص ہے۔ متنبی کا شعر ہے :-

مغاني الشعب طيبا في المغاني — بمنزلة الربيع من الزمان

۵۔ شعر میں کوئی لفظ وسط اور قافیہ میں بہ طریق حقیقت واقع ہو جیسے :-

وكل ذي غيبة يؤوب — وغائب الموت لا يؤوب

اس میں لفظ یوب تصریع مکرر ہے۔

کبھی بہ طریقِ مجاز ہوتی ہے، مثلاً :-

فتى كان شربا للعفاة ومرتعا — فاصبح للهندية البيض مرتعا

اس شعر میں لفظ "مرتعا" مجاز ہے۔

۶۔ پہلا مصرعہ اس وقت تک معلق رہے جب تک دوسرے مصرعہ کا پہلا لفظ اس کی صفت بنا کر نہ ملا یا جائے۔ مثلاً

الا ايها الليل الطويل الا انجلي — بصبح وما الاصباح فيك بامثل

پہلا مصرعہ لفظ "بصبح" کا محتاج ہے، اس کو تصریع معلق کہتے ہیں

۷۔ مختلف القافیہ مصرعوں کے نام کو تصریع مسطور کہتے ہیں، مثلاً :-

اقلني قد ندمت على الذنوب — وبالاقرار عذت من الجحود

اس شعر میں ذنوب کا قافیہ جحود لایا گیا ہے جو معیوب ہے۔

**مومن اور خصوصیات شعر** اسی کسوٹی پر "مومن" کے اشعار دیکھنا چاہئے، مومن کے تمام دیوان میں زیادہ تر اول و دوم مدارج کے اشعار ہیں، سوم و چہارم کے کم، پنجم و ششم کے اس سے کم۔ ہفتم کا نشان نہیں۔

(مثال اول و دوم)

(۱) غضب سے تیرے ڈرتا ہوں رضا کی تیری خواہش ہے — نہ میں بیزار دوزخ سے نہ میں مشتاق جنت کا

پہلا مصرعہ بجائے خود مستقل ہے لیکن دوسرا ملا دیا گیا تو ارتباط بڑھ گیا۔

(۲) اظہار شوق شکوہ اثر اس سے تھا عبث　　میں نے کہا کہ مرتے ہیں تم پر کہا عبث

اس شعر کا پہلا مصرعہ اس قدر مستقل ہے کہ دوسرا نہ بھی ملایا جائے تب بھی مضمون میں کوئی نقص نہیں رہتا

(۳) تصریع ناقص کی مثال:۔

خبر نہیں کہ اسے کیا ہوا پر اس در پر　　نشانِ پا نظر آتا ہے نامہ بر کا سا

(۴) نہ جاؤں گا کبھی جنت کو میں نہ جاؤں گا　　اگر نہ ہوئے گا نقشہ تمہارے گھر کا سا

اس شعر میں تصریع موجود ہے یعنی پہلا مصرعہ دوسرے کی جگہ اور دوسرا پہلے کی جگہ رکھ دیا جائے تو مقصود میں فرق ہو۔

مرتبۂ نجم حتاط اور قادر الکلام شعراء کے نزدیک یہ عیب سمجھا جاتا ہے، اس لئے "مومن" نے اس سے حتی الوسع احتراز کیا ہے۔

## الفاظ اور شعر

ناظم اور ناثر کی قدرت اور فضیلت نظم اور نثر میں الفاظ اور معانی کی موزونیت سے معلوم ہوتی ہے۔
ابن رشیق قیروانی العمدہ صفحہ ۸۰ جلد اول میں لکھتے ہیں کہ:۔

"لفظ جسم اور معنی روح ہے ان دونوں میں باہم ارتباط ایسا ہوتا ہے جیسا جسم اور روح میں، جس طرح جسم کی قوت سے روح قوی اور ضعف سے ضعیف ہوتی ہے یہی حال الفاظ کا ہے، معنے اگر درست ہوتے ہیں اور لفظ میں نقص ہوتا ہے تو شعر میں نقص پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر معنے میں خرابی ہے تو لفظ بیکار معلوم ہوتا ہے"

اسی کتاب میں آگے چل کر معانی اور الفاظ کے موازنے میں "الفاظ" کی خرابی و صحت پر زیادہ زور دیا ہے:۔

"اکثر ائمۂ لغت خوبی الفاظ کو معانی پر ترجیح دیتے ہیں "بعض علماء کا قول ہے کہ الفاظ معانی سے زیادہ ضروری اور قیمتی ہوتے ہیں ابو ہلال عسکری اس فن کے جید امام کا قول ہے کہ "معانی کی تمام خوبیاں الفاظ پر موقوف ہیں، یہی وجہ ہے کہ شعراء اور خطباء اپنے کلام میں اثر پیدا کرنے کے لئے مناسب الفاظ کی ترتیب دیتے ہیں" (صفحہ ۲۴ کتاب صناعتین)

علامہ قلقشندی کی رائے ہے کہ:۔

"شیریں الفاظ کی طرف طبیعت خود بخود مائل ہوتی ہے نہ کہ معانی کی طرف"

کلام فصیح کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

"فصاحت کا انحصار الفاظ پر ہے، یعنی لفظ فصیح وہ ہے جس کے فوراً سمجھنے میں کسی قسم کے اہتمام کی ضرورت نہ ہو۔

پھر لکھتے ہیں کہ:۔

الفاظ میں خاص قسم کی کشش ہوتی ہے جس کی طرف قوت سامعہ کا خود بخود میلان ہوتا ہے۔ اگر الفاظ میں سختی ہوتی ہے تو اس سے نفرت پیدا ہوتی ہے اول الذکر کی مثال آواز بلبل اور دوسرے کی مثال گدھے کی آواز ہے"

اس پر اگر یہ اعتراض کیا جائے "اس قسم کی نفرت یا رغبت کا انحصار الفاظ پر نہیں بلکہ آواز پر ہے" اس کا جواب یہ ہے کہ آواز الفاظ کی تابع ہوتی ہے، یعنی کوئی آواز لفظ یا الفاظ سے خالی نہیں ہوتی۔

ہماری رائے میں الفاظ صرف سامعہ نواز ہی نہیں ہوتے بلکہ ان سے قوت باصرہ، دل و دماغ سب کو کیفیت و لذت حاصل ہوتی ہے۔

(مثال الفاظ فصیح)

مومن نے اپنے اشعار میں اس کا کہاں تک اہتمام کیا ہے، ذیل کے شعروں سے معلوم ہو سکتا ہے:۔

دیدۂ حیراں نے تماشا کیا　　دیر تلک وہ مجھے دیکھا کیا

اس شعر میں الفاظ دیدۂ حیراں - تماشا - دیکھا کیا کی فصاحت قابل ذکر ہے، اس شعر میں ان سے زیادہ موزوں الفاظ کا اجماع مشکل ہے - یا اس مضمون یا ان معانی کو دوسرے الفاظ میں ڈھالنے سے خوبی ساقط ہو جاتی ہے۔

(۲) تیرے پردے نے کی یہ پردہ دری　　تیرے چھپتے ہی کچھ چھپا نہ رہا

اس شعر کے الفاظ خط کشیدہ کو معیار مذکورہ پر جانچ کر دیکھئے۔

(۳) تلخ کامی پر مجھے، تجھکو لب شیریں پہ ناز　　آمرے جادو سے اعجاز مسیحائی ملا

اس شعر میں الفاظ تلخ کامی - لب شیریں - جادو - اعجاز مسیحائی کے کرشمے دیکھئے۔

(۴) ہل جاتے ہی اغیار نکل آتے ہیں باہر　　زنجیر در یار ہے یا سلسلہ اپنا

اس شعر میں لفظ سلسلہ نے شعر کو شعر بنا دیا ہے۔

**معانی اور شعر** | صبح الاعشیٰ میں ہے کہ "معانی" کا وجود الفاظ کے لئے ایسا ہے جیسا کہ جسم کے لئے لباس ہوتا ہے جس طرح جسم کپڑے کا تابع ہوتا ہے اسی طرح الفاظ معانی کے تابع ہوتے ہیں - صاحب بلاغت کو الفاظ سے زیادہ معانی کے اہتمام کی ضرورت ہوتی ہے۔

معانی کی چند صورتیں ہوتی ہیں:-

۱- مستقیم حسن — یہ صورت وہ ہوتی ہے کہ اپنی صحت پر خود دلالت کرتی ہے۔ اس کی مثال عربی میں رایت زیداً ہے اور اردو میں "میں نے زید کو دیکھا ہے"، اس قسم کے اہتمام کا نام "سحر حلال" ہے۔

۲- مستقیم قبیح ہے، اس کی مثال عربی میں "زیداً رایت" "زید کو دیکھا میں نے" اس کا دوسرا نام تعقید ہے ابن اثیر نے مثل السائر میں اس کا نام مغالطۂ معنویہ رکھا ہے۔

۳- مستقیم کاذب — اس کی مثال "حملت الجبل" میں نے پہاڑ اٹھا لیا حقیقتاً غلط ہے لیکن اپنے موقعہ پر مبالغہ موزوں ہے۔

۴- مستقیم محال — ان باتوں کا ذکر جو عقلاً اور عادۃً محال ہوں۔ اس کا دوسرا نام غلو ہے۔ یہ بھی اپنے موقعہ پر مستحسن اور موزوں ہے بشرطیکہ شاعر کا دماغ صحیح ہو اور اس میں کافی تمیز ہو، ورنہ معیوب ہے مثلاً اردو کا یہ شعر:- ؎

ایک دن رونے جو بیٹھا میں برائے امتحاں　　سو سمندر، ساٹھ نالے، کتنے دریا بہہ گئے

۵- مستقیم غلط - اس کی مثال عربی میں یہ ہے کہ کوئی کہے "ضربنی زیدٌ" مجھ کو زید نے مارا، لیکن منشا ہو "ضربت زیداً" میں نے زید کو مارا، یہ بھی اپنے موقع پر درست ہوتا ہے بشرطیکہ شاعر اس موقع کو سمجھے۔

"مومن" نے ان اقسام کو جس طرح پیش نظر رکھا ہے، ان کی مثالیں دیکھ لیجئے:-

مثال اول:- ؎

اس کوچہ کی ہوا تھی کہ میری ہی آہ تھی　　کوئی تو دل کی آہ پر پنکھا سا جھل گیا

اس شعر میں "سلاست" کی خوبی جہاں تک ہے ارباب نظر پر مخفی نہیں۔

ایسی لذت خلش دل میں کہاں ہوتی ہے　　رہ گیا سینہ میں اس کا کوئی پیکاں ہوگا

اس شعر میں تعقید ضرور ہے لیکن "معیوب" نہیں اہل فن سمجھ سکتے ہیں۔ اس قسم کے اشعار بہت کم بلکہ الشاذ کالمعدوم ہیں، لیکن

ان کا عیب "مومن" نے اپنی حکمت سے نکال دیا ہے۔

مثال سوم :- ؎ مرگئے اس کے لبِ جاں بخش پر　　ہم نے علاج آپ ہی اپنا کیا

اس شعر کا "کذب" صدق استعارہ و تشبیہ کے انداز رکھتا ہے، شاعر کا یہ کمال قابل ذکر ہے۔

مثال چہارم :- ؎ یہ مشتِ پر سوختہ پھولیں گے قفس کو　　تو ساتھ کسی کے مجھے صیاد نہ کر بند

"مومن" کے اس محال میں امکان کی بیساختگی دیکھئے۔

مثال پنجم :- ؎ نام وصال لینے سے ہوتا ہے مضطرب　　کیونکر کہوں اسے مرے مرنے کا غم نہیں

لفظ "وصال" سے کذب میں صدق کا جلوہ موجود ہے، مومن نے اس قسم کا کمال اپنے دیوان میں اکثر جگہ دکھایا ہے۔

**ترتیب اور شعر** اہتمام الفاظ و معانی سے زیادہ "ترتیب" کا خیال شعر کو بہتر اور شاعر کے کمال کو ظاہر کرتا ہے۔ جو شاعر جس قدر صاحب کمال ہوتا ہے، اسی قدر اس کے اشعار کی ترتیب بہتر ہوتی ہے۔

فصیح اور بلیغ الفاظ استعمال بھی کیے جائیں، لیکن ان کی ترتیب درست نہ ہو تو ان کی فصاحت اور بلاغت بیکار ہوتی ہے۔ مفرد الفاظ عام پر استعمال کیے جاتے ہیں۔ لیکن ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا لیکن الفاظ ترتیب اور ترکیب سے دلکش اور دلگداز بن جاتے ہیں۔

ائمہ معانی و بیان کی رائے ہے کہ قرآن حکیم اپنی ترتیب الفاظ کی وجہ سے معجزہ ہے۔

آیات :- وقیل یا ارض ابلعی ماءک ویا سماء اقلعی وغیض الماء وقضی الامر واستوت علی الجودی الخ سُن کر ایک عرب نے اس کی فصاحت و بلاغت پر سجدہ کیا تھا، حالانکہ الفاظ ارض۔ سماء۔ امر۔ ماء وہی ہیں جو روزانہ بولے جاتے ہیں لیکن ترتیب میں آکر معجزہ بن گئے۔

ترتیب میں حسب ذیل امور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

۱۔ ضعف تالیف نہ ہو، مثلاً "ضرب غلامہ زیداً" (مارا اس کے غلام نے زید کو) اس میں ضعف تالیف ہے۔

۲۔ تعقید نہ ہو۔ (اس کی مثال بیان ہو چکی ہے)

۳۔ تنافر کلمات نہ ہو مثلاً (ولیس قرب قبر حرب قبر) اس کی دوسری مثال آچکی ہے۔

شمس الدین محمد بن قیس رازی نے ان خصوصیات پر ایک فیصلہ کن محقق مضمون لکھا ہے، اس کا خلاصہ دیکھئے اور اس معیار پر "مومن" کو جانچئے۔

"کوئی شخص اس وقت تک شاعر کہے جانے کا مستحق نہیں جب تک ادوات شعر سے واقف نہ ہو۔ کلمات صحیح، الفاظ شیریں، عبارات بلیغ، معانی لطیف سے اپنے شعر کو آراستہ کرنا نہ جانتا ہو، وزن مناسب، ردیف اور قافیہ کی خوبی اور موزونیت سے آگاہ نہ ہو۔"

دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ :-

شاعر کو اس جوہری کے مانند ہونا چاہئے، جو جذب نظر خریداران کے لئے اپنے جواہرات کو مناسب اور موزوں مواقع پر رکھتا ہے شاعر کو بھی شعر میں مناسب الفاظ کو موزوں جگہ رکھ کر اپنے صحت مذاق کا ثبوت دینا چاہیئے۔

اس موضوع پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ جمیع اصناف پر اس کتاب میں لطیف بحث ہے اس جگہ صرف اسی پر اکتفا کرنا مناسب سمجھا گیا "مومن" دنیائے شاعری میں میرؔ کے بعد پہلے شخص ہیں جو الفاظ کو شعر میں نگینے کی طرح جڑتے ہیں اور اس فن میں موزونیت اور مناسبت کا ایسا کمال دکھاتے ہیں جو نظروں کو خیرہ کر دیتا ہے۔

اگر اس خصوصیت کا اضافہ کر لیجئے کہ تمام اصناف معانی و بیان سے اپنے پورے دیوان کو سجایا ہے تو ان کی اس قدرت میں الکا شریک کوئی شاعر نہیں۔

پہلے بتایا گیا ہے کہ "شاعر" اپنے فضل و کمال، طبیعت، وقت، فضا، گرد و پیش، رنگِ زمانہ سے متاثر ہوتا ہے، اور وقت و زمانہ شاعر کو متاثر کر کے اپنی زبان بنا لیتا ہے۔ اس لئے شاعر جو کچھ کہتا ہے وہ اس کی زبان نہیں ہوتی بلکہ زمانے کی۔ ہومر اپنے وقت کے یونانیوں کی زبان تھا اور ڈمینٹ اور ملٹن کا بھی یہی حال تھا۔

حکیم "مومن" بھی اپنے وقت اور زمانے کے واقعات اور فضا سے متاثر ہوئے ہیں، لیکن اپنی خود داری کے حدود سے آگے نہیں بڑھے اور شعراء کی طرح زمانے نے ان سے بھی موافقت نہیں کی ہے لیکن وہ اس سے پریشان اور مضطرب ہو کر متانت سے کبھی آگے نہیں بڑھے، ضروریات نے ان کو بھی مجبور کیا ہے، لیکن کبھی اپنے اشعار کے موتیوں کو بازار میں لے کر نہیں گئے۔

## خصوصیاتِ غزل

لغت میں غزل کے معنی ہیں، حدیث زناں " ان کے ساتھ عشقبازی کرنا اور اس عشقبازی میں خطرے کی پروا نہ کرنا۔

صاحب معجم کی رائے ہے کہ " غزل کو مناسب اور خوشگوار وزن شیریں اور سلیس الفاظ، دلنشیں معانی سے آراستہ ہونا چاہیئے۔ درشت کلمات اور ناگوار ترکیب سے بچنا غزل گو کا اولین فرض ہے۔

سعدی اور حافظ و جامی اور خسرو غزل کہنے والوں کے سرتاج اسی لئے ہیں کہ ان لوگوں نے غزل کی زبان الگ کر دی ہے۔ اردو میں غزل گوئی کے میدان میں میرؔ سب سے آگے اس وجہ سے ہیں کہ غزل کے لئے انھوں نے الگ اقلیم بنا لیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ میرؔ "جذبات تغزل" کے نشہ میں اسقدر متوالے ہیں کہ ان کو " الفاظ " اور دوسرے آورد کے اہتمام کی طرف چنداں توجہ نہیں ہوئی، مومنؔ نے جذبات کے ساتھ قیود اور پابندی کے آورد میں آمد کا رنگ پیدا کر کے دنیا کے سامنے ایک نئی چیز پیش کی ہے۔

معنوی حیثیت سے دیکھئے کہ غزل کی بنیاد حسن و عشق ہے، حسن عشق پیدا کرتا ہے، عشق سے حسب ذیل اوصاف پیدا ہوتے ہیں۔

۱۔ عشق، عاشق کو دلیر اور جانباز بنا دیتا ہے، اس کو جان ایسی چیز کی مطلق پروا نہیں ہوتی۔ فارس کا ایک شاعر کہتا ہے ؎

تا سر ندہم پا نہ کشم از سر کویش　　نامردی و مردی قدمے فاصلہ دارد

مومنؔ اس مضمون کو اس طرح ادا کرتا ہے۔

کشتۂ نادبتان روزِ ازل سے ہوں مجھے　　جان کھونے کے لئے اللہ نے پیدا کیا

۲۔ عشق میں معشوق پرستی کے علاوہ عاشق کا کوئی مشغلہ نہیں ہوتا، عشق ہی عاشق کا ایمان ہے۔ عشق ہی عاشق کا مذہب ہے، فارس کا شاعر اس مضمون کو یوں ظاہر کرتا ہے ؎

دو عالم را بہ یک بار از دلِ تنگ　　برون کردیم تا جائے تو باشد

مومنؔ نے اس مضمون کو ایسے انوکھے انداز میں بیان کیا ہے کہ شعر موتی بن گیا ہے ؎

چارہ گر جنت میں اس کے آستاں سے لیگئے　　ایک بھی میری نہ مانی لاکھ سر پٹکا کیا

"جنت" راحت و آرام کی مترادف اس کا حصول طلب خدا کا ثمرہ ہے۔ "مومن" اپنے عشق میں یک در گیر و محکم گیر

کو کس طرح ثابت کرتے ہوئے آستان یار کو جنت پر ترجیح دیتے ہیں۔

۳۔ عاشق، عشق کی مصیبتوں سے چھوٹنے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ ان کو عشق کا شعار جانتا ہے فارسی شاعر کہتا ہے۔

نالہ از بہر رہائی نکند مرغ اسیر　　　خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نبود

مومن اس مضمون کو اس طرز میں ادا کرتے ہیں ؎

اب قید سے امید رہائی نہیں رہی　　　ہمدرد پاسباں ہیں جو زندانیوں میں ہم

عام موازنہ اور مقابلہ کے بعد "مومن" کو جذبات تغزل میں "حافظ" کے سامنے لا کر دیکھئے۔ حافظ کا پایہ تغزل میں ایسا ہے کہ استادانِ فن حافظ کی غزل گوئی کو کرامات کہتے ہیں۔

## موازنہ حافظ و مومن

(حافظ)　جہاں ز ابروئے عید از ہلال وسمہ کشید
ہلالِ عید برابروے یار باید دید

(مومن)　نیم لبسمل ہیں نہ چھیڑ اے تپش دل کہ ابھی　　　روئے قاتل کا نظارہ کوئی دم کرتے ہیں

حافظ صاحب کہتے ہیں کہ ہلال عید کے جو لوگ منتظر ہیں ان کو ابروئے دوست دیکھنا چاہئے وہی سب کچھ ہے۔

"مومن" ایسے عاشق بیتاب وازخود رفتہ کو عید اور محرم کی کیا خبر وہ نظارہ یار کے وقت بیخودی سے دل کا اضطراب بھی پسند نہیں کرتا کہ مبادا اس یکسوئی نظارہ میں فرق آجائے۔

انصاف شرط ہے دیکھئے دونوں شاعروں میں جذبات عشق و محبت کس نے بہتر صورت میں ادا کئے ہیں۔

(حافظ)　دانی کہ چیست دولت دیدار یار دیدن　　　در کوئے او گدائی بر خسروی خریدن

(مومن)　گلی میں اس کے نہ پھر آتے ہم تو کیا کرتے　　　طبیعت اپنی نہ جنت کے درمیان لگی

حافظ کہتے ہیں کہ معشوق کے کوچے کی گدائی بادشاہی سے بہتر ہے۔

مومن کا عشق جنت پر کوئے یار کو اس طرح ترجیح دیتا ہے کہ مجال دم زدن باقی نہیں رہی!

(حافظ)　شراب لعل کش و روے مہ جبیناں بین　　　خلاف مذہب آناں جمال اینان بین

(مومن)　مے نہ اتری گلے سے جو اس بن　　　مجھ کو یاروں نے پارسا جانا

حافظ صاحب شراب پینے اور نظارہ یار کرنے کے علاوہ دنیا میں اور کوئی کام پسند نہیں کرتے۔

مومن کے حلق کے نیچے شراب زہر کی طرح بھی ہجر میں اُتر نہیں سکتی۔

حافظ کے یہاں بیشتر خوش حالی اور رندانہ فارغ البالی صورت دکھائی ہے۔

مومن عاشق تن کے یہاں اس کا ذکر کہاں جذبات تغزل و عشق دونوں کا فرق ظاہر ہے۔

حافظ سے موازنے کا منشا یہ تھا کہ مومن نے جذبات تغزل کا جو مفہوم سمجھا ہے وہ جذبات عشق کے عین مطابق ہے۔ عاشق کو جیسا ہونا چاہئے، مومن اپنے اشعار غزل میں نمایاں ہے۔

ناقدان فن اور صاحبانِ مذاق نے غزل یا عشق کے جذبات کو ذیل کی صورتوں میں نمایاں کیا ہے۔

## (معشوق کا انداز کج ادائی)

**جذبات تغزل** | فارسی شاعر کہتا ہے:-

باغیر نشینی و فرستی زپئے ما　　　آں را کہ نداند رہِ کاشانۂ ما را

مومن کی شان دیکھئے ؎

مجلس میں تا نہ دیکھ سکوں یار کی طرف　　　دیکھے ہے مجھ کو دیکھ کے اغیار کی طرف

فارسی شعر میں معشوق اپنی محفل میں بلانے اور غیر کے ساتھ ملاطفت دکھانے اور عاشق کے جلانے کے لئے اس کو ایسے شخص کی معرفت بلواتا ہے۔ جو عاشق کا گھر تک نہیں جانتا۔

مومن کا رنگ دیکھئے کہ وہ مجلس میں موجود ہے، رقیب کے ساتھ بیٹھا ہوا دیکھتا ہے۔ اس پر اکتفا نہیں بلکہ عاشق کے جلانے کو معشوق عجیب لطیف انداز میں کج ادائی دکھاتا ہے۔

ارباب فن دونوں کا فرق محسوس کریں اور مومن کے جذبات کی داد دیں۔

## (معشوق کا ذکر کسی عنوان سے ہو بہتر ہے)

فارسی شاعر کا خیال دیکھئے ؎

بہر مجلس کہ جا سازم حدیث نیکواں پرسم　　　کہ حرفِ آں مہ نا مہرباں را درمیاں پرسم

مومن کا انداز دیکھئے :-

نہ مانوں گا نصیحت پر نہ سنتا میں تو کیا کرتا　　　کہ ہر ہر بات پر ناصح تمھارا نام لیتا تھا

پہلے شعر میں ذکر معشوق معمولی رنگ میں ہے، خود عاشق ذکر کرتا ہے اگرچہ اس کے لئے پیرایہ تلاش کرتا ہے۔ مومن نے دشمن عقل "ناصح" کی نصیحت میں عشق کے مزے لئے ہیں۔ اس مضمون کو مومن نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

عربی کا ایک شعر بالکل اسی مضمون کا ہے ؎

احب العذل لتکرارہ　　　حدیث الحبیب علی مسمعی

نصیحت کرنے والے کی نصیحت اس لئے پسند کرتا ہوں کہ بار بار دوست کا نام سننے میں آتا ہے۔

"مومن" کی بلند پروازئ خیال نے اور لطیف انداز بیان نے دونوں شاعروں کو پست کر دیا۔

## (ستم محبوب)

فارسی شعر ؎　　این جورِ دیگر ست کہ آزارِ عاشقاں　　　چنداں نمی کند کہ بہ بیداد خو کند

مومن ؎　　جب مجھے رنج دل آزاری نہ ہو　　　بیوفا پھر حاصلِ بیداد کیا

مضمون قریب قریب دونوں ایک ہیں مگر مومن نے اپنے شعر میں اثر کی بجلی بھر دی ہے، الفاظ او بندش سے آسمان شاعری میں ستارے جڑ دئے ہیں۔

## (محبوب کی نسبت بدگمانی)

فارسی شاعر کہتا ہے ؎

کاش اے محرم نمی پرسیدیم کاں مہ کجاست　　　یک سخن گفتی و بازاز صد گمانم سوختی

مومن ؎　روز کا بگاڑ آخر جان پر بناد ے گا　　ان کو شوقِ آرائش دل ہے بدگماں اپنا

## ( معشوق کو خط لکھنا )

فارسی شاعر کہتا ہے ؎

بہ جاناں نامہ ہرگز عاشق بیمار نہ نویسد　　کہ از بے طاقتی یک حرف را صد بار بنویسد

مومن ؎　حالِ دل یار کو لکھوں کیونکر　　ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا

## ( ستم کی ادا )

فارسی شاعر کہتا ہے ؎

تا مرا در نظر مدعیان خوار کند　　ہر چہ گویم بخلافِ سخنم کار کند

مومن ؎　لاش کس کی ہے ؟ یہ عدو سے نہ پوچھ　　میں ہوں کشتہ ترے تغافل کا

فارسی شعر میں ابتدائے ادا ہے اور مومن کے شعر میں انتہا ہے، لطف بیان نے شعر کو اپنا لیا ہے۔ تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے تو ضخیم دفتر ہو جائے۔ یہاں یہ دکھانا منظور ہے کہ مومن نے تغزل کا جو مفہوم سمجھا ہے اور دوسروں کو سمجھانا چاہا ہے وہ اپنی جگہ بے مثل ہے۔ مومن سے پہلے فارسی شاعری اردو کے سامنے جو کچھ ناز کرتی بجا تھا لیکن "مومن" نے اپنے کمال شاعری سے اردو شاعری بالخصوص غزل گوئی کو اس مرتبہ پر پہونچا دیا ہے کہ اس کا جواب مشکل سے کسی زبان میں مل سکتا ہے مومن کا یہ کمال دیکھئے کہ غزل۔ مثنوی۔ قصیدہ۔ واسوخت کی زبان۔ ترتیب و الفاظ۔ معانی۔ انداز بیان۔ لہجہ وغیرہ میں نمایاں فرق رکھا ہے۔

**الفاظ غزل** | غزلوں میں مومن نے جس طرح الفاظ کا اہتمام کیا ہے اس کی چند مثالیں دیکھ لیجئے:۔

یہ جوشِ یاس تو دیکھو کہ اپنے قتل کے وقت　　دعائے وصل نہ کی وقت تھا اثر کا "سا"

اس شعر میں لفظ "سا" جس اہتمام سے رکھا گیا ہے اس نے لطف معانی کو دوبالا کر دیا ہے۔ یہی "سا" تمام غزل میں علیحدہ علیحدہ رنگ دکھاتا ہے۔ دوسری غزل میں دیکھئے:۔

اس کوچے کی ہوا تھی کہ میری ہی آہ تھی　　کوئی تو دل کی آگ پہ پنکھا سا جھل گیا

ایسی لذت خلشِ دل میں کہاں ہوتی ہے　　رہ گیا سینہ میں اس کا کوئی پیکاں ہوگا

اس شعر میں لفظ "کوئی" کی تنکیر نے ایسی خوبی اور دلکشی پیدا کر دی ہے جس نے تمام شعر بالخصوص پہلے مصرعہ کو سانچے میں ڈھال دیا ہے۔

---

درد ہے جان کے عوض ہر رگ و پے میں ساری　　چارہ گر! ہم "نہیں ہونے کے" جو درماں ہوگا

اس شعر میں "نہیں ہونے کے" الفاظ نے محاورہ کو بیساختگی کے ساتھ اظہار جذبات میں جادو کیا ہے۔

سینے سے گھبرا کے آخر جاں لب تک آ گئی　　حال پہونچا یاں تلک اور تم نہ آئے یاں تلک

اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں یاں تلک دو جگہ کس طرح آیا ہے اور دونوں جگہ کیا کام کر رہا ہے۔ ارباب فن سے پوشیدہ نہیں۔

---

کیا دل کو لے گیا کوئی بیگانہ آشنا　　کیوں اپنے جی کو لگتے ہیں کچھ اجنبی سے ہم

اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں " سے " کتنا فصیح ہے!

---

اسے خوں ٹرگئی ہے بیطرح زانوئے جاناں کی　　یہ سر تکیہ پہ ہمدم جس طرح رکھوں نہ ٹھہریگا

اس شعر کے دونوں لفظ " بیطرح " اور " نہ ٹھہرے گا " کا انداز دیکھئے۔

## معانی غزل

جس طرح غزل میں " الفاظ " درد و بیتابی " بیکسی، جذبات کے اظہار کے لئے مخصوص ہوتے ہیں اسی طرح " معانی " کا حال ہے، " مومن " نے اپنی غزلوں میں اس کا بھی اسی اعتبار سے اہتمام و لحاظ کیا ہے، مثالوں سے ظاہر ہے۔

کیا سناتے ہو کہ ہے ہجر میں جینا مشکل　　تم سے بیرحم پہ مرنے سے تو آساں ہوگا

معنوی اعتبار سے یہ شعر کتنا بلند ہو گیا ہے؛

جذبۂ دل کو نہ چھاتی سے لگاؤں کیونکر　　آپ وہ میرے گلے دوڑ کے اکبار لگا

کیوں گلے دینے خطِ آزادی　　کچھ گنہ بھی غلام کا صاحب

پہلے شعر میں چھاتی سے لگانے کے محاورہ میں معنوی خوبیوں کو دیکھئے دوسرے میں پہلے مصرعہ کی رعایت سے غلام اور صاحب کے الفاظ نے معنوی حیثیت سے شعر کو بہت بلند کر دیا ہے۔

اس قسم کے اشعار سے تمام دیوان بھرا پڑا ہے

## لہجہ

غزل میں " لہجہ " کو بھی خاص وقعت اور خاص قوت ہے، مومن کو اس کے ادا کرنے پر بھی غیر معمولی قدرت ہے۔ مثال ملاحظہ فرمائیے۔

دمِ آخر بھی تم نہیں آتے　　بندگی اب کہ میں چلا صاحب

جذبۂ دل نے غیر کے بھی کیا کہیں تاثیر کی　　آج کیوں آتے ہوئے ہر گام پر رکتے ہیں آپ

مومن خدا کے واسطے ایسا مکاں نہ چھوڑ　　دوزخ میں ڈال خلد کو کوئے بتاں نہ چھوڑ

لہجے کی خوبی کے یہی معنی ہیں کہ مطلب کو اس طرح ادا کرے کہ اس میں تاثیر پیدا ہو جائے۔ ان اشعار میں یہ خصوصیت موجود ہے، لہجے کے اعتبار سے " الفاظ " اور " معانی " میں جو اہتمام ہوتا ہے وہ مومن کی غزلوں میں بدرجہ اتم موجود ہے،

## ترکیب و ترتیب

کمال غزل یا کمال شاعری کا انداز ترکیب اور ترتیب سے بھی ہوتا ہے۔ مثلاً:

اے جذبِ دل وہ شوخ ستمگر تو اک طرف　　پیغام لے کے بھی کوئی آیا نہیں ہنوز

ہم تا سحر آپ میں نہیں رہتے　　کیا جانے رہے وہ کس کے گھر رات

جو نقاب اٹھی میری آنکھوں پہ پردا پڑ گیا　　کچھ نہ سوجھا عالم اس پردہ نشیں کا دیکھ کر
اثر غم ذرا بتا دینا　　وہ بہت پوچھتے ہیں کیا ہے عشق

ہم نے تفصیل کے لئے عنوان قائم کر کے علیحدہ علیحدہ طور پر مثالیں پیش کی ہیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ "مومن" کے ہر شعر میں یہ تمام خوبیاں یکجا طور پر موجود ہیں۔

## سلاست زبان

ہم ہیں اور نزع شب ہجر میں جاں ہونے تک
صبر آتا ہے کوئی تاب و تواں ہونے تک

مجھ پہ عاشق نہیں ہے تجھ ظالم　　صبر آخر کرے وفا کب تک
لے شب وصل غیر بھی کاٹی　　تو مجھے آزمائے گا کب تک

یا الٰہی مجھ کو کس پردہ نشیں کا غم لگا　　سینے میں اندر ہی اندر کچھ گھلا جاتا ہے دل
سرمہ ہیں اس چشم جادو فن میں ہم　　خاک ڈالیں دیدۂ دشمن میں ہم

اعجاز سلاست کے اظہار کے لئے مومن کی حسب ذیل غزلیں قابل ملاحظہ ہیں ؎

اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا　　رنج راحت فزا نہیں ہوتا
مجھے جنت میں وہ صنم نہ ملا　　حشر اور ایک بار ہونا تھا
آسماں راہ پر نہیں آتا　　دعوائے خضر بے دلیل ہوا
اس کے اٹھتے ہی ہم جہاں سے اُٹھے　　کیا قیامت تھا دل کا آنا

اسی طرح ہر ردیف میں وہ غزلیں موجود ہیں جن پر شاعری اور زبان فخر کرتی ہیں۔

---

## مطلع

غزل میں مطلع اور مقطع شاعری اور جذبات کی ابتدا اور انتہا ہیں مشکل سے کوئی شاعر ایسا ملتا ہے جس کے مطلع اور مقطع دونوں بہتر ہوں۔

مومن میں یہ کمال موجود ہے۔ چند مطلع قابل ذکر ہیں۔

آخر امید ہی سے چارۂ حرماں ہوگا　　مرگ کی آس پہ جینا شب ہجراں ہوگا۔
دیدۂ حیراں نے تماشا کیا　　دیر تلک وہ مجھے دیکھا کیا
میں نے تم کو دل دیا تم نے مجھے رسوا کیا　　میں نے تم سے کیا کیا اور تم نے مجھ سے کیا کیا
امتحاں کے لئے جفا کب تک　　التفات ستم نما کب تک
شام سے تا صبح مضطر صبح سے تا شام ہم　　ایک عالم میں ہیں کیوں لے گردش ایام ہم
دل آگ ہے اور لگائیں گے ہم　　کیا جانئے کسے جلائیں گے ہم

## مقطع

یہ بیجا مشہور نہیں کہ مقطع "مومن" کا حصہ ہے چند مثال اس کی بھی دیکھ لیجئے۔

اے تپ ہجر دیکھ مومن ہیں　　ہے حرام آگ کا عذاب ہمیں
بتخانہ میں ہو گر ترا گھر　　مومن ہیں تو پھر نہ آئیں گے ہم

نکل کے دیر سے مسجد میں جا رہ اے مومن    خدا کا گھر تو ہے تیرے اگر مکاں نہیں
عمر ساری تو کٹی عشقِ بتاں میں مومن    آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے
تنگ آنے سے نہ کعبے کو تکلیف دے مجھے    مومن بس اب معاف کریاں جی بہل گیا
دوستی اس صنم آفت ایماں سے کرے    مومن ایسا بھی کوئی دشمن ایماں ہوگا

"مومن" نے غزل کے ہر صنف میں اشعار کہے ہیں، ان کے اشعار عاشقانہ بھی ہیں رندانہ بھی، ظرافت بھی جھلکتی ہے۔ شراب کی مستی بھی لیکن کسی صنف میں اپنے خاص رنگ کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔

واعظ اور ناصح کو بڑے بڑے متین اور مہذب شعرا نے بے نقط سنائی ہیں اور اس میں وہ تہذیب اور متانت کی حد سے گزر گئے ہیں، میرؔ ایسے خوددار و غیور متین و مہذب شاعر نے بھی اس رنگ میں یہ کہا ہے ؎

میں داڑھی تری واعظ مسجد ہی میں منڈواتا    پر کیا کروں ساتھ اپنے حجام نہیں رکھتا

مومن کو اس رنگ میں دیکھئے ؎

اس وسعتِ کلام سے جی تنگ آگیا    ناصح تو میری جان نہ لے دل گیا گیا
کیا پوچھتا ہے تلخیٔ الفت میں پند گو    ایسی تو لذتیں ہیں کہ تو جان کھا گیا
حوروں کی ثنا خوانی واعظ یونہی کب مانی    لے آ کہ ہے نادانی باتوں میں بہل جانا

"مومن" نے جہاں کہیں "خمریات" میں مستانہ مضمون لکھے ہیں وہاں بھی حدود شرعی سے آگے نہیں بڑھے ہیں۔ استاد مولانا آسیؔ سکندر پوری فرمایا کرتے تھے کہ "شعر ایسا ہونا چاہئے کہ بر سر منبر پڑھا جا سکے۔" یہ تعریف "مومن" کے کلام (غزل) پر صادق آتی ہے۔

**علوم اور مومن** شاعر کا شعر اس کے علوم و فنون، طبیعت اور رنگ زمانہ سے متاثر ہوتا ہے۔ مومنؔ کے علوم کو ان کی غزل میں دیکھئے اور قدرتِ بیان کی داد دیجئے۔

**قرآن و حدیث**

کیوں سنے عرضِ مومنِ مضطر    صنم آخر خدا نہیں ہوتا

اس شعر میں قرآن کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے یجیب دعوۃ الداع اذا دعان اور اس آیت کی طرف لفظاً جس کا مقصود یہ ہے کہ خدا مضطر کی سنتا ہے۔

خدایا ہاتھ اٹھاؤں عرض مطلب سے بھلا کیونکر    کہ ہے دستِ دعا میں گوشہ دامانِ اجابت کا

اس شعر میں آیت لا تقنطوا من رحمۃ اللہ اور اس کے ہم معنی حدیث کی طرف اشارہ ہے

**فلسفہ**

آخر امیدی سے چارۂ حرماں ہوگا    مرگ کی آس پہ جینا شبِ ہجراں ہوگا

یہ ایک مسئلہ ہے کہ انتہا کے بعد پھر ابتدا ہوتی ہے، انتہائی ناامیدی کے بعد امید پیدا ہوتی ہے، غالب نے اس کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید    ناامیدی اس کی دیکھا چاہیئے

غالب کو بیان فلسفہ کے لئے مناسب الفاظ نہیں ملے، جہاں کہیں ملے ہیں مسئلہ کو چیستاں کے اشعار بنا دیئے ہیں "مومن" نے دونوں سے اپنے بیان کو محفوظ رکھا ہے نہ تو ابتذال آنے دیا ہے اور نہ اطلاق۔

تو نے جو قہرِ خدا یاد دلایا مومن ، شکوۂ جورِ بتاں دل سے فراموش ہوا

ایک مسئلہ ہے کہ ایک وقت میں صرف ایک ہی خیال ہو سکتا ہے، اس کا بیان ہے۔

**نجوم**

دیکھ اپنا حالِ زار منجم ہوا رقیب
تھا سازگار طالعِ ناساز دیکھنا

**حکمت و طب**

جنوں کے جوش سے بیگانہ وار ہیں احباب
ہمارا حال وطن میں ہوا سفر کا سا

سودا اور جنون سے کچھ تمیز نہیں رہ جاتی۔ ۵

دردِ سر جان کے عوض ہر رگ و پے میں ساری
چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا

اسی طرح ضمنی طور پر اور بھی علوم و فنون آ گئے ہیں جن کا ذکر طوالت پیدا کرے گا۔

**موازنہ** دعوے کی دلیل مستحکم کرنے کے لئے موازنہ ضروری چیز ہے سب سے پہلے "مومن" کا موازنہ "میر" سے کر کے دیکھنا چاہئے کہ "مومن" اپنے انداز میں رب النوعِ استادشاعران "میر" کے مقابلہ میں کہاں تک کامیاب اور سرسبز ہوئے ہیں۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ "میر" نے "غزل" میں خاص رنگ پیدا کر کے اس کو متعلق فن بنایا ہے، اس کے تسلیم میں بھی پس و پیش نہیں ہو سکتا کہ "مومن" نے اس فن کو آسمانِ عروج کا آفتاب بنا کر اُردو کے ذرّوں پر کسبِ ضیا کے لئے احسانِ عظیم کیا ہے۔

**میر و مومن**

گرمی سے میں تو آتشِ غم کے پگھل گیا
راتوں کو روتے روتے ہی جوں شمع گل گیا

ہم خستہ دل ہیں تجھ سے بھی نازک مزاج تر
تیوری چڑھائی تو نے کہ یاں جی نکل گیا

**میر**

گرمیٔ عشق مانعِ نشو و نما ہوئی
میں وہ نہال تھا کہ اُگا اور جل گیا

مستی میں چھوڑ دیر کو کعبے چلا تھا میں
لغزش بڑی ہوئی تھی ولیکن سنبھل گیا

عریاں تنی کی شوخی ہے دیوانگی میں میر
مجنوں کے دشتِ خار کا دامن بھی جل گیا

**مومن**

پھوڑا تھا دل نہ تھا یہ موئے پر خلل گیا
جب ٹھیس سانس کی لگی دم بھی نکل گیا

اُس کوچے کی ہوا تھی کہ میری ہی آہ تھی
کوئی تو دل کی آگ پہ پنکھا سا جھل گیا

جوں خفتگانِ خاک ہے اپنی فتادگی
آیا جو زلزلہ کبھی کروٹ بدل گیا

اس نقشِ پا کے سجدہ نے کیا کیا کیا ذلیل
میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

بت خانہ سے نہ کعبے کو تکلیف دے مجھے
مومن بس اب معاف کہ یاں جی بہل گیا

پہلے شعر میں میر صاحب نے آمد کے رنگ میں رات ہی بھر میں آتشِ غم سے گھل گھل کر شمع کی طرح تمام ہو جانے کو کہا ہے۔ "مومن" نے اپنا "سخت دل" پیش کیا ہے لیکن اہتمام اور بہتت دیکھئے بہترین سلیقے اور اسلوب سے موتیوں کی طرح مالے میں پرو کر اب دونوں کا فرق ظاہر ہے یہی مناسبت تمام غزل میں قائم ہے۔

(۱)

**میر**

لبریزِ شکوہ تھے ہم لیکن حضور تیرے
کارِ شکایت اپنا گفتار تک نہ پہونچا

بے میشم نم رسیدہ پانی چوانے کوئی
وقتِ اخیر اس کے بیمار تک نہ پہونچا

یہ بختِ تیرہ دیکھو باغِ زمانہ میں ہے
پژمردہ گل بھی اپنے دستار تک نہ پہونچا

**مومن**

اللہ رے ناتوانی جب شدت قلق میں — بالیں سے سر اُٹھایا دیوار تک نہ پہونچا
مفت اول سخن میں عاشق نے جان دیدی — قاصد بیان تیرا اقرار تک نہ پہونچا

(۳)

تیسری غزل میں مشترک قوافی کو سامنے رکھ کر فرق دیکھنا چاہیے۔

**میرؔ**

سمجھی نہ بادِ صبح کہ آکر اُٹھا دیا — اس فتنۂ زمانہ کو ناحق جگا دیا
پوشیدہ رازِ عشق چلا جائے تھا سو آج — بے طاقتی نے دل کے وہ پردہ اُٹھا دیا
تکلیف داد دل کی عبث ہمنشیں نے کی — دردِ سخن نے میرؔ سبھوں کو رُلا دیا

---

**مومنؔ**

چلون کے بدلے مجھ کو زمیں پر گرا دیا — اس شوخ بے حجاب نے پردہ اُٹھا دیا
فرماتے ہیں وصال ہے انجام کارِ عشق — کیا ناصحِ شفیق نے مژدہ سُنا دیا
اشکِ فغاں کی ہائے رقیب آفرینیاں — محشر نے خفتگانِ زمیں کو جگا دیا
ہمدم دکھا اب اس کو کسی ڈھب کہ رحم کے — ناصح کو میرے حالِ زبوں نے ڈبا دیا
ایسی غزل کہی ہے کہ جھکتا ہے سب کا سر — مومنؔ نے اس زمین کو مسجد بنا دیا

ان دونوں غزلوں کے فیصلہ کی ضرورت نہیں، صاحب نظر اس میں خود فرق نکال سکتے ہیں۔

**مومن کا ایک لفظ**

"مومن" نے اپنی ایک مرصع غزل میں لفظ "گویا" اس طرح استعمال کیا ہے:-

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

ترازو کے ایک پلّے میں اس لفظ کو رکھیئے اور دوسرے میں "میرؔ" کی یہ غزل جس میں "گویا" ردیف ہے۔ ؎

غنچہ ہے وہ دہاں ہے گویا — ہونٹھ پر رنگِ پان ہے گویا
میرے مرنے سے بھی وہ چونکتے ہیں — اب تک مجھ میں جان ہے گویا
حیرتِ روئے گل سے مرغِ چمن — جب ہی یوں بے زبان ہے گویا
مسجد ایسی بھری بھری کب ہے — میکدہ اک جہان ہے گویا
بسکہ ہیں اس غزل میں شعر بلند — یہ زمیں آسمان ہے گویا
وہی سوزِ مزاج شب میں ہے — میرؔ اب تک جوان ہے گویا

انصاف سے بتائیے کہ وزن کس کا زیادہ ہے، حالانکہ "مومن" کا گویا "میرؔ" کے بعد ہے لیکن "مومن" نے اپنی کرشمہ کا دل سے ایک لفظ کو ایسا "موتی" بنایا ہے جس کے وزن کا موتی بڑے بڑے جوہریوں کے جواہر خانہ میں نہیں۔

**مومنؔ و غالبؔ**

مسلم الثبوت، جگت اُستادوں سے موازنے کے بعد معاصرین سے مقابلہ کی بھی ضرورت ہے، یہ ظاہر ہے کہ میرؔ کا زمانہ اور تھا اور مومن کا اور، اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ زمانہ کے اعتبار سے دونوں کی شاعریاں متاثر ہوئیں معاصرین کے ساتھ موازنہ اور مقابلہ میں "مومن" کا جوہر ہر اعتبار سے کھُل جائے گا۔

ہمارے خیال میں جو زمانہ "مومن" کو ملا تھا وہ شاعری کے کمال کا زمانہ تھا، بڑے بڑے محقق اور فاضل ہستیاں اس وقت موجود تھیں

ذوق اور غالب کے ایسے اُستادوں کے سامنے فروغ پانا مشکل اور دشوار بات تھی۔

ان شاعروں کے علاوہ علوم معانی وبیان، عروض وقوافی، ادب وانشا کے بڑے بڑے ماہرین موجود تھے۔ مفتی صدر الدین آزردہؔ جس پایے کے شاعر تھے اس سے زیادہ علوم عقلیہ ونقلیہ کے فاضل تھے، ان کے سامنے شعرائے عصر زانوئے ادب تہ کرتے تھے، لیکن "مومن" نے ان فضلائے زمانہ سے دادِ تحسین وخراجِ آفریں وصول کیا تھا۔

ان میں غالب اور ذوق کا مرتبہ یکے بعد دیگرے بہت بلند تھا۔

غالب کی ان دو معرکۃ الآرا غزلوں سے مومن کی غزلوں کا حسب ذیل موازنہ ہے، جو غالب کے زمانے ہی میں بہت مشہور ہو چکی تھیں۔ ان غزلوں کے مشترک قوافی خاص کر قابلِ غور ہیں۔

**غالب**

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں　　کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں
قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں　　میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں
میں اور حظِ وصل خدا ساز بات ہے　　جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں
غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی　　پیتا ہوں روزِ ابر وشبِ ماہتاب میں

---

**مومن**

تاثیر صبر میں نہ اثر اضطراب میں　　بیچارگی سے جان پڑی کس عذاب میں
کہتے ہیں تم کو ہوش نہیں اضطراب میں　　سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں
بے نالہ منہ سے جھڑتے ہیں بے گریہ آنکھ سے　　اجزائے دل کا حال نہ پوچھ اضطراب میں
ناکامیوں سے کام رہا عمر بھر ہمیں،　　پیری میں یاس ہے جو ہوس تھی شباب میں
کیا جلوے یاد آئے کہ اپنی خبر نہیں　　بے بادہ مست ہوں میں شبِ ماہتاب میں

غالب کی غزل کا پہلا شعر دیکھئے، مصرعہ اول میں الفاظ کی مشکل پسندی نار۔ التہاب نے شعر کو "تغزل" کی آن سے گرا دیا ہے "ملتی ہے خوئے یار سے" ترکیب نار اور التہاب کی مناسبت ہے پہلے لکھا جا چکا ہے کہ "غزل کے لئے الفاظ اور معانی میں جو غنودگی ترکیب میں سلاست ہونا چاہئے وہ غالب کے اس شعر میں مفقود ہے۔ مومن کا پہلا شعر اس کے مقابلہ میں دیکھئے۔

جذبات عشق کے اعتبار سے کسقدر مناسب اور موزوں الفاظ لائے ہیں۔

معنوی اعتبار سے "مومن" کے شعر سے غالب کو کوئی مناسبت نہیں، غالب کہتا ہے کہ عذاب میں اس لئے راحت ہے کہ اس میں دوست کی خو ہے، اس ذرا سے مضمون کے لئے الفاظ کا پہاڑ اُٹھایا ہے

"مومن" کہتا ہے کہ صبر اور اضطراب دونوں بیکار ہیں، گویا کہ ارتفاع نقیضین کو مومن نے ثابت کرنا چاہا ہے، جب یہ صورت ہو کہ نہ تو صبر کرنے سے اور نہ اضطراب سے کچھ حاصل ہو تو اس وقت جان پر کیسا عذاب ہوتا ہے۔

لفظ بیچارگی نے اس شعر میں وہ کام کیا ہے جو جسم میں روح کرتی ہے، اس کی بلاغت پر جتنا غور کیجئے گا شعر میں لطف پیدا ہوتا جائے گا جواب کے قافئے میں غالب قاصد کے آنے سے پہلے ایک خط اور لکھ لینا چاہتے ہیں، "میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں" مفہوم اور مضمون بطنِ شاعر میں ہے۔

"مومن" نے کس قدر بلیغ مضمون ادا کیا ہے کہ "کہتے ہیں تم کو ہوش نہیں اضطراب میں" اس نتیجہ کو اس طرح رکھا ہے کہ مقدمات

خود سمجھ میں آتے ہیں۔ یہ "جواب" ایسا لاجواب ہے کہ پھر کچھ کہنے کی گنجائش نہیں۔

تیسرا شعر اضطراب کے قافیہ کا ہے۔

غالب کا منشا یہ ہے کہ قاصد نے آکر یا خود معشوق نے وصل کا مژدہ سنایا یا وصل حاصل ہوا (کچھ صاف نہیں) بہ صورت خدا ساز ہوتی ہے۔ اس خوشی میں جان نذر کرنا تھا لیکن اسکو میں بھول گیا' پورے شعر میں اگر اپنی طرف سے الفاظ اور عبارات کا اضافہ نہ کیجئے تو شعر چیستاں بنا رہتا ہے۔

"مومن" کہتا ہے کہ دل کے ٹکڑے نالہ بن کر منہ سے اور آنکھ سے نکل رہے ہیں اس کو دیکھنا چاہئے پوچھنے کی ضرورت نہیں "بے گریہ آنکھ سے"؟ اس لئے کہا کہ بجائے اشک دل کے ٹکڑے نکلتے ہیں جھڑنے کے لفظ سے پھول جھڑنے کی طرف بھی لطیف اشارہ ہوتا ہے' اب دونوں کا فرق ظاہر ہے۔

غالب کے یہاں محذوفات نے شعر کو "راز" بنا دیا ہے "مومن" مختصر الفاظ میں کئی صفحہ کی داستان رنگین بیان کردی ہے ماہتاب کے قافیے میں "مومن" کا شعر غالب کے شعر سے اتنا بلند ہے کہ دونوں میں کوئی مناسبت نہیں۔

غالب نے واقعہ بیان کیا ہے "مومن" نے دلربا تصویر کھینچی ہے' شباب کے قافیہ میں "مومن" نے ناکامیوں کا عجیب و غریب فلسفہ بیان کیا ہے۔ اب دوسری غزل بھی قابلِ غور ہے۔

**غالب**

| | |
|---|---|
| ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں | اِک چھیڑ ہے وگرنہ مراد امتحاں نہیں |
| ہم کو ستم عزیز ستمگر کو ہم عزیز، | نامہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں |
| ہرچند جاں گدازیٔ قہر و عتاب ہے، | ہرچند پشتِ گرمیٔ تاب و تواں نہیں |
| پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے سخن کی میں | روح القدس اگرچہ مرا ہمزباں نہیں |

**مومن**

| | |
|---|---|
| اظہارِ دوستی کی خوشی کیا شبِ وصال | دشمن سے سن چکا ہوں کہ تو مہرباں نہیں |
| پیشِ عدو سمجھ کے ذرا حال پوچھنا | قابو میں دل نہیں مرے بس میں زباں نہیں |
| کرتے وفا امیدِ وفا پہ تمام عمر | پھر کیا کریں کہ اس کو سرِ امتحاں نہیں |
| ہر ذرہ میری خاک کا برباد ہو چکا، | بس اے خرامِ ناز کہ تاب و تواں نہیں |

ان دونوں غزلوں میں صرف مشترک قوافی لکھے گئے ہیں' تنقید کی ضرورت نہیں' معیار بتایا جا چکا ہے اب فیصلہ ان کے ہاتھ میں ہے جو انصاف کے ساتھ فیصلہ و تحیص کر سکتے ہیں۔

غالب پرست' غالب کے دوسرے شعر کی بہت تعریف کرتے ہیں ان کو چاہئے کہ "مومن" کے اس قافیہ پر غور کریں' غالب کے شعر میں اشکال پسندی اور دقت نظری کے بعد بھی معمولی مضمون کے سوا کچھ نہیں۔

"مومن" نے کس وقت اور کس کی زبان سے معشوق کی' مہربانی' کا حال سنا ہے اور اس کو کس انداز میں بیان کیا ہے' بلاغت کی مثال کے لئے یہ شعر سند ہے۔

**ذوق و مومن** | غالب کے اغلاق اور مشکل پسندی سے موازنہ کرنے کے بعد ذوق کی سلاست اور روانی سے بھی مقابلہ کرنا چاہیئے۔

**ذوق**

خط پڑھ کے اور بھی وہ ہوا پیچ و تاب میں — کیا جانیں لکھ دیا اسے کیا اضطراب میں
یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں — واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں
بے بادہ عورگی میں ہوا ذوق چوں مویز — کی توبہ بیوقوف نے ناحق شباب میں

"مومن" نے اس ردیف اور قافیہ میں جو کچھ لکھا ہے اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ذوق کے اشعار پر اظہار خیال کافی ہے۔
ذوق نے صرف تین ہی شعر لکھے ہیں ان میں دو اپنے رنگ میں بہتر ہیں، تیسرے شعر میں الفاظ "عورگی" "چوں مویز" کے ندرت اور نقصِ ترکیب کے علاوہ معنوی کوئی خوبی پیدا نہیں ہوئی۔

"مومن" نے اپنے ہر شعر میں "تلاش" "مضمون آفرینی" "طرزِ ادا" اور "اسلوب بیان" سے تغزل کا گلستاں طیار کر دیا ہے۔

**ذوق**

منہ یہ دل کے لئے تھے نہ تھے زباں کے لئے — سو ہم نے دل میں مزے سوزشِ نہاں کے لئے
نہیں ثبات بلندیٔ عزّ و شاں کے لئے — کہ ساتھ اوج کے پستی ہے آسماں کے لئے
ہزار لطف ہیں جو ہر ستم میں جاں کے لئے — ستم شریک ہوا کون آسماں کے لئے
نہ چھوڑ تو کسی عالم میں دوستی کہ یہ شے — عصا ہے پیر کو اور سیف ہر جواں کے لئے
بنایا آدمی کو ذوق ایک مردِ ضعیف — اور اس ضعیف سے کل کام دو جہاں کے لئے

---

**مومن**

دعا بلا تھی شبِ غم سکونِ جاں کے لئے — سخن بہانہ ہوا مرگِ ناگہاں کے لئے
ہے اعتماد مرے بختِ خفتہ پر کیا کیا — وگرنہ خواب کہاں چشمِ پاسباں کے لئے
بھلا ہوا کہ وفا آزما ستم سے ہوئے — ہمیں بھی دینی تھی جاں انکے امتحاں کے لئے

ذوق نے اس بحر میں ۲۶ شعر اس انداز کے کہے ہیں ذوق نے اپنی غزلوں میں بیشتر اخلاقی شعر کہے ہیں! اکثر اشعار ایسے بھی ہیں کہ ان کا ہونا جذبات تغزل کے سلسلہ میں بہتر معلوم نہیں ہوتا، مثلاً چوتھا شعر اس کو تغزل کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں

"مومن" نے اپنے تمام دیوان میں سلسلہ لفظ و تغزل کو ہر جگہ پیش نظر رکھا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کے دیوان میں اخلاقی اشعار کم ہیں یہی حال اور علوم و فنون کا ہے جہاں کہیں اخلاقی اشعار ضمناً آ گئے ہیں ان میں وہ لفظ موجود ہے۔

"مومن" نے اس کا اہتمام کیا ہے کہ معاملاتِ حسن و عشق میں دوسرے مسائل اور معاملے آنے نہ پائیں، حقیقت بھی اِسکی متقضی ہے غور سے دیکھئے تو "مومن" کے سوا اس اہتمام کا شاعر کوئی دوسرا نہیں،

مومن اور ذوق میں وہی فرق ہے جو غزل اور قصیدے میں ہوتا ہے، مومن پر تغزل کا رنگ اس قدر غالب ہے کہ قصیدے میں بھی اس کی جھلک ہے، ذوق قصیدے میں ڈوبے ہوئے ہیں اس لیے ان کی غزلوں میں بھی اس کا رنگ موجود ہے اس لئے حقیقتاً مومن اور ذوق کا موازنہ غزل میں نہیں ہو سکتا۔

قصیدے کی "واہ" کو غزل کی "آہ" سے واسطہ نہیں تاہم ذوق کی اُستادی اور قدرتِ کلام سے انکار نہیں ہو سکتا، قصیدے میں ان کی جسقدر تعریف ہو مناسب ہے۔ اردو فارسی سے موازنہ کرنے کے بعد "مومن" تنہا وہ شاعر ہیں کہ ان کی غزلوں کا موازنہ "برج بھاشا" کے تغزل سے کیا جا سکتا ہے تاکہ "مومن" کے کمال کی قدر ایسی زبان کے مقابلے میں کی جا سکے جس کا مقابلہ مغرب کی کوئی زبان نہیں کر سکتی۔

## بھاشا کا تغزل اور مومن کی غزل

بہاری کہتا ہے۔

پوس ماس سنی سکھن پے سائیں چلت سواد          گہی کر بین پردیں تحیا رد پیو راگ ملاد

ترجمہ:- پوس کے مہینہ میں سکھیوں سے یہ بات سُن کر کہ پیارے علی الصباح پردیس کو جائیں گے اس چالاک عورت نے بین لیکر ملاد کی راگ الاپی (ملاد کی راگ سے پانی برستا ہے) مطلب یہ ہے کہ معشوق سفر کو نہ جاسکے۔

بہاری کا دوسرا شعر:- ؎

مانجو بدہی تنواچھہ سوچھ راکھتے کاج          درگ پگ پوچھن کو کئے بھوشن پا انداج

ترجمہ:- جسم کی خوبصورتی قائم رکھنے کے لئے خدا نے پائے نگاہ کے صاف کرنے کو زیور پا انداز بنایا

چھوی نہ ششوتا کی جھلک جھلکیو یوبن رنگ          دیپتی دیہ دوہون ملی دیپتی تاپتا رنگ

ترجمہ:- لڑکپن کی جھلک نہیں گئی تھی کہ جسم پر جوانی کا رنگ چڑھ گیا' دونوں کے ملنے سے جسم تانبہ کی طرح چمکنے لگا۔

میرن کہتا ہے:- ؎

تم بن اے نی کون کرے کرپا مو پر ناتھ          موہن اکیلی جان کے دُکھ کر دینو ساتھ

خسرو کہتا ہے:- ؎

خسرو اپنا سوہاگ کی جاگی پی کے بھنگ          من مورے من پیؐو کو دوؤ بھئے اک رنگ

ترجمہ:- اے خسرو میں نے شبِ وصال معشوق کے ساتھ جاگ کر بسر کی میرا جسم اور اس کی روح دونوں مل کر ایک چیز بن گئی تھی۔

ستی رام:- ؎

چلت لال کے ہیں کیو سجنی ہیو پشان          کاہ کہوں در کت نہیں آئے دیوگ کرشان

ترجمہ:- معشوق کی جدائی کے وقت میں نے اپنا کلیجہ پتھر کا بنالیا کیا کہوں کہ وہ آتشِ فراق سے پھٹ کیوں نہیں جاتا

ایک اور شاعر کہتا ہے:- ؎

تارے گنت گنت ہوں ہاری          ٹپکن لاگے نین ؎

ترجمہ:- تارے گنتے گنتے میں ہار گئی، آنکھیں ٹپکنے لگیں۔

مومن

وقتِ وداع بے سبب آزردہ کیوں کیا          یوں بھی تو ہجر میں مجھے رنج و عذاب تھا

کاٹے لینے دو گلا تم شوق سے گھر جائیو          ایک رقصِ نیم بسمل کا تماشا دیکھ کر،

وقتِ وداع آہ گلا کاٹ رہے تھے،          کیا کھینچتے دامن کو ترے کام میں تھا ہاتھ،

ہندی شعر میں پانی برسانے کی فکر کی جارہی ہے تاکہ معشوق سفر سے باز آجائے

آپ کو قابو میں لانے کی کوشش ہے لیکن معشوق پر کچھ زور نہیں چلتا۔

اُردو کے تینوں شعر دیکھئے کہ "سفر" کا اثر ہے اور معشوق کو سفر سے باز رکھنے کے لئے کیسی کیسی جانبازی دکھائی جارہی ہے۔

اک نگاہِ سرسری دیوانہ ہمکو کر گئی          گردشِ چشمِ پری رو ساحرِ بنگالہ تھا

ہندی شعر میں معشوق کے تن کی نزاکت بیان کرنے کے بعد خاموشی ہے' اُردو میں صرف آنکھوں کی حقیقت بیان کی ہے اور یہ دکھایا ہے کہ اس کا اثر دل پر کیا ہوتا ہے۔ دونوں کا فرق ظاہر ہے۔

خواب میں کیا خوش ہو یوسف کو زلیخا دیکھ کر          کھل گئیں آنکھیں تجھے "اے جلوہ آرا" دیکھ کر

جو نقاب اُٹھی مری آنکھوں پہ پردا پڑ گیا    کچھ نہ سوجھا عالم اس پردہ نشیں کا دیکھ کر

ہندی اور اُردو مذاق کا فرق ظاہر ہے "مومن" نے اپنے دونوں شعر کہاں سے کہاں پہونچا دیئے ہیں۔

درد ہے جاں کے عوض ہر رگ وپے میں ساری    چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا،

ہندی شعر کا مطلب یہ ہے کہ میں تنہا نہیں ہوں بلکہ دکھ بھی ساتھ ہے' اُردو شعر کا مضمون کیا دلنشین اور کس قدر بلند ہے۔

بے خود تھے غش تھے محو تھے دنیا کا غم نہ تھا    جینا وصال میں بھی تو مرنے سے کم نہ تھا

دونوں کا رنگ جُدا ہے۔ حضرت امیر خسروؒ نے وصال کی جو کیفیت بیان کی ہے، مومن نے اس میں ایسی بات پیدا کی ہے جس کا جواب دنیائے شاعری میں نہیں۔

وہ چلا، جان چلی دونوں یہاں سے کس کے    اُس کو تھاموں کہ اسے پاؤں پڑوں کس کس کے

ان نصیبوں پر کیا اختر شناس    آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا

دوسرا شعر دیکھئے۔

تارے کے بدلے گن کے شب تار کاٹ دی    ایام ہجر میں مرے کیا کام آئے داغ

**شکسپیر اور مومن**

ہندی سے موازنہ کے بعد فخر یورپ شکسپیر سے موازنہ کر کے دیکھنا چاہیئے کہ "مومن" نے ان مضامین کو کیونکر بیان کیا ہے جن مضامین کو شکسپیر نے ادا کیا ہے اور یورپ اس کو معجزہ سمجھتا ہے۔

شکسپیر

But, Soft! what light through yonder window breaks
It is the East, and Juliet is the sun.
Arise, fair Sun & Kill the envious moon
who is already sick and Pale with grief

(2) with loves light wings did I O'er Perch these walls
for stoney limits can not hold love out

(3) O! Swear not by the moon, the inconstant moon
that monthly changes in her circled orb.

یہ اشعار رومیو جولیٹ کے بہت مشہور ڈرامے کے ہیں پہلے اشعار میں یہ دیکھنا چاہیئے کہ رومیو جولیٹ سے ملنے گیا ہے۔ جولیٹ دریچے سے نظارہ فردوشی کر رہی ہے' رومیو اس منظر کو اپنے الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ یہ دریچہ مشرق ہے اور جولیٹ آفتاب' آفتاب مشرق سے نکلا ہے۔ اس اُجالی رات میں ماہتاب کی روشنی جو زرد معلوم ہوتی ہے وہ حسد سے کیونکہ آفتاب (یعنی جولیٹ) سے حسد کر رہا ہے۔

اے خوبصورت آفتاب' حاسد ماہتاب کو (اپنے غمزے سے) قتل کر ڈال"

اس کے مقابلے میں دیکھئے "مومن" کیا کہتا ہے:-

مومن    دیدۂ حیراں نے تماشا کیا    دیر تلک وہ مجھے دیکھا کیا

"مومن" کہتا ہے کہ میں جو معشوق کا نظارہ کر کے حیران رہ گیا تو گویا میری آنکھوں نے مجھ کو تماشا بنا دیا، اس تماشے کو معشوق دیر تک دیکھتا رہا۔ عاشق کا تماشا بننا اور معشوق کا دیکھنا حسن و عشق کا کیسا انوکھا اور دلچسپ بیان ہے۔

شکسپیر　رومیو دیوار پھاند کر جولیٹ تک پہونچا ہے وہ تعجب سے پوچھتی ہے تم کیسے آئے درمیان میں پتھر کی دیواریں حائل تھیں، وہ کہتا ہے کہ محبت کے ہلکے پھلکے بازو پتھر کی دیواروں کی پروا نہیں کرتے (انہوں نے اُڑا کر پہونچا دیا ہے)

مومن　تھی نوحہ زنی دل کے جانے پہ ضروری　　شاید کہ وہ گھبرا کے سرِ بام نکلتا

مومن معشوق کو خود بام تک بلاتا ہے لیکن کس طرح کہ باوجود ناز معشوقانہ آنا ضروری ہو۔

شکسپیر　جولیٹ، رومیو سے پیمانِ محبت لینے پر قسم کھلاتی ہے وہ چاند کی قسم کھاتا ہے، جولیٹ کہتی ہے "چاند تو ہر مہینے میں بدل جاتا ہے کہیں تم بھی نہ بدل جاؤ"

مومن　سچ ہے سچا آپ کا پیماں ولے　　مرگ نے کب وعدۂ فردا کیا

"مومن" کا معشوق عہد کرتا ہے کہ وہ کل پھر آئے گا، عاشق کہتا ہے آپ کا وعدہ سچا سہی لیکن اس درمیان میں اگر موت آگئی تو وہ وعدۂ فردا کرنے سے رہی۔

دوسرے یہ کہ معشوق کا جانا ہی موت ہے، موت کل کا وعدہ نہیں کرتی۔

ان دونوں شعروں کا لطف اور ان میں فرق اربابِ ذوق سمجھ سکتے ہیں "مومن" نے اپنے الفاظ کی جادو نگاری سے مضمون کو جادو بنا دیا ہے

۱۔ "الفاظ" کے اہتمام میں اور ان کی ترکیب و ترتیب میں ایسا کمال دکھایا ہے کہ جو لفظ جس جگہ، جس طرح، جس مفہوم کے ادا کرنے کے لئے رکھ دیا ہے۔ اس کے سوا دوسرا لفظ لانا اساتذۂ فن کے لئے بھی دشوار ہے۔

۲۔ "مومن" کا یہ کمال دیکھئے کہ ان کی جدت پسندی نے غزل، قصیدہ مثنوی۔ واسوخت کے لئے حتی الوسع الفاظ بھی علٰحدہ کر دیئے ہیں۔

۳۔ جس طرح شکسپیر نے اپنے لئے ڈرامے کا میدان علٰحدہ کیا ہے، "مومن" نے غزل کی اقلیم اپنے لئے درست کر لیا ہے، جس میں وہ مالک تخت و تاج ہیں، اس میں اس کا اضافہ کر لیجئے کہ انہوں نے قواعد مقررہ کو پامال نہیں کیا ہے۔

۴۔ تمام دیوان عشقِ حلال کا مرقع ہے یعنی وہ تمام شاعروں کی طرح امرد پرستی نہیں کرتے بلکہ ان کا عشق خود پاک اور تصوف کے پاک دامن سے چھنا ہوا ہے۔

امرد پرستی کے جذبات نے بڑے بڑے متقی اور متورع شعراء کا دامن بھی داغدار بنا دیا ہے۔ مثلاً میر صاحب کہتے ہیں:۔

ستم ہیں قہر ہیں لونڈے شراب خانے کے　　اُتار لیتے ہیں عمامہ ہر نمازی کا،

اس شعر میں لونڈے کے لفظ نے سخت تنغص پیدا کر دیا ہے۔ دوسرا شعر اس سے مہذب دیکھئے:۔

خط مُنہ پہ آئے جاناں خوبی پہ جان دیگا　　ناچار عاشقوں کو رخصت کے پان دیگا

دوسرے دور میں مصحفی کو دیکھئے:۔

مان کہنے کو مرے امرد پرستوں سے نہ مل　　صاف چہرے پر ترے خط کا ابھی آغاز ہے

تیسرے دور میں آتش بھی اس میں مبتلا ہیں:۔

سبزے سے خطِ یار کے ہوتا ہے غم غلط　　کیونکر کہیں نوشتۂ قسمت کو ہم غلط

مومن کے معاصر ذوق بھی اسی رنگ میں کہتے ہیں:۔

ذوق ہے ایک رندِ شاہد باز　　دخل کیا اس کو پارسائی میں

اگرچہ اردو شعراء نے اس مضمون میں فارسی کی تقلید کی ہے لیکن "مومن" نے اس کو محسوس کر کے اپنی راہ الگ بنائی جو محفوظ بھی ہے

اور خوشنما بھی مومن نے نہ تو امرد پرستی کی ہے اور نہ کھلم کھلا "لیلےٰ" "عذرا" "سلمیٰ" کو معشوق بنایا ہے بلکہ اپنے رازِ عشق کو معشوق پردہ نشین کے حوالے کر دیا ہے، وہ اپنی غزلوں میں لفظاً جابجا اس کا ذکر کرتے ہیں اور معناً اس کی مناسبت سے لطیف مضامین پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں:۔

ہجر پردہ نشیں میں مرتے ہیں زندگی پردہ در نہ ہو جائے

اہل ذوق سمجھ سکتے ہیں کہ مومن نے اس بدعت سے کتنی دلنشیں ایجاد کی ہے دیوان کے اکثر غزلوں میں اس رعایت کے لطیف اور بلیغ اشعار موجود ہیں۔

۵۔ مومن نے غزل میں خمریات کے مضامین کم رکھے ہیں جسقدر ہیں ان میں بھی مومن بہکے نہیں ہیں یہی وجہ ہے کہ اکثر نقادوں کو دھوکا ہوا ہے کہ مومن کے یہاں تصوف نہیں اس کا ذکر آگے آتا ہے۔ اس کی وجہ مومن کی غیر معمولی متانت اور غیرت ہے۔

۶۔ رندانہ مضامین میں وہ کبھی جادۂ شریعت سے بے لگام آگے نہیں بڑھے۔ مصحفی کا ایک شعر ہے:۔

یارب کبھی وہ دن ہو کہ خلوت میں وہ صنم کھلوائے اپنے بند قبا میرے ہاتھ سے

خدا سے اس قسم کی دعا اور تمنا کرنا بالکل اس کے مشابہ ہے کہ کوئی کہے "خدایا آج میری چوری کامیاب کرنا" یا جوئے میں پانسہ میرے ہی موافق پڑے۔

اس قسم کی دعائیں اور تمنائیں ترکِ ادب میں داخل ہیں۔

۷۔ مومن کے خمیر میں عشق کا سوز و گداز کوٹ کوٹ کر بھرا ہے اس پر تصوف کی حلقہ بگوشی نے آگ بنا دیا ہے، لیکن اس آگ میں خود ہمیشہ جلے مگر دوسروں کو اس کی گرمی سے بھی محفوظ رکھا ہے۔ وہ شرابِ عشق کے متوالے ہیں پیتے ہیں مگر بہکتے نہیں۔

۸۔ ان کی غزلوں میں ضمنی طور پر علوم طبیعات و فلسفہ، حکمت، طب، نجوم، جفر و رمل موجود ہیں، لیکن اس طرح کہ وہ بھی جذبات غزل میں گم ہیں علیحدہ معلوم نہیں ہوتے جیسا کہ مثال میں دکھایا گیا ہے، آیندہ ایک موقع اس کے اظہار کا اور آتا ہے۔

اکثر ارباب نظر کو دھوکہ ہوا ہے وہ سمجھتے ہیں کہ مومن کے کلام میں یہ علوم نہیں۔

۹۔ مومن نے اپنی غزلوں کیلئے مناسب بحریں اور موزوں ردیف اور قافیے تجویز کئے ہیں، اس مناسبت اور موزونی میں ترنم، نغمات، موسیقی کو بہت کچھ دخل ہے۔

۱۰۔ بعض فارسی مضامین اگر لئے ہیں تو اس طرح کہ اردو میں وہ آکر گم ہو گئے ہیں اگر مالک زبان (فارسی کا شعر) تلاش کرنا چاہے تو اس کو بھی دستیاب نہیں ہو سکتے۔

۱۱۔ لہجہ اور طرز ادا میں بیساختگی عاشقانہ عجز، اس طرح پیدا کرتے ہیں کہ سنگ دل معشوق موم ہو جائے۔

۱۲۔ نامرادی۔ یاس۔ حسرت۔ بیکسی سے دنیاوی زندگی سے اس طرح بیزاری دکھاتے ہیں کہ دنیا سے نفرت ہو جاتی ہے۔

۱۳۔ اخلاقی مضامین کے بیان میں تغزل سے مناسبت کو پوری طرح سے سمجھ لیتے ہیں تاکہ ان کے گلدستہ میں کوئی نامناسب اور اجنبی کانٹا نہ شریک ہو جائے۔

۱۴۔ غزلوں میں اشعار کی تعداد ناگوار زیادہ نہیں ہوتی حتی الوسع منتخب کہتے ہیں۔

۱۵۔ مضامین کو اس طرح ادا کرتے ہیں کہ "مسلمات" کو سمجھنے والے کی سمجھ پر چھوڑ دیتے ہیں ضروری ٹکڑوں کا اظہار اس طرح کرتے ہیں کہ شعر نہایت بلیغ ہو جاتا ہے، مثلاً:۔

تھی نوحہ زنی دل کے جنازے پہ ضروری شاید کہ وہ گھبرا کے سرِ بام نکلتا،

اس شعر میں دل کا جنازہ کہا جنازہ کہنے سے مرنا خود بخود سمجھ میں آگیا۔ تلمیحاتِ بعیدہ بھی ان کا شیوہ ہے لیکن اس طرح نہیں کہ نامناسب ہو یا سمجھ میں نہ آئے۔

۱۶۔ معانی اور بیان، فصاحت اور بلاغت کی اکثر مثالیں ان کے اشعار میں اس طرح موجود ہیں کہ ان سے ایک رسالہ ان علوم پر طیار ہو سکتا ہے۔

۱۷۔ کوئی مسئلہ اخلاقی یا علمی تغزل سے علٰحدہ ہو کر بیان نہیں کرتے۔

۱۸۔ کسی شعر میں کوئی لفظ بھی اس خیال سے غافل اور بے پروا ہو کر نہیں لاتے کہ اس کا تعلق تمام تر شعر سے نہ ہو۔ ان کے اشعار میں الفاظ کی حالت زنجیر کی کڑیوں کی ہے کہ ایک کڑی کی جنبش سے تمام زنجیر جنبش میں آجاتی ہے۔

۱۹۔ مومن نے ضرورتِ شعری کو اپنے دیوان میں آنے نہیں دیا ہے معمولی بات بھی ایسے انداز سے بیان کرتے ہیں کہ غیر معمولی ہو جاتی ہے۔

۲۰۔ مضمون کی تلاش میں ایسا ڈوبتے ہیں کہ دیکھنے والوں کی نظریں حیران ہو جاتی ہیں۔

۲۱۔ ایسی ہجو ان کے شعر میں ایک گناہ کبیرہ ہے جس سے انتقام یا حصول زر مقصود ہو اس کے قریب نہیں جاتے۔

۲۲۔ اپنی خصوصیات میں وہ کسی کے مقلد نہیں بلکہ "امام" اور مجتہد ہیں۔

## اعتراضات اور اس کا جواب

باوجود اس کے مومن انسان ہیں، جس طرح خطا اور نسیان انسان کا شعار ہے مومن نے بھی غلطیاں کی ہونگی، لیکن جو غلطیاں ان کی طرف منسوب کی جاتی ہیں در اصل غلطیاں نہیں بلکہ اعتراض کرنے والوں کی بھول یا زبردستی ہے۔

ذیل کے اعتراضات اور جواب سے حقیقت معلوم ہو جائے گی۔

(۱) خیالات کی پیچیدگی۔ (۲) اس کی مثال میں ذیل کے اشعار پیش کیے جاتے ہیں:۔

دیکھ اپنا حالِ زار، منجم ہوا رقیب — تھا سازگار طالعِ ناساز دیکھنا،
ان سے پری وش کو نہ دیکھے کوئی — مجھ کو مری شرم نے رسوا کیا
تاثیر بیقراریِ ناکام آفریں — ہے کام ان سے شوخ شمائل کو تھامنا

یہاں تک تو چنداں مضائقہ نہ تھا، حالانکہ اس کا متناہی جواب دیا جا چکا ہے لیکن حسب ذیل اشعار بھی اس مد میں شمار کیے گئے ہیں:۔

ذکر اغیار سے ہوا معلوم — حرفِ ناصح برا نہیں ہوتا
دفن جب خاک میں ہم سوختہ ساماں ہونگے — فلس ماہی کے گلِ شمع شبستاں ہونگے
لیا ہے دل کے عوض جان دے رقیب تو دوں — میں اور آپ کی سوداگری زیاں کے لئے

یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان اشعار کے کون اجزا سمجھ میں نہیں آتے اور ان کے سمجھنے میں کیا اشکال ہے۔ پھر اشکال اور اغلاق کا معیار کیا رہا ہے، اگر اس کا نام اشکال اور اغلاق ہے تو غالب کے ان اشعار کے متعلق کیا کہا جائے گا۔

ودیعت خانۂ بیداد کاوش ہائے مژگاں ہوں — نگینِ نامِ شاہد ہے مرا ہر قطرہ خوں تن میں
گلشنِ آباد دل مجروح میں ہو جائے ہے — غنچۂ پیکانِ شاخ ناوکِ صیاد گل
حریفِ مطلب مشکل نہیں فسونِ نیاز — دعا قبول ہو یارب کہ عمرِ خضر دراز

مجنون فسوں شعلہ خرامی فسانہ ہے ہے شمع جادہ داغ نیفرد ختن ہنوز

یہ اشعار دیوانِ غالب نسخہ حمیدیہ مطبوعہ مفید عالم پریس آگرہ سے لیے گئے' ذوق کے ایسے سلاست پسند کے کلام میں بھی اس قسم کی مثالیں موجود ہیں۔

طاس قلیاں میں رکھا ہی اس نے ابر مردہ کو ڈوب مررو رد کے توا ے ابریسمیں ہیں
بے بادہ غورگی میں ہوئی ذوق جوں مویز کی توبہ بے وقوف نے ناحق شباب میں
مَیں ہوں وہ نخچیر جسکو دیکھتا ہے وقت ذبح دیدۂ حسرت سے حلقہ جوہر سا طور کا

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت فارسی دانی کے غلبہ اور رواج کی وجہ سے ظہوری۔ انوری۔ خاقانی کے رنگ میں کہنا کمال سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ غالب نے اس کا تتبع یہاں تک کیا کہ بعض اشعار ایسی زبان اور ایسی ترکیب میں ادا ہوئے ہیں کہ اب تک یہ طے نہ ہو سکا کہ ان کی زبان اُردو ہے یا فارسی؟ اور شاعر کا مقصد کیا ہے؟ الفاظ سے یہ مقصد حاصل بھی ہوتا ہے یا نہیں جو منشائے بیان ہے

(۲) زبان کی ناہمواری کا الزام لگا کر یہ اشعار پیش کیئے جاتے ہیں:-

بے حجابی کا گلہ کیجئے تو کہتا ہے ترے پردۂ چشم کی تقصیر کہ حائل نہ ہوا
ہاں جوشِ طپش چھیڑ چلی جائے کہ پھر تو جھڑ جائیں گے فرمودہ اگر دام نہ ہوگا

مومن کا یہ اندازِ بیان اگر قابلِ اعتراض ہے تو میر ذوق اور غالب پر کیوں مہربانی کی گئی ہے حالانکہ وہ لوگ اس رفتار میں کئی قدم آگے ہیں۔

میر ہوتا تھا مجلس آرا اگر غیر کا بجھے تو مانند شمع مجھ کو کاہے کے تئیں جلایا
غالب میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یاد آیا
" مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں شایانِ دست و بازوے قاتل نہیں رہا
ذوق سرد مہری اسے فلک ڈال نہ ہالا کہ بن آگ نخل سرمازدہ کی طرح سے جل جاؤنگا
کیا لیچلے گلی سے تری ہم کہ جوں نسیم آئے تھے سر پہ خاک اُڑا سے چلے گئے

اس قسم کے اشعار ان شعراء کے کلام میں بکثرت موجود ہیں' ان کے علاوہ سودا' آتش اور مصحفی کے کلام میں بھی یہ مثالیں بکثرت ملیں گی' داغ نے بھی اس سے احتراز نہیں کیا ہے۔ مثلاً

تیرے بیمارِ محبت اب تو قابلِ غور ہوئے جاتے ہیں

حقیقت یہ ہے کہ اس دور تک یہ انداز معیوب نہ تھا ورنہ مومن یا ان معاصرین کبھی گوارا نہ کرتے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ اصولی طور پر تو مذموم ہے اور نہ غلط ہے' البتہ اس کا ترک بہتر ہے۔

(۳) "مومن" نے مضاف الیہ کے نون آخر کا اعلان کیا۔ مثلاً

یہ دیکھ لو مجھے کہ طاقتِ بیان نہیں

اس کا اظہار بھی ابتدائے دور سے اس وقت تک معیوب نہ تھا' اس دور کے بعد بھی اس کا اظہار کیا گیا ہے۔
میر کے ایسے محقق اور اہل زبان' مسلّم الثبوت اُستاد نے اس طرح کہا ہے:-

خوبرو سب کی جان ہوتے ہیں آرزوے جہان ہوتے ہیں
غمزۂ چشم خوش قدانِ زمین' فتنۂ آسمان ہوتے ہیں'

مصحفی نے لکھا ہے :-

دشوار ہے اپنے کو پیمبر کے پہونچنا　　ہے موسیٰ عمران بھی یاروں مرے آگے

میر دوسری جگہ لکھتے ہیں :-

غنچہ ہے وہ دہاں ہے گویا　　ہونٹھ پر رنگ پان ہے گویا

میر حسن لکھتے ہیں :-

درد فراق، زخم جگر داغ دل حسن　　کیا کیا نہ وہ ہمیں گل خنداں دے چکا

غالب نے لکھا ہے :-

مشکیں لباس کعبہ علی کے قدم سے جان　　ناف زمین ہے نہ کہ نافِ غزال ہے

مصحفی کے شاگرد مسرور نے لکھا ہے :-

بدنام تو ہوا ہیں وہ کہتے ہیں دیکھئے ،　　کیا کچھ کرے گا دیدۂ گریان آپ کا

(۴) "مومن نے شمر کو حرکت میم کے ساتھ نظم کیا"

یہ اعتراض بھی غلط ہے اصل لفظ شمِر میم کے کسرہ کے ساتھ ہے (دیکھئے اقرب الموارد وقاموس وغیرہ) شمر خود غلط ہے۔ شمر اسم ہوا ابن افریقش بادشاہ یمن کا، اس نے شمر نبقد فتح کر کے اس میں قلعہ وغیرہ بنا یا اس لئے شمر کند یعنی اس کو بنایا کہا گیا۔ آخر میں وہ سمرقند ہوگیا۔

مومن نے اس لفظ کو عوام کے خلاف صحیح استعمال کیا

(۵) "مومن نے حسب ذیل ردیفیں بیکار رکھی ہیں :-

مجھ پہ طوفان اٹھائے لوگوں نے　　مفت بیٹھے بٹھائے لوگوں نے

اس میں "لوگوں نے" بیکار ہے۔

یہ اعتراض بھی بالکل پوچ ہے کیونکہ "لوگوں نے" فاعل ہی فعل معروف میں جملہ بغیر فاعل کے پورا نہیں ہوتا اس لئے اس کا ذکر ضروری تھا۔ اس کے علاوہ اور جو اعتراضات ہیں وہ قابل التفات نہیں البتہ ان میں ایک اعتراض قابل لحاظ اور لائق جواب ہے۔

(۶) "مومن نے تلمیح بعید سے کام لیا ہے مثلاً :-

جلتا ہوں اہل ناز کی تبدیل جلد سے　　مومن غضب ہے آتش لذت فزائے داغ

تیشہ کچھ دشنۂ شیریں نہیں اے غیرت　　اپنے ہی خون سے گر دامن فرہاد بھرے

جس زمانے میں "مومن" نے یہ شعر کہے ہیں "مسلمان" اپنے مذہب اور اس کی روایات سے بالعموم واقف ہوتے تھے اس لئے "اہل ناز" اور "تبدیل جلد کے الفاظ کے ذکر سے بدنصاہم جلو داغہا" کی طرف ذہن کا فوراً منتقل ہو جانا متعین تھا، اب اگر کسی کا ذہن منتقل نہ ہو تو "مومن" پر کچھ اعتراض نہیں ہو سکتا۔ کبھی آگے چل کر معتقدات مذہب لوگ بھول جائیں تو اس وقت کے اشعار جن میں اشارے موجود ہیں قابل اعتراض نہیں ہو سکتے۔

دوسرے شعر کا واقعہ بھی عام طور پر مشہور تھا اور مشہور ہے اس لئے اس کو بھی تلمیح بعید نہیں کہہ سکتے۔ تعجب ہے کہ اس شعر میں تو تلمیح بعید ہے اور غالب کے اس شعر میں نہیں۔

کاوِ کاوِ سخت جانیہائے تنہائی نہ پوچھ     شام کرنا صبح کو لانا ہے جوئے شیر کا

یا اس شعر میں :-

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا     کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

(۷) قصیدوں میں "مومن" نے الفاظ و محاورات علمیہ استعمال کیے ہیں تو ان کے کمال کی دلیل ہے، اعتراض کی صورت نہیں۔ انوری، خاقانی کے قصائد دیکھئے ان میں علوم عقلیۂ نقلیہ کے پیچیدہ مسائل موجود ہیں، اور یہ چیزوں کی قابلیت اور سعادت کی دلیل سمجھی جاتی تھی، یہ بھی معلوم ہے کہ مسائل علمیہ، محاورات و الفاظ علمیہ کے ذریعہ سے بیان کیے جاتے ہیں، اس کا ذکر آچکا ہے۔

(۸) غالب نے کہا ہے :-

کل کے لئے کر آج نہ خسّت شراب میں     یہ سوئے ظن ہے ساقیٔ کوثر کے باب میں

اس شعر سے یہ حدیث کون شخص سمجھ سکتا ہے "من شرب الخمر فی الدنیا لم یطعمھا فی الاخرۃ" جو دنیا میں شراب پیئے گا وہ عاقبت میں شراب طہور سے محروم رہیگا۔

شارحین غالب میں سے کس کس نے اس حدیث کو اس شعر سے سمجھا ہے؟ دوسرے یہ کہ اس شعر کا مخاطب غائب اور مجہول ہے لہٰذا شعر کامل نہیں کہا جاتا ہے کہ "مومن" کا دیوان بیان تصوف۔ فلسفہ۔ اخلاق سے خالی ہے سب سے پہلے مومن کے اشعار کو تصوف کے نقطۂ خیال سے جانچنا چاہیئے۔

## تصوف اور مومن

تصوف کے معنی اگر صرف خمریات کے ہیں (جیسا کہ آجکل عام طور پر سمجھا جاتا ہے) تو معترضین کا خیال بالکل صحیح ہے۔ لیکن تصوف کے معنی ان اصطلاحات علمیہ اور جذبات سوز و گداز کا نام ہے جن سے تصوف مرکب ہے تو "مومن" کے کلام میں ان کا وجود شروع سے آخر تک ہے۔

تصوف "عشق حقیقی" کے اظہار کا فن ہے، عشق حقیقی عشق مجازی کا پرتو ہے۔

عشق مجازی بیشتر اعمال روبہ کی طرف لیجاتا ہے تصوف نے اس پر حقیقت کا رنگ چڑھا کر اخلاق کو سنوارا ہے۔

شاعری کے اعتبار سے "جذبات حسن و عشق" مجازی اور حقیقی دونوں میں مشترک ہیں مثلاً

۱۔ عشق مجازی میں "ایک ہی معشوق کے حسن و جمال پر جان و مال قربان کرنا چاہیئے یا ایک ہی محبوب اور معشوق کی صورت عاشق صادق کو ہر جگہ نظر آتی ہے، سوا معشوق کے عاشق کسی کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔

عشق حقیقی میں اس کو وحدت وجود "ہمہ اوست" سے ظاہر کرتے ہیں۔

مومن نے اس مسئلہ کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

چارۂ دل سوائے صبر نہیں،     سو تمہارے سوا نہیں ہوتا

دوسرا شعر اسی مضمون کا ہے :-

عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن     آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہونگے

تصوف میں ایک درجہ فنا کا ہوتا ہے جس میں آکر صوفی ہر چیز کو بھول جاتا ہے "مومن" اس مسئلہ کو ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں۔

نشۂ اُلفت سے بھولے یار کو     سچ ہے ایسی بیخودی میں یاد کیا

تصوف میں "عشق و محبت" دوران خون کے ساتھ عاشق کی رگ رگ میں ساری ہوتے ہیں۔ "مومن" نے اسکو اس طرح

بیان کیا ہے:-

درد ہے جاں کے عوض ہر رگ و پے میں ساری ۔۔۔ چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا

صوفی جب فانی فی الشیخ ہو جاتا ہے تو گویا اس کو وصل یا وصال نصیب ہوتا ہے یہ درجہ ریاضت کے بعد ملتا ہے "مومن" نے اس مسئلہ کو یوں حل کیا ہے:-

فرماتے ہیں وصال ہے انجام کارِ عشق ۔۔۔ کیا ناصح شفیق نے مژدہ سُنا دیا

تصوف میں شیخ 'ساقی' شراب کیفِ محبت ہے 'میخانہ خانقاہ ہے کیفِ محبت کا لطف شیخ کے بغیر حاصل نہیں ہوتا 'مومن نے اس کو اس طرح بیان کیا ہے:-

مئے نہ اُتری گلے سے جو اس بن ۔۔۔ مجھ کو یاروں نے پارسا جانا،

حاصل یہ ہے کہ وہ تمام جذبات جو عشق مجازی میں ہوتے ہیں عشق حقیقی میں موجود ہیں 'اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُردو کا ہر شاعر جو فارسی کا متبع ہے اور جذباتِ عشق اور سوز و گداز رکھتا ہے 'اس کے اشعار غزل میں جذبات تصوف کا ہونا ضروری ہے "مومن" کا دیوان ان جذبات سے بھرا ہے تو 'تصوف' سے خالی کیونکر رہ سکتا ہے؟ صبر و رضا و تسلیم بھی تصوف کی ایک منزل ہے "مومن" نے اس کو اس طرح دکھایا ہے۔

شبِ ہجر میں کیا ہجومِ بلا ہے ۔۔۔ زباں تھک گئی مرحبا کہتے کہتے،

سب کے آخر میں یہ کہ حضرت امیر خسروؒ کا یہ شعر بھی اپنے اندر تصوف کا رنگ رکھتا ہے۔

گوری سوئے سیج پر مُکھ پر ڈالے کیس ۔۔۔ چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چوندیس

یہ شعر حضرت امیر خسروؒ نے اپنے پیر حضرت سلطان نظام الدین اولیاؒ کی وفات پر ان کے مزار کے سامنے کہا تھا۔

غرضکہ وصل و فراق 'حسن و عشق کے جذبات اور ان جذبات سے جو سوز و گداز پیدا ہوتا ہے وہ تصوف کا عکس ہے۔

**فلسفہ** | "تصوف" کے متعلق جو حال عام غلط فہمی کا ہے وہی فلسفہ کا بھی ہے "فلسفہ" کے معنیٰ آجکل اس مہمل شعر کے ہیں 'جس کی ترتیب نہایت پیچیدہ ہو یا تو بالکل سمجھ میں نہ آئے اگر آئے تو سمجھنے والا اس کے مفہوم سے مطمئن نہ ہو سکے۔ مومن کی غزلوں میں اس قسم کا فلسفہ نہیں ہے 'البتہ علوم حکمیہ طبیعیہ جو اہلی فلسفہ میں موجود ہیں ان کا ذکر آچکا ہے 'چند اشعار کا ذکر اس جگہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

مار ڈالا ہم کو جورِ گردشِ ایام نے ۔۔۔ بڑھ گئی رات اپنی روزِ حشر کی تقصیر سے

اس شعر میں علم ہیئت بیان کیا ہے۔

شوق کم ہونے سے اندوہ فزا ہوتا ہے ۔۔۔ ہائے پرہیز سے یہ درد سوا ہوتا ہے

طبیعیات کا ایک مسئلہ ہے۔

کر علاجِ جوشِ وحشت چارہ گر ۔۔۔ لادے اک جنگل مجھے بازار سے

حکمت کا مسئلہ ہے:-

اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک ۔۔۔ شعلہ سا چمک جائے ہے آواز تو دیکھو

موسیقی ہے 'یہ علم بھی علوم فلسفہ میں داخل ہے۔

**اخلاق** | دیوان "مومن" میں اس کا ذکر اور بیان بھی موجود ہے مثلاً

خودداری کی شکست پر اس طرح افسوس کرتے ہیں :۔

اس نقشِ پا کے سجدہ نے کیا کیا ذلیل　　　میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

نازک مزاجی :۔

بات کرنے میں رقیبوں سے ابھی ٹوٹ گیا　　　دل بھی شاید اسی بدعہد کا پیماں ہوگا

غیرت :۔　　　دیکھ لو شوقِ ناتمام مرا　　　غیر لیجائے ہے پیام میرا

اعترافِ گناہ :۔

دھو دیا اشکِ ندامت نے گناہوں کو مرے　　　تر ہوا دامن تو بارے پاک دامن ہوگیا

اس قسم کے اشعار کثرت سے موجود ہیں، البتہ ان کا تغزل سے علٰحدہ کرنا اور رواز کو سمجھنا صحیح تنقید ہے۔

اصنافِ سخن :۔

"مومن" نے اپنے غزل کی طرح اور اصنافِ سخن" کی بھی الگ راہ نکالی ہے۔

**قصیدہ** علم الادب اور معجم میں قصیدے کی حدود میں ہے کہ "مدح" کو شاندار الفاظ سے مرتب ہونا چاہئے، بازاری اور مبتذل الفاظ سے قصیدہ کا بچنا اولیں فرض ہے۔

ممدوح کی مدح میں ایسا مبالغہ نہ ہو کہ وہ "ذم" کی صورت اختیار کرے، ممدوح کی شان اور اپنی حقیقت کو پیشِ نظر رکھنا بھی قصیدہ گو کا فرض ہے۔ ممدوح اگر "بادشاہ" ہے تو اس کا درجہ کم نہ کرے اور نہ اسقدر بڑھادے کہ "پیغمبری" یا "خدائی" دیدے۔

قاضی یا امیر کی مدح کرے تو ان کو بادشاہ، کے برابر یا اس سے زیادہ نہ کہے۔

حدودِ شرعیہ و عقلیہ کا خیال رکھنا بھی قصیدہ گو کے ذمہ ہے۔

جن قصائد میں اس قسم کی پابندی نہیں ہوتی اس کے اشعار ممدوح اور مذموم ہوتے ہیں، قرآن حکیم اور احادیث کثیرہ میں اس قسم کے اشعار کی مذمت ہے "مومن" نے ان "خصوصیات" اور "حدود" کو بدرجۂ اتم پیشِ نظر رکھا ہے۔ راجہ چندولال کی تعریف میں "مومن" نے جو قصیدہ لکھا ہے اس کو اس نظر سے دیکھ لیجئے کہ الفاظ کا ثقل اور "ندرت" قدرت اور علم و فضل کی دلیل ہے کیونکہ "مومن" نے ان سے مسائل علمیہ کو بیان کیا ہے۔

**مثنوی** چونکہ مسلسل واقعات رطب و یابس کا بیان ہوتا ہے اس لئے واقعات کی تابع ہے۔ "مومن" پر جو لوگ یہ الزام رکھتے ہیں کہ "ان کی مثنویاں متانت سے گری ہوئی ہیں" ان لوگوں نے شاید حضرت جامی کی "مثنوی یوسف زلیخا" "امیر خسرو کی "مجنوں لیلیٰ" اور نظامی کی "لیلیٰ مجنوں" "شیریں خسرو" میں، شبِ زفاف اور شبِ وصال کے بیان نہیں دیکھے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ شاعر ایسے مواقع کے جذبات بیان کرنا اپنا کمال سمجھتا ہے، معانی و بیان کے ماہرین کا قول ہے کہ جو بیان حسن صورت واقعہ اور فطری جذبات کے مناسب ہوتا ہے، اسی قدر اثر انداز فطرت ہوتا ہے۔

"مقامات بدیع الزماں ہمدانی" میں خصوصیت کے ساتھ ایک "مقالہ" اسی بیان میں ہے۔ بڑے بڑے محتاط "شاعر" اس صنف میں آکر مجبور ہو جاتے ہیں "مومن" کی سادگی دیکھئے کہ وہ اپنے واقعات اور واردات اپنی زبان سے بے کم و کاست بیان کر دیتے ہیں" کوئی واقعہ کہیں اگر متانت سے گر جاتا ہے تو واقعہ کی نوعیت ہے شاعری کا کیا قصور ہے۔

**واسوخت** "مومن" نے اس صنف کو اپنے لئے مخصوص کر لیا ہے، ان کا اصل سوز و گداز، امنگ، جذبات عشق، کیفیاتِ حسن کا منکر

اس کے اندر ہے، جس شاعر میں یہ جذبات جسقدر زیادہ ہونگے اسی مناسبت سے واسوخت "سوز و گداز" کا مرقع ہوگا۔

**رباعیاں** "مومن" نے رباعیاں کم کہی ہیں، چونکہ رباعیاں واردات عشق و حسن کے بیان کی چیز نہیں اس لئے ان کے رنگ میں "مومن" کی جھلک نمایاں نہیں۔

**معمے اور تاریخیں** دونوں چیزیں "مومن" کی ذہانت اور طبّاعی کا خط و خال ہیں۔ "علوم ادبیہ" میں ان کا بھی خاص وزن ہے "مومن" کے معموں میں حضرت امیر خسروؒ کی "ذہانت" اور ہمہ گیری کا رنگ نظر آتا ہے۔

**مرثیہ** "محرک جذبات شاعری" "مومن" کی "محبوبہ دلنواز" کا انتقال ہوتا ہے اس کا مرثیہ "مومن" ایسا شاعر جیسا لکھ سکتا ہے "مومن" نے لکھ کر شاعری میں اضافۂ عظیم کیا ہے، اس کے چند شعر دیکھ لیجئے:۔

دل کی طرح سے یہ بھی چلی جان کو کیا ہوا — دم میں نہیں ہے دم مرے جاناں کو کیا ہوا
سر پیٹتا ہے شانہ پڑا دونوں ہاتھ سے — کیا جانے اس کی زلفِ پریشاں کو کیا ہوا
پیتی ہے اپنا خونِ دل افسوس سے حنا — اس دستِ رشکِ پنجۂ مرجاں کو کیا ہوا
دل میں شکن ہے زلفِ مسلسل کدھر گئی — برہم ہے حال کاکلِ پیچاں کو کیا ہوا
گردش پر اپنے ناز ہے پھر روزگار کو — اس چشمِ رشکِ فتنۂ دوراں کو کیا ہوا

خیال کیجئے کہ "محبوب" کا ماتم ان سے زیادہ موزوں اور دردانگیز الفاظ میں کیونکر ہو سکتا ہے۔ "مومن" نے "مرثیہ" کے لئے بھی نئی راہ نکالی ہے، اس کی مثال دنیائے شاعری میں مشکل سے ملے گی۔

**معاصرین** "مومن" اس معاملے میں بھی منفرد ہیں کہ ان کے معاصرین ایسی ہستیاں تھیں جن پر شاعری کو ناز ہے۔ ہمارے خیال میں "مومن" کے اس اہتمام کا سبب معاصرین تھے وہ سمجھتے تھے کہ جب تک شاعری میں کوئی خاص رنگ نہ ہوگا، ان کے سامنے فروغ پانا مشکل ہے۔ تذکرہ نویسوں نے ان کے نام حسب ذیل لئے ہیں:۔

غالب۔ ذوق۔ آزردہ۔ شیفتہ۔ صہبائی۔ عیش۔ عارف۔ درخشاں۔ علائی۔ سالک۔ بیتاب۔ حضور۔ برق میر صاحب۔ شور۔ آزاد۔ تائب۔ تسکین۔ نشتر۔ حزیں۔ شہرت۔ عزیز۔ رقم۔ تعشق۔ تابش۔ نمکین۔ عاشق۔ اوج۔ نازنیں۔ تصویر۔ قلق۔ کامل۔ تجلی۔ جوشش۔ یکتا۔ تنویر۔ جعفری۔ بسمل۔ بیدل۔ شوق۔ تسلی۔ نالاں۔ ماہر۔ جنون۔ اشکی۔ حشمت۔ ایجاد۔ رسا۔ رفعت۔ قناعت۔ حیا۔ ظہیر۔ صابر۔ داغ۔ احسان۔

یہ وہ معاصرین ہیں جو مومن کے ساتھ ایک مشاعرے میں شریک ہوتے تھے۔ جس کا ذکر فرحت اللہ بیگ صاحب نے اپنے مضمون میں کیا ہے۔

**تلامذہ** حسب ذیل تلامذہ کا ذکر امتیاز احمد صاحب نے اپنے مضمون "مومن کی اُردو شاعری" مندرجہ "نگار" جنوری ۱۹۲۸ء میں کیا ہے:۔

وحشت۔ مضطر۔ کرم۔ تسکین۔ یاس۔ اکبر۔ عظمت۔ شیفتہ۔ الہی۔ تلق۔ بیتاب۔ بیمار۔ تسکین۔ تہور۔ برق۔ راحت۔ راسخ۔ سالک۔ صاحب۔ ظہور۔ شورش۔ صفیر۔ قیصر۔ کاظم۔ تسنیم۔ وحشت۔

ان تلامذہ میں سلیم۔ شیفتہ۔ تسکین۔ اُستادانِ فن ہیں۔ ان پر "مومن" کو ناز تھا۔

**وفات** ہندوستان کے اس مایۂ ناز شاعر نے جو شاعری اور تغزل کا امام تھا ۵۱ برس کی عمر میں کوٹھے سے گر کر ۱۲۶۸ ہجری میں وفات پائی۔

۵ مہینے پہلے خود ہی تاریخ کہی تھی "دست و باز و بشکست" اس میں پورے ۱۲۶۸ھ نکلتے ہیں ۔ دلی دروازے کے باہر حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے مقبرے کے پاس دفن ہوئے۔

**جوہر کلام** یوں تو "مومن" علیہ الرحمۃ کا پورا دیوان ایسے نشتروں کا مجموعہ ہے جو رگ ہائے دل کو چھیڑ کر سراپا درد بنا دیتے ہیں لیکن ذیل کے اشعار وہ ہیں جو دنیا کی تمام زبانوں کے مقابلے میں ایشیائی شاعروں کے لئے فخر و مباہات کی دلیل بن سکتے ہیں۔ اور لعل و جواہر میں نہیں بلکہ ان سے زیادہ قیمتی چیز یعنی دل کے ٹکڑوں میں تولے جا سکتے ہیں۔

اس نقش پا کے سجدے نے کیا کیا ذلیل
میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

درد ہے جاں کے عوض ہر رگ و پے میں ساری
چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا

سچ ہی سہی آپ کا پیمان وصل
مرگ نے کب وعدۂ فردا کیا

نہ مانوں گا نصیحت پر نہ سنتا میں تو کیا کرتا
کہ ہر ہر بات پر ناصح تمہارا نام لیتا تھا

چارہ گر جنت میں اس کے آستاں سے لیگئے
ایک بھی میری نہ مانی لاکھ سر پٹکا کیا

خدنگ یار کے ہمراہ نکلی جان سینے سے
یہی ارمان اک مدت سے جی میں تھا نکل آیا

گور میں بھی جوشِ غم دل سے نہ نکلا ہائے ہائے
آپ ہی میں ہم نہیں جب کنج تنہائی بلا،

ضد سے وہ پھر رقیب کے گھر میں چلا گیا
اے رشک میری جان گئی تیرا کیا گیا

دمِ آخر بھی تم نہیں آئے
بندگی اب کہ میں چلا صاحب

اتنی فرصت دے ستمگر کہ پہونچ جائے اجل
دم کے دم اور بھی سینے سے مرے تیر نہ کھینچ

تارے کے بدلے گن کے شبِ تار کاٹ دی
ایام ہجر میں مرے کیا کام آئے داغ

سینے سے گھبرا کے آخر جان لب تک آگئی
حال پہنچا یاں تلک اور تم نہ آئے یاں تلک

دھواں اُٹھتا ہے دل سے وقتِ گریہ
بجھا دی تو نے کیا اے چشم تر آگ

عشق نے یہ کیا خراب ہمیں،
کہ ہے اپنے سے اجتناب ہمیں،

چھٹتا ہے جیتے جی کوئی زنجیر زلف سے
دیوانہ ہوں کہ چارۂ سودائے دل کروں

کیا شکوہ جفائے آسماں کا
میں آپ کو دور کھینچتا ہوں

توبہ گنہ عشق سے فرمائے ہے واعظ
یہ بھی کہیں دل دے کے گنہگار ہوا ہے

میں اگر آپ سے جاؤں تو قرار آجائے
پھر یہ ڈرتا ہوں کہ ایسا نہ ہو یار آجائے

داغ خوں سے میرے وہ حیران ہوئے
دامن الجھا ہے گلِ بے خار سے،

چھوٹ کر کہاں اسیرِ محبت کی زندگی
ناصح یہ بندِ غم نہیں قیدِ حیات ہے

میرے تغیرِ رنگ کو مت دیکھ،
تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے،

رقیب کھائے قسم تو وفا کا آئے یقیں
تو میری جان ہے کیا تیرا اعتبار صحیح

وہ آئے ہیں پشیماں لاش پر اب — تجھے اب زندگی لاؤں کہاں سے
یارو کسی صورت سے تو احوال بتا دو — دروازے پر اس کے میری تصویر لگا دو

## علم عروض اور مومن

عام طور پر جہلا میں مشہور ہے کہ "طبع موزوں را عروض و قافیہ درکار نیست" یہ مصرعہ ان لوگوں کے لئے باعثِ تسکین ہے جو فنِ شعر یا علم عروض سے واقف نہیں لیکن شاعری میں اُستادی کا دعویٰ کرتے ہیں ان کو شاید یہ معلوم نہیں کہ کسی چیز کا جہل اس کے عدم کو لازم نہیں کرتا۔ وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ آجکل بیشتر خرابیاں فنِ شعر و علم عروض میں نظر آتی ہیں۔ نئی نئی بحریں نئے نئے اسلوب تراشے جاتے ہیں، مسلمات سے اعراض اور روگردانی کی جاتی ہے۔ وہ "کفر مذہب شعر" اور "شرک فی ملت العروض" ہے، ایسے لوگ ٹھوکریں کھاتے ہیں ان کو پتہ نہیں چلتا" اپنی بد مذاقی کو مذاق اور جہل و نادانی کو مہارت سمجھتے ہیں وہ یہ نتیجہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اپنی بدعتوں سے، ملتِ شاعری کو برباد کر رہے ہیں، اس طرح رفتہ رفتہ زبان اور ادب تباہی اور بربادی کی طرف جا رہی ہے۔ "عوام" کا ذکر تو ایک طرف اس مرض میں اکثر خواص بھی مبتلا ہیں۔ بڑے بڑے مشہور اساتذہ ایک غزل کے متعدد اشعار مختلف بحروں میں کہہ جاتے ہیں اور ان کو اپنی اس غلطی کا احساس تک نہیں ہوتا۔

بعض سابق اساتذہ نے بھی جو علم اور فن سے بے بہرہ تھے فاش غلطیاں کی ہیں ان کے تفصیلی ذکر سے فتنے کا جگانا مقصود نہیں ہے۔

حکیم "مومن" کی ہمہ گیری فنِ شعر اور علم عروض سے بھی آشنہ کام نہیں رہی ہے، اس لئے حکیم صاحب نے اس میں بھی اُستادانہ احتیاط برتی ہے۔ ان کے مذاق کی صحت اور خداداد مناسبت و موزونیٔ طبع نے وہ بحریں غزلوں کے لئے استعمال کی ہیں جو نہایت شگفتہ، رواں اور لبریز ترنم ہیں۔ ان میں اکثر بحریں وہ بھی ہیں جو ہندی۔ اُردو۔ فارسی میں یکساں دلپذیر معلوم ہوتی ہیں۔

## تفصیلی بحور مفردہ

دو قسم کی بحریں عام طور پر مستعمل ہیں مفردؔ و مرکبؔ بحور مفردہ ہیں ۔ مومنؔ نے حسب ذیل بحروں میں داد مذاق دی ہے۔

بحر ہزج۔ اس کے ارکان "مفاعیلن، مفاعیلن، مفاعیلن، مفاعیلن" چار بار ایک مصرعہ میں اور آٹھ مرتبہ پورے شعر میں آتے ہیں۔

یہ بحر عربی آغانی میں بکثرت رائج ہے:۔

اسے خو پڑ گئی ہے بے طرح زانوئے جاناں کی — یہ سر تکیہ پہ ہمدم جس طرح رکھوں نہ ٹھہرے گا

اس غزل کے مصرعہ اول میں "زانوئے جان کی" میں ترتیب ترنم ہے۔

دوسرے مصرعہ میں الفاظ "رکھوں نہ ٹھہرے گا" میں ترنم اور اتار چڑھاؤ موجود ہے۔ یہ غزل ہندی راگ بھیرویں میں اصلی حالت کے ساتھ گائی جا سکتی ہے۔

اس بحر میں عروض و ضرب دونوں مسبغ بھی استعمال کئے جاتے ہیں۔ مثلاً:۔

فلک ظالم بری قسمت جہاں دشمن وہ بت بے درد — بتاؤ تو بھلا پھر کس سے جا کر میں کروں فریاد

---

گلیم فقر کو کیوں دوش پر ہم ڈالتے اے رندؔ — اگر کملی سے بہتر جانتے کم خوابِ پشمہ کو

رندؔ کے شعر کے پہلے مصرعہ میں تسبیغ ہے اور دوسرا سالم ہے۔

فن کے اعتبار سے یہ نقص نہیں لیکن احتیاط کی رو سے قادر الکلام شعرا اس سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مومن نے بھی اس سے گریز کی ہے۔ اس بحر میں اور بھی زحافات ہیں جو طبیعت کو پسندیدہ معلوم نہیں ہوتے۔ مومن نے اس سے کنارہ کشی کی ہے۔

یہ بحر اس طرح بھی مستعمل ہے۔ غالب نے کہا ہے:۔

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا     درد کی دوا پائی درد لا دوا پایا

مومن نے اس میں بھی طبع آزمائی کی ہے:۔

روز کا بگاڑ آخر جان پر بنا دے گا     ان کو شوق آرائش دل ہے بدگماں اپنا

اس کو شمس اختر کہتے ہیں۔

مومن نے یہ "زحاف" ترنم کی وجہ سے اختیار کیا ہے۔ اس کے ہر ٹکڑے میں زیر و بم موجود ہے۔ ہزج کی شگفتہ صورت مثمن اخرب مکفوف محذوف بھی ہے۔ مومن نے کہا ہے:۔

تھی نوحہ زنی دل کے جنازے پہ ضروری     شاید کہ وہ گھبرا کے سرِ بام نکلتا

ہزج مسدس مقصور الآخر میں میر ممنون کہتے ہیں:۔

نہیں دیتی دکھائی صورت زیست     غضب صورت ہوں آیا دیکھ کر آج

لفظ "زیست" اگرچہ مفاعیل کی تقطیع کی رو سے باعتبار فن درست ہے لیکن بادی النظر میں "ت" اور "ی" زائد معلوم ہوتے ہیں اور نظر کو دھوکا ہوتا ہے کہ دونوں حرف ساقط ہیں۔ مومن اس سے بچتے ہیں۔

ہزج مسدس اخرب مقبوض:۔

مومن:۔ کیا شکوہ جفائے آسماں کا     میں آپ کو دور کھینچتا ہوں

بحر رمل:۔ ارکان فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلاتن، ایک مصرعہ میں پورے شعر میں دوبار۔ یہ بحر اردو میں سالم مستعمل نہیں اس لئے یا تو محذوف آتی ہے یا مقصور مقطوع یا مشعث بالسبغ

مومن:۔ ایک نگاہِ سرسری دیوانہ ہم کو کر گئی     گردش چشم پر ساحر جنگامہ تھا

کہہ رہا ہے کون ہم سے بے شکیبائی بلا     مجھ کو قسمت سے نصیحت گر بھی سودائی ملا

رمل کی ایک صورت غالب نے یہ بھی جائز کی ہے۔

غم شبیر میں ہے سینہ یہاں تک لبریز     کہ رہیں خونِ جگر سے مری آنکھیں رنگیں

پہلے مصرعہ میں لبریز کی "ز" کی وہی شکل ہے جس کا ذکر ہزج میں آچکا ہے۔

رمل مثمن مجنون محذوف مسکن:۔

مومن:۔ اہل بازار محبت کا بھی کیا سودا ہے     عشرتِ عمر ابد قیمت غم دیتے ہیں،

رمل مسدس مقصور:۔

مومن:۔ نشۂ اُلفت میں بھولے یار کو     سچ ہے ایسی بیخودی میں یاد کیا

بحر رجز م مستفعلن، مستفعلن، مستفعلن، مستفعلن

مومن :- دن رات فکرِ جور میں یوں رنج اُٹھانا کب تلک　　میں بھی ذرا آرام لوں تم بھی ذرا آرام لو

مومن نے بالکل سالم استعمال کیا ہے۔

بحر وافر۔ اُردو میں مستعمل نہیں۔

بحر متقارب ۔ فعولن ، فعولن ، فعولن ، فعولن ،

اس بحر میں مومن نے مثنویاں زیادہ کہی ہیں کیونکہ یہ بحر مثنویوں کے لئے زیادہ موزوں ہے اور شعراء نے اس میں غزلیں بھی لکھی ہیں۔ یہ مومن کی حکمت اور دانائی ہے کہ اس نے بحور کو اصلی جگہ استعمال کیا ہے۔

اس بحر میں فعولن ہشت بار ایک مصرعہ میں آتا ہے۔ تیر نے استعمال کیا ہے۔ مومن نے غزل کے لئے اس کو مناسب نہیں سمجھا ہے۔ متقارب مثمن مقبوض اثلم۔ اس میں ترنم بھی ہے اور سلاست بھی۔ مومن نے اس کو لیا ہے۔

عدم میں رہتے تو شاد رہتے اسے بھی فکر و ستم نہ ہوتا　　جو ہم نہ ہوتے تو دل نہ ہوتا جو دل نہ ہوتا تو غم نہ ہوتا

اس وزن کو مولانا جامی نے سوّلہ ارکان سے مرکب کرکے جاری کیا ہے جو صرف غزل کے لئے مخصوص تھا۔ مومن نے اس کو اُردو میں لاکر ترنم کے ساتھ شگفتہ کر دیا ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ترنم ن اور م میں بھی ہے۔ ان کی ترتیب زیر و بم کے ساتھ مومن نے اکثر استعمال کی ہے۔ یہ علٰحدہ مسئلہ ہے اس لئے صرف اجمالی بیان کافی ہے۔

بحر مضارع ۔ مفاعیلن ، فاعلاتن ، مفاعیلن ، فاعلاتن

مضارع مثمن اخرب :-

مومن :- اللہ رے ناتوانی جب شدّتِ قلق میں　　بالیں سے سر اُٹھایا دیوار تک نہ پہونچا

اس میں عروض و ضرب مسبغ بھی آتا ہے یعنی فاعلاتن کی جگہ فاعلان - میر کہتے ہیں :-

رہتے بغیر تیرے اے رشک ماہ تا چند　　آنکھوں میں یوں ہمارے عالم سیاہ تا چند

ن - د اس میں زائد معلوم ہوتے ہیں - مومن نے اس سے احتراز کیا ہے

مضارع مثمن اخرب مکفوف محذوف۔

مومن :- سینہ پہ ہاتھ دھرتے ہی کچھ دم پہ بن گئی　　سو جان کا عذاب ہوا دل کا تھامنا

بحر مجتث ۔ مس تفع لن فاعلاتن مس تفع لن فاعلاتن

مجتث مثمن مخبون محذوف :-

مومن :- لگے خدنگ جب اس نالۂ سحر کا سا　　فلک کا حال نہ ہو کیا مرے جگر کا سا

بحر سریع ۔ مومن نے اس بحر کو بھی مثنوی کے لئے مخصوص کیا ہے

بحر خفیف۔ خفیف مسدس محذوف شکن :-

مومن :- غیر چھڑکے ہے زخم دل پر نمک　　اب کسی کا بھی آسرا نہ رہا

## عیوب عروض

عروض میں حسب ذیل عیوب ایسے ہیں جو شعر کو شعر رہنے نہیں دیتے بشرطیکہ فہم و ادراک میں نقص نہ ہو مومن نے سختی سے احتراز کیا ہے۔

۱- تخلیع ۔ نقلی ارکان اور ناپسندیدہ وزن سے مرکب شعر اسی تحت میں آتا ہے۔

۲- تجرید- اس بحر کے اشعار میں جب اختلاف ہو تو سخت عیب ہے اس کے لئے صحیح مذاق اور مہارت کی ضرورت ہے اکثر اساتذہ نے دھوکہ کھایا ہے۔

مولوی نجم الغنی صاحب رامپوری اپنی کتاب بحر الفصاحت میں لکھتے ہیں کہ

"عظیم شاگرد شاہ حاتم نے بحر ہزج کے ساتھ بحر رمل کو ملا دیا تھا، اس پر انشاء اللہ خاں نے بر سر مشاعرہ اعتراض کیا تھا۔

مشہور اُستاد وحشت نے ایک شعر لکھا ہے:-

سنبھالے ہیں مرے نالوں نے بھالے ‌ ‌ ‌ فلک اپنی پشت خمیدہ کو تھامے

اس شعر کے دونوں مصرعے مختلف ہیں پہلا ہزج مسدس، دوسرا متقارب مثمن ہے۔

غالب نے ان چاروں مصرعوں میں غلطی کی ہے۔

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد ‌ ‌ ‌ عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے،

دیار دو سرا ہے کب دہر میں سبتا تو ‌ ‌ ‌ پھر کیا یہ تو تو میں میں ہے کیا قیل وقال ہے

تیسرے مصرعہ کا وزن تینوں سے مختلف ہے۔

۳- اختلاف غیر معتاد- یعنی عروض محذوف کا استعمال بحر طویل میں اور مقطوع کا کامل میں نادرست ہے۔

اس تفصیلی بیان کا مقصد یہ ہے کہ کسی شاعر کی تنقید کے لئے ضروری ہے کہ شاعر کے خصوصیات سمجھ لئے جائیں اور اس کے ہر جزو اور ہر مسئلہ پر کافی روشنی ڈالی جائے۔

مومن جن علوم و فنون کے سرچشمہ اور مخزن تھے ان کے اشعار میں ان علوم پر بحث کرنا تنقید نگاری کا فرض ادا کرنا ہے، اور میں نے یہ فرض اجمالاً ادا کیا ہے +

# مومن کی غیر مطبوعہ غزلیں

## (۱)

کوچہ میں بستر آپ کے شام اور کا ہوا — اپنا جو تھا مقام، مقام اور کا ہوا
تھا تم کو مجھ سے ربط تو تم سے مجھے بھی تھا — تم اور کے ہوئے تو غلام اور کا ہوا
یہ چشم پوشی آپ کو شب نیند آگئی — وہ ہیں کہ بس فسانہ تمام اور کا ہوا
دن رات وہ ہے غیر ہے اور تازہ اختلاط — اب کاہے کو گزر لب بام اور کا ہوا
ہم اپنے ہونٹ چاٹتے ناکام رہ گئے — حاصل لبوں سے آپ کے کام اور کا ہوا
دل تو عبث ہے دشت تمنا نورد اب — وہ آہوے رمیدہ تو رام اور کا ہوا
دام اجل میں پھنس گیا آتے ہی جال میں — صیاد صید میں تہ دام اور کا ہوا
رہنے لگا ہے خانہ دل میں غم فراق — رہتے تھے تم جہاں وہ مقام اور کا ہوا

جانباز مومنؔ اس نے دیا غیر کو خطاب
ہم جان پر بھی کھیلے پہ نام اور کا ہوا

---

## (۲)

سینہ سے منفعل ہے کھڑا، تیر کھینچ کر — ایک آہ، مر گیا ہے جو نخچیر، کھینچ کر
بیتابی دل کی لے اڑی، صیاد نے ہزار — باندھے تھے بال مرغ ہوا گیر کھینچ کر
ہے رنج دست غیرت ہمت سے وصل میں — جی سے خفا ہوں منت تقدیر کھینچ کر
بے طاقتی سے اب تو یہ احوال ہے کہ ہم — نالہ بھی، غش سے رہتے ہیں تا دیر کھینچ کر
میں تشنہ کام آب شہادت ہوں، کاشکے! — وہ کافر آئے سامنے شمشیر کھینچ کر
مژدہ جنوں بہار کا دکھلائے ہے مجھے — چشم خیال نقشہ زنجیر کھینچ کر
تم آج تک نہ آتے اگر آتے آپ سے — لائی ہے میرے نالے کی تاثیر کھینچ کر
بیماری تب غم ہجراں میں اب کی بار — یہ ناتواں ہوں مومنؔ دلگیر کھینچ کر

آتا نہیں ہے جو ورق سادہ کچھ نظر
بہزاد ڈھونڈے ہے مری تصویر کھینچ کر

---

غزلیں ہمیں مولانا عرشی کی وساطت سے حاصل ہوئی ہیں۔

(۳)

غم کو ہم سے ربط ہے مدت سے ہم کو غم سے ربط
ہم اسی سے ربط رکھتے ہیں جو رکھے ہم سے ربط

اف رے سوز گریۂ غم تیری دولت سے مدام
دامن دوزخ کو ہے مژگان چشم نم سے ربط

اس دل صد چاک کو کیوں کر نہ ہووے پیچ و تاب
شانہ رکھتا ہے کسی کے کاکل برہم سے ربط

دل سے پیوستہ ہیں یوں داغ غم ہجراں مرے
جس طرح ہووے نگیں کو خانۂ خاتم سے ربط

ہائے رشک شمع و گل تو ہو گریزاں مجھ سے اور
شمع کو پروانے سے ہو گل کو شبنم سے ربط

آہ سے روشن ہے مضمونِ غم و درد نہاں
کیا عبارت کو دیا ہے معنی مبہم سے ربط

ہم مزاجی دوستی کا ہے سبب کیا ہے عجب
گر رکھے تیغ قضا اس ابروئے خوش خم سے ربط

اس طرف کو بھی ہے میلانِ طبیعت ان دنوں
بعد مدت ان کو پھر ہوتا چلا ہے ہم سے ربط

میں تو دیوانہ ہوا مومن کا کہ ہے اس شخص کو
اس قدر وحشی مزاجی پر بھی ایک عالم سے ربط

---

(۴)

لوگ کیا جانیں ہیں سوز شمع و پروانے کا حظ
کوئی پوچھے میرے جی سے ہائے جل جانے کا حظ

سامنے آتے ہی ہو جانا نہاں کس واسطے؟
چھیڑنے کا میرے حاصل تیرے ترسانے کا حظ

گر سنیں گا ہے نوائے دلخراشِ عاشقاں
بھول جائیں آپ لذت راگ کی گانے کا حظ

ڈوب جاتا زہر کھاتا جان دیتا ہر طرح
خضر کو ہوتا اگر معلوم مر جانے کا حظ

چکھتے ہیں سوزِ محبت کا مزا لذت نصیب
تجھ سے اے ناصح کہے کیا کوئی غم کھانے کا حظ

ہم نہ کہتے تھے وہ ہنس کر اور چھڑکے گا نمک
کیوں دل مجروح دیکھا زخم دکھلانے کا حظ

ہے ہجوم تاک اپنی خاک پر پیر مغاں
بعد مردن بھی ہے باقی ہم کو میخانے کا حظ

جذب دل تو جانتا ناصح نہیں کس سے کہوں
فائدہ ہر دم کی بیتابی کا گھبرانے کا حظ

مومن بیدین کب چلتا ہے طوف کعبہ کو
پڑ گیا ہے اس کو زاہد طوف بتخانے کا حظ

---

(۵)

ترے درد ہجر میں کب تلک پڑے تڑپیں آٹھ پہر تلک
دم صبح سے سر شب تلک سر شب سے لیکے سحر تلک

مرے جینے سے جو تو ہے غمیں تو لگا یہ شوق سے تیغ کیں
کہ عزیز تجھ سے تو جاں نہیں نہ دریغ تجھ سے ہے سر تلک

زہے دشت عشق کہ آہ یہاں ہوئے کیسے لوگ تباہ یہاں
یہ عجب ہے جائے کہ راہ یہاں سبھی بھولتے ہیں خضر تلک

مرے نالہ پر تو ہنسے ہے کیا اسی سے بر آئے گا مدعا
کہ تو دیکھنا جو پہنچ گیا کسی روز گوش اثر تلک

دم گریہ کس لئے پاس تھی، سنی کس سے پھر خبر خوشی — مری جان کس لئے پھر گئی ابھی آکے دیدۂ تر تلک
نہ خیال حیرا ارم کبھو نہ بہشت کی ہمیں جستجو — یہی ہے ہوس یہی آرزو کہ گزار ہو ترے در تلک
مرے حال کی اسے کیا خبر کہ وہ رحم کھا کے ہو چارہ گر — کوئی نامہ بر نہ پیام ہے کہ وہ جائے یار (کے) گھر تلک
مرا نامہ دے اُسے یا کہے کہ ذرا تو جا کے خبر تو لے — کہ ترا مریض ہر آن سے ہے کچھ اور آن دگر تلک
کبھو تکیہ سے نہ اُٹھا نا سر، پڑے رہنا بیخود و بے خبر — کبھو ہوش ہے کوئی دم اگر تو غشی ہے دو دو پہر تلک

شب ہجر غم سے ہے جاں بلب نہ تنگ ہم سے ہو مومن اب
کہ ہیں میہماں ترے شب کی شب نہیں بچتے آج سحر تلک

---

(۶)

کہے ہے کون رکھو مرہم زنگار پر رکھو — نہیں رکھتے تو خنجر ہی دل انگار پر رکھو
مرے مرقد پہ کیا ہے کام شمع و گل کا اے یارو — یہاں پروانہ و بلبل کے ایک دو چار پر رکھو
طبیبو زہر ہی دیدو کہیں بس مٹ چکے قصہ — ندامت نزع کی تلخی دل بیمار پر رکھو
برا ہے سر چڑھانا بے وفاؤں کا کہا مانو — ندامت طرۂ گل گر خود دستار پر رکھو
رولانا مجھ کو کب تک پوچھتا غیار کے آنسو — کبھی دامن مرے بھی دیدۂ خونبار پر رکھو
ذرا حسرت نکلنے دو خدا کے واسطے یارو — مرے لاشے کو ایکدم آستانِ یار پر رکھو

چلا جاتا ہے بتخانے میں اے زاہد بھولے سے
گماں کچھ اور مت تم مومن دیندار پر رکھو

# موازنۂ مومن و غالب

(عبدالباری آسی)

اس میں شک نہیں کہ مومن و غالب دونوں شاعر تھے اور شاعر بھی ایسے جن پر دنیائے شاعری بجا طور پر فخر و ناز کر سکتی ہے اور جنھوں نے اپنی اپنی جگہ خصوصیت استادانہ حاصل کر لی تھی لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ دونوں مختلف راہوں کے چلنے، مختلف مذاق رکھنے والے تھے اور دونوں کے رنگ طبائع میں بہت اختلاف تھا۔

غالب آزاد مزاج۔ رندلاؤ بالی۔ غم و افکار کو کیف شراب سے دور کرنے والا۔ زخم خوردہ۔ مگر مرہم کی جستجو سے بے پروا۔ دردمند مگر فکر چارہ سے مستغنی۔

مومن عاشق مزاج۔ الفت و محبت کی مضبوط زنجیروں میں جکڑا ہوا۔ حسن پر جان دینے والا۔ زمانہ کے غم و الم سے اثر لینے والا آن پر جان دینے والا۔

غالب فاقہ مست۔ مگر مزاج میں شاہانہ بولتے ہوئے۔ مومن شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے حلقۂ ارادت کا بیٹھنے والا۔ غالب امرائے عہد کا شناگو اور عقیدت مند۔ مومن روسا کی باتوں کو چین ابرو سے دیکھنے والا۔ ان کی صحبتوں سے محترز۔ ان کے مال و دولت پر نظر استحقار ڈالنے والا۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ دونوں کا رنگ شاعری بھی جداگانہ ہوگا۔

سنتا ہوں کہ ہندوستان میں اگر کوئی مومن کا جواب ہے تو وہ غالب ہے اگر کوئی غالب کا جواب ہے تو وہ مومن ہے۔

کیا یہ صحیح ہے؟ اسی پر گفتگو کرنا موضوع بحث ہے۔

قبل اس کے کہ اصناف شاعری پر نظر ڈالی جائے صفات شاعری کو دیکھیے تو بڑا فرق محسوس ہوگا۔ غالب و مومن کی شاعری میں تشبیہات۔ رنگ بلاغت۔ طرز فصاحت۔ استعارات۔ انداز بیان۔ محاکات۔ بیان جذبات۔ ادائے مضمون۔ جدت تخیل وغیرہ وغیرہ سب چیزیں مشترک اور یکساں طریقہ پر پائی جاتی ہیں۔ لیکن نگاہ حقیقت شناس اس فرق و امتیاز کو محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتی جو ان دونوں میں پایا جاتا ہے۔

**مثنوی** وہ مایۂ ناز صنف شاعری جو صرف اہل عجم کے لئے سرمایۂ ناز ہے اور عرب کی شاعری میں نمونۃً بامثال کے سوا اس کا وجود کہیں نہیں ہے مثنوی ہے۔ وہ متاع ادب جس نے فارس کے ذخیرۂ ادب کو گراں قدر اور گراں بہا بنایا۔ صرف مثنوی ہے۔ جس کے ثبوت میں شاہ نامہ۔ سکندر نامہ۔ منطق الطیر۔ بوستان زلیخائے جامی۔ تحفۃ العراقین۔ مثنوی زلالی۔ مثنوی مولانا روم وغیرہ وغیرہ سیکڑوں مثنویاں پیش کی جا سکتی ہیں۔ یہی وہ چمکنے والے جواہرات ہیں جن کی آب و تاب نے عرب کے ادبی متاع کو ماند کر دیا تھا۔ فارسی کی تمام اصناف شعر کے ساتھ یہ بھی ہندوستان میں آئی اور عالی دماغ ادیبوں کے ہاتھوں

دوسرے اصناف سخن کے ساتھ یہ بھی پروان چڑھتی رہی مگر اس زمانہ کو جس میں زبان اردو اپنے بچپن کے گہوارے میں تھی ——— ہم ایام جاہلیت میں شمار کرتے ہوئے میر کے زمانہ تک پہونچتے ہیں۔ میر تقی میر نے اُردو میں اس صنف کو خصوصیت کے ساتھ ترقی دی۔ اور بیس سے زاید مثنویاں لکھیں جن میں بعض نہایت مختصر ہیں۔ مگر شعلۂ عشق۔ دریائے عشق۔ اعجاز عشق۔ شکار نامہ۔ اژدر نامہ۔ ہجو بقال۔ تنبیہ الجہال وغیرہ مثنوی کے بہتر نمونے ہیں۔ میر صاحب کی مثنویاں بعض بلا قید زمانی اور بعض اُس زمانہ کے لحاظ سے نہایت عمدہ اور دلچسپ ہیں مگر فی الاصل اس صنف کو عروج کمال پر پہونچانے والے میر حسن ثابت ہوئے اور ان کی مثنوی کی اتنی شہرت ہوئی کہ میر صاحب کی مثنویوں کی شہرت صرف ان کی ذات بابرکات کی افضلیت کے ساتھ وابستہ رہ گئی۔ میر حسن کے بعد اگرچہ کئی مثنویاں بدر منیر کے جواب میں لکھی گئیں مگر مقبولیت اور شہرت نہ پا سکیں۔ آخری دور میں مثنوی گلزار نسیم کو لکھنؤ میں خاص شہرت ہوئی مگر دلی میں رنگین کے علاوہ اور دوسرا شخص مثنوی لکھنے والا نظر نہیں آتا یہاں تک کہ مومن و غالب کا زمانہ آجاتا ہے۔ مومن اور غالب دونوں نے اس صنف میں نہایت جانکاہی اور محنت سے کام لیا اور اس مردہ صنف کے ساتھ اعجاز مسیحائی کیا غالب نے فارسی میں تقریباً گیارہ مثنویاں لکھیں۔ سرمہ بنیش۔ درد و داغ۔ چراغ دیر رنگ و بو۔ باد مخالفت۔ شان نبوت۔ تہنیت عید شوال۔ تہنیت عید۔ دیباچہ۔ تقریظ آئین اکبری۔ ابر گہر بار۔ اور اردو میں مختصر چند شعر "مثنوی در صفت انبہ"

مومن کا یہ تمام کارنامہ جوان کی شاعری کا ایک درخشندہ گوہر شب چراغ ہے خزانہ اُردو میں ہے۔

نامۂ مومن۔ دوسرا نامہ۔ شکایت ستم۔ قصۂ غم۔ قول غمیں۔ تف آتشیں۔ قیس مغموم۔ آہ و زاری مظلوم۔ مثنوی ناتمام۔ مثنوی مضمون جہاد۔

ہرچند مثنویوں میں دونوں کا موازنہ یا تقابل درست نہیں ہو سکتا کیونکہ غالب کی مثنویاں فارسی میں ہیں اور مومن کی اُردو میں تاہم اجمالاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ غالب کی مثنویاں زیادہ تر واقعات ضروری پر مبنی ہیں اور مومن نے باستثنائے بعض سب عشقیہ لکھی ہیں اور اس طرز میں گویا وہ خود ہی موجد اور خود ہی خاتم ہیں۔ ان کی مثنویاں حسن و عشق کے واقعات کے آئینے ہیں جن میں دونوں تصویروں کا بال بال نظر آتا ہے۔ ان مثنویوں کے بعض بعض مناظر میر تقی اور میر حسن کی مثنویوں سے ملتے جلتے ہیں۔ مگر اصل یہ ہے کہ خواہ فراق کا بیان ہو خواہ اشتیاق اور وصال کا اس میں وہ آپ اپنی نظیر ہیں کیونکہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ سب وہ واردات ہیں جو سوختہ جاناں عشق پر گزرتی رہتی ہیں اور یہی سبب ہے کہ جو لطف ان کے بیان میں ملتا ہے وہ دوسروں کے بیان میں ہرگز نہیں ہے۔

اصناف سخن میں سے وہ اصناف جو اُردو میں مشترک طور پر غالب و مومن کے یہاں پائی جاتی ہیں۔ قصیدہ۔ رباعی مرثیہ اور غزل ہیں، سب سے پہلے ہم قصیدہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ قصیدہ کے لئے اول توانائی الفاظ کی ضرورت پڑتی ہے جن میں علو اور شکوہ و شان پائی جائے اس کے بعد تشبیب آجاتی ہے۔ جس میں تمام زور شاعری صرف کر دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد گریز ہے یعنی وہ نازک موقعہ جہاں سے اس کو اپنے اصلی مقصد کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ روانی۔ جوش وغیرہ بھی اس کے لئے ضروری ہیں۔ چونکہ قصیدوں کے اغراض و مقاصد مختلف ہوتے ہیں اس لئے یہ کوشش تو بے سود ثابت ہوگی کہ غالب و مومن کے ایک مضمون کے قصاید کو ڈھونڈا جائے اس واسطے صرف مندرجۂ بالا باتوں کا لحاظ کرتے ہوئے ہم ایک موازنہ کی صورت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

مومن حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شان میں قصیدہ اس طرح شروع کرتے ہیں ؎

کٹتی ہے میری تیغِ زباں سے زبانِ تیغ — کیونکر سخن فروش ہوں سوداگرانِ تیغ
نہلا دیا عدو کو لہو میں بسانِ تیغ — میری زباں کے آگے چلے کیا زبانِ تیغ
پھر جوش آگیا دمِ خوں نابہ ریز کو — پھر تیزیٔ زباں پہ ہے قرباں زبانِ تیغ
میدانِ کشت و خوں میں مرادِ سمندِ سوار — جادے عناں کشیدہ تو ہو ہمعنانِ تیغ

میں نے صرف یہ چار شعر اس لئے لکھے ہیں کہ دیکھنے والوں کو قصیدہ کی اٹھان معلوم ہو جائے۔ ورنہ اس قصیدہ میں مومن کے یہاں تیس چالیس شعر تقریباً اسی انداز اور اسی شان کے موجود ہیں۔ سب سے پہلے شاعر کے شعور پر نظر ڈالئے کہ اس نے چونکہ خداوند ذوالفقار کی مدح سنجی کرنا چاہی ہے لہٰذا زمین قصیدہ بالکل اسی کے موافق تجویز کی۔ دوسری خوبی جو قصیدہ میں نمایاں ہے وہ صنعت براعۃ الاستہلال ہے جس کی شان قصیدہ کے مطلع سے نمایاں ہو رہی ہے۔ تیسری خاص بات جو مصنف کے ذہن میں آئی وہ یہ تھی کہ اُن مناسبات کو جو ممدوح سے متعلق ہیں ایک ایک کر کے تشبیب میں لے آیا۔ مثلاً ؎

فردوسی ایک خارجنان بیان تھا — گلریز میرے دم سے ہوئی داستانِ تیغ

اگر تھوڑا سا تامل کیا جائے تو فردوسی کو خارجنانِ بیان بنانے کے اسباب نظر کے سامنے پھر جاتے ہیں۔ کیونکہ گو فردوسی نے عمر بھر حرب و ضرب کے مناظر لکھے مگر مومن کو اس بات پر فخر ہے کہ وہ صرف کافروں کی مدحہ سنجی میں رہا اور وہ دراصل باغِ جناں مدح کے لئے ایک کانٹا ثابت ہوا مگر میں کہ حضرت علی ابن ابی طالب کی مدحہ سنجی کا ارادہ کر رہا ہوں۔ دراصل یہ داستانِ تیغ گویا گلریزیِ داستانِ تیغ ہے۔ دوسرے مناسباتِ ممدوح دیکھئے ؎

یہ دل خراشیاں مرے اشعارِ شوخ کی — سینے پہ منکروں کے ہیں لاکھوں نشانِ تیغ
جس جا کہ خطبہ خواں ہو مری تیزیٔ زباں — واں جانے فرضِ سجدۂ مہر فشانِ تیغ
صدمہ زدۂ جراحتِ منکر حسود کو — کرتا ہوں رزم گاہ میں میں امتحانِ تیغ
مومن کو آرزو ہے، ثوابِ جہاد ہے — کفّار کاش آکے سنیں داستانِ تیغ

معلوم ہوتا ہے کہ ایک دریا اُمڈا ہوا چلا آرہا ہے۔ اسی روانی اور تسلسل کی حالت میں اس آسان طریقہ سے گریز کیا ہے جس کا جواب نہیں گویا مصنف نے گریز کا ارادہ نہیں کیا بلکہ بے اختیار اُس کے قلم سے یہ اشعار نکلتے گئے ہیں ؎

آتی ہے لب پہ مدحِ خداوندِ ذوالفقار — لیجاؤ منکروں کے لئے ارمغانِ تیغ
شیرِ خدا علی کہ شجاعت سے جس کی ہے — سرپنجۂ اسد پہ زنخ زن بیانِ تیغ

یہی وہ مقامات ہیں جو قصیدہ میں دشوار ہوتے ہیں۔

اب مرزا غالب کا وہ قصیدہ ملاحظہ فرمائیے جو انھوں نے حضرت علی کرم اللہ کی مدح میں کہا ہے۔ قصیدہ سے مصنف کا کمال اور قادر الکلامی ظاہر ہے مگر وہ مناسبات جو مومن کے یہاں ہے اس میں نہیں ہے۔

دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں — ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں
بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق — بے کسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں
ہرزہ ہے نغمۂ زیر و بمِ ہستی و عدم — لغو ہے آئینہ فرقِ جنون و تمکیں

پوری تشبیب اسی طریقہ سے کہی گئی ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ غالب کی کہنہ مشقی نے اس میں بہت کچھ حسن پیدا کر دیا ہے مگر قصیدہ میں وہ بات نہیں ہے جو مومن کے یہاں ہے تخلّص میں انھوں نے تشبیب کو ختم کرکے اس طرح پیچھا چھڑایا ہے ۔

کس قدر ہرزہ سرا ہوں کہ عیاذاً باللہ　　یک قلم خارجِ آداب وقار و تمکیں
نقشِ لاحول لکھ اے خامۂ ہذیاں تحریر　　یا علی عرض کر اے فطرتِ وسواس قریں

دیکھنے والا پہلی نظر میں دیکھ لیتا ہے کہ مصنف نے ایک تشبیب بغیر سوچے سمجھے محض اپنی شاعرانہ قوت بیان کے زور میں لکھی ہے اس کے بعد اس کو خیال پیدا ہوا ہے کہ اس قصیدہ کا منقبت کی طرح رخ پھیر دینا چاہیئے اسی لیئے اس کو دقت ہوئی ہے اور اس نے گریز کا یہ انداز پسند کیا ۔ برعکس اس کے مومن کے یہاں پہلے ہی سے اہتمام کیا گیا ہے اور اس صفائی اور خوبصورتی سے گریز کیا ہے کہ داد نہیں دی جا سکتی ۔

اس کے بعد رباعی پر جب نظر ڈالتے ہیں تو غالب کے یہاں اُردو کی چند رباعیات نظر آتی ہیں مگر در حقیقت وہ قابل موازنہ نہیں ہیں کیونکہ مومن کے یہاں رباعیات کا ایک بہت کافی سرمایہ اور ذخیرہ موجود ہے جس میں ہر قسم کے خیالات ادا کیئے گئے ہیں ۔ برعکس اس کے غالب کے یہاں چند رباعیات ہیں اور اُن کے دیکھنے سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ انھوں نے بجبر لکھی ہیں یا بعض واقعات نے اُن سے لکھوا دی ہیں ۔ بہرصورت کم سے کم اردو میں غالب صنف رباعی کے مرد میدان نہیں سمجھے جا سکتے ۔

ان سب کو چھوڑنے کے بعد موازنہ کے واسطے صرف ایک غزل کی صنف باقی رہ جاتی ہے جن میں دونوں کا سرمایہ ہم کافی موجود ہے ۔ غزلوں کے موازنہ کے لئے دو صورتیں ہو سکتی ہیں ایک تو یہ کہ ایک غزل غالب کی لکھی جائے اور ایک مومن کی مگر یہ تحصیل حاصل ہے کیونکہ اگر صرف یہی بات مدنظر ہو تو بجائے خود دونوں کے دیوان علیحدہ علیحدہ موجود ہیں دوسرے یہ کہ موازنہ کے لئے اُن غزلوں پر نظر کی جائے جو ہم طرح ہیں اور جن میں ایک زمین میں دونوں نے گلفشانیاں کی ہیں ۔ یہ البتہ کارآمد ہے بشرطیکہ دونو کے قوافی کو چن لیا جائے اور پھر دونوں کے رنگ طبیعت کے موافق اُن پر تنقید کی جائے ۔ چنانچہ پہلے ہم یہی کرتے ہیں ۔ اگرچہ دونوں کی ہم طرح غزلیں بہت کم ہیں ۔ تاہم جو کچھ ہیں ان کو پیش نظر رکھ کر اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہوں ۔

غالب کی ایک مشہور غزل کا مقطع ہے ؎

مجھ پر جفائے ترک وفا کا گماں نہیں　　اک چھیڑ ہے وگرنہ مراد امتحاں نہیں

نہایت پاکیزہ مطلع کہا ہے ۔ یعنی معشوق مجھ پر میرا امتحان لینے کے لئے جفا نہیں کرتا اور نہ اس کو یہ خیال ہے کہ جفا کرنے سے میں وفا چھوڑ دوں گا ۔ بلکہ مقصود صرف ایک چھیڑ جاری رکھنا ہے ۔ اس سے زیادہ عاشق کی حرماں نصیبی کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ جفا بھی سہتا ہے تو اُس میں بھی اُس کو کوئی امید نہیں ۔ اگر معشوق کی یہ جفا امتحان لینے کے لئے ہوتی تو کچھ امید افزا ہو سکتی تھی ۔ یا کاش معشوق یہی سمجھتا کہ جفا کرنے سے یہ وفا چھوڑ دیگا ۔ مگر وہ سمجھ چکا ہے کہ عاشق وفا نہ چھوڑیگا ۔ اس سے بدنصیبیٔ عاشق کے پہلو کو شعر میں اور بھی تقویت پہونچی ہے ۔ یعنی وفا پر ثابت قدم سمجھتے ہوئے وہ جفا کرتا ہے ۔ مگر حکیم مومن خاں فرماتے ہیں ؎

کرتے وفا امید جفا پر تمام عمر　　پر کیا کریں کہ اس کو سر امتحاں نہیں

مضمون تقریباً یکساں ہے فرق یہ ہے کہ غالب کہتا ہے کہ وہ جفا کرتا ہے مگر امتحان کے لئے نہیں کرتا ۔ حکیم صاحب کہتے ہیں کہ جفا کرتا ہی نہیں ورنہ ہم عمر بھر اُس سے وفا کیئے جاتے ۔ اس میں حرمان و مایوسی کا مضمون غالب کے شعر سے ۔ بہت ؟

زیادہ بڑھا ہوا ہے جفا ہونے ہیں تو ایک امید بھی ہے یعنی اگر آج اس کو خواہش امتحان نہیں تو ممکن ہے کہ کسی وقت پیدا ہو جائے مگر وہ بدنصیب واقعی بڑا بدنصیب ہے جس پر جفا بھی نہیں کی جاتی۔ اس کے علاوہ پہلے مصرع کی صفائی بیان کی تعریف ہی نہیں ہو سکتی۔ "پر کیا کریں" کے ٹکڑے نے اور بھی زیادہ مجبوری کا رنگ پیدا کر دیا اور اس ابہام و ایہام نے کہ "اب کیا وفا کریں" اس بات پر بھی بہت کافی روشنی ڈالدی کہ ہم کو اظہار وفا کا بھی موقع نہیں دیا جاتا ؎

غالب۔ ہم کو ستم عزیز ستم گر کو ہم عزیز نامہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں

ہم ستم دوست ہیں اور وہ ستمگر ہے ہم کو ستم کی ضرورت ہے اور ستم گر کو ایک ستم دوست کی احتیاج ہے۔ اس صورت سے ایک رابطہ اتحاد فی مابین قائم ہے۔ لہٰذا اگر وہ مہربان نہیں ہے تو نامہربان بھی نہیں ہے۔ غالب کے منطقی استدلال نے اس میں عجیب و غریب لطف پیدا کر دیا ہے۔ اور یہی استدلال اس شعر کو مرزا کے خاص رنگ میں لے آیا ہے۔ ہمارے نزدیک سب سے بڑی خوبی اس شعر میں انداز بیان کی ہے اور پھر یہ کہ منطقی رنگ کے ساتھ اس میں تغزل کا رنگ کوٹ کوٹ کے بھر دیا ہے مگر مومن کہتے ہیں ؎

اظہار دوستی کی خوشی کیا شب وصال دشمن سے سن چکا ہوں کہ تو مہرباں نہیں

مدتوں کے بعد ایک ہجراں نصیب کو شب وصال میسر ہوئی ہے۔ معشوق گرم جوشیاں کر رہا ہے۔ مگر اس سے بھی اس ستم نصیب عاشق کو کوئی تسکین نہیں ہوتی۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے دشمن سے سنا تھا کہ تو کسی کا دوست نہیں ہوتا اور اگر یہ سنا محض سننے ہی کی حد تک ہوتا تو غنیمت تھا مگر چونکہ اس وقت اس کے قول کی تصدیق ہو رہی ہے جب کہ وہ دشمن کے پاس نہیں ہے اور ہم پر مہربان ہے لہٰذا یہی اُس کی بے ثباتی محبت کا ثبوت ملتا ہے۔ استدلال کی صورت تقریباً یکساں ہے ؎

غالب۔ پاتا ہوں اُس سے داد کچھ اپنے کلام کی روح القدس اگرچہ مرا ہمزباں نہیں

اس شعر میں ایک تعلی شاعرانہ کے سوا اور کچھ نہیں۔ روح القدس پر اپنی ترجیح ایک بے لطف سی بات ہے مگر مومن خاں اسی قافیہ میں تغزل کی شان پیدا کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

پیش عدو سمجھ کے ذرا حال پوچھنا قابو میں دل نہیں مرے بس میں زباں نہیں

اول تو جس صفائی کے ساتھ کہا گیا ہے اُس کی تعریف محال ہے اور اس کے علاوہ بلاغت اور شعر کی معنویت اور بھی قیامت ہے جس کی وجہ سے یہ شعر غالب کے شعر سے بہت بڑھ گیا ہے۔

غالب نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گر خراب سو گز زمین کے بدلے بیاباں گراں نہیں

یہ شعر غالب نے ایک شوخی کا انداز قائم رکھتے ہوئے تغزل کی حد میں کہا ہے اور نہایت ہی عمدہ صورت سے کہا ہے مگر مومن خاں کے یہاں ایک ناصحانہ انداز بیان ہے ؎

اتنے سبک نظر میں ہیں اوضاع روزگار دنیا کی حسرتیں مرے دل پر گراں نہیں

یعنی زمانہ کو میں اتنا ہیچ و پوچ سمجھ چکا ہوں کہ دنیا کی حسرتیں اب میرے دل پر کوئی گرانی پیدا نہیں کرتیں۔ اس میں لطف یہ ہے کہ حسرت بھی میری نظر میں سبک ہو گئی ہے۔ تاب و تواں کا قافیہ غالب نے قطعہ بند کہا ہے ؎

غالب ہر چند جاں گدازی قہر و عتاب ہے ہر چند پشت گرمی تاب و تواں نہیں

جاں مضطرب ترانۂ ھَل مِن مَزِید ہے لب پردہ سنج زمزمۂ الاماں نہیں

یعنی اگرچہ تمام ظلم ہو رہے ہیں۔ اگرچہ بے حد ناتوان ہوں۔ مگر پھر بھی جان خواہشمند ہے کہ اور بھی ستم ہوں۔ لب ہرگز نغمۂ الاماں نہیں کہتا یہ ایک کیفیت خاص ہے جو اکثر عشق میں ہوتی ہے۔ گر شوکت الفاظ کے سوائے شعر میں کوئی ندرت نہیں ہے ؎

ہر ذرہ میری خاک کا برباد ہو چکا
بس اے خرام ناز کہ تاب و تواں نہیں
مومن

انداز تغزل میں بے مثل ہے اور باوجود اس کے کہ مرزا نے اس کو قطعہ کی صورت میں کہا ہے مگر اس میں کوئی خاص خوبی نہیں پیدا کر سکے اور مومن نے ایک ہی شعر میں سوز و ساز کی دنیا بھر دی۔

دوسری غزل ملاحظہ فرمائیے۔ غالب کہتے ہیں ؎

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں
کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

یعنی مجھ پر جو آگ کا عذاب کیا گیا ہے۔ میں اس سے بہت خوش ہوں کہ آگ جب ملتہب ہوتی ہے تو مجھ کو اپنے معشوق کی آتش خوئی یاد آتی ہے اور اس لئے اس عذاب میں ایک قسم کی راحت معلوم ہوتی ہے۔ کافر ہوں۔ کا ٹکڑا اس شعر میں نہایت سوچ سمجھ کر کہا گیا ہے جس سے وسعت معنی بہت بڑھ گئی ہے۔ مگر نار اور التہاب نہایت ثقیل ہیں ؎

جلتا ہوں ہجر شاہد و یادِ شراب میں
شوقِ ثواب نے مجھے ڈالا عذاب میں
مومن

مفہوم بالکل ظاہر ہے مگر مومن کا انداز بیان دوسرے مصرعہ میں نہایت ہی صفائی کے ساتھ اُستادی کی شان پیدا کر رہا ہے پہلے مصرع میں جلتا ہوں کہ ایہام نے شعر کے معنی میں بہت زیادہ مدد کی ہے۔

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں
شبہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں
غالب

اس مضمون کو دیکھ کر کسی کی جراءت نہیں ہو سکتی کہ کوئی نقص نکال سکے مگر افسوس کہ یہ مضمون غالب کا نہیں ہے بلکہ خود کے ایک شعر کا ترجمہ ہے ؎

زہے عمر دراز عاشقاں گر
شب ہجراں حساب عمر گیرند

کھولا جو دفتر گلہ اپنا زیاں گیا
گزری شب وصال ستم کے حساب میں
مومن

وہی انداز تغزل جو مومن کے کلام کی جان ہے اس میں بھی موجود ہے اگرچہ مضمون کو بلند نہیں کہا جا سکتا مگر صفائی اور سادگی مضمون نظر انداز بھی نہیں کی جا سکتی ؎

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں
غالب

مضمون آفرینی جس کے لئے غالب کی شاعری خلق ہوئی تھی۔ اس شعر میں بھی بدرجۂ اتم موجود ہے یعنی معشوق کی جفا وفا

کی صورت میں اور عاشق کی کامیابی ناکامیابی کے رنگ میں ہے۔ اور طرہ یہ کہ شاعر کا وہی خاص انداز بیان ہے جس کا وہ عادی ہے اس لئے شعر بہت ہی بے مثل ہے مگر مومن نے اس قافیہ کو جس خوبی سے کہا ہے وہ باوجود اتنی زبردست مضمون آفرینی کے غالب کے شعر سے بہت بڑھا ہوا ہے۔ کہتا ہے۔

تیری جفا نہ ہو تو ہے سب دشمنوں سے امن
بدست غیر، محو دل، اور بخت خواب میں

جس صورت میں مصرع اولیٰ لگایا گیا ہے اُس سے بہتر کوئی صورت خیال میں نہیں آتی۔ غیر اس وقت شراب عیش سے بدمست ہے۔ میرا دل محو ہو کر رہ گیا ہے۔ میرا نصیب محو خواب ہے اگر ایسے میں تو بھی جفا سے باز آجائے تو مجھے تمام دشمنوں سے نجات مل جائے تغزل کی حد میں ایسی مضمون آفرینی اور اُسی کے ساتھ بیان میں یہ شگفتگی مومن ہی کا حصہ تھا ؎

غالب قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

چونکہ بیان میں صفائی کو انتہائی طریقہ سے ملحوظ رکھا گیا ہے اس لحاظ سے شعر کو جو درجہ دیا جائے کم ہے مگر مومن کے تغزل کا انداز کسی مضبوط سے مضبوط انداز بیان کی عمارت کو قائم نہیں رہنے دیتا۔ ملاحظہ ہو ؎

کہتے ہیں تم کو ہوش نہیں اضطراب میں
سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں

اتنی بڑی داستان کہ عاشق و معشوق کے پاس سیکڑوں گلے ہزاروں شکوے لئے ہوئے پہونچا۔ تمام رونا رویا۔ رحم اور رجوع کا منتظر رہا۔ مگر معشوق نے ناز۔ شوخی۔ سادگی۔ ظرافت۔ غصے۔ جھنجھلاہٹ کے لہجہ میں اتنا کہہ دیا کہ آپ کو اپنے اضطراب میں ہوش بھی ہے۔ تمام گلوں کا خاتمہ کر گیا۔ ایک جملہ نے معانی کا ذخار دریا شعر میں موجزن کر دیا۔ اس جواب میں جس قدر پہلو نکلتے ہیں بیان نہیں ہو سکتے ؎

میں مضطرب ہوں وصل میں خوف رقیب سے
ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں

میں شب وصال میں خوف رقیب سے مضطرب ہوں مگر خدا معلوم تم کو کیا کیا وہم ہو رہا ہے۔ پہلے مصرع میں بہت سے پہلو ہیں اور بیان کی تہہ میں ایک خاص قسم کی شوخی بھی ہے۔ اس کے علاوہ ایہام کے ہونے سے ایک خاص لطف پیدا ہو گیا ہے اگرچہ اس قافیہ کو وہ غالب سے بڑھا نہیں سکے ؎

پھیلی شمیم یار مرے اشک سرخ سے
دل کو غضب فشار ہوا اضطراب میں

میں اور حظّ وصل خدا ساز بات ہے جان نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

مومن نالہ منہ سے جھڑتے ہیں بے گریہ آنکھ سے
اجزائے دل کا حال نہ پوچھ اضطراب میں

غالب کے شعر میں شوخی اور شان عشق ہے۔ مومن کے یہاں مایوسی حزن و یاس پریشان حالی۔ دونوں مضمون بالکل جدا ہیں

نازک خیالیاں دونوں میں ہیں مگر ایک دوسرے سے متجاوز نہیں۔ البتہ مومن کے یہاں اجزائے دل کہکر شعر میں جان ڈال دی گئی ہے۔ اجزائے دل اضطراب میں جس صورت سے تباہ ہوتے ہیں ان کی تشریح اس صورت سے ایک غالب ہی نہیں بلکہ شاید دیگر اساتذہ عجم کے یہاں بھی نہ ملے گی اسی کے ساتھ اس مسئلہ پر کافی روشنی پڑتی ہے کہ جب انسان نالہ کرتا ہے تو وہ آغاز گریہ دل کے اجزا کی تباہ کن ہوتی ہے اور جب روتا ہے تو وہ آنسوؤں کو برباد کر دیتے ہیں اس کے علاوہ شعر کا ظاہری حزن بھی شان عاشقی کی ایک مایوس تصویر ہے ؎

غالب

تیوری چڑھی ہوئی ہے جو اندر نقاب کے
ہے اک شکن پڑی ہوئی طرف نقاب میں

غالب نے معشوق کی ایک ادا اور اس کے اثر کے مترتب ہونے کو لیکن ایک نئی صورت سے دکھایا ہے ؎

غالب

چین جبین کو دیکھ کے دل بستہ تر ہوا
کیسی کشودِ کار کشودِ نقاب میں

غالباً کسی ہجران نصیب عاشق کے لئے اس سے زیادہ خوش نصیبی اور کچھ نہیں ہوسکتی کہ معشوق اس کے سامنے بے نقاب ہو مگر مومن اس وصل میں بھی اپنی حرماں نصیبی دکھاتا ہے اور اسی تیوری کو جس سے غالب نے ایک صورت محاکات پیدا کی ہے اپنے دل بستہ ہونے کی وجہ ٹھہراتا ہے۔ اگرچہ مضمون کو کوئی خاص درجہ دینا کھلی ہوئی ناانصافی ہے مگر دوسرے مصرع کا حسنِ بیان اہل نظر سے داد لیے بغیر نہیں رہ سکتا ؎

غالب

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

غالب نے حسن معشوق کی دو خاص کیفیتوں کا منظر دکھایا ہے اور سچ یہ ہے کہ اس طرح دکھایا ہے کہ غالب کے سوا دوسروں نے ان کے علاوہ اس قافیہ کو حسن کے ساتھ نہیں کہا۔ مومن کا یہ شعر اگرچہ انداز تغزل میں بُرا نہیں مگر وہ غالب کے برابر نہیں پہونچے ؎

مومن

ہے منتوں کا وقت شکایت رہی رہی
آئے تو ہیں منانے کو وہ پر عتاب ہیں

مومن کیا جلوے یاد آئے کہ اپنی خبر نہیں بے بادہ مست ہوں میں شبِ ماہتاب میں

اگرچہ مومن کا یہ شعر غالب کے مقطع ؎

غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

کی برابری نہیں کرسکتا۔ مگر اپنی معنی آفرینی کی وجہ سے اس میں بھی ایک حسن پیدا ہوگیا ہے۔ شب ماہ کو دیکھ کر خود بخود مست ہو جانا نہایت پاکیزہ مضمون آفرینی ہے مگر پھر بھی اسے شعریت کے حدود میں نہیں لاسکتے ؎

غالب

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

یہ شعر غالب کے ادبی کارناموں میں سے ایک زبردست کارنامہ کہے جانے کا مستحق ہے۔ مگر حدِ تغزل سے دور اور حکیمانہ خیالات سے معمور ہے۔ مومن نے اس قافیہ میں تغزل کا رنگ پیدا کرکے خاص چیز بنا دیا ہے ؎

قاتل جفا سے باز نہ آیا وفا سے ہم
فتراک میں جو سر ہے تو پا ہے رکاب میں

---

بجا ہوتا ہے جفا ہوتا ہے ۔ اس زمین میں بھی دونوں استادوں کی غزلیں موجود ہیں مگر افسوس ہے کہ ہم قافیہ صرف ایک ہی شعر ہے ؎

غالب
پُر ہوں میں شکوؤں سے یوں راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

غالب کی تشبیہ نے بھی شعر کو بہت بلند کر دیا ہے اور اس کے مصرع ثانی کی بے تکلفی خصوصیت سے قابل داد ہے مگر مومن نے اسی عاشقانہ انداز کو مد نظر رکھتے ہوئے ایک سامنے کا مضمون ادا کر دیا ہے ؎

اک نظر دیکھے سے سر تن سے جدا ہوتا ہے
بے جگہ آنکھ لڑی دیکھئے کیا ہوتا ہے

یہ شعر پڑھ کر مآل عاشقی اور حرمان نصیبی کی پُر حسرت تصویر نظر کے سامنے آجاتی ہے ۔ سب سے بڑی خوبی انداز بیان کی بے تکلفی ہے جس کی وجہ سے کم از کم یہ شعر غالب کے شعر کے مقابلے میں لایا جا سکتا ہے ورنہ اگر دونوں کی غزلوں کو دیکھا جائے تو دونوں باغ و بہار ہیں ۔ مضمون ۔ زبان ۔ معنی آفرینی کسی لحاظ سے ایک دوسرے سے کم نہیں ہے ۔ ہم طرح غزلوں میں سے ایک غزل یہ بھی ہے ۔ آسماں کے لئے ۔ جہاں کے لئے ۔ مگر وہ صورت بدستور قائم ہے ۔ بہت کم قافیہ ملتے ہیں پھر بھی جو ہیں وہ حاضر ہیں ؎

بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے
رکھوں کچھ اپنے بھی مژگانِ خونفشاں کیلئے

مژۂ یار نے اس قدر خون آشامی کی ہے کہ اب دل میں خون بہت کم رہ گیا ہے اور وہ مجبور ہو کر کہتا ہے کہ اب مجھ کو اپنے مژگان خونفشاں کے واسطے بھی کچھ رکھنا چاہیئے ۔ شعر کی بندش کی چستی قابل داد ہے ۔ مضمون میں جگر کاوی بھی کی گئی ہے مگر شان عشق کے منافی ہے ۔ مومن اپنے خاص انداز میں کہتا ہے ؎

وہ لعل روح فزا سے کہاں تلک بوسے
کہ جو ہے کم ہے یہاں شوقِ جانفشاں کیلئے

مضمون شعر اس قدر صاف ہے کہ غالباً اس کی تشریح کی احتیاج نہیں مگر لعل روح فزا اور شوق جاں فزا کی ترکیبوں نے اس کو بہت بلند کر دیا ہے ؎

غالب
فلک نہ دُور رکھ اُس سے مجھے کہ میں ہی نہیں
دراز دستیٔ قاتل کے امتحاں کے لئے

غالب کے یہاں یہ شعر بیت الغزل ہے ۔ تعریف محال ہے ۔ مومن کا اس قافیہ میں اتنا کہنا بھی کمال ہے لکھتے ہیں ۔

مومن بھلا ہوا کہ وفا آزما ستم سے مرے ہمیں کبھی دستی تھی جاں اس کے امتحاں کے لئے

وفا آزما ستم سے مُرنا ہمارے لئے غنیمت ہو اور نہ ہم کو تو ایک نہ ایک دن نذرِ امتحان کرنی تھی اپنے خاص انداز کو محفوظ رکھتے ہوئے کہا گیا ہے بات میں سے بات نکالی ہے۔

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے
غالب

سوائے شوخی بیان کے اور کچھ شعر میں نہیں ہے بلکہ اگر بدمذاقی نہ سمجھی جائے تو اس قسم کے شعروں کو انبیاء کے سُو ادب کی حد میں لایا جاسکتا ہے مگر مومن نے اس قافیہ کو غالب سے بہت اچھا کہا ہے ؎

خلافِ وعدۂ فردا کی ہم کو تاب کہاں
امید یک شبہ ہے یاسِ جاوداں کے لئے

یعنی ہم میں کل کی وعدہ خلافی کی تاب کہاں ہے ایک رات کی امید بھی یاس جاوداں کے لئے کافی ہے۔

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

غالب کے بہترین شعروں میں ایک شعر یہ بھی ہے حسرت واندوہ حرمان وآرزو کی ایک مکمل تصویر ہے مگر بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ ایک نظری دھوکہ ہے اس پر اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ مرغ اسیر قفس میں آشیاں بنانے کے لئے خس کیونکر فراہم کرسکتا ہے اسیر سے یہ آزادانہ حرکتیں نہایت مستبعد ہیں۔

کہاں وہ عیشِ اسیری کہاں وہ امنِ قفس
ہے بیمِ برق بلا روز آشیاں کے لئے
مومن

مومن نے اپنے اصلی رنگ کو چھوڑ کر یہ شعر فلسفیانہ انداز میں کہا ہے اور اس قدر صاف اور سادہ مصرعہ لگایا ہے کہ یقینی یہ شعر غالب کے شعر سے بڑھ گیا ہے غالب نے اسی مفہوم کو ایک جگہ یوں ادا کیا ہے ؎

بے تکلف در بلا بودن بہ از بیم بلاست
قعرِ دریا سلسبیل و روئے دریا آتش است
غالب

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے
غالب

یہ وہ شعر ہے جس کی خوبی پر تمام شارحین غالب اور مولانا حالی بہ اتفاق رطب اللسان ہیں اور کوئی شک نہیں کہ یہ ایجاز واختصار کے لحاظ سے بیت الغزل کہا جاسکتا ہے۔ مگر مومن نے اس قافیہ کے کہنے میں نہایت جگر کاوی کی اور لطف یہ کہ اپنے رنگ پر قائم رہ کر اتنا عمدہ کہا ہے کہ غالب کے شعر سے اگر زیادہ نہیں تو کسی طرح کم بھی نہیں ہے۔

ہے اعتماد مرے بختِ خفتہ پر کیا کیا
وگرنہ خواب کہاں چشمِ پاسباں کے لئے
مومن

خواب چشم پاسباں کا اپنے بختِ خفتہ کو معتمد علیہ قرار دینا ایک عجیب وغریب مضمون ہے اس پر اس کے انداز بیان نے ایک اور قیامت ڈھا دی ہے جس کی تشریح ناظرین کے غور وتعمق کی محتاج ہے۔

ایک غزل اور ہے جس کی ردیف وقافیہ۔ جائے ہے۔ آئے ہے۔ ہے ہم طرح ہے مگر افسوس کہ ہم قافیہ شعر کوئی بھی نہیں۔ دوسری غزل وہ ہے جس کا ردیف وقافیہ۔ حیا ہے۔ مزا ہے۔ اس میں دو تین قوافی ملتے ہیں۔

غالب کہتا ہے ؎

شبنم بہ گل و لالہ نہ خالی ز ادا ہے　　داغِ دلِ بے درد نظر گاہِ حیا ہے

بیان کرنے والوں نے اس شعر کے عجیب عجیب معنی بیان کئے ہیں۔ ممکن ہے وہ سب کے سب صحیح ہوں مگر اصل میں یہ شعر وہی بیدل اور شوکت بخاری وغیرہ کے رنگ میں ہے جس سے آخر میں خود غالب بھی متنفر ہو گئے تھے۔ اسی لحاظ سے اس کو قابل اعتنا قرار دے کر کوہ کندن وکاہ برآوردن کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ سنئے مومن کا شعر سنئے جس کے بیان کی روانی۔ زبان کی خوبی قابل داد ہے۔

کس طرح نہ اُس شوخ کے رونے پہ ہنسوں میں
نظروں میں مروت ہے نہ آنکھوں میں حیا ہے

بارہا سنا گیا ہے کہ معشوق کے رونے پر ہنستے ہیں۔ مگر جو صورت مومن نے بیان کی ہے وہ انتہائی درجہ ہے اس بدگمانی کا جو آخر میں عاشق کو پیدا ہو جاتی ہے اور کسی صورت معشوق کی بے وفائی کا خیال اُس کے دل سے نہیں ہٹتا ؎

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے　　غالب

غالب کا یہ شعر بے مثل ہے جس کے مقابلہ پر مومن کا یہ شعر لکھنا صرف موازنہ کی ضرورت سے ہے ورنہ درحقیقت کوئی نسبت نہیں ہے۔

آزردۂ حرماں سے ملاقات نبھے کیا
یعنی کہ نہ ملنا ہی نہ ملنے کی سزا ہے

دونوں باکمالوں کے مقطعے بھی دونوں کے کمال کا آئینہ ہیں جن کو میں صرف نقل کئے دیتا ہوں۔ امتیاز ارباب ذوق کی نظر پر منحصر ہے۔ میں کوئی فرق نہیں نکال سکتا میرے خیال میں ایک کی خوبیاں دوسرے پر غالب آئی جاتی ہیں ؎

بیگانگیٔ خلق سے بیدل نہ ہو غالب
کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے　　غالب
مومن نہ سہی بوسۂ پا سجدہ کریں گے
وہ بت ہے جو اوروں کا تو اپنا بھی خدا ہے　　مومن

## موازنہ مضامین

جہاں تک میرا خیال ہے غالب اور مومن کے ہم قافیہ شعر اب نہیں رہے اگرچہ مجھے اس بات کا دعویٰ نہیں ہے کہ میں نے اس فرض کو اچھی طرح ادا کیا۔ مگر یہ کہنے کی گنجائش ہے کہ دونوں کے ہم قافیہ شعروں میں سے کوئی شعر شاید باقی نہیں رہا۔

اس سے زیادہ لطیف چیز میرے نزدیک وہ ہم مضمون اشعار ہیں جو دونوں استادوں کے یہاں ملتے ہیں اور جن سے صحیح طریق پر دونوں کی افتاد طبیعت کا پتہ چلتا ہے ؎

اس نقش پا کے سجدہ نے کیا کیا کیا ذلیل
مومن — میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

یعنی مجھے نقش پا کے اوپر سجدہ کرنا فرض تھا اور معشوق کے نقش پا صرف کوچۂ رقیب ہی میں مل سکتے تھے اس واسطے وہیں سجدہ کیا اور رقیب کے کوچہ میں سجدہ کرنا میرے لئے باعث ننگ تھا ؎

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
غالب — اے کاش جانتا نہ تری رہ گزر کو میں

معنی جو کچھ ہیں ظاہر ہیں صرف یہ لکھنا ضروری ہے کہ اشتراک جذبۂ رشک و رقابت۔ خودداری اور احترام عشق میں ہے۔ غالب اس کے رہ گزر کو ڈھونڈھتے اور اسی کی وجہ سے کوچۂ رقیب میں جاتے ہیں ان کے یہاں بہ نسبت عشق کے خودداری کا جذبہ غالب ہے جس سے تنگ ہو کر وہ کہتے ہیں کہ ع

اے کاش جانتا نہ تری رہ گذر کو میں

برعکس اس کے یہاں جذبۂ عشق کا غلبہ ہے کہ جہاں تک ان کو نقش قدم ملے وہیں تک سجدے کرتے گئے۔ مگر پھر بھی غلبۂ عشق اسکے سوا کہنے اور کہنے سے مانع ہے کہ میں کیا ذلیل ہوا ہوں مگر وہ غالب کی طرح اس ذلت کو صرف ذلت سمجھتے ہیں یہ نہیں کہتے کہ کاش میں ایسا نہ کرتا۔ اسی سے دونوں کے مزاج اور طبیعتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ مومن کے یہاں احترام عشق کو ملحوظ رکھتے ہوئے شعر کو ترجیح دینا پڑتی ہے۔

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا
مومن — میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا

دوستی کا پردہ ہے بیگانگی
غالب — منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیئے

اشتراک مضمون صرف اس بات میں ہے کہ کھنچا کھنچا رہنا کسی تعلق کا پتہ دیتا ہے اور برعکس اس کے سب سے یکساں برتاؤ کرنا اس خیال کو زائل کرتا ہے خیال میں کسی کو کسی پہ ترجیح نہیں دی جاسکتی۔ البتہ مومن کے یہاں غالب سے انداز تغزل بہت زیادہ ہے۔ غالب کے یہاں بندش میں ایک قسم کی الجھن ہے۔ بعض الفاظ مخل فصاحت بھی ہیں مثلاً چھوڑا چاہیئے وغیرہ مگر مومن کے یہاں اس ثقالت کا نام نہیں ہے۔

کرتے ہیں اپنے زخم جگر کو رفو ہم آپ
مومن — کچھ بھی خیال جنبش مژگاں نہیں رہا

---

پھر جمع کر رہا ہوں دل لخت لخت کو
غالب — عرصہ ہوا ہے دعوت مژگاں کئے ہوئے

غالب کا شعر اس قدر بلند واقع ہوا ہے کہ بادی النظر میں مومن کا شعر اس پایہ کا نہیں معلوم ہوتا۔ اس کا خیال ہے کہ میرا جگر لخت لخت کو جمع کرنا ہی مژگاں کی دعوت دینا ہے۔ اس شعر کی تہ میں جو ایک ظرافت ہے جسے زہر خندہ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ بے حد لطیف ہے۔ مگر مومن کے یہاں اُس کی بجائے ایک قسم کی جدت ہے مگر پر شوق ہے۔ اسی طرح غالب کے یہاں جیسا دوسرا مصرع ہے۔ مومن کے یہاں اس ظرافتِ لطیف کی ایک ہلکی سی جھلک پہلے مصرع میں ہے۔

مومن — ہائے رے چھیڑ اُسنے سن سن کے ۔ حال میرا کہا کہ کیا صاحب
تغافل پیشگی سے مدعا کیا
غالب — کہاں تک اے سراپا ناز کیا کیا

غالب کا مقصد صرف اتنا ہے کہ میں اپنا حال کہتا ہوں وہ سنتا ہے اور پھر بھی تجاہل عارفانہ کی راہ سے کیا کیا کر رہا ہے نہ معلوم اس سے کیا مقصد ہے مگر مومن کا صاف انداز بیان نہ کہیں فارسی ترکیب کا منت کش ہے اور نہ اس بات کو مبہم چھوڑتا ہے کہ آخر اس سے کیا مقصد ہے وہ رموز عشق سے پوری آگاہی رکھتا ہے اور انداز حسن سے قطعاً خبردار ہے وہ جانتا ہے کہ یہ بھی ایک چھیڑ ہے ایک انداز ہے اور پرسش پنہاں۔

مومن — مجھ کو محشر میں وہ صنم نہ ملا حشر اور ایک بار ہونا تھا
وائے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو
غالب — آج تک تو یہ توقع تھی کہ واں ہو جائے گا

غالب قبل از محشر ہی اپنے خیال کا اظہار کرتا ہے لیکن مومن کہتا ہے کہ حشر ہوا اور صنم نہ ملا۔ یہی فقرہ اس بات کا مرادف ہے کہ انصاف نہیں ہوا۔ وہ اس بات کا افسوس کرکے نہیں رہ جاتا بلکہ کہتا ہے کہ یہ ایک ایسا قضیہ ہے ایسا اہم معاملہ ہے کہ اس کے لئے دوبارہ حشر ہونا چاہیئے۔ گو اس کی خواہش بے سود رہتی اور اس کی کوشش بیکار رہتی ہے جو ردیف سے ظاہر ہو رہی ہے مگر اس کی یہ خواہش معانی کے دفتر کے دفتر پیش کر دیتی ہے اگرچہ غالب کے یہاں معشوق اور عاشق کی ایک گفتگو جو شعر کے مضمون سے پہلے ہونی چاہیئے مقدر ماننی پڑتی ہے مگر پھر بھی وہ شعر کی چرکی کو پورا نہیں کر سکتی۔

چاہتا ہوں میں کہ مسجد میں رہوں مومن ولے
مومن — کیا کروں بتخانے کی جانب کھنچا جاتا ہے دل
غالب — جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد پر طبیعت ادھر نہیں آتی

مفہوم دونوں شعروں کا ایک ہے۔ مگر غالب کے یہاں بندش اس قدر چست ہے کہ مومن کے شعر کی یہ لطافت بھی کہ دل خود بخود بت خانہ کی طرف کھنچا جاتا ہے۔ اُس کا مقابلہ نہیں کرتی۔

پاتے تھے چین کب غمِ دوری سے گھر میں ہم
مومن — راحت وطن کی یاد کریں کیا سفر میں ہم
تھی وطن میں شان کیا غالب کہ ہو غربت میں قدر
غالب — بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس جو گلخن میں نہیں

مومن کا خیال ہے کہ گھر میں بھی دوری تھی اور اسی غم میں مبتلا تھے اب غربت میں ہیں تو غربت ہم کو کیا وطن کی یاد دلائے وہاں کون سی راحت تھی۔ اور یہاں کیا نہیں ہے یہ ایک صاف اور سیدھا مضمون ہے مگر غالب کی جگر کاوی اور ان کی مضمون آفرینی اس میں عجیب شان پیدا کر دیتی ہے اور یہ کہنا کہ ہماری وطن میں کون سی شان تھی کہ غربت میں کسی قدر کی امید رکھیں۔ مایوسی و غم و حرماں کی ایک مکمل تصویر ہے اُس پر یہ تشبیہ کہ میں ایک مشت خس ہوں اور وطن میرے لئے گلخن ہے۔ اب وطن میں نہیں ہوں تو گویا گلخن میں نہیں ہوں۔ شعر کو لے اڑی ہے اور باوجود نامانوس الفاظ کے بھی مومن کے شعر کو برابر نہیں آنے دیتی۔ مومن کے یہاں اگر کوئی خوبی ہے تو اس شعر میں صرف اندازِ تغزل ہے جس کے مقابلہ میں غالب کا یہ شعر بھی لایا جا سکتا ہے ؎

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب
تم کو بے مہریٔ اربابِ وطن یاد نہیں

مومن — ہو کے آزردہ پشیماں ہوں کہ میں جس سے کہوں
سن کے کہوے کوئی ایسے سے خفا ہوتا ہے

غالب — نہ ہے اُس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے
تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

غالب انتہائے حزن و یاس۔ خودداری اور غلبۂ عشق کا اظہار کرتا ہے اکثر ہوتا ہے کہ جب ظلم و ستم حد سے گذر جاتے ہیں تو عاشق کے دل میں ایک جذبہ اسی قسم کا پیدا ہوتا ہے مگر وہ ایک قسم کا جنون ہے جس کا نتیجہ اعترافِ شکست کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا اس مضمون کو قائم چاند پوری نے خوب کہا ہے ؎

ظالم تو میری سادہ دلی پر تو رحم کر — روٹھا تھا تجھ سے آپ ہی اور آپ من گیا

مومن بھی اسی جذبۂ خودداری کا اظہار کرتا ہے مگر غلبۂ عشق کی کیفیت اور حسن کا احترام اور اپنی دیوانگی کا اس ٹکڑے سے اظہار کر دیتا ہے کہ "کوئی ایسے سے خفا ہوتا ہے۔" اور یہی کیفیت ہے جو غالب کے اتنے بے مثل شعر سے بڑھا کر مومن کے اندازِ بیان کو میرؔ سے ملا دیتی ہے۔

مومن — بڑی مشکل پڑی کیا چارۂ دردِ نہاں سمجھے — کہیں تو کیا کہیں اور بن کہے کیونکر دوا ہووے

غالب — ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال — کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیونکر ہو

غالب کا خیال ہے کہ اب ہماری قوتِ مدرکہ نے یہ بات طے کر لی ہے کہ وصال دراصل کوئی چیز نہیں بلکہ وصال نام ہے اس فکر کا کہ "گر نہ ہو" الخ مومن کہتے ہیں کہ عجب مشکل میں پڑے ہوئے ہیں اور ہمارا عجیب درد ہے جب سوچتے ہیں کہ اس کا علاج کریں تو درد بیان نہیں ہو سکتا۔ اور بغیر اظہارِ درد کی دوا ممکن نہیں۔ خیال قریب قریب الجھن اور کاوش کی وجہ سے مشترک ہے مگر غالب کے یہاں شعریت اور تغزل زیادہ ہے اور مومن کے یہاں بخلاف اُن کے طرز کے منطقیت زیادہ ہو گئی ہے۔

مومن — چھٹکر کہاں اسیرِ محبت کی زندگی — ناصح یہ بندِ غم نہیں قیدِ حیات ہے

غالب — قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں — موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

مومن اپنے عاشقانہ انداز میں کہتے ہیں کہ ناصح تو نے یہ سمجھا ہے کہ اگر میں بندِ غم سے آزاد ہو جاؤں تو زندگی بہ آرام گزریگی

حالانکہ تیرا یہ خیال ہے کیونکہ یہ بندِ غم ہی دراصل قیدِ حیات ہے اس کے بغیر کسی اسیرِ محبت کی زندگی ہو ہی نہیں سکتی۔ ایسا ہی ایک یہ شعر بھی ہے۔

مومن
درد ہے جان کے عوض ہر رگ و پے میں ساری
چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا

مومن نے شعر مذکور کو دائرہ عشق و محبت میں رکھا ہے اور غالب نے اپنی طرز کے موافق اس میں منطقی استدلال کی صورت پیدا کردی ہے بلحاظ تغزل کے مومن کے شعر کو ترجیح دی جاسکے تو شاید صحیح ہو ورنہ بات بالکل ایک ہے اور ایک دوسرے سے کم نہیں۔

مومن
بدنامیوں کے ڈر سے عبث تم چلے کہ میں
ہوں تیرہ روز میری سحر بھی تو رات ہے

غالب
جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

وہی فرق ہے۔ مومن صرف اپنی تیرہ روزی کو سبب قرار دے کر دن کو رات کہتا ہے اور غالب اس کلیہ کو عام کردیتا ہے اور وہی شان منطق جو ان کا خاصہ ہے اُس میں پیدا کرکے قریب قریب ایک علمی مسئلہ کو عشقیہ شعر بنا دیتا ہے۔ مومن کے یہاں یہ بات زیادہ ہے کہ تم کیوں جاتے ہو میرے یہاں دن اور رات یکساں ہیں۔ مگر غور سے دیکھئے تو یہاں سوال پیدا ہو جائے گا کہ عاشق کی تیرہ روزی صرف فراق سے ہوتی ہے مگر اب تو معشوق موجود ہے۔ پھر اب دل کیونکر تیرہ ہو سکتا ہے۔ اور سحر رات کی طرح کیونکر تاریک ٹھہر سکتی ہے۔

مومن
کرکے زخمی مجھے نادم ہوں یہ ممکن ہی نہیں
گر وہ ہوں گے بھی تو بے وقت پشیماں ہوں گے

غالب
کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

اشتراکِ خیال معشوق کی پشیمانی میں ہے۔ مگر غالب کے یہاں انداز بیان مومن سے بہتر ہے اگرچہ مومن کے یہاں بھی بندش وغیرہ نہایت چست ہے مگر ع

ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

غالب کو مومن کے درجہ سے ہٹا کر حافظ کے مقابل پر پہونچا دیتا ہے۔

حافظ
آفریں بر دلِ نرم تو کہ از بہرِ ثواب
کشتۂ غمزۂ خود را بنماز آمدہٗ

---

مومن
اب تو مرجانا بھی مشکل ہے ترے بیمار کو
ضعف کے باعث کہاں دنیا سے اٹھا جائے ہے

غالب
در کشاکش ضعفم نگسلد رواں از تن
اینکہ من نمی میرم ہم ز ناتوانی ہاست

دونوں خیال بالکل یکساں ہیں اور سوائے زبان کے اور کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ البتہ مومن نے وہی قیدِ عشق

اور غالب نے عمومیت پیدا کر دی ہے جس سے کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہو گیا ہے مگر درجۂ امتیاز نہیں پیدا ہو سکتا۔

مومن — کیا کیجیے کہ طاقتِ نظارہ ہی نہیں — جتنے وہ بے حجاب ہیں ہم شرمسار ہیں

غالب — جب وہ جمالِ دلفروز صورتِ مہرِ نیم روز — آپ ہی ہو نظارہ سوز پردہ میں منہ چھپائے کیوں

اشتراک صرف اس خیال میں ہے کہ کوئی اس کو بے حجاب نہیں دیکھ سکتا۔ غالب کے یہاں وہی استدلال منطق ہے مگر مومن کے یہاں "کیا کیجیے" اور ؎

وہ جتنے بے حجاب ہیں ہم شرمسار ہیں

دونوں ٹکڑے نہایت ہی عجیب و غریب ہیں جن سے عشق کی محرومی مترشح ہوتی ہے اور اسی کی بنا پر اس شعر کو غالب کے شعر سے مرجح قرار دیا جا سکتا ہے۔ غالب کا ایک شعر اور بھی قریب قریب اسی مضمون کا ہے۔

غالب — نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا — مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

---

مومن — جان دیدوں ہے اس آفتِ جاں سے معاملہ — بس کب تلک انتظارِ تقاضائے دل کروں

غالب — دل اس کو پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے — ہمیں دماغ کہاں حسن کے تقاضا کا

جان یا دل قبل تقاضا دینے کی وجہ سے دونوں خیال مشترک ہیں۔ غالب کے یہاں بر بنائے وضع خودداری تقاضائے حسن کو مکروہ سمجھا ہے اور مومن کے یہاں جان دینا اس وجہ سے ہے کہ حسن آفتِ جان ہے۔ وہ خواہ مخواہ ایک نہ ایک وقت میں جان لے کر چھوڑے گا۔ فرق دونوں خیالوں میں صرف اسی سبب کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ مومن کے یہاں صفائی ہے۔ بس کے لفظ نے حدِ انتظار قائم کر کے اور بھی ایک زور پیدا کر دیا ہے۔ غالب کے اس شعر پر علی حیدر صاحب نظم طباطبائی نے اعتراض کیا ہے کہ بجائے تقاضا کے تقاضے چاہیے۔ مگر یہ اعتراض صحیح نہیں ہے۔ ہر چند کہ زبان پر دونے کے ساتھ ہے۔ مگر یوں بھی غلط نہیں ہے بلکہ صحیح اسی طرح ہے۔ میر ممنون دہلوی استاد اکبر شاہ ثانی کہتے ہیں ؎

الٰہی وہ جو وعدے ہیں وفا کس طرح ہوویںگے

میر ممنون — نہ واں خو یاد آنے کی نہ یاں شیوہ تقاضا کا

مومن — منظور ہو تو وصل سے بہتر ستم نہیں — اتنا رہا ہوں دور کہ ہجراں کا غم نہیں

غالب — رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج — مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

اشتراک خیال اس بات میں ہے کہ خوگرِ رنج ہونے پر رنج رنج نہیں رہتا۔ مومن کہتا ہے کہ اب میں جدا رہتے رہتے جدائی کا خوگر ہو گیا اور اسی وجہ سے کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوتی۔ لہٰذا اگر مجھے اب بھی تکلیف دینا چاہتے ہو تو یوں تکلیف دو کہ مجھ سے ملو تاکہ میں خوکردۂ ہجراں اس نئی صورت سے تکلیف پاؤں اور غالب صرف ایک فلسفیانہ مسئلہ بتا دیتے ہیں اور کچھ نہیں کہتے۔ چونکہ مومن کے یہاں یہ مسئلہ بھی ہے مضمون آفرینی بھی ہے اور پھر حدودِ تغزل سے باہر نہیں اس لئے ان کے شعر کو ترجیح دی جائے گی۔

مومن — کس پہ مرتے ہو آپ پوچھتے ہیں — مجھے فکرِ جواب نے مارا

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے

غالب — کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا

معشوق کے تجاہلِ عارفانہ کے لحاظ سے دونوں خیالوں میں اشتراک ہے مگر غالب کے یہاں نہایت عمدہ طریقہ سے یہ مفہوم ادا کیا گیا ہے جو مومن اور نعمت خاں عالی دونوں سے زیادہ ہے ؎

زمردم یار می پرسد کہ عالی کیست طالع ہیں — کہ عمرم در محبت رفت وکار آخر رسید ایں جا

---

جب ہو گیا یقیں کہ نہیں طاقتِ وصال

مومن — دم میں ہمارے وہ ستم ایجاد آگیا

غالب — کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن — جانوں کسی کا حال میں کیونکر کہے بغیر

معشوق کی ایک عیارانہ چال اور ایک التفاتِ بیکار کے لحاظ سے دونوں خیال ایک ہیں مگر مومن کے بیان میں ایک قسم کی رکاکت ہے اور غالب کے ہاں چستیٔ بندش کے ساتھ خیال میں ایک قسم کی پختگی ہے ۔ پھر بھی مومن کا شعر غالب کے شعر سے میرے نزدیک کم نہیں ۔ بلکہ اس مصرع کی بلاغت ع

جب ہو گیا یقیں کہ نہیں طاقتِ وصال

پر پورا پورا غور کیا جائے تو اس سے بہتر بھی کہا جاسکتا ہے ۔

مومن — وقتِ جوشِ بحرِ گریہ میں جو گرم نالہ تھا — حلقۂ گرداب ہر اک شعلۂ جوالہ تھا

شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا

غالب — شعلۂ جوالہ ہر اک حلقۂ گرداب تھا

میں نے غور کے باوجود بھی اُس فرق کو دریافت نہیں کیا جو ان دونوں شعروں میں ہے ۔

مومن — رشکِ پیغام ہے عنان کشِ دل — نامہ برراہ بر نہ ہو جائے

غالب — ہو لئے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ — یارب اپنے خط کو ہم پہونچائیں کیا

اشتراک خیال رشک کی وجہ سے ہے ۔ مگر مومن کا انداز بیان کہ "نامہ برراہ بر نہ ہو جائے" عجیب و غریب ہے ۔ پہلے مصرع میں جو ترکیب صرف کی ہے وہی مفید معنی ہے ۔ اور ہر لحاظ سے شعر کو غالب کے شعر پر غالب رکھتی ہے ۔

صبحِ فرقت ہے وہ نہ شامِ وصال

مومن — ہائے کیا ہو گیا زمانے کو

وہ فراق اور وہ وصال کہاں

وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

خیالات صاف صاف ہیں مگر مومن کا دردناک اندازِ بیان اتنا زبردست ہے کہ کسی حیثیت سے غالب کا شعر اُس کا مقابلہ نہیں کرسکتا ۔

---

# مومن کا فارسی کلام

(جوہر ٹونکی)

حکیم مومن کی فارسی شاعری کے متعلق نہ تو آج تک وضاحت سے کسی نے کچھ لکھا اور نہ عام طور سے دنیا کو معلوم ہے کہ مومن خاں کی کلیات فارسی کن اصناف سخن پر مشتمل ہے غالباً میں بھی اس سے بیخبر ہی رہتا اگر مجھ کو قسمت سے مومن خاں کے فارسی کلام کا مجموعہ نہ مل جاتا۔ مجھے جب یہ نسخہ دستیاب ہوا تو میں نے اکثر محققین سے ذریعہ خطوط معلوم کیا کہ مومن خاں کے کلیات کے متعلق ان کی کیا رائے ہے، لیکن قریب قریب سب نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

سب سے پہلے میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ نادر نسخہ مومن خاں کے پاس ۔ سے مجھ تک کس طرح پہنچا۔ اس نسخہ کے مجھ تک پہنچنے کا ذریعہ نواب وزیر الدولہ صاحب بہادر والی ٹونک ہیں۔ جو میرے پردادا صاحبزادہ عباد اللہ خاں کے بھائی تھے۔ نواب وزیر الدولہ والیِ ٹونک سے چونکہ مومن خاں کے خاص تعلقات تھے اس لئے مومن خاں نواب صاحب سے اکثر خط و کتابت کرتے رہتے تھے۔ مومن خاں سے ابتدائی تعلقات نواب صاحب کے اس وقت ہوئے جبکہ نواب صاحب ایک عرصہ تک انتظاماً دہلی میں مقیم رہے۔ بہادر شاہ بادشاہ چونکہ نواب وزیر الدولہ صاحب کے خالو تھے اس لئے اکثر دہلی کے باکمال لوگوں سے ان کی رسم و راہ ہوگئی جن میں ایک مومن خاں بھی تھے۔ مومن خاں نے نواب موصوف کے لئے کچھ قصائد بھی لکھ کر روانہ کئے تھے۔ ایک قصیدہ کلیات مومن (اردو) میں درج ہے جس کا مطلع ہے:۔

یاد ایام عشرت فانی ۔۔۔ نہ وہ ہم ہیں نہ وہ تن آسانی

انھیں ایام میں یہ نسخہ بھی نواب وزیر الدولہ کو مومن خاں نے بطور نذر روانہ کیا تھا ۔۔۔ مومن خاں اور نواب وزیر الدولہ میں خاص تعلقات پیدا ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ دونوں ایک ہی پیر کے مرید تھے۔ جس زمانہ میں یہ نسخہ روانہ کیا گیا اس وقت چونکہ میرے پردادا کو بھی شاعری سے شغف تھا اس لئے انھوں نے نواب صاحب سے نسخہ ہذا کو مانگ لیا میرے پردادا کے انتقال کے بعد یہ نسخہ میرے دادا کے پاس رہا اُن کے بعد میرے والد مرحوم کے ورثہ میں آگیا۔ لیکن یہ نسخہ کسی طرح والد صاحب کے پاس سے گم ہوگیا اور ایک عرصہ تک گم رہا اور والد صاحب کی وفات کے قریب دس سال بعد ایک روز بازار میں فروخت ہوتا ہوا دیکھا گیا۔ میرے نزدیک مولانا احمد حسن صاحب جو مومن خاں سے خاص عقیدت رکھتے ہیں انھوں نے اس نسخہ کو خرید لیا اور میں نے ان سے لیا۔

**نسخہ کی خصوصیت۔** نسخہ میں خاص خصوصیت یہ ہے کہ جہاں جہاں کاتب سے غلطیاں ہوئی ہیں، وہاں مومن خاں نے

خود اپنے قلم سے ان کی اصلاح کی ہے، ایسی اصلاحیں نسخہ میں پچاس ساٹھ جگہ موجود ہیں۔ اگر کسی غزل یا قصیدے یا تاریخ میں کوئی شعر رہ گیا ہے تو بعد میں اس کا اضافہ مومن خاں نے خود اپنے قلم سے کیا ہے۔ اس کے علاوہ جو آٹھ تاریخی رباعیوں کا نسخہ روانہ کرتے وقت اضافہ کیا گیا ہے وہ بھی مومن خاں نے خود اپنے ہی قلم سے کیا ہے جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ تاریخ وفات خواجہ محمد نصیر مرحوم (نواسہ خواجہ میر درد قدس سرہٗ)
۲۔ تاریخ وفات عبداللہ عرف مغلجان وکیل عدالت دیوانی دہلی۔
۳۔ تاریخ جلوہ پردازی در عہد محمد بہادر شاہ بادشاہ۔
۴۔ تاریخ ریش تراشیدن دبیر الدولہ۔
۵۔ دیگر
۶۔ کتخدائی برادر زادہ خود عبدالرحمٰن۔
۷۔ " نامعلوم
۸۔ " نامعلوم

## تفصیل اصنافِ سخن

قصائد چھ، غزلیں ایک سو پندرہ، رباعیاں ایک سو چھتر تاریخیں سو ہیں اور کل صفحات ایک سو چھیانوے۔ ایک قصیدے کے بعض اشعار ملاحظہ ہوں۔

گر چنیں است گردشِ افلاک — زود چو گنج میروم در خاک
زارم از عشق ظالمے کہ ازو — ہم فلک کردہ ظلم استدراک
دلِ بریاں و خاطرِ مایوس — جانِ نمناک و دیدۂ نمناک
باتب و تابِ آتشِ ہجراں — آنچنانم کہ شعلہ و خاشاک
ہستیم کار کردہ بر من تنگ — دارم از سلیِ مرگ چشم ہلاک
تا رود آب در حضیض زمیں — تا کند نخل سر سوئے افلاک
دشمن و دوست تو مائل باد — بہ نشیبِ ثریٰ باوجِ سماک

## غزل

مومن خاں کی غزل کا انداز جس طرح اردو میں جداگانہ حیثیت رکھتا ہے اسی طرح فارسی میں بھی وہ کسی بات کو معمولی طرح نہیں کہتے وہ اپنا خیال پیچیدگی کے ساتھ بیان کرتے ہیں لیکن زبان و بیان کی سلاست و حلاوت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے انھیں خصوصیات کی بنا پر ان کا فارسی کلام ایک خاص مرتبہ رکھتا ہے۔

مثال کے طور پر چند شعر پیش کئے جاتے ہیں۔

یار گر خواست کہ عاشق نہ رسد تا سر کو — راند اوّل ز در خویش نگہبانش را

مومن خاں محبوب کے دربان سے چونکہ بدگمان ہیں اس لئے اظہار بدگمانی نہایت لطیف پیرایہ میں کیا ہے۔

ناصح کہ چاکِ غرضِ من بخیہ میزند — یارب نہ بیند آں صنم جامہ زیب را

یہاں مومن خاں کو اپنے ناصح مشفق سے خوف رقابت پیدا ہو جاتا ہے اور وہ نہیں چاہتے کہ ناصح اُن کے صنم جامہ زیب کو دیکھے۔ رشک اور خوف رقابت کے ساتھ ساتھ، شعر سے ایک لطیف طنز کا پہلو بھی نکلتا ہے یعنی ناصح مشفق اسی وقت تک

میری بخیہ گری میں مصروف ہے اور اسی وقت تک مجھے نصیحت کر رہا ہے جب تک کہ اُس نے میرے محبوب کو نہیں دیکھا ہے جب وہ اسے دیکھ لے گا تو یقیناً وہ بجائے میرے اپنے دامن کی بخیہ گری کی فکر کرے گا۔ اس لئے بہتر ہے کہ وہ میرے صنم جامہ زیب کو دیکھے ہی نہیں۔

دل را فریب وعدہ بدہ گو وفا مکن　　　شاید تسلی شود ایں ناشکیب را

اللہ رے مجبوری عشق کہ دل کی خاطر دانستہ فریب کھانا گوارا کرتے ہیں اور محبوب سے فریب دہی کی التجا کسقدر موثر الفاظ میں کرتے ہیں

نازکیں بیشگا فداں ستمگر سینۂ مارا　　　کہ بہر آرزوے خولیش خالی میکند جا را

مومن کے یہاں دیگر خصوصیات کے علاوہ ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے محبوب کو کسی حالت میں مورد الزام ٹھہرانا نہیں چاہتے بلکہ ان کی ہر جفا کو وفا سمجھتے ہیں اور اُس کی دشمنی اور عداوت کو دوستی تصوّر کرتے ہیں۔ محبوب کی بیگانہ روی کے زخم دل پر پے در پے کھاتے ہیں اور پھر بھی لذت یگانگت محسوس کرتے ہیں۔

در رنجِ زندگی بخیالِ عدم خوشم　　　یادِ وطن زدود فزاید غریب را

مومن انتہائی عالم یاس میں بھی مسکراتے ہیں ہر غم میں ان کی زندہ دلی کسی نہ کسی صورت سے کوئی خوشی کا پہلو نکال ہی لیتی ہے گو دنیا کی بے ثباتی کی تصویر الفاظ سے کھینچ رہے ہیں اور عارضی قیام گاہ کو مستقرِ دائمی پر ترجیح دے رہے ہیں لیکن رنج زندگی کو تکلیفِ مسافرت قرار دے کر تصورِ عدم سے خرم و شادکام ہیں۔

زکاہشِ غمش اندر وطن غریب شدم　　　کہ ہیچکس نشناسد دریں دیار مرا

وطن میں رہ کر اپنے غریب الوطن ہونے کا کس قدر مکمل ثبوت دیا ہے۔

رحمے چہ میکنی بگمانِ جنونِ شوق　　　پیراہنِ رقیب قبا کردہ ایم ما

اس شعر میں مومن خاں کا ذوقِ شعری اپنے اصلی خدوخال میں نمایاں ہے وہ محبوب کی نگاہ سے رقیب کا اعتبار کھونے کے لئے اس کا سارا روپ بدلتے ہیں اور وہ جب ان پر رحم کھاتا ہے تو اصل واقعہ کا اظہار کرتے ہیں۔ یعنی اس کو متنبہ کرنا چاہتے ہیں کہ رقیب کا جنونِ شوق رقیب کے لئے جو تیری مہربانی اور رحم کی وجہ بنا ہوا ہے وہ فرضی ہے اور رقیب صرف تیری مہربانی حاصل کرنے کے لئے اور تجھے اپنی محبت میں مبتلا کرنے کے لئے جنونِ شوق کا ڈھونگ رچائے ہوئے ہے اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب میں رقیب کا بھیس بدل کر اور اُس کی قبا پہن کر تیرے سامنے آیا تو تو مجھ پر بھی رحم کرنے پر مجبور ہو گیا۔

ازکفِ دشمن گرفتم جام را　　　می شناسم گردشِ ایام را

چونکہ علم ستارہ شناسی میں مومن کو ید طولےٰ حاصل تھا اس لئے اُن کی نظر گردشِ دوراں کا اچھی طرح جائزہ لے سکتی تھی، چنانچہ مومن خاں کا یہ کہنا کہ "می شناسم گردشِ ایام را" میرے خیال میں غلط نہ ہوگا شعر سے ظاہر ہے کہ انھوں نے اپنی زمانہ شناسی کا ثبوت بطریق احسن پیش کیا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ "زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز" کی تشریح۔ جس جامعیت کے ساتھ کی ہے وہ قابلِ داد ہے، لفظ "دشمن" سے جو تغزل شعر میں پیدا کیا گیا ہے وہ بھی صرف مومن خاں ہی کا حصہ ہے۔ مومن خاں دشمن کے ہاتھ سے جام لے کر سیر نہیں ہوتے، کیونکہ وہ تمام میخانے کی شراب کو اپنا ہی حق سمجھتے ہیں

یا یہ کہئے کہ دوسرے کو اس کا اہل نہیں سمجھتے ۔

شکستنِ دلِ صیاد چوں روا دارم فگند دام و قفس تا کند شکار مرا

اسے مقتضائے عاشقی کہئے یا مومن کی فطرت یا افتادِ طبیعت کہ وہ دانستہ مصیبت میں پھنسنا چاہتے ہیں لیکن کسی کی دل شکنی کرنا گوارا نہیں کرتے ۔ اسی غزل کا ایک اور شعر ملاحظہ فرمائیں :-

ز شوقِ جورِ تو در خویشتن نمی گنجم چہ غم کہ تنگیِ عالم دہد فشار مرا

تنگی عالم کے جملہ کی جامعیت ملاحظہ ہو کہ ایک جملہ سے دو معنی پیدا کئے گئے ہیں ۔ ایک جگہ تنگی کے لفظی معنی اختصار اور کمی کے لئے گئے ہیں تو دوسری جگہ اصطلاحی معنی رنج و ابتلا کے لئے گئے ہیں ۔ یہ امر مسلم ہے کہ جو شخص اپنے آپ میں نہیں سما سکتا وہ از خود رفتہ ہے اور بحالت از خود رفتگی تنگیِ عالم کا اس کو کچھ غم نہیں ہو سکتا یعنی عالم از خود رفتگی نے تنگی اور کشادگی تکلیف اور مصیبت کا احساس ہی اُس کے دل سے کھو دیا ہے ۔ اس لئے اُس کو تنگیِ عالم محسوس ہی نہیں ہے ۔

اب میں کچھ ایسے ہم طرح اشعار پیش کرتا ہوں جو دوسرے شعرا کے یہاں انھیں قوافی میں پائے جاتے ہیں :-

## غالب ، مومن

غالب :- دل مایوس را تسکیں بروں میتواں دادن چہ امید است آخر خضر و ادریس و مسیحا را

غالب کو دل مایوسی کے مرض سے اس قدر مایوس ہے کہ تسکین مسیحا و ادریس و خضر سے بھی مطمئن نہیں ہیں اور وہ مزید اپنا اطمینان کرنا چاہتے ہیں ۔

مومن :- مپرس از چارہ ساز یہا ز پرسش بیشتر سوزم تپے دارم کہ اعجازش نفس سوزد مسیحا را

مرض کی نوعیت اور شدت دونوں پر جس خوبصورتی سے روشنی ڈالی گئی ہے ظاہر ہے یہ کلیہ ہے کہ اگر کسی مایوس مریض کی مزاج پرسی کی جائے تو بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ مایوسی کی بنا پر مریض آب دیدہ ہو جاتا ہے اور یہی پرسش احوال مرض میں شدت و اضافہ کا باعث ہو جاتی ہے ۔ اسی کلیہ کو مومن خاں نے بہت خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے ۔

غالب :- غالب رسیدہ ایم بکلکتہ و بہ ے از سینہ داغ دوریِ احباب شستہ ایم

غالب کلکتہ پہنچ کر اپنے دل سے دوستوں کی جدائی کا غم بھلا بیٹھے ہیں ۔ لیکن مومن خاں کہتے ہیں :-

مومن :- تا آب گشتہ ایم ز شرمِ نفاقِ خلق گردے ز دامنِ دلِ احباب شستہ ایم

مومن خاں کا احساسِ غیرت و ایثار قابلِ ملاحظہ ہے کہ وہ دنیا کے نفاق کی وجہ سے شرم سے پانی پانی ہو کر اپنے احباب کے دل سے آپس کی کدورت دھو رہے ہیں ۔

غالب :- راہیست کہ در دل فتد ار خوں رود از دل ناید بزباں شکوہ و بیروں رود از دل

شعر خوب ہے لیکن اب اسی قافیہ میں مومن کا مطلع بھی ملاحظہ فرمائیے ۔

مومن گر دل ہمگی خوں شود و خوں رود از دل مشکل کہ تمنائے تو بیروں رود از دل

کہتے ہیں کہ اگر غم سے دل خون ہو کر بھی بہہ جائے تو بھی مشکل ہے کہ تیری تمنا دل سے دور ہو ۔

اب کچھ اشعار نظیری نیشاپوری اور غالب کی ان مسلسل غزلیات کے پیش کئے جاتے ہیں جو تینوں شعرا نے ایک ہی زمین میں

کہی ہیں - یہ غزل نظیری کی اس وقت کی معلوم ہوتی ہے جب نظیری کا محبوب کسی اور کے عشق میں مبتلا ہے۔

## نظیری، غالب اور مومن

نظیری

چشمش بلاے میرود مژگانِ نمناکش نگر — در سینہ دارد آتشے پیراہنِ چاکش نگر
شرم از میاں برخاستہ مہر از دہاں برداشتہ — گفتارِ بے ترسش ببیں رفتارِ بیباکش نگر
از کوئے معشوق آمدہ شہیدگاں درحلقہ اش — از صیدِ آہو میرسد شیراں بفتراکش نگر

غالب :-

در گریہ از بس نازکی رُخ ماندہ بر خاکش نگر — واں سینہ سودن از تپش بر خاکِ نمناکش نگر
برقے کہ جانہا سوختے دل از جا ترش ببیں — شوخے کہ خونہا ریختے دست از حنا پاکش نگر
آں سینہ کز چشم جہاں مانندِ جاں بودے نہاں — اینک بہ پیراہن عیاں از روزنِ چاکش نگر
بر مقدمِ صید افگنی گوشے بر آوازش ببیں — در بازگشت توسنے چشمے بفتراکش نگر

مومن :-

بسمل شد و جلاد تر انداز بیباکش نگر — خورد آب پیکانِ بلا مژگانِ نمناکش نگر
خاکے بدل افتادہ ام در زلفِ عنبر بیز بیں — گردے بدل بنشستہ ام بر دامنِ پاکش نگر
شوخے کہ از ناز داد آشنید احوالِ کسے — دادِ تظلم میدہد افغان بیباکش نگر
اکنوں برائے بوالہوس صد زخم کاری میزند — آں دستِ ناوک را ببیں پیراہنِ چاکش نگر

نظیری، غالب، مومن، تینوں ہی نے اپنے اپنے اشعار میں محبوب کی عاشقانہ بیتابی اور بے قراری کا اظہار کرتے ہوئے اپنا اپنا زورِ بیان اور کمالِ شاعری دکھایا ہے۔ لیکن نظیری کے مطلع سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ جملہ اشعار معہ مطلع محبوب کے لئے مخصوص کر دئے گئے ہیں۔ "ش" کی ضمیر سے خیال اس طرف جاتا ہے لیکن واضح طور پر نہیں۔ غالب نے اپنے مطلع میں لفظ نازکی کہہ کر اس کمی کو پورا کر دیا ہے۔ علیٰ ہذا مومن خاں نے بھی لفظ "جلاد" مطلع میں کہہ کر جملہ اشعار کے مجموعی مفہوم پر پوری طرح روشنی ڈالدی ہے۔ ان قوافی کے علاوہ دوسرے قوافی بھی مومن نے نظم کئے ہیں جو نظیری کے یہاں تو نہیں ملتے البتہ غالب کے یہاں ملتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں:-

غالب :-

برآستانِ دیگرے در شکرِ دربانش ببیں — در کوئے از خود کمتری در رشک خاشاکش نگر
خواند بہ امیدِ اثر اشعارِ غالب ہر سحر — از نکتہ چینی در گزر فرہنگ دادراکش نگر

مومن :-

گر نیم نازے میکند صد طعنہ بر من می زند — با بیخودیہائے جنوں در ہوش ادراکش نگر
در سجدہ آخر تا کجا نالیدن از دستِ صنم — مومن جبینے ہمچو گل مالیدہ بر خاکش نگر

پختگیِ بیان اور سلاستِ زبان کے اعتبار سے نظیری، غالب اور مومن تینوں کے اشعار کو اگر ملا دیا جائے تو ذرہ برابر فرق معلوم نہیں ہوتا کہ ایرانی شاعر کے کون سے اشعار ہیں اور ہندوستانی شعرا کے کون سے ہیں۔

ایک اور زمین ہے جس میں عبدالرحیم خانخاناں اور نظیری دونوں کا مقابلہ شبلی نے شعر العجم میں کیا ہے یہ امر مسلم ہے کہ خانخاناں کی غزل اپنی کیفیت تغزل کے لحاظ سے اپنا جواب خود آپ ہے۔ بیشک نظیری کا کوئی شعر ایسا نہیں جو خانخاناں کی غزل کے ساتھ پڑھا جاسکے۔ اسی زمین میں غالب اور مومن کی بھی غزلیں ہیں۔ خانخاناں کی غزل کو چھوڑ کر باقی تین شعرا کے

ہم قافیہ اشعار پیش کئے جاتے ہیں صاحبانِ ذوق دلنظر خود فیصلہ کریں کہ نظیری اور غالب نے کیا کہا ہے اور مومن خاں نے انھیں قوافی کو کس طرح نظم کیا ہے۔

نظیری :- درازدستیِ حسن کہ گل بہ چشمم ریخت — کہ تا بدامنم از جیب در شکرخندست
غالب :- نگاہِ مہر بدل سرندادہ چشمہ نوش — ہنوز عیش بانداز ۂ شکرخندست

نظیری کہتا ہے کہ حسن کی درازدستی نے وہ پھول کھلادئے ہیں یعنی (آنکھوں میں وہ اشک خونی پیدا کردئے ہیں) کہ جن کی وجہ سے جیب سے لیکر دامن تک مسکراہٹ ہے۔ شکرخند کے معنیٰ تبسم اور ہنسی کے ہیں۔ اس لئے چاکِ جیب کو بھی شکرخند یعنی مسکراہٹ ہی کہا گیا ہے۔ غالب کہتے ہیں کہ مجھے باوجود محبوب کے التفات کے مکمل مسرّت میسر نہیں ہے اور میرا ابھی عیش تبسم تک محدود ہے۔

اب اسی قافیہ میں مومن خاں کہتے ہیں۔

بہ تلخکامیِ من ذوقِ وصل گریاں باد — دمے کہ زہر چکانم لب شکرخندست

مفہوم کی ندرت کے ساتھ ساتھ مومن کے شعر میں جو تغزل پایا جاتا ہے وہ نظیری اور غالب دونوں کے اشعار کے تغزل سے مرجح حیثیت رکھتا ہے۔ ذرا پیوند کا قافیہ بھی ملاحظہ ہو :-

نظیری :- بحرفِ اہلِ غرض قرب بُعد مانندست — دلِ شکستہٗ ما را ہزار پیوندست
غالب :- درازدستیِ من چاک ارفگند چہ عیب — زہیش دلق ورع باہزار پیوندست
مومن :- بصلح آمد و شوقِ وصال میکشدم — شکستہ آہ دلے راکہ دیر پیوندست

نیاز صاحب نظیری کے شعر کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ نظیری کے شعر کا پہلا مصرعہ الجھا ہوا ہے۔ میرے خیال میں پہلا مصرعہ ہی نہیں بلکہ پورا شعر الجھا ہوا ہے غالب نے بھی دوسرے مصرعہ میں "چہ عیب" کہہ کر عیب نہ ہونے کی کوئی دلیل پیش نہیں کی۔ اگر نظیری کے دوسرے مصرعہ میں دل کو ہزار پیوند کہا گیا ہے تو غالب نے دلق کو ہزار پیوند کہہ دیا لیکن دونوں نے کوئی بات پیدا نہیں کی۔ مومن خاں کے شعر کا دوسرا مصرعہ اپنی معنویت کے اعتبار سے پورے شعر کے مفہوم کا حامل ہے۔

نظیری :- نظیری از تو بجاں کندن است لب بکشائے — بایں قدر کہ بگوئی بمیر خورسندست

نظیری حالتِ نزع میں اپنے محبوب کی زبان سے یہ سننے کا آرزومند ہے کہ "بمیر" اگر محبوب اس سے کہدے کہ مرجا تو مراد پوری ہوجائے۔ غالب[1] نے شعر میں اپنی خودداری کا ثبوت دیا ہے وہ کہتے ہیں کہ غالب وہ نہیں کہ دنیا سے وفا کا طالب ہو وہ دنیا کا احسان لینا نہیں چاہتے بلکہ وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ اگر کوئی غالب کا حال پوچھے اور جواب میں صرف یہ کہدیا جائے کہ وہ جیتے، کافی ہے اور اسی پر وہ خوش ہے۔ . . . . . . . نظیری کے یہاں آرزومند کا قافیہ نہیں ہے۔ غالب اور خانخاناں کے یہاں یہ قافیہ ہے اور خوب ہے۔

خانخاناں :- شمارِ شوق ندانستہ ام کہ تا چندست — جزایں قدر کہ دلم سخت آرزومندست
غالب :- زبیم آنکہ مبادا بمیرم از شادی — نگوید ارچہ بمرگِ من آرزومندست

مومن خاں بھی آرزومند کے قافیہ میں کہتے ہیں۔

---

[1] غالب کا شعر ہے ؎ وآں بود کہ وفا خواہد از جہاں غالب :- بدیں کہ پرسد گویند ہست، خورسندست

خوش است جور توائے چرخ لذتے پردم　　بقہر نیز کہ نادیدہ آرزومند ست

پند کا قافیہ خانخاناں اور نظیری دونوں کے یہاں نہیں ہے غالب کے یہاں البتہ ہے کہتے ہیں :-

غالب :- نگفتۂ کہ بہ تلخی لبا زو پند پذیر　　بروکہ بادۂ ما تلخ تر از ین پند ست

دوسرے مصرعہ کا بے ساختہ پن خوب ہے۔ لیکن مومن کو جو پند سے تنفر ہے وہ بھی قابلِ ملاحظہ ہے۔

مومن :- چناں زحرفِ نصیحت گراں ملول شدم　　کہ نشنوم زلبِ یار ہم اگر پند ست

اب کچھ وہ اشعار مومن ، غالب اور حافظ کے پیش کئے جاتے ہیں جو ہم طرح اور ہم قافیہ ہیں ۔

حافظ :- ساقیا برخیز و در دہ جام را　　خاک برسر کن غمِ ایام را

غالب :- در دلِ تست انچہ برمن میرود　　می شناسم سختیٔ ایام را

مومن :- از کفِ دشمن گرفتم جام را　　می شناسم گردشِ ایام را

حافظ :- محرمِ رازِ دلِ شیدائے من ،　　کس نمی بینم زخاص و عام را

غالب :- رحمت عام است دائم خاص عام　　عشرتِ خاص است ہردم عام را

مومن :- بے کسی بنگر کہ بر تابوتِ من　　چشم گریاں ست خاص و عام را

حافظ :- صبر کن حافظ بسختی استوار　　عاقبت روزے بیابی کام را

غالب :- بسکہ ایمانم بغیب است استوار　　از دہانِ دوست خواہم کام را

مومن :- کام دل ردیش ندیدیم در جہاں　　از جہاں رفتیم کہ جوئیم کام را

ایک دوسری غزل کے کچھ اشعار حافظ اور مومن کے ملاحظہ ہوں :-

حافظ :- آں چناں در ہوائے خاک درش　　میرود آبِ دیدہ ام کہ مپرس

مومن :- بر جگر تیر خوردہ نخچیرم　　نگہے از تو دیدہ ام کہ مپرس

حافظ :- کشتہ ام درجہان و آخر کار　　دلبرے برگزیدہ ام کہ مپرس

مومن :- جائے ما نیز نیست از تنگی　　خلوتے برگزیدہ ام کہ مپرس

حافظ :- من بگوشِ خود از دہانش دوش　　سخنہائے شنیدہ ام کہ مپرس

مومن :- من بکویت نبودم از غیر　　ماجرائے شنیدہ ام کہ مپرس

حافظ :- ہمچو حافظ غریب در رہ عشق　　بمقامے رسیدہ ام کہ مپرس

مومن :- بے تو از حال من چہ می پرسی　　ہاں بجائے رسیدہ ام کہ مپرس

# شرح کلامِ مومن

## بعض استفسارات کے جواب میں

(نیاز فتحپوری)

۱۔ تاثیر سوزِ دل کرۂ نار ہے مگر — اس شعلہ رو کو سینہ سے میرے لگا دیا

کہتے ہیں کہ ہر چیز حیز اصلی کی طرف مائل ہوتی ہے اس لئے آگ بھی اپنے حیز اصلی یعنی کرۂ نار کی طرف مائل ہے اس کو سامنے رکھئے تو شعر کا مطلب واضح ہو جائے گا یعنی اگر میرے سوزِ دل کی تاثیر نے اس شعلہ رو کو مجھ سے ملا دیا تو اس کا سبب یہ ہے کہ میرا سوزِ دل کرۂ نار ہے اور اس شعلہ رو کو اصولاً اس طرف مائل ہونا چاہئے تھا۔ اس شعر کے تمام معنوں کی بنیاد صرف لفظ شعلہ رو پر قائم ہے

۲۔ کیا شاد شاد ہوں کہ وہ ہے تلخکام تر — میری جو شورشوں نے عدو کو مزہ دیا

میری شورشوں اور بیتابیوں سے دشمن نے لطف اٹھانا چاہا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مجھ سے زیادہ تلخکام ہے اور یہ بات میرے لئے بڑی خوشی کی ہے — ہو سکتا ہے کہ لطف اٹھانے سے مراد یہ ہو کہ اس نے محبوب پر اپنی محبت کا اظہار کیا ہو اور محبوب نے اسے بھی تکلیف پہنچائی ہو۔ اب رہا زیادہ تلخکامی کا سوال، سو ہو سکتا ہے کہ اشارہ اس طرف ہو کہ چونکہ عدو نے فی الواقع محبت بھی نہ کی تھی اس لئے یہ تلخکامی اور زیادہ ناگوار ہوئی۔

۳۔ دکھانا نہ ہ میرے نالۂ آہن گداز نے — آئینہ دیکھنے کا تماشہ دکھا دیا

پہلے لوہے کو صیقل کر کے آئینہ بناتے تھے اس لئے مومن کے نالۂ آہن گداز نے محبوب کے آئینہ کو پگھلا دیا۔

۴۔ رشک فغاں کی ہائے رقیب آفرینیاں — محشر نے خفتگانِ زمین کو جگا دیا

محشر نے میری فغاں پر رشک کر کے اتنا ہنگامہ بپا کیا کہ خفتگانِ زمین جاگ اٹھے اور وہ سب محبوب کو دیکھ کر فریفتہ ہو گئے۔ گویا محشر کا میری فغاں پر رشک کرنا میرے حق میں رقیب پیدا کرنے والا ثابت ہوا۔

۵۔ غش ہیں کہ بے دماغ ہیں گل پیرہن نمط — از بس دماغ عطرِ گریباں نہیں رہا

غش ہیں یعنی ہم خوش ہیں کہ گل پیرہن والوں (معشوقوں) کی طرح ہم بھی بے نیاز ہو گئے اور اس طرح کسی کے عطر گریباں سونگھنے کی بھی پروا نہیں رہی۔ مدعا یہ کہ اب ہم بھی معشوقوں کی طرف سے بے پروا ہو گئے ہیں۔

۶۔ ناکامیوں کا گاہِ گلہ، گاہ شکر ہے — شوقِ وصال و اندوہِ ہجراں نہیں رہا

ہماری ناکامیاں اس حد تک پہنچ گئیں کہ نہ شوقِ وصال باقی رہا نہ غمِ ہجراں اور اب ہماری حالت یہ ہے کہ کبھی تو ہم شوقِ وصال باقی نہ رہنے پر اپنی ناکامیوں کی شکایت کرتے ہیں۔ اور کبھی غمِ ہجراں نہ رہنے پر ان کا شکریہ۔

۷۔ آسیب چشم مہر پری طلعتاں نہیں ‌ ‌ ‌ اے انس اک نظر کہ میں انساں نہیں رہا

معشوقوں کی چشم مہر کا ڈر یا خلل مجھے نہیں رہا تو میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ انسان نہیں رہا اس لئے اُے اُنس ، اے محبت پھر اک نظر کر کہ میں پھر انسان بن جاؤں۔

۸۔ بے سیر دشت و بادیہ لگنے لگا ہے جی ‌ ‌ ‌ اور اس خراب گھر میں کہ ویراں نہیں رہا

مومن اس گھر کو جو آباد ہے، خراب کہتا ہے اور پھر تعجب کرتا ہے کہ اسی گھر میں اس کا جی لگنے لگا ہے۔

۹۔ کیا دم نہ کروگے اگر ابرام نہ ہوگا ‌ ‌ ‌ الزام سے حاصل بجز الزام نہ ہوگا

محبوب نے مومن پر یہ الزام قائم کیا کہ تم بالکل پیچھے پڑ گئے ہو اور میں اس بات سے بھاگتا ہوں۔ اس کے جواب میں مومن کہتا ہے کہ کیا اگر میری طرف سے ابرام (اصرار) نہ ہوگا تو کیا تم مجھ سے نہ بھاگو گے یعنی یقیناً بھاگو گے اور پھر الزام تمہیں پر عائد ہوگا۔

۱۰۔ بیٹھا رہوں کیا منتظر دور میں ساقی ‌ ‌ ‌ اتنوں میں کوئی میکدہ آشام نہ ہوگا

اے ساقی کیا میں اس انتظار میں بیٹھا رہوں کہ دورِ شراب مجھ تک آئے تو شراب پیوں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اتنے مجمع میں کوئی ایک بھی ایسا نہ ہوگا جو میخانہ کا میخانہ ختم کر دے اور شراب مجھ تک پہونچ ہی نہ سکے۔

۱۱۔ خو ہو گئی ہجراں میں تڑپنے کی شب وصل ‌ ‌ ‌ گو چین ہو دل کو مجھے آرام نہ ہوگا

اس شعر میں "شبِ وصل" کا تعلق دوسرے مصرعہ سے ہے۔ یعنی مجھے تو ہجر میں تڑپنے کی عادت ہو گئی ہے۔ اس لئے اگر شبِ وصل دل کو چین ملا بھی تو مجھے لطف نہ آئے گا۔

۱۲۔ کم ظرفی اغیار پہ ساقی کی نظر ہے ‌ ‌ ‌ افسوس ہے آلودہ لب جام نہ ہوگا

لب جام کا مے آلودہ ہونا یعنی اسے شراب سے لبریز کر دینا۔ مطلب یہ ہوا کہ ساقی اغیار کی کم ظرفی کو دیکھ رہا ہے۔ اس لئے شاید وہ لبریز جام کسی کو نہ دے گا اور ہم بھی کم ظرفی اغیار کی وجہ سے اس نعمت سے محروم رہیں گے۔

۱۳۔ کیا فتنۂ محشر کو قدِ یار سے نسبت ‌ ‌ ‌ بے خاص کشی ولولۂ عام نہ ہوگا

"خاص کشی" یعنی چُن چُن کر ہلاک کرنا۔ مطلب یہ ہوا کہ قدِ یار تو خاص خاص آدمیوں کو دیکھ کر ہلاک کرتا ہے اس لئے لوگوں میں ولولہ پیدا ہو جاتا ہے لیکن فتنۂ محشر میں تو سبھی ہلاک ہو جائیں گے اس لئے ولولہ کس میں پیدا ہوگا۔

۱۴۔ اغیار سے بے فائدہ ہے گرمیٔ صحبت ‌ ‌ ‌ کاہے کو جلے گے جو کوئی خام نہ ہوگا

اگر تم اغیار سے گرمیٔ صحبت اس لئے رکھتے ہو کہ مجھے جلاؤ تو یہ خیال فضول ہے کیونکہ میں خام تو ہوں نہیں جو جلوں جلنے کا تعلق اغیار سے نہیں بلکہ خود مومن سے ہے۔

۱۵۔ العطش زن سپہر و یار و عدو : ‌ ‌ ‌ بے گنہ خوں مرا سبیل ہوا

میرا خون بیکار سبیل عام ہوا کیونکہ آسمان، رقیب اور محبوب کی پیاس اب بھی نہیں بجھی اور بدستور میرے خون کے پیاسے ہیں۔

۱۶ ہرزہ گردی سے ہم ذلیل ہوئے ‌ ‌ ‌ چرخ کا اعتبار ہونا تھا

ہم اور چرخ دونوں ہی ہرزہ گرد ہیں لیکن میں اپنی ہرزہ گردی کی وجہ سے اتنا ذلیل ہوا کہ آسمان کی ہرزہ گردی کو بھی

لوگ بھول گئے اور میرے مقابلہ میں اس کا اعتبار بڑھ گیا۔

۱۷۔ نہ گیا تیر نالہ سوئے رقیب مرغ عرشی شکار ہونا تھا

"مرغ عرشی" سے مراد فرشتے ہیں۔ یعنی میرے تیر نالہ سے فرشتے تو زخمی ہو گئے لیکن رقیب ان کا شکار نہ بن سکا۔

۱۸۔ امتحاں کیجئے مرا جب تک شوق زور آزما نہیں ہوتا

جب تک میرے شوق نے زور آزمائی نہیں کی۔ امتحاں کئے جائیے لیکن جس دن یہ ہوا تو پھر امتحان ختم ہو جائیگا اور آپ خود کھنچکر میرے پاس پہنچ جائیں گے۔

۱۹۔ نارسائی سے دم رکے تو رکے میں کسی سے خفا نہیں ہوتا

خفا میں ایہام ہے یعنی خفا ہونا برہم ہونے۔ کے معنی میں بھی آتا ہے اور دم رکنے کو بھی "دم خفا ہونا" کہتے ہیں اور اسی ایہام پر شعر کی بنیاد قائم ہے۔

۲۰۔ کیا ہوا ہو اگر وہ بعد امتحاں اپنا بیگنہ سزا پائے اب وہ دل کہاں اپنا

اگر محبوب امتحان کے بعد اپنا ہوا بھی تو کیا کیونکہ اب ہم میں امتحان یعنی بیگناہ سزا پانے کی تاب ہی باقی نہیں

۲۱۔ صبر بعد آسائش اس قلق پہ مشکل تھا عیش جاوداں نکلا رنج جاوداں اپنا

اگر راحت کے بعد تکلیف ہوتی تو صبر مشکل تھا اس لئے ہمارا رنج جاوداں فی الحقیقت عیش جاوداں ہے۔ ہمیں راحت کے بعد تکلیف کا سامنا کرنا ہی پڑا۔

۲۲۔ عشق بت میں خدا ہو تو در خور پرستش ہیں نام ہو گیا اتنا گم کیا نشاں اپنا

ہم نے عشق بت میں اپنا نام و نشان اتنا گم کر دیا کہ نام ہو گیا اور اب خود خدا کی طرح (جو خود بھی بے نام و نشان ہے) ہماری پرستش ہونے لگی۔

۲۳۔ اچھی مری بدنامی تھی یا تھی تری رسوائی گر چھوڑ نہ دیتا میں پامال جفا ہوتا

مومن اپنے محبوب سے ترک الفت کی وجہ ظاہر کر رہے ہیں کہ اگر میں صحبت ترک نہ کرتا تو تم جفا کرتے اور اس طرح تم بدنام ہوتے اسلئے اگر میں ترک الفت سے بدنام ہوا تو ہوا تم رسوائی سے بچ گئے۔

۲۴۔ غلط کہ صانع کو ہے گوارا خراشِ ہائے انگشت ہائے نازک
جواب خط کی امید رکھتے جو قولِ جف القلم نہ ہوتا

بر بنائے روایت حدیث مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ جو کچھ ہونا تھا یا ہو گا اسے قلم لکھ کر قلم خشک ہو گیا (جف القلم بما ہو کائن) اس لئے جواب خط کی امید رکھنا عبث ہے کیونکہ قدرت نے یہ گوارا نہ کیا ہو گا کہ محبوب کی نازک انگلیوں کو جواب دینے کی زحمت میں مبتلا کیا جائے۔

۲۵۔ ملے ہو غیر سے بے پردہ تم انکار کے بعد جلوہ خورشید کا سا تھا کچھ اُدھر آخر شب

آخر شب میں خورشید کی سی جھلک غیر کے مکان میں نظر آئی تو معلوم ہوا کہ تم اس سے بے پردہ ملے ہو۔ "انکار کے بعد" کا پتہ آخر شب سے چلا ورنہ ابتدائے شب ہی میں یہ جھلک نظر آتی۔

۲۶۔ صبح دم آنے کو وہ تھا کہ گواہی دے ہے رجعت قہقری چرخ و قمر آخر شب

چونکہ اسے صبح کے وقت آنا تھا اس لئے صبح ہوتے ہوتے چرخ دقمر نے پھر الٹی گردش شروع کر دی تا کہ صبح ہی نہ ہو۔

۲۷۔ ضبط نالہ بوالہوس کا ننگ کے باعث نہیں    شرم سے آہ و فغاں بے اثر رکھتے ہیں آپ

بوالہوس نے ضبط نالہ اس لئے نہیں کیا کہ وہ اسے ننگ سمجھتا ہے بلکہ اس شرم سے نہیں کیا کہ اس کے نالہ و فغاں بے اثر ہے۔

۲۸۔ آوارگی ہے باعث نشو و نما کہ دیکھ    سرسبز جب ہوئی تو پھری در بدر بسنت

بسنت میں گیہوں کی نئی بالی لے کر احباب کے یہاں جاتے ہیں اس کو بسنت پھرنا کہتے ہیں اور سرسبزی سے مراد اس رسم کی کامیابی ہے جو اس آوارگی یا در بدر پھرنے کے بعد ہی حاصل ہوتی ہے۔

۲۹۔ اے ستم پیشہ مرے بعد کہاں نشۂ عشق    دیکھ خمیازۂ حسرت ہے یہ شمشیر نہ کھینچ

معشوق تلوار کھینچ کر مومن کو قتل کرنے آیا تو انھوں نے سمجھایا کہ مجھے قتل تو کرتا ہے لیکن یہ سمجھ لے کہ میرے بعد ایسا نشۂ عشق رکھنے والا نہ ملے گا۔ اس کی وہ شاعرانہ تعبیر یوں کرتے ہیں کہ جس تلوار سے تو مجھے قتل کر رہا ہے اس کا خم بھی خمیازہ حسرت کا حکم رکھتا ہے۔ یعنی تلوار خود سمجھتی ہے کہ اب مومن ایسا نشۂ عشق رکھنے والا کبھی نہ ملے گا۔

۳۰۔ آوازِ گنبد اس سے شکایت عدو کی تھی    ناچار چپ ہیں صورت دیوار کی طرح

عدو کی شکایت اُس سے (یعنی محبوب سے) آوازِ گنبد ہو گئی یعنی آوازِ بازگشت بن کر پھر ہمیں تک واپس آئی اس لئے ہم مجبوراً دیوار کی طرح خاموش ہو گئے۔ یعنی نہ دشمن کی شکایت کریں گے نہ الٹ کر اس کو سنیں گے۔

۳۱۔ جا سکتے نہیں، جاتے ہیں اس کو میں جو ناصح    چھٹ جائیں گے قصہ سے کیا تو نے اگر بند

"جا سکتے نہیں" یعنی پہنچ نہیں سکتے۔ مطلب یہ کہ اس کی گلی میں جاتے تو ہیں لیکن اس تک پہنچ نہیں سکتے اس لئے اگر ہم کو مقید کر دیا گیا تو اس بیکار دوا دوش سے بچ جائیں گے۔

۳۲۔ تا شکوہ غیر کا نہ کروں مجھ سے کہتے ہیں    کیوں سرگذشت تم کو بھی ہے کوہکن کی یاد

محبوب عاشق سے پوچھتا ہے کہ تمھیں کوہکن کی سرگذشت بھی یاد ہے یا نہیں اور مدعا اس سے یہ ہے کہ کوہکن کے مقابلہ میں خسرو کی کامیابی کو یاد کروں اور اس طرح غیر کا شکوہ کرنا چھوڑ دوں۔

۳۳۔ نوید اے دل کہ رشکِ غیر سے چھوٹے اے ہم نے    ستم کا کر دیا خوگر جفاؤ جور سہہ سہہ کر

ظلم سہہ سہہ کر ہم نے یار کو جفا کا اتنا خوگر بنا دیا ہے کہ وہ اب غیر پر بھی جفا کرے گا ........ ... ..
اور ظاہر ہے کہ غیر اس کو برداشت نہ کر کے محبت ترک کر بیٹھے گا۔ اس صورت میں ہمیں رشک غیر سے نجات مل جائے گی،

۳۴۔ مومن یہ تاب کیا کہ تقاضائے جلوہ ہو    کافر ہوا میں دین کے آداب دیکھ کر *

پہلے مصرعہ میں موسیٰ اور جلوہ طور کی طرف اشارہ ہے یعنی اہل دین میں یہ تاب نہیں کہ جلوے کا تقاضا کر سکیں کیونکہ اس کا نتیجہ موسیٰ کو جو کچھ ملا ظاہر ہے۔ اس لئے دین کے یہ آداب دیکھ کر میں کافر ہو گیا کیونکہ بتوں کی پرستش میں اس قسم کا کوئی اندیشہ نہیں

۳۵۔ زخمی کیا عدو کو تو مرنا محال ہے    قربان جاؤں تیرے مجھے نیمجاں نہ چھوڑ

یہ شعر مومن کے فکر شاعرانہ کی نہایت پاکیزہ مثال ہے۔ کہتا ہے کہ تم نے اگر دشمن کو صرف زخمی کر کے چھوڑ دیا تو مجھے رشک تو ضرور آئے گا لیکن نہ اتنا کہ مر جاؤں اس لئے مجھے نیم جاں چھوڑ کر نہ جاؤ اور عدو کو ہلاک ہی کر دو تاکہ میں بھی اس رشک سے جان دے دوں۔

۳۶۔ دل گرمیٔ فریب پہ بھی میں نثار ہوں پروانہ کیا مجال کرے امتحانِ شمع

میں بناوٹی گرمجوشی و اختلاط پر بھی قربان ہوں اور جس طرح پروانہ شمع کی خلوص و صداقت کا امتحان نہیں لے سکتا، اسی طرح مجھے بھی یہ دیکھنے کی ضرورت نہیں کہ محبوب کی گرم جوشی سچی ہے یا جھوٹی۔

۳۷۔ مجلس میں تا نہ دیکھ سکوں یار کی طرف دیکھے ہے مجھ کو دیکھ کے اغیار کی طرف

وہ اغیار کو دیکھ کر مجھے دیکھتا ہے تاکہ رشک کی وجہ سے اس کو نہ دیکھ سکوں۔

۳۸۔ اس نے دکھا دکھا کے مجھے چھیڑ دیکھنا گل پھینکے عندلیب گرفتار کی طرف

وہ دکھا دکھا کر عندلیب گرفتار کی طرف پھول پھینک رہا ہے۔ گویا چھیڑ رہا ہے کہ دیکھ بلبل کتنی کامیاب ہے کہ اس کا محبوب (پھول) اس کے پاس ہے اور تو اس نعمت سے محروم ہے۔

۳۹۔ ہے کیا قبول سجدہ شہیدانِ عشق کا ہوں غوث سر جھکاتے ہی تلوار کی طرف

"غوث" صوفیہ کے یہاں خاص مرتبہ کے لوگ ہیں، جن کے اعضا عبادت کے وقت جدا جدا ہو جاتے ہیں۔ مطلب یہ کہ تلوار کی طرف سر جھکاتے ہیں میرے اعضا خود بخود جدا ہو جاتے ہیں اور صورت میں شہیدان عشق کے سجدہ کے قبول یا عدم قبول کی بحث ہی کیا!

۴۰۔ دل میں ناصح آئے کیا اپنا خیال جا سکے کب یار کے مسکن میں ہم

اپنا دل یار کا مسکن ہے اور یار کے مسکن تک اپنا گزر نہیں۔ اس لئے اپنا خیال دل میں کیا آسکتا ہے۔

۴۱۔ بیزار جان سے جو نہ ہوتے تو مانگتے شاہد شکایتوں پہ تیری، مدعی سے ہم

دشمن نے محبوب سے کہا کہ مومن تمھاری شکایت کرتا پھرتا ہے اور اس پر محبوب آمادہ قتل ہو گیا اس واقعہ پر مومن کہتا ہے کہ مدعی کا کہنا بالکل غلط ہے اور ہم اس سے ثبوت میں ضرور شہادت طلب کرتے لیکن ہم خود جان سے بیزار ہیں اس لئے اس لئے اس جھگڑے سے کیا فائدہ۔

۴۲۔ دیکھا ادھر کو تو نے کہ بس دم نکل گیا اترے نظر سے اپنی نگہبانیوں میں ہم

ہم نے یہ کوشش کی تھی کہ کس طرح تیری نگاہ سے بچے رہیں لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ تو نے ادھر دیکھا ہی تھا کہ دم نکل گیا اس طرح خود ہم اپنی نگاہ سے اُتر گئے کہ کیوں ہم نے اپنی نگہبانی کی فکر کی تھی جس کا نتیجہ کچھ نہ نکلا۔

۴۳۔ مت کیجو دیر آنے میں کیا جانے کیا بنے پھینکا ہے جذب شوق نے یوسف کو چاہ میں

اس شعر میں بھی فکر شاعرانہ ہے اور بہت پُرلطف۔ مومن محبوب سے کہتا ہے کہ دیکھو زلیخا کے جذب شوق نے یوسف کو چاہ میں گرا دیا تھا اس لئے آنے میں دیر نہ کرو ورنہ معلوم نہیں میرا جذب شوق تمھیں کس مصیبت میں مبتلا کر دے۔

۴۴۔ ظالم وہ بے وفا ہے عدو جس کے رشک سے اتنا کچھ آگیا خلل اپنے نباہ میں

عدو اتنا بے وفا ہے کہ اس کے رشک سے میری نباہ میں بھی خلل پڑتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ اگر میں تجھ سے نباہ کرتا معلوم نہیں ہوتا تو اس کا سبب بھی دشمن ہی ہے۔

۴۵۔ کیوں نہ آدھی رات تک جاگے وہ جسکا دھیان ہو آہوئے نیم خواب میں نرگس نیم باز میں

پہلا مصرع تقطیع سے گرتا ہے۔ بجائے کیوں کے کیونکر پڑھئے۔ آہوئے نیم خواب اور نرگس نیم باز ایک ہی چیز ہے یعنی

معشوق کی نیم باز آنکھیں۔

۴۶۔ ان سے اب التفات کی غیر کو ہیں شکایتیں — سن کے مرا مبالغۂ منت احتراز میں

مجھ سے محبوب نے احتراز شروع کیا تو میں نے اس پر اظہار تشکر کیا۔ غیر نے یہ سمجھ کر کہ شاید معشوق کا احتراز ہی کام کی بات ہوگی، خود بھی التفات یار سے بیزار ہو کر اس کی شکایتیں شروع کر دیں۔

۴۷۔ پردہ نشیں کے عشق میں پردہ دری نہ ہو کہیں — ہوتی ہیں بے حجابیاں جان نہفتہ راز میں

"جان نہفتہ راز" یعنی وہ جان جس کا راز پوشیدہ ہو۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ میں اپنی جان دینے سے اس لئے ڈرتا ہوں کہ کہیں اس سے کسی پردہ نشیں کے عشق کی پردہ دری نہ ہو (جان نہفتہ راز میں بے حجابی اسی وقت ہوگی جب وہ نکلے گی)

۴۸۔ منظور ہو تو وصل سے بہتر ستم نہیں — اتنا رہا ہوں دور کہ ہجراں کا غم نہیں

مومن نے مکر شاعرانہ سے کام لیا ہے۔ محبوب سے کہتا ہے کہ میں تم سے اتنا دور رہا ہوں کہ ہجراں میرے لئے غم کی چیز نہیں اس لئے اگر واقعی مجھے ستانا چاہتے ہو تو مجھ سے ملو کیونکہ ستم کی بہتر صورت یہی ہے۔

۴۹۔ سیدھا نہ کر دیا ہو مرے ذوق قتل نے — قاتل کے آگے گردن اغیار خم نہیں

اغیار میرے شوق قتل کو دیکھ کر بہت ہارگئے اور اسلئے اب قاتل کے آگے ان کی گردن جھکی ہوئی نظر نہیں آتی۔ دوسرے مصرعہ سے یہ مفہوم بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اغیار، محبوب کی اطاعت سے باہر ہو گئے ہیں، گردن خم کرنا، اطاعت قبول کرنے کو بھی کہتے ہیں۔

۵۰۔ غیرت کی جا ہے رام نزاکت ہوا وہ شوخ — وحشت کا جوش کیونکہ نہ ہو مجھ سے رم نہیں

یہ دیکھ کر کہ محبوب فرط نزاکت کی وجہ سے اب مجھ سے گریز نہیں کرتا۔ مجھے وحشت ہوتی ہے کیونکہ جب مجھ سے احتراز نہیں تو ظاہر ہے غیر والے سے بھی نہ ہوگا۔

۵۱۔ کیا خوش ہوں کوئے غیر میں گر نقش پا نہ ہو — وہ شوخ جانتا ہوں کہ ثابت قدم نہ ہو

اگر کوئے غیر میں محبوب کا نقش پا نظر نہیں آیا تو خوشی کی بات نہیں کیونکہ جانتا ہوں کہ وہ کسی بات میں ثابت قدم نہیں ہے اور ہو سکتا ہے کہ وہ کسی اور جگہ پہنچا ہو یا یہ کہ پھر غیر کے پاس آنے جانے لگے۔

۵۲۔ جانا حرام ہجر بتاں میں تو کیا گناہ — پیر مغاں شراب ہے شیشہ میں سم نہیں

اگر ہجر یار میں شراب کو میں نے حرام جانا تو کیا گناہ کیا۔ اگر شراب زہر ہوتی تو البتہ اس عالم میں اُسے پی جاتا۔

۵۳۔ بے التفاتیاں جو عدو سے سنی نہ تھیں — ہم جانتے تھے وصل میں رنج و الم نہیں

چونکہ ہنگام وصل کسی بے التفاتی کا حال دشمن سے نہ سنا تھا اس لئے ہم سمجھتے تھے کہ وصل میں رنج و الم نہیں ہوتا لیکن یہ خیال غلط نکلا اور محبوب وصل میں بھی ہم سے محترز ہی رہا۔

۵۴۔ بے جرم پائمال عدو کو کیا کیا — مجھ کو خیال بھی ترے سر کی قسم نہیں

اگر دشمن کو بے خطا پائمال کیا تو تم اس سے یہ خیال نہ کرو کہ میں اپنے انجام سے ڈر کر ترک محبت کر دوں گا۔

۵۵۔ ناصح کہاں تلک تری باتیں اٹھا سکوں — سچ ہے کہ مجھ میں طاقت جور و ستم نہیں

ناصح نے مومن سے کہا کہ تم جور و ستم برداشت کرنے کی قوت نہیں رکھتے اس لئے محبت ترک کر دو۔ اس کے جواب میں مومن کہتا ہے کہ شاید اسی لئے میں تیری باتیں برداشت نہیں کر سکتا گویا بالفاظ دیگر ناصح کی نصیحت کو انتہائی جور و ستم ظاہر کیا گیا ہے۔

۵۶- عاشق کشی ہے شیوہ اگر بوالہوس سہی     آخر کچھ اپنی جان کے دشمن تو ہم نہیں

اگر وہ سچے عاشقوں ہی کو ہلاک کرتا ہے تو پھر ہم بھی ہوس پرستی اختیار کریں گے کیونکہ ہم بھی تو اپنی جان کے دشمن نہیں ہیں۔

۵۷- تلخیِ خسرو ہو شیریں کام شادی مرگ کیا     جانکنی ہے انتقام کوہکن کی فکر میں

اگر خسرو اپنے رقیب کوہکن کی موت پر فرطِ خوشی سے نہیں گیا بلکہ بیچین ہے تو اس کا سبب صرف یہ ہے کہ اس سے کوہکن کا انتقام لیا جا رہا ہے۔

۵۸- وہم عشق لالہ رو سے داغ دل کیا کیا کھلے     جان کر گلچیں کو تاراج چمن کی فکر میں

یہ دیکھ کر کہ گلچیں تاراج چمن کی فکر میں ہے، میرے داغ دل تازہ ہوئے کیونکہ مجھے یہ وہم پیدا ہوا کہ کہیں وہ اس لالہ رو کی محبت میں مبتلا نہ ہو اور اسی لئے پھولوں کو توڑ رہا ہو کہ یہ اس سے مشابہ ہیں۔

۵۹- خاک میں وہ تپش نہیں خار میں وہ خلش نہیں     کیوں نہ ہیں زیادہ ہو جوش جنوں بہار میں

بہار میں جوش جنوں بڑھ جانے کی شاعرانہ تاویل کی ہے کہ میں تو صرف خلش اور تپش کا شائق ہوں چونکہ بہار میں ان چیزوں کی کمی ہو جاتی ہے اس لئے مرا جوش جنوں بڑھ جاتا ہے۔

۶۰- مرگ ہے انتہائے عشق یاں رہی ابتدائے عشق     زندگی اپنی ہوگئی رنجش بار بار میں

رنجش بار بار کی وجہ سے عشق کی انتہا نہ ہو سکی اور اس لئے جان بچ گئی ورنہ ظاہر ہے کہ عشق کی انتہا میں مرنا ہی پڑتا۔

۶۱- مانے نہ مانے منع تپشہائے دل کروں     میں غیر تو نہیں کہ تماشائے دل کروں

تماشا کرنا یعنی نمائش کرنا۔ مطلب یہ کہ میں غیر تو ہوں نہیں کہ دل کی بیتابیوں کی نمائش کرتا پھروں اس لئے میرا فرض یہی ہے کہ میں تپش دل نہ ظاہر ہونے دوں۔

۶۲- مرتا ہوں کس عذاب سے ہے وقت جی ہی ہے     اس دم دعا برائے تمنائے دل کروں

مشہور ہے کہ جانکنی کی تلخی کے وقت ایک ساعت قبول دعا کی بھی آتی ہے اس لئے مومن کہتا ہے کہ میں جس تکلیف سے جان دے رہا ہوں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شائد قبول دعا کا وقت یہی ہے اس لئے جی چاہتا ہے کہ تمنائے دل پوری ہونے کی دعا کر دوں۔

۶۳- جاں دیدوں، ہے اس آفت جاں سے معاملہ     بس کب تک انتظار تقاضائے دل کروں

میں کب تک اس کا انتظار کروں کہ وہ دل کا تقاضہ کرے اور دل دے کر جان کو مصیبت میں ڈالے۔ آخر کار جان دینا ہی ہے اس لئے کیوں نہ اس سے پہلے ہی اس جھگڑے کو ختم کر دوں۔

۶۴- وہ علی الرغم عدو مجھ پہ کرم کرتے ہیں     ہے ستم لطف کے پردے میں ستم کرتے ہیں

"علی الرغم عدو" یعنی دشمن کی ضد میں، مطلب یہ کہ محض دشمن کی ضد میں مجھ پر لطف ہونا بڑا ستم ہے۔

۶۵- محضرِ قتل ہے مکتوب گنہگاروں کا     سر قاصد کو وہ فتوے سے قلم کرتے ہیں

ہم نے قاصد کے ذریعہ خط بھیجا تو معشوق نے اس جرم میں اسے قتل کر دیا۔ گویا ہم گنہگاروں کا مکتوب ہی محضر قتل تھا جس سے فتوئے قتل حاصل کیا گیا۔

اپنے سودے کی نہ پوچھو کہ خریدار کے ساتھ     جنس میں تو ہے دل اور بیع سلم کرتے ہیں

"بیع سلم" اس بیع کو کہتے ہیں جس میں خریدار فروخت شدہ شئے پر فوراً قابض نہ ہو سکے۔ مطلب یہ کہ دل کا سودا ابھی گویا

"بیع سلم" کا سا ہے کہ مالک تو اس کا ہو جاتا ہے کوئی اور لیکن وہ بیچنے والے کے پاس ہی رہتا ہے۔

۶۷۔ کشتۂ یار ہوں اس رشک سے مرتا ہے جہاں — وہ بھی کیا ہیں جو مری موت کا غم کرتے ہیں

لوگ میری موت کا غم نہیں کرتے بلکہ وہ اسی رشک میں مبتلا ہیں کہ مومن تو کشتۂ یار ہوا اور وہ نہ ہو سکے۔

۶۸۔ صورت دکھائے جو کبھی جا کے خواب میں — بیدید آنکھ کھول دے جھنجلا کے خواب میں

بیدید کے معنی بے مروت و سنگدل کے ہیں۔ اسی معنی میں "بیدیدہ" بھی استعمال ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ اگر کبھی خواب میں مجھے دیکھ لیتا ہے تو وہ بے مروت فوراً جھنجلا کے آنکھ کھول دیتا ہے۔

۶۹۔ آنکھوں کو بند کر کے وہیں کھول دے گر آئے — یوسف کسی کے محوِ تماشہ کے خواب میں

وہ شخص جو تیرا محو تماشہ ہے اسکو اگر یوسف بھی خواب میں نظر آئے تو فوراً آنکھیں کھول دے۔ مطلب یہ کہ جو تیرا تماشائی ہے، وہ یوسف پر نگاہ نہیں ڈال سکتا۔

۷۰۔ کابوس ہیں بتاتے مجھے واں تو رشک ہے — کاش اور کوئی آئے اطبا کے خواب میں

کابوس ایک بیماری ہے جس میں انسان سوتے سوتے چونک پڑتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرے بار بار چونک پڑنے کو اطبا کابوس کا مرض بتاتے ہیں حالانکہ اس کا سبب یہ ہے کہ میرا محبوب مجھے خواب میں نظر آتا ہے اس لئے بربنائے رشک میں یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ میرا محبوب ان طبیبوں کو خواب میں نظر آئے لیکن یہ ضرور چاہتا ہوں کہ کوئی اور حسین انھیں اسی طرح نظر آئے اور وہ بھی میری طرح چونک پڑیں اور اس طرح انھیں حقیقت کا علم ہو سکے۔

۷۱۔ سو رہتے پائے ناقہ زمانِ وداع گر — طالع نہ ہوتے قیس کے لیلیٰ کے خواب میں

دوسرے مصرعہ میں۔ "قیس کے" بعد "اور" محذوف ہے۔ یعنی اگر قیس کے اور لیلےٰ کے طالع خواب میں نہ ہوتے تو وداع کے وقت ناقۂ لیلےٰ کے پاؤں سو جاتے اور وہ روانہ نہ ہو سکتی۔

۷۲۔ نیرنگ عشق سے نہ ہو غافل ہے ایک رنگ — اس دل کے جاگنے میں زلیخا کے خواب میں

مشہور ہے کہ زلیخا نے یوسف کو خواب میں دیکھا تھا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کھچکر زلیخا کے پاس پہنچ گئے۔ مومن کہتے ہیں کہ جو کشش زلیخا کے خواب میں تھی وہی میرے دلِ بیدار میں بھی ہے۔ دونوں کا ایک رنگ ہے۔

۷۳۔ رہتا ہے دھیان دیکھتے ہو جب مجھے نہیں — کیوں چونک چونک پڑتے ہو گھبرا کے خواب میں

اگر تم مجھے دیکھتے بھی نہیں ہو تو میرا دھیان ضرور تمھیں رہتا ہے ورنہ خواب میں گھبرا کر چونک پڑنا کیسا۔ ؟

۷۴۔ اس کی گلی ہے نالۂ زنجیر غل نہ کر — یاں پاؤں جاگتے ہیں کوئی جاگے خواب میں

"نالہ زنجیر" سے خطاب ہے کہ اس کی گلی میں غل نہ کر کیونکہ یہاں ہر ایک کے پاؤں پہنچ کر سو جاتے ہیں۔ دوسرے مصرعہ میں "استفہام انکاری" ہے اسی لئے اس لہجہ سے پڑھیئے۔

۷۵۔ سوزِ دل کے ہاتھ سے ڈھونڈھوں جو امن آب میں
ہووے ہر ہر قطرہ داغ افزائے گلخن آب میں

میرے سوزِ دل کا یہ عالم ہے کہ اگر پانی میں پناہ لوں تو ہر ہر قطرہ گلخن کو بھی داغ رشک دے۔ یعنی گلخن بھی اپنی گرمی کو بھول جائے۔

۷۶۔ گر ہو وہ دستِ حنائی عکس افگن خواب میں — ہو دے مرجاں جوں چنار آتش زنِ تن آب میں

اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس کے دست حنائی کا عکس پانی میں پڑے تو پنجۂ مرجاں بھی چنار کی طرح آگ دے اٹھے۔ اس شعر کے پہلے مصرع میں ردیف بیکار معلوم ہوتی ہے کیونکہ بحالت خواب دست حنائی کا عکس افگن ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اسی طرح دوسرے مصرعہ میں تن کا لفظ بھی کوئی خاص مفہوم پیدا نہیں کرتا۔

۷۷۔ دی دلِ سوزاں کو تشبیہ سمندر میں نے اب — چھوڑ کر آتش کدہ ڈھونڈے ہے مسکن آب میں

سمندر آگ کا کیڑا ہے لیکن اگر میں اب دل سوزاں سے اسے تشبیہ دیدوں تو وہ بھی آگ سے گھبرا کر پانی میں اپنا ٹھکانا ڈھونڈے۔

۷۸۔ یاد چشم یار میں دریا پہ رویا بن گئیں — مردم آبی کی پلکیں شمع روشن آب میں

میں چشم یار کی یاد میں دریا پہ رویا تو آنسوؤں کی سوزش کی وجہ سے مردم آبی کی پلکیں بھی شمع کی طرح جلنے لگیں،

۷۹۔ دکھاتے آئینہ ہو اور مجھ میں جان نہیں — کہو گے پھر بھی کہ میں تجھ سا بدگمان نہیں

جب موت پر سکتہ کا شبہ ہوتا ہے تو چہرے کے سامنے آئینہ رکھ کر دیکھتے ہیں کیونکہ اگر ہلکی سے ہلکی سانس ہو گی تو بھی آئینہ پر اس کا دھندلا سا نشان پڑ جائے گا۔ مومن کہتا ہے کہ یہاں تو جان ہی نہیں اور تم سکتہ کا شبہ کر کے آئینہ دکھاتے ہو۔ کیا اسی پر یہ بدگمان نہ ہونے کا دعویٰ کرتے ہو۔

۸۰۔ ہجراں میں بھی زیست کیوں نہ چاہوں — جاں دادۂ شوخ بے وفا ہوں

ہجر کے زمانہ میں کوئی عاشق زندہ رہنا نہیں چاہتا۔ لیکن مومن ایسا چاہتے ہیں کیونکہ وہ ایک شوخ بے وفا کے عاشق ہیں اور بے وفائی کا اتنا اثر ان میں پیدا ہونا چاہئے۔

۸۱۔ اُف کر گئی یاد گرمجوشی — میں آتش مردہ سے جلا ہوں

محبوب کی گرمجوشی کی یاد مجھے پھونک گئی گویا یوں سمجھئے کہ مردہ آگ نے مجھے جلا دیا۔ مردہ آگ اس لئے کہا کہ اب وہ گرمجوشی کہاں ہے صرف اس کی یاد باقی رہ گئی ہے جس نے پھونک کر رکھ دیا۔

۸۲۔ کیا شکوہ جفائے آسماں کا — میں آپ کو دور کھینچتا ہوں

میں آسماں کا شکوہ کیا کروں گا جبکہ خود اپنے آپ کو اس سے زیادہ بلند سمجھتا ہوں یعنی آسمان کا شکوہ کرنا میری خودداری و عالی حوصلگی کی توہین ہے۔

۸۳۔ خود بینی و بیخودی میں ہے فرق — میں تم سے زیادہ کم نما ہوں

"کم نما" ہونا یعنی اپنے آپ کو چھپانا۔ مطلب یہ ہے کہ تم تو صرف خود بینی کی وجہ سے پوری طرح کسی کے سامنے نہیں آتے اور یہاں میں اپنی بیخودی کی وجہ سے خود اپنے آپ سے بھی چھپا ہوا ہوں اس لئے میں اس باب میں تم سے بڑھا ہوا ہوں۔

۸۴۔ مجھ رمز شناس سے یہ باتیں — کیا خوب میں غیر سے بُرا ہوں

محبوب نے مومن سے کہا کہ یہ زمانہ دوستی کا نہیں ہے اور اس پر مومن نے کہا کہ میں یہ باتیں خوب سمجھتا ہوں۔ کیا میں رقیب سے بھی بُرا ہوں کہ اس کے لئے تو زمانہ دوستی کا ہو اور میرے لئے نہیں۔

۸۵۔ کیا کیجئے کہ طاقت نظارہ ہی نہیں — جتنے وہ بے حجاب ہیں ہم شرمسار ہیں

محبوب جتنا زیادہ بے حجاب ہوتا ہے اتنا ہی ہم شرم کی وجہ سے دیکھ نہیں سکتے۔

۸۶۔ عمر دراز کی ہے رقیبوں کو آرزو  دیکھو زمانِ ہجر کے امیدوار ہیں

اس شعر میں مومن نے یہ ظاہر کیا ہے کہ زمانِ ہجر سے زیادہ طویل مدت اور کوئی نہیں ہوتی۔

۸۷۔ شبنم خراب مہر و کتاں سینہ چاک ماہ  لو اور بھی ستم زدۂ روزگار ہیں

مومن کے صحیح رنگ کا شعر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا میں تنہا میں ہی ستم زدہ نہیں بلکہ شبنم بھی آفتاب کی محبت میں پریشان ہے اور کتاں بھی ماہتاب کے عشق میں سینہ چاک ہے۔ اصل مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ جو تعلق شبنم و آفتاب یا کتاں و ماہتاب میں ہے وہی مجھ میں اور میرے محبوب میں ہے۔

۸۸۔ دل کا کیا حال کرے دیکھیے یہ گرمیٔ حسن  ٹھیرتا آئینۂ یار میں سیماب نہیں

آئینہ سیماب سے تیار کیا جاتا ہے لیکن گرمیٔ حسن کا یہ عالم ہے کہ وہ آئینہ کے پشت پر ٹھیرتا ہی نہیں۔ یہ دیکھ کر مومن کو خیال آتا ہے کہ دیکھیے گرمیٔ حسن سے اس کے دل کا کیا حال ہو۔ سیماب سے دل کو تشبیہہ بھی دیتے ہیں۔

۸۹۔ آہِ فلک فگن ترے غم سے کہاں نہیں  جو فتنہ خیز اب ہے زمیں آسماں نہیں

دنیا میں اب ہر جگہ تیرے غم سے فلک شگاف آہیں بلند ہوتی ہیں۔ پہلے یہ فتنے آسمان سے نازل ہوتے تھے اور اب تمہارے دور میں زمین ہی سے اٹھتے ہیں۔

۹۰۔ ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے  صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں

مومن کا خاص شعر ہے۔ آشیاں کی بربادی مسلم ہے اس لئے اگر صیاد کی نگاہ اس طرف نہیں تو بجلی کا ڈر ہے۔

۹۱۔ اظہارِ دوستی کی خوشی کیا شبِ جمال  دشمن سے سن چکا ہوں کہ تو مہرباں نہیں

تمہارا مجھ سے وصل میں محبت کا اظہار کرنا باعث خوشی نہیں ہو سکتا کیونکہ رقیب سے تمہاری نامہربانیوں اور بے وفائیوں کا حال سن چکا ہوں۔

۹۲۔ نومیدیِ جواب ہے کیوں اتنے شوق پر  یہ کیا ہوا کہ میں پسِ قاصد رواں نہیں

شوق کا تقاضا یہ تھا کہ قاصد کے پیچھے پیچھے مومن خود بھی ساتھ جاتے لیکن جواب کی طرف سے اتنی مایوسی ہے کہ وہ اس کی ہمت نہ کر سکے۔

۹۳۔ کرتے وفا امیدِ وفا پر تمام عمر  پر کیا کریں کہ اس کو سرِ امتحاں نہیں

جب محبوب کو وفا کا امتحان ہی مقصود نہیں تو کس امید پر وفا کیجئے۔

۹۴۔ اس کو بھی جانتا ہوں فریبِ وصالِ غیر  تم کو عبث یقیں ہے کہ میں بدگماں نہیں

تم کہتے ہو میں بدگماں نہیں حالانکہ اس سے مراد تمہاری صرف یہ ہے کہ میں دھوکے میں آکر وصالِ غیر کے معاملے کو بھول جاؤں۔

۹۵۔ اتنے سبک نظر میں ہیں اوضاعِ روزگار  دنیا کی زحمتیں ہرے دل پر گراں نہیں

دنیا کی باتیں میری نگاہ میں اتنی حقیر ہیں کہ مجھے اپنی ناکامیوں کا خیال بھی نہیں آتا۔

۹۶۔ میں جانتا ہوں نعش پہ آنے کا مدعا  آسودگی پسند تری شوخیاں نہیں

تمہاری شوخیاں مرنے کے بعد بھی مجھے آسودہ دیکھنا نہیں چاہتیں، اسی لئے تم نعش پر آئے ہو۔

۹۷۔ اس بُت کی ابتدائے جوانی مراد ہے  مومن کچھ اور فتنۂ آخر زماں نہیں

جس چیز کو فتنۂ آخر زماں کہتے ہیں وہ اس بُت کی ابتدائے جوانی ہے۔

# مومن کے قصائد

(نیاز فتحپوری)

قصیدہ گوئی میں سودا اور ذوق کو خاص شہرت حاصل ہے، کیونکہ ان دونوں نے متعدد قصائد لکھے اور اپنا پورا زورِ طبع ان پر صرف کر دیا۔ غزل کی طرح اردو میں قصیدہ گوئی بھی فارسی کی تقلید تھی اور چونکہ فارسی کی قصیدہ گوئی کا تعلق شاعری سے اتنا زیادہ نہ تھا جتنا اظہارِ فضل و کمال سے اس لئے اردو میں بھی قصیدہ گوئی کا رنگ یہی رہا۔ تاریخی و علمی اصطلاحات، دقیق و مشکل الفاظ، تخیل کی بلندی، مضمون آفرینی، زورِ بیان، مبالغہ و تعلی، قصیدہ گوئی وہ خصوصیات تھیں جو فارسی میں عام طور پر پائی جاتی تھیں اور جن کا تتبع اردو میں بھی کیا گیا۔

فارسی قصیدہ گوئی کی تفصیل پر اظہارِ خیال کا محل نہیں، ورنہ میں شاید زیادہ تفصیل کے ساتھ ان خصوصیات پر روشنی ڈال سکتا۔ بہر حال ان تمام ذیلی مباحث سے ہٹ کر جس وقت ہم اردو کی قصیدہ نگاری پر نگاہ ڈالتے ہیں تو چار شاعروں کے نام ہمارے سامنے آتے ہیں۔ سودا، ذوق، غالب اور مومن۔

غالب نے اردو میں کوئی ایسا قصیدہ نہیں لکھا جس کا ذکر سودا اور ذوق کے قصائد کے ساتھ کیا جا سکے۔ اس نے اپنا سارا زورِ قلم فارسی قصیدہ نگاری میں صرف کر دیا اور بہت کامیاب ہوا۔ سودا ان خصوصیات کے لحاظ سے جو قصیدہ کے لئے ضروری سمجھی جاتی ہیں۔ بڑا کامیاب قصیدہ گو تھا۔ ذوق کے قصائد گو زورِ بیان کے لحاظ سے سودا کے قصائد سے کمتر ہیں لیکن روانی و پختگی کے لحاظ سے وہ سودا سے بڑھے ہوئے ہیں۔ مومن کے یہاں ذوق و سودا دونوں کا رنگ پایا جاتا ہے اور اگر مدح گوئی کو اپنا پیشہ بنا کر زیادہ قصائد لکھتے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ سودا اور ذوق کے ساتھ ان کا نام بھی نہ لیا جاتا۔

مومن نے صرف نو قصیدے لکھے۔ ایک حمد میں، دوسرا نعت میں، چار خلفاء کرام کی منقبت میں۔ ایک حسنؓ کی شان میں۔ صرف دو قصیدے انھوں نے دنیاوی حیثیت سے لکھے۔ ایک والی ٹونک کی مدح میں۔ دوسرا راجہ پٹیالہ کی تعریف میں اور ان تمام قصائد میں انھوں نے سودا اور ذوق دونوں سے اپنی راہ علیحدہ اختیار کی۔

قصیدہ میں تشبیب خاص چیز ہے اور اس پر تمام شعراء نے اپنا پورا زور صرف کیا ہے۔ لیکن عرفی کی طرح یہ خصوصیت مومن ہی کو حاصل تھی، اکثر قصائد میں انھوں نے تشبیب کو اس کے صحیح معنی میں پیش کیا اور پورا رنگِ تغزل اس میں بھر دیا خلیفۂ ثانی کی منقبت میں جو قصیدہ ہے اس کی تشبیب کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

جو اس کی زلف کو دوں اپنا عقدۂ مشکل — تو بوالہوس کا بھی ہرگز کبھی نہ چھوٹے دل
تم اور حسرتِ ناز، آہ کیا علاج کروں — میں نیم جاں نہ رہا امتحان کے قابل

چلا ہی جاتا ہوں میں گو چلا نہیں جاتا　　غضب ہے شوقِ رسائی و دوریِ منزل
خدا سے ڈربتِ بیدرد، ہے یہ کیا انصاف　　کہ تو جفا سے نہ ہو اور وفا سے ہوں میں خجل

کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ غزل کے اشعار نہیں ہیں۔ سودا اور ذوق کے قصائد میں ایسا رچا ہوا رنگِ تغزل آپکو نہ ملے گا۔ مومن نے بھی دوسرے شعرا کی طرح قصائد میں زمانہ کی شکایت، اس کی ناقدر شناسی اور اپنی ناکامی و نامرادی کا ذکر کیا ہے۔ لیکن اکثر و بیشتر اسی متغزلانہ رنگ میں خلیفۂ ثالث کی منقبت میں تو انھوں نے غزل کیا پوری واسوخت لکھدی۔

نیک نامی نہ سہی مجھ کو ہے تم سے سروکار　　چھوڑ دوں آج وفا گر ہو وفا سے بیزار
گر تمھیں صحبتِ اغیار سے پرہیز نہیں　　ہم بھی کچھ چارۂ آزار کریں گے ناچار
وہ جلے محفلِ دشمن میں جو ہو شمع لقا　　مجھ کو چھیڑا نہ کرو تم سے کہا ہے سو بار
بے مروت مری نظروں میں ہیں انداز ترے　　آجکل کچھ نگہِ لطف ہے سوئے اغیار
آپ دیکھا نہ سنا اور سے، یہ جھوٹ نہیں　　تیری آنکھیں کہے دیتی ہیں نہ کرنا انکار

الغرض مومن کی یہ خصوصیت کہ وہ قصیدوں میں بھی غزل کی طرف آجاتے ہیں، ان کی وہ انفرادی خصوصیت ہے جس میں ان کا کوئی ہمسر نہیں۔

جیسا کہ پہلے کہہ چکا ہوں۔ قصائد میں زورِ بیان، مبالغہ، دقت آفرینی اور تلمیحات کا خصوصیت کے ساتھ لحاظ رکھا جاتا تھا۔ اور یہ وہ روایت تھی جس سے مومن بھی نہ بچ سکے اور چونکہ عربی فارسی کے فاضل، طب و نجوم کے ماہر تھے اس لئے ایسی ایسی علمی اصطلاحیں استعمال کیں اور ایسی ایسی تلمیحات سے کام لیا ہے کہ ہر شخص ان کو سمجھ ہی نہیں سکتا۔ مثلاً حضرت عثمانؓ کی منقبت کے مطلع ثالث میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

صوفیوں نے ترے چہرہ کا جو عالم دیکھا　　ہوئے قایل کہ تجلی کو نہیں ہے تکرار

اس شعر کا مفہوم سمجھ میں آہی نہیں سکتا جب تک کسی کو صوفیوں کا یہ نظریہ معلوم نہ ہو کہ تجلئ خداوندی کی تکرار نہیں ہو سکتی۔ مدعا یہ کہ صوفیوں کو تیرا چہرہ دیکھنے کے بعد ہی اس کی تصدیق ہوئی کہ تجلی کی تکرار ممکن نہیں۔ کہنا صرف یہ تھا کہ تو اپنے جمال میں بے مثل ہے لیکن اسے ظاہر کیا اس انداز سے!

اس قصیدہ میں اصطلاحاتِ نجوم کا عالم دیکھئے:-

ذروۂ اوج سے برجیس کی رجعت ہو جائے　　ثور میں زہرہ کرے مہ کے قراں سے انکار
تاکہ ہو جائے ہر آزار کا مصدر ایک ایک　　سخت تخسین کو ہے دفعِ طبیعت پہ قرار
بندھے امید گر اک خوشۂ گندم کی مجھے　　مہر تحویل سے ہو برجِ شرف کے بیزار
گر حصولِ زرِ مسکوک کی سمجھوں میں دلیل　　ناخنِ شیر سے ہو سینۂ خورشید نگار
خون کے میرے ارادہ سے ہو ذابحِ سعد　　قتل پر میرے کمر باندھے ہے شکلِ جبار
زیست اپنی ہے تو تربیع و تقابل کے سوا　　بھول جائیں گے منجم جو ہیں باقی انظار

ان اشعار میں ذروہ (بلندی) برجیس، زہرہ، تخسین، تحویل، شرف، ذابحِ سعد، تربیع، تقابل، انظار، سب علم نجوم کی اصطلاحیں ہیں۔

رئیس پٹیالہ کی تعریف میں جو قصیدہ لکھا گیا ہے اس کی ابتدا بھی انھوں نے اسی قسم کے اشعار سے کی ہے ۔

صبح ہوئی تو کیا ہوا ہے وہی تیرہ اختری — کثرتِ دود سے سیاہ شعلۂ شمعِ خاوری
چشمِ ستارۂ سحر، یوں ہے زحل سے سرمہ سا — دشنۂ ترکِ چرخ سے تیز نگاہ مشتری

مومن نے فلسفہ کی اصطلاحوں سے بھی کام لیا ہے ، مثلاً :-

جب ستایا مجھے اس نے وہی اُلفت وہی طل — یہ غلط ہے کہ اعادہ نہیں بہر معدوم

فلاسفہ کا اعتقاد ہے کہ جو شے معدوم ہو جائے وہ پھر وجود میں نہیں آسکتی ، مومن کہتا ہے یہ خیال غلط ہے ، کیونکہ جب کبھی محبوب نے مجھے ستایا ۔ گئی ہوئی محبت پھر لوٹ آئی ۔

ایک اور شعر :- فکرِ الزام حکیم و متکلم ہوا سے — تو مجسم نظر آجائیں نقاط موہوم

نقطہ کو حکیم و متکلم فرضی و موہوم مانتے ہیں ، مومن کہتے ہیں کہ اگر میرا ممدوح ان کے اس نظریہ کو باطل کرنے پر آئے تو نقطہ بھی جسم اختیار کر کے سامنے آجائے ۔

نعتیہ قصیدہ میں ایک جگہ لکھتے ہیں :-

ہے دشتِ بزمِ طرب کثرتِ نتائج سے — نہ کیوں ہو شکلِ حماری کو نازِ شکلِ عروس

شکل حماری اور شکلِ عروس ، اقلیدس کی دو شکلیں ہیں ۔ جن میں شکلِ عروس کثرتِ نتائج کے لحاظ سے زیادہ اہم چیز کہی جاتی ہے ۔

اسی شکلِ عروس کا ذکر انھوں نے ایک اور جگہ بھی کیا ہے :-

گواہِ عصمتِ مریم ہو کثرتِ اولاد — عقیمہ مجھ سے سنے گر بیانِ شکلِ عروس

مومن کا یہ شعر بہت مشکل ہے ، اس لئے اس کی توضیح کئے دیتا ہوں :-

شکلِ عروس اقلیدس کی ایک ایسی شکل ہے جس سے نتائج کثیر پیدا ہوتے ہیں ۔ مطلب یہ کہ اگر میں کسی عقیمہ (بانجھ عورت) کے سامنے شکلِ عروس کا بیان کروں تو اس کا بانجھ پن دور ہو جائے اور اس کی اولاد کی کثرت کو دیکھ کر لوگوں کو جناب مریم کی پاک دامانی کا یقین آجائے کیونکہ جب ایک عقیمہ کے اتنی اولاد پیدا ہو سکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ دوشیزہ کے بطن سے اولاد نہ ہو سکے ۔

دیکھ کر تیری تیغِ کوہ شگاف — ٹوٹ جاتی ہے سرکشوں کی کمر
خطِ نصف النہار ہو محسوس — گر فلک کو عدو بنائے سپر

خطِ نصف النہار فضائے آسمان کا ایک فرضی خط ہے ۔ لیکن مومن اپنے ممدوح سے کہتا ہے کہ اگر تیرا دشمن تیری تلوار کا وار بچانے کے لئے آسمان کو سپر بنائے تو اس کا خطِ نصف النہار بھی باوجود فرضی و موہوم ہونے کے محسوس ہونے لگے اور ایسا معلوم ہو گویا آسمان کی ڈھال میں بال پڑ گیا ہے ۔

طبی اصطلاحات ملاحظہ ہوں :-

جو ہوں معالجِ مبطوں تو قالبِ ارواح — کرے دعائے رواجِ طریقِ جالینوس
ورم ہو چارہ گر قبض تا بدستِ لئیم — کیا ہو میں نے جو تجویز وزنِ مغز فلوس

مبطون اس مریض کو کہتے ہیں جسے معدہ کی شکایات رہتی ہوں۔ جالینوس یونان کا مشہور طبیب تھا جسے امراض معدہ کے علاج میں بڑی دستگاہ حاصل تھی اور جس کی جوارش جالینوس بڑی مشہور چیز ہے۔ مومن کہتا ہے کہ اگر میں کسی مریضِ معدہ کا علاج کروں تو خود ملک الموت جان نکالنے کی جگہ جالینوس کے طریق علاج کی دعا کرنے لگیں۔

دوسرے شعر میں درم قبض اور فلوس سے ایہام کا کام لیا ہے۔ فلوس۔ املتاس کو کہتے ہیں، اور پیسوں کو بھی اس طرح درم طبی وزن بھی ہے اور سکہ کا نام بھی۔ قبض۔ اسہال کا ضد بھی ہے اور مٹھی بند کرنے کو بھی کہتے ہیں۔ مطلب یہ کہ اگر میں رفعِ قبض کے لئے ایک درم مغز فلوس تجویز کروں تو بخیل کا بخل بھی دور ہو جائے۔

چوسر کی اصطلاح دیکھئے۔

نرد بازوں کو عہد میں تیرے ششش جہت جیسے مہرۂ ششدر

مہرۂ ششدر چوسر میں اس مہرہ کو کہتے ہیں جو چھ خانوں میں سے کسی خانہ میں نہ چل سکے اور زچ ہو جائے۔

مومن کے یہاں تاریخی و مذہبی تلمیحات بھی بکثرت پائی جاتی ہیں (جن کی تفصیل کا موقع نہیں) اور اپنے اظہارِ فضل و کمال کے لئے ایسے ایسے دقیق الفاظ استعمال کئے ہیں کہ معمولی پڑھا لکھا انسان انھیں سمجھ ہی نہیں سکتا نعتیہ قصیدے کے چند الفاظ ملاحظہ ہوں:۔ عجوس (ابر باراں) غموس (جھوٹی قسم) قربوس (زین کے سامنے کا حصہ)۔ بدریطوس (ایک مخصوص دعائے جدائی)۔ مطلوس (مٹا ہوا)۔ قصہ مختصر یہ کہ تمام ان خصوصیات کے لحاظ سے جو ایک قصیدہ کی کامیابی کے لئے ضروری سمجھی جاتی تھیں۔ مومن کے قصیدے بھی کامیاب ہیں اور اگر ہم اس رنگِ تغزل کو دیکھیں جو مومن کے قصائد میں پایا جاتا ہے۔ تو یہ کہنے میں تامل نہ ہونا چاہیے کہ اس باب میں مومن کی انفرادیت بہت نمایاں ہے۔

# قصائدِ مومن میں عنصرِ تغزل

نیاز فتحپوری

مومن شاعر تھا۔ بڑا حسن پرست، بڑا عاشق مزاج شاعر، یوں تو پہلے سبھی شاعر ایسے ہوتے تھے مومن پر کیا منحصر ہے۔ لیکن اس کی کیفیاتِ عشقیہ اپنے دوسرے ہمعصر شعراء سے مختلف تھیں۔ غالب بھی طبعاً حسن پسند دل رکھتے تھے، عاشقانہ سوزش بھی ان کے کلام میں پائی جاتی ہے اور فدا کارانہ جذبۂ عشق بھی، لیکن انھوں نے اسے اپنی زندگی کا ماحصل نہیں سمجھا۔ انھوں نے ناکامیٔ محبت میں فلسفہ و تصوف کا سہارا لے کر کچھ سکون بھی حاصل کرنا چاہا، لیکن مومن کے یہاں یہ بات کہیں نظر نہیں آتی۔ وہ ہمیشہ نیم دراغ و نیمہ خاکستر پروانہ کی طرح جلا۔ خاک ہوا اور اپنی تپش و بیقراری ہی سے لطف اٹھایا۔ وہ تصوف میں مرشد و خانقاہ کا قایل رہا ہو لیکن اپنی حیاتِ عشقیہ کو وہ اس سے بالکل علیحدہ رکھتا تھا اور اس نے کبھی اس معصیت کی عذر خواہی میں فلسفہ یا طریقت و شریعت کی پناہ نہیں لی۔

وہ جنسی عشق و محبت کرنے والا شاہد پرست انسان تھا اور ہمیشہ انھیں واردات محبت کو اس نے نظم کیا جو اس سلسلہ میں ہر شخص کو پیش آتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ مومن عاشقِ محروم نہ تھے، انہیں جس سے محبت ہوئی اس کو پا بھی لیا، لیکن یہ کوئی دیر پا وقفہ کامرانی نہ تھا اور نہ باندازہ جذبات کافی سکون بخش۔ ان کی حالت۔ "ہم میر دتشنہ مستقی دو دریا ہمچناں باقی ———— کی سی تھی

یہی وہ ناآسودگی تھی جس نے ان کی غنائی شاعری میں انفرادیت پیدا کی اور یہی وہ چیز تھی جس نے ان کو اچھا قصیدہ گو نہ بننے دیا کیونکہ قصیدہ کا اصل حسن تشبیب نہیں گریز ہے اور مومن کے کسی قصیدہ کی گریز میں نہ کوئی جدت پائی جاتی ہے نہ کوئی تنوع، اس کا سبب یہ تھا کہ ان کی تشبیب بھی بے جان ہو جاتی تھی، وہی شکایتِ زمانہ یا ذکر بہار جو تمام شعراء کا معمول تھا، اس سے وہ اپنا قصیدہ شروع کرتے تھے اور جب اس سے گریز کر کے وہ ممدوح کی مدح کی طرف آتے تھے تو کوئی منطقی تسلسل پیدا نہ کر سکتے تھے۔

اس لیے جہاں تک فنِ قصیدہ نگاری کا تعلق ہے وہ کوئی بڑے شاعر نہ تھے۔ ہر چند ان کے قصائد سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑے فاضل شخص تھے۔ تمام علوم متداولہ (منطق، ہیئت، فلسفہ، تاریخ وغیرہ) میں انہیں پوری دستگاہ حاصل تھی، لیکن یہ سب بازیگری تھی شاعری نہ تھی۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر قصیدہ گو کی حیثیت سے مومن کا ذکر ذوق کے ساتھ تو کیا جا سکتا ہے لیکن غالباً محض ایک متبع و مقلد کی حیثیت سے، کیونکہ خود مومن نے قصیدہ گوئی میں اپنی کوئی راہ علیحدہ قائم نہیں کی اور اگر ہم ان غزلیہ اشعار کو نظر انداز کر دیں جو مومن نے اپنے قصائد میں شامل کر دیئے ہیں (خواہ وہ بے محل ہی کیوں نہ ہوں) تو پھر مومن کے قصائد محض فنی تصنعات و تکلفات کے سوا کچھ نہیں رہتے۔

ہر چند قصائد اور غنائی شاعری میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ لیکن معلوم نہیں ایسا کیوں ہے کہ آج تک کسی نے محبوب کی مدح میں کوئی قصیدہ نہیں لکھا، غالباً اس لیے کہ معشوق اگر تعریف کے قابل ہو جائے تو معشوق کب رہے۔

بہر حال اس میں شک نہیں کہ فنی حیثیت سے مومن کے قصائد بھی کم اہمیت نہیں رکھتے اور اگر ہم قصائد کے متغزلانہ حصوں کو بھی سامنے رکھیں جہاں وہ بے اختیارانہ ایک عاشق دلنواز کی حیثیت سے سامنے آگیا ہے تو یہ اہمیت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

مومن کا پہلا قصیدہ حمد کا ہے۔ لیکن معلوم نہیں اس کے لئے بحرِ ہزج مسدس (اخرب مقبوض محذوف، مفعول مفاعلن فعولن)

کیوں اس نے اختیار کی، جو مثنوی کے لئے زیادہ موزوں ہے اور شاعرانہ فن کاریوں کی کم گنجائش اپنے اندر رکھتی ہے۔ اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ یہ قصیدہ انتہائی سادگی کے ساتھ مناجات کے رنگ میں لکھا جاتا تھا اور فنی نمائش پیش نظر نہ تھی۔ لیکن بایں ہمہ اس میں بھی اس نے کافی اظہار علمیت سے کام لیا ہے۔ غزلیہ اشعار بھی بہت کم پائے جاتے ہیں جو ہیں بھی وہ معیاری نہیں۔ مثلاً

اللہ غم بتاں میں یک چند — بے فائدہ جان کو کھپایا
سمجھا نہ کہ ہے رہِ خطرناک — دین و دل و عقل کو لٹایا
کی گریہ نے کتنی آبیاری — دریا مری چشم نے بہایا
گرداب مرے ڈبونے کو تھا — جو قطرہ کہ خاک پر گرایا

---

دل گرمیِ شوقِ شعلہ رونے — کیا کیا مجھے خاک پر لٹایا
گہ ساقیِ سُرخ لب کے غم نے — خونابِ دل و جگر پلایا
ہم بزمیِ ماہ وش نے گا ہے — چوں بدر سحر تلک جگایا
کرکے رہے شکر بختِ بیدار — ساتھ اپنے صنم نے گر سلایا
بوسہ جو دیا ذقن کا گویا — سیبِ خلدِ بریں کھلایا
واعظ کی کبھی کوئی نہ مانی — کتنا ہی عذاب سے ڈرایا
توڑا نہ وفا کے سلسلہ کو — توبہ ہی پہ زور آزمایا

اس میں شک نہیں یہ اشعار قصیدہ کے رنگ سے علحدہ ہیں لیکن رنگِ تغزل بھی ان کا بہت پھیکا ہے اور کہیں کہیں عامیانہ بھی۔
دوسرا قصیدہ نعت کا ہے اور اس میں شک نہیں بڑے معرکہ کا قصیدہ ہے۔ مومن نے اس میں پورا شاعرانہ زور صرف کر دیا ہے اور اپنے علم و فضل کی نمائش کا دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ بحر بھی انہوں نے بہت موزوں اختیار کی ہے (مجتث مثمن، مخبون محذوف) مفاعلن فعلاتن، مفاعلن فعلن، اور بحر کے لب و لہجہ کے جوش سے پورا فائدہ اٹھایا ہے۔

مطلع ہے:۔

چمن میں نغمۂ بلبل ہے یوں طرب مانوس — کہ جیسے صبح شب ہجر نالہائے خروس

تشبیب بہاریہ ہے اور بڑی زوردار، مبالغہ و ندرتِ تخئیل کا کوئی پہلو ایسا نہیں جو ترک ہو گیا ہو، قصیدہ کیا ہے ایک طوفانِ معانی ہے جس میں زمین و آسمان کو ایک کر دیا ہے اور کسی اور کے لئے کہنے کی گنجائش نہیں چھوڑی۔
مومن کا یہ وہ قصیدہ ہے جو ذوق کے بہتر سے بہتر قصیدے کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا ہے اور ایسی شدید محویت کے ساتھ لکھا ہو کہ کسی ایک جگہ بھی غزل کا رنگ پیدا نہیں ہوا اور کہیں کہیں ہلکا سا نظر آتا بھی ہے تو اس کا تعلق خیال سے نہیں بلکہ صرف الفاظ و ترکیب الفاظ سے ہے۔ مثلاً:۔

فسونگری دمِ مشاطۂ نسیم کی دیکھ — کہ مشکِ ناف ہوئے غنچہ ہائے زلفِ عروس
صدا نکلتی ہے مل کر ہوا سے کیا ہو فرق — کہ بانگِ خندۂ گل ہے کہ نالۂ ناقوس
جو خواب میں بھی کبھی دیکھتی جمال اس کا — تو دیتی دل کہیں یوسف کو دخترِ طیموس
(زلیخا)

فریب وعدہ پہ چھوڑی توں نے جھوٹی قسم — سنا نہ بسکہ زباں سے تری وعید غموس[1]
دیئے ہیں میرے حسد نے زمیں ہزاروں داغ — روا ہے باندھے گر عندلیب کو طاؤس

ان اشعار کا انتخاب میں نے صرف اس لحاظ سے کیا ہے کہ وہ نامانوس نہیں اور غزل میں بھی اس زبان کا استعمال ہوتا ہے ورنہ یوں ان اشعار میں کوئی تغزل نہیں۔

تیسرا قصیدہ خلیفۂ اول کی مدح میں لکھا ہے لیکن اس کی بحر بھی بہت سادہ ہے۔ خفیف مجنون مقطوع (فاعلاتن، مفاعلن، فعلن) مطلع ہے:-

کوئی اس دور میں جیے کیونکر — ملک الموت ہے ہر ایک بشر

بڑی رواں اور آسان بحر ہے، قافیہ کے لحاظ سے بھی بہت وسیع ہے۔ اس قصیدہ کی تشبیب شکایتِ زمانہ سے تعلق رکھتی ہے اور زبان، لغت، تلمیحات کے لحاظ سے زیادہ مشکل نہیں۔ اس قصیدہ میں لطفِ زبان بھی نمایاں ہے اور سلاستِ بیان بھی، لیکن رنگِ تغزل کے اشعار زیادہ نظر نہیں آتے۔ کہیں کہیں درمیان میں البتہ وہ غزل کی طرف چلے گئے ہیں اور بڑی خوبصورتی کے ساتھ مثلاً:-

دشمنِ جانِ عاشقاں دیدار — گر نگہ تیغ ہے، مژہ خنجر
خاص وہ مایۂ دل آشوبی — جس کا بیمارِ غم نہ ہو جانبر
وہ جو سر کاٹ کر پشیماں ہو — رحم گر آئے نیم بسمل پر
وہ نزلی جس نے حال کی میری — عمداً کیا کہ بھول کر بھی خبر
وہ کہ مومن کی ضد سے مومن ہو — یہ گر اس کے لئے بنے کافر

اس کے بعد اپنے کمالات کے اظہار کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنی محبوبہ کی بیوفائی کا ذکر کرتے ہوئے فریاد کی ہے کہ:-

اے دریغا حریمِ نوشابہ — مجھے دی تھی جو عقلِ اسکندر[2]
اے بلقیس گر بنایا تھا — میں بھی زیبندہ تھا سلیماں فر[3]
ملک پرویز چاہیئے تھا مجھے — اے شیریں خشم کیا تھا اگر[4]
روتے ہیں تیری جان کو ظالم — ایک میں کیا کہ سارے اہلِ ہنر
سینہ صافوں کو سلکِ مروارید — نہ ملے جز سرشکِ دیدۂ تر
لبِ رنگیں بیاں ہے اور خوں ناب — تیرہ باطن ہے اور مئے احمر

یہ اشعار سب زمانے کی شکایت کے ہیں کہ وہ نااہلوں کو تو سرفراز کرتا ہے اور اہلِ کمال کو پامال و سرگوار، لیکن لب و لہجہ غزل کا سا ہے، آگے چل کر مطلعِ ثانی میں یہ رنگ زیادہ نکھر جاتا ہے۔

کیا کہوں جی پہ کیا گزرتی ہے — یہ ستم کس کو آئے گا باور
اپنی حسرت کا کچھ علاج نہیں — یار ہو بخت یا فلک یاور
ہے یقیں یہ کہ خاک ہی میں ملے — آرزوئے وصالِ سیمیں بر

---

[1] یعنی میں ہوا کا فرتو وہ کافر مسلماں ہو گیا۔
[2] اشارہ ہے نوشابہ (ملکۂ بردع) اور سکندر کی ملاقات کی طرف
[3] اشارہ ہے بلقیس و سلیمان کے واقعۂ شادی کی طرف
[4] تلمیح خسرو و شیریں۔

نکلے ارمان کیا کہ نکلے ہیچ — نالہائے شب و فغانِ سحر
دیکھو انصاف سے کہ ظلم ہے ظلم — گر نہ ہو روئے التفات ادھر

چوتھا قصیدہ خلیفۂ ثانی کی منقبت میں ہے۔ بحر بھی بہت موزوں ہے (مجتث، مثمن، مخبون، محذوف) مفاعلن، فعلاتن، مفاعلن فعلن۔ مومن کا قصیدہ بڑے معرکہ کا قصیدہ ہے اور علمی اصطلاحات و تاریخی اشاروں سے خالی نہیں، لیکن اس کا آغاز بالکل غزلیہ انداز سے کیا ہے

جو اس کی زلف کو دوں اپنا عقدۂ مشکل — تو بوالہوس کا بھی ہرگز کبھی نہ چھوٹے دل[1]
تم اور حسرتِ ناز! آہ کیا علاج کروں — میں نیم جاں نہ رہا امتحان کے قابل
وہ شوخ برقِ عناں خاک میں ملا دیوے — اگر ہو حسرتِ دنبالہ گردیِ محمل
چلا ہی جاتا ہوں میں گو چلا نہیں جاتا — غضب ہے شوقِ رسائی و دوریِ منزل
یہ کیا غضب ہے کہ تم کو تو ربط غیر سے اور — مجھے یہ حکم کہ زنہار تو کسی سے نہ مل
وصالِ غیر کے طعنوں سے جی جلا اس کا — کہاں وہ گرمیِ صحبت کہ ہو دو ہوا میں خجل

یہ تمام اشعار مطلعِ اول کے ہیں جن میں اکثر غزل کے شعر معلوم ہوتے ہیں اور غزل کا بھی وہ رنگ جو مخصوص ہے مومن سے، مطلعِ ثانی اس سے زیادہ گہرے تغزل سے شروع ہوتا ہے۔

دل اب کی بار ہوا ایسی بے جگہ مائل — کہ جان کو بھی ٹھکانے لگا رکھے گا دل
فغاں کہ دلبر خود کام سے پڑا مجھے کام — حصولِ کار ہے بیکار و سعیِ بے حاصل
وہ تند خو کہ اگر جور سے پشیماں ہو — تو بہر عذر کرے ناز ہائے تاب گسل
وہ بیوفا کہ مکر جائے جاں فکستن تک — کرے جو وعدۂ روزِ جزا دمِ بسمل[2]
وہ شمعِ انجمنِ ناز ہائے حوصلہ سوز — جو مجھے خواریِ مشتاق، رونقِ محفل
وہ بدشعار و طرحدار و دل رُبا جس سے — امیدِ وصل خطا، ترکِ آرزو مشکل
وہ شوخ بے سبب آزار و بیگنہ خوں ریز — کہ جرمِ قاتلِ عثمان کا نہ ہو قائل
وہ نکتہ داں کہ تقیہ کو اصلِ دین کہے — دمِ شکایتِ عاشق نہ ہو جفا سے خجل[3]

ان دو شعروں سے اس خیال پر کافی روشنی پڑتی ہے کہ مومن کی محبوبہ شیعی مسلک رکھتی تھی۔ جیسا کہ بعض کا خیال ہے۔ اس کے بعد ہی فوراً بغیر کسی موڑ یا ربط کے وہ حضرت عمرؓ کا ذکر شروع کر دیتا ہے جس کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔

پانچواں قصیدہ حضرت عثمانؓ کی منقبت میں ہے جو بحرِ رمل مثمن مخبون مقطوع مسبغ میں لکھا گیا ہے (فاعلاتن، فعلاتن، فعلاتن، فعلان)۔ اس قصیدہ کے دونوں مطلع بالکل غزل ہیں، پہلے مطلع کے بعض اشعار ملاحظہ ہوں:۔

---

[1] یعنی اگر اس کی زلف کو میں اپنا عقدۂ مشکل یا اپنی قسمت کی سخت گرہ دیدوں تو رقیب بھی کبھی اس سے نہ چھوٹے حالانکہ وہ محض ہوس پرست ہے اور محبت کی دشواریوں سے گریز کرتا ہے۔

[2] "دمِ بسمل" سے مراد جانکنی کا وقت ہے۔ شعر کا مفہوم یہ ہے کہ اس کی بیوفائی کا یہ عالم ہے کہ اگر وہ جانکنی کے وقت قیامت میں ملنے کا وعدہ کرلے تو دم توڑتے توڑتے پھر اس وعدہ سے پھر جائے۔

[3] چونکہ محبوب تقیہ کا قائل ہے اس لئے وہ اپنے ستم کو تقیہ یعنی رحم کہتا ہے اور شکایت عاشق سے شرمندہ نہیں ہوتا۔

ہے یہی حسرت دیدار تو مرنا دشوار، دم شماری کی مری عمر ہے تا روزِ شمار
بدگمانی نے دعا سے بھی رکھا محروم آہ، رازِ دل غیر سے کس طرح میں کرتا اظہار
بے سبب قتل سے آیا نظر انجام اپنا سرمۂ دیدۂ دشمن ہے مری خاکِ مزار
دھوم ہے تابش خورشید قیامت کی مگر مجھ سے اللہ نہ پوچھے گا عذابِ شبِ تار
دردِ سر میری شکایت سے نہیں یہ تم کو بزمِ دشمن میں جو تم نے پی تھی سو اس کا ہے خمار
تاب بھی دیکھ کر اس بُت کی تجلی نہ رہی میری قسمت میں نہ تھا ہائے خدا کا دیدار
خاک ڈالی ہے جو سر میں تو اسی کوچہ کی یوں میں دیوانہ ہوں پر کام میں اپنے ہشیار
ہم سے دشمن نے کہے راز تری مستی میں ایسے کم ظرف کو دیتے نہیں جامِ سرشار
حور کا ذکر ہو سناک سے کرائے واعظ مجھ کو اس بت کے سوا اور سے ہے کیا سروکار
میرے سینہ پہ قدم زور سے مت رکھو ظالم ہاں نہ چبھ جائیں کفِ پا میں کہیں دل کے خار
کس کی دل گرمی بیجا نے جلایا ہی کو کہ ہے خاکسترِ گلخن مری خاطر کا غبار
بات میری جو کسی طرح سمجھتا ہی نہیں وہم آتا ہے کہ ناصح بھی نہ ہو عاشقِ زار
غیر کو بام پہ آ جلوہ دکھایا تم نے یہ نہ سوچا کہ پڑا ہے کوئی زیرِ دیوار
بیم رسوائی اور اندیشۂ بدنامی سے کیا کروں کر نہ سکا وحشتِ دل کا اظہار
شاد شاد آئے عیادت کو دمِ آخر تم ایسے بیدرد پہ کرتا ہے کوئی جان نثار

اس کے بعد دوسرا مطلع شروع ہوتا ہے۔ اس کا رنگ تغزل بھی ملاحظہ ہو۔

نیکنامی نہ سہی مجھ کو ہے تم سے سروکار چھوڑ دوں آج وفا گر ہو وفا سے بیزار
آگیا لب پہ دم اور بات نہ پوچھی تم نے بوسہ دینے کا اسی منہ سے کیا تھا اقرار
گر تمہیں صحبتِ اغیار سے پرہیز نہیں ہم بھی کچھ چارۂ آزار کریں گے ناچار
وہ جلے محفلِ دشمن میں جو ہو شمع تھا مجھ کو چھیڑا نہ کرو تم سے کہا ہے سو بار
نقدِ جاں اپنی تجلی کی نہ کہنا قیمت صبح محشر کہیں بن جائے نہ روزِ بازار
سیلِ مروت مری نظروں میں ہیں انداز ترے آج کل کچھ نگہ لطف ہے سوئے اغیار
آپ دیکھا نہ سُنا اور سے پر جھوٹ نہیں تیری آنکھیں کہے دیتی ہیں نہ کرنا انکار

آپ نے دیکھا کہ اس قصیدہ کی تشبیب میں محض تغزل ہی نہیں بلکہ واسوخت کا بھی کافی رنگ نمایاں ہے۔

---

چھٹا قصیدہ حضرت علی کی منقبت میں ہے اور صرف یہی ایک قصیدہ ایسا ہے جو اپنی ردیف (تیغ) کی وجہ سے غزل کا متحمل نہ ہو سکتا تھا۔ یہ قصیدہ بحر مضارع اخرب مکفوف مقصور (مفعول، فاعلات، مفاعیل، فاعلات) میں لکھا گیا ہے جو قصیدہ کے لئے بہت موزوں ہے۔

اس کا مطلع ہے۔ کشتی ہے میری تیغِ زباں سے زبانِ تیغ کیونکر سخن فروش ہوں سوداگرانِ تیغ[1]

---

[1] یعنی تیغ کے سوداگر اپنی تیغ کی تعریف میں میری تیغ زبان کے سامنے کیا باتیں بنا سکتے ہیں

اس قصیدہ کا آغاز شاعرانہ تعلّی سے ہوا ہے اور خود ستائی کا پورا حق ادا کر دیا ہے۔ لیکن تغزل کی حدود تک کہیں نہیں پہنچا اور بہ لحاظ تشبیب و ردیف اس کا موقع بھی نہ تھا۔

---

ساتواں قصیدہ امام حسن کی منقبت میں ہے اور بحر و قافیہ کے لحاظ سے بڑی وسعت اپنے اندر رکھتا ہے۔ مطلع ہے:-

چاہتا خلق کو صہبا و صنم سے محروم　　ایسی نیت پہ بہشت آپکی واعظ معلوم

اس کی بحر بھی وہی ہے جو حضرت عمر کے قصیدۂ منقبت کی ہے اور بڑی مترنم بحر ہے۔ اس قصیدہ میں بھی جا بجا ہمیں تغزل کے آثار نظر آتے ہیں لیکن زیادہ واضح و روشن نہیں۔ مثلاً:-

گر نہ ہو میکشی و وصلِ صنم کی تعذیر　　تو یقین آئے مجھے یہ کہ جہاں ہے موہوم[1]

جوشِ وحشت سے یہ ناصح نہ پہنا از زنجیر　　دیکھ دیوانہ نہ ہو، میں نہیں پابندِ رسوم

کر دیا خواہشِ بیداد نے احوال تباہ　　تو تو ظالم نہیں زنہار، پہ میں ہوں مظلوم

طعنۂ وصلِ ہوسناک پہ ہنس دیتے ہیں　　مگر الزام و ندامت نہیں لازم ملزوم[2]

یہ قصیدہ بھی اپنے جوش و ندرتِ تخیل کے لحاظ سے مومن کا خاص کارنامہ ہے۔

---

آٹھواں قصیدہ نواب محمد وزیر خاں والی ٹونک کی مدح میں کہا گیا ہے اور غالباً اس لئے بہت آسان و رواں بحر میں کہا گیا ہے کہ ممدوح اس سے پورا لطف اٹھا سکے۔ علمی اصطلاحات و تلمیحات سے بھی زیادہ کام نہیں لیا گیا۔ اس کی بحر خفیف مخبون مقطوع ہے۔ (فاعلاتن مفاعلن، فعلن) مطلع یہ ہے:-

یادِ ایامِ عشرتِ فانی　　نہ وہ ہم ہیں نہ وہ تن آسانی

تشبیب کا آغاز شکایتِ زمانہ سے ہوتا ہے اور اسی رنگ کو قائم رکھتے ہوئے قصیدہ ختم کیا گیا ہے۔ بحر کی روانی کے لحاظ سے اس میں تغزل کی بڑی گنجائش تھی۔ لیکن معلوم نہیں مومن نے کیوں اس سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ فنِ قصیدہ نگاری کے لحاظ سے وہ قصیدہ البتہ بڑے معرکہ کا ہے جس میں بحر کی روانی اور وسعت قافیہ کے پیش نظر مومن کو بڑی معنی آفرینی کا موقع مل گیا ہے۔

یہ قصیدہ، بحر رجز مثمن مطوی مخبون میں لکھا گیا ہے (مفتعلن، مفاعلن، مفتعلن، مفاعلن) مطلع کا زور و بدبہ ملاحظہ ہو۔

صبح ہوئی تو کیا ہوا ہے وہی تیرہ اختری　　کثرتِ دود سے سیاہ شعلۂ شمعِ خاوری

مطلع سے تشبیب کا انداز ظاہر ہے، وہی شکایتِ زمانہ اور وہی اپنی حسرت و ناکامی کا اظہار۔ لیکن مومن نے نہ اپنی خودداری کو کہیں مجروح ہونے دیا نہ اپنے مصائب کی گراں قدری پر حرف آنے دیا۔

اس قصیدہ میں بھی مومن نے بڑی بلند تعبیراتِ شاعرانہ سے کام لیا ہے اور پورا زورِ قلم صرف کر دیا ہے۔ لب و لہجہ اور ترنم کے لحاظ سے بھی مومن کا یہ قصیدہ خاص چیز ہے۔

---

[1] میں جہاں کو صرف اس لئے موہوم نہیں کہہ سکتا کہ وہاں کی میکشی اور وصل صنم کی جسمانی تعذیر ملے گی۔ اگر جہاں وہم ہی وہم ہوتا تو پھر تعذیر کا کوئی سوال پیدا نہ ہوتا۔

[2] وہ میرے طعنہ پہ نادم نہیں ہوتے بلکہ ہنس دیتے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ الزام کو ندامت لازم نہیں ہے۔

غزل کا عنصر اس میں نہ ہونے کے برابر ہے۔ کہیں کہیں بعض اشعار پر اس کا سایہ ضرور پڑ گیا ہے۔ مثلاً

رغبتِ وصل پر عذرِ یار کو ہائے ہائے ہے ۔۔۔ تا کسی آفت قرار نے ہوسِ ستمگری
کل سے زیادہ آج ہے غم کی فراہمی مباد ۔۔۔ آج سے کل زیادہ ہو حال کی اپنے ابتری
جانِ جہاں کو دل دیا دشمنِ جاں ہوا جہاں ۔۔۔ سر میں ہوا، نظر میں یاس سینہ میں آرزو بھری

---

اصناف شاعری میں غزل و قصیدہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے لیکن فرق یہ ہے کہ غزل کے نام سے ہر شخص دو چار شعر کہہ کر شاعر بن سکتا ہے۔ لیکن قصیدہ کہنا اتنا مشکل فن ہے کہ قدیم شعراء سے بھی چند ہی نے اس میں نام پایا جن میں سے ایک مومن بھی ہیں۔ غالب نے بھی اردو میں قصیدے کہے ہیں، لیکن جس حد تک کمال فن کا تعلق ہے اس کا اظہار غالب کے فارسی قصائد سے ہوتا ہے۔ ذوق کا مرتبہ البتہ بہت بلند ہے اور شاید اس لئے کہ قدرت نے شعر گوئی کی جو اہلیت انہیں عطا کی تھی، وہ زیادہ تر قصیدہ نگاری سے تعلق رکھتی تھی۔ غزل کہنے کے طبعی رجحانات انہیں بہت کم تھے۔ یہ فن بالکل ختم ہو گیا ہے اور اسے ختم ہونا چاہیے۔ کیونکہ قصیدہ کہنے کے لئے جس فضل و کمال اور وسعت مطالعہ کی ضرورت ہے، اس سے ہمارے اکثر شعراء کو بہرہ یاب ہونے کا موقع نہیں ملتا۔ کیونکہ اس کے لئے علوم قدیمہ اور فارسی و عربی ادب کا جاننا ضروری ہے اور اس کی فرصت اب کہاں۔ تاہم یہ ضرور کہوں گا کہ اگر ہمیں اپنے کلاسکل ادب کو محفوظ رکھنا ہے تو اردو شاعری میں صرف روایات غزل ہی کو سامنے نہ رکھنا چاہیئے بلکہ خصوصیت کے ساتھ قصیدہ نگاری کی روایات کو بھی زندہ رکھنا ضروری ہے، حیرت ہے کہ آج غزل میں گل و بلبل کے ذکر کو تو پامال و فرسودہ چیز سمجھا جاتا ہے۔ لیکن گل و بلبل سے ہٹ کر جو شاعری اردو میں کی گئی ہے یعنی قصیدہ نگاری اس پر کسی کو توجہ نہیں اور یہ بیگانگی اب اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ آج ہماری بڑی بڑی دانش گاہوں میں بھی ذوق، سودا اور مومن کے قصائد کو سمجھنے اور سمجھانے والا دانشور مشکل ہی سے کوئی ملے گا۔

# قصائدِ مومن کے بعض مشکل اشعار کی شرح

(نیاز فتحپوری)

جب قصائد مومن کا ذکر آتا ہے تو میں بے چین ہو جاتا ہوں۔ ایک زمانہ وہ تھا جب دنیا اس کی زبان کو بے تکلف سمجھ لیتی تھی اور آج وہ وقت آیا ہے کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ بھی اس کے سمجھنے سے عاری ہیں۔ فہل من مدکر!

مومن کو غزل گو شاعر کی حیثیت سے سب لوگ جانتے ہیں، لیکن قصیدہ نگار ہونے کی حیثیت سے اس کی عظمت کا علم کم لوگوں کو حاصل ہے۔ حالانکہ اس صنفِ سخن میں بھی (سودا کو چھوڑ کر) وہ بڑے مرتبہ کا مالک تھا اور جوشِ بیان و ندرتِ خیال تو اسی کا حصہ تھا۔

اس میں شک نہیں کہ مومن کے بعض قصائد بہت دقیق ہیں اور ان میں نامانوس الفاظ کی بھی کمی نہیں لیکن مومن نے یہ قصائد اس وقت لکھے تھے جب یہ الفاظ لوگوں کے لئے اتنے غیر مانوس نہ تھے۔ اس وقت قصیدہ نگاری کی فنی خصوصیت یہی تھی کہ شاعر اپنا تبحرِ علمی ظاہر کرنے کے لئے اپنی پوری قوت سے کام لے اور ندرتِ خیال و جوشِ بیان سے اس میں اچنبھاپن پیدا کر دے۔ چنانچہ مومن نے بھی اپنے بعض قصائد میں اس خصوصیت کا پورا لحاظ رکھا اور طب، حکمت و نجوم وغیرہ کی اصطلاحات سے کام لے کر ان کو بہت مشکل بنا دیا۔

"قصیدہ در تعریف رسالت مآب" مومن کا بڑا اہم قصیدہ ہے جس میں قصداً ایسا قافیہ اختیار کیا گیا کہ بہت سے دقیق و نامانوس قافیوں کا استعمال ناگزیر ہو جائے۔ اسی قصیدہ کے بعض مشکل اشعار کی صراحت یہاں کی جاتی ہے۔

۱۔ زبان لال کہاں اور مدیحِ تاج خروس　　گرا ہے خاک پہ کیا لعلِ افسرِ کاؤس

زبانِ لال (گونگی زبان)۔ مدیح (تعریف)۔ تاج خروس (ایک سرخ پھول جسے مرغ کیس بھی کہتے ہیں۔ افسر (تاج) کاؤس (ایران کے کیانی خاندان کا ایک مشہور بادشاہ)

مومن یہ کہنا چاہتا ہے کہ "میری زبان گنگ، تاج خروس (کنایہ ہے ذات نبوی کی طرف) کی تعریف سے قاصر ہے" اور پھر دوسرے مصرع میں تشبیہی صورت سے یہ کہہ کر کہ "وہ تاج خروس ہے یا تاج کاؤس کا کوئی لعل" تعریف بھی کر دی ہے۔

۲۔ غبارِ صحنِ چمن کیمیائے عیش و نشاط　　بہارِ لالہ و گل سیمیائے عرضِ شموس

عرض (پیش کرنا — شموس (جمع شمس)

اس قصیدہ کی تشبیب بہاریہ ہے اور موسم بہار میں لطف و رنگینی کا جو انتہائی تصور ذہن میں آ سکتا ہے اسے مومن نے مختلف پیرایوں میں پیش کیا ہے۔ چنانچہ اس شعر میں بھی وہ اسی کا اظہار کرتا ہے کہ صحن چمن کا غبار بھی حصولِ عیش و نشاط کیلئے اکسیر کا حکم رکھتا ہے اور لالہ و گل کی کثرت کا یہ عالم ہے گویا علم نیر نجات نے ہر طرف آفتاب ہی آفتاب بکھیر دئے ہیں۔

۳۔ زہے فریب صفا خاک سبز ہے گلچیں　　پڑے جو وسعتِ گلزار میں گلوں کے عکوس

عکوس (جمع عکس)

اس سے قبل کے شعر میں اس نے باغ کے در و دیوار کی صیقل و صفائی کا حال بیان کیا ہے کہ آشیانے میں طائروں تک کے پاؤں نہیں جمتے اور اس شعر میں صحن چمن کی صفائی کا ذکر کیا ہے کہ اس کی خاک پر پھولوں کا عکس اس طرح پڑ رہا ہے کہ گلچیں کو اس پر پھولوں کا دھوکا ہو جاتا ہے اور وہ خاک سمیٹنے لگتا ہے۔

۴۔ ہے وشت بزم طرب کثرت نتائج سے　　نہ کیوں ہو شکل حماری کو نازِ شکلِ عروس

اس میں اقلیدس کی اصطلاحات سے کام لیا گیا ہے۔ شکل حماری اور شکل عروسی دونوں اقلیدس کی شکلیں ہیں اور شکل عروسی بہت کثیر النتائج شکل ہے۔

۵۔ مزاج دہر میں یہ اعتدال آیا ہے　　کہ جس نبات کو دیکھو وہ صالح الکیموس

طبی اصطلاح میں کیموس ہضم ثانی کو کہتے ہیں جس سے خون صالح پیدا ہوتا ہے۔

۶۔ نمو کا معجزہ صلی علیہ، پھر گندم　　ہوائے جنبش غربال سے بنے ہے سبوس

(چھلنی)　(بھوسی)

جوش نمو کا یہ عالم ہے کہ چھلنی کی ہوا سے بھوسی پھر گیہوں بن جاتی ہے۔

۷۔ صفات آئے جو آئینہ ہوا میں نظر　　لگا خواص و عوارض کو اعتبارِ نفوس

اس شعر میں فلسفہ سے کام لیا گیا ہے۔ دنیا میں اعیان کا تعلق دو چیزوں سے ہے۔ ایک نفس، جوہر یا ذات۔ دوسرے نفس کے صفات جنھیں "خواص و عوارض" بھی کہتے ہیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے کو مستلزم ہیں، نہ اعراض بغیر جوہر کے پائے جاسکتے ہیں، نہ جوہر کو بغیر اعرض کے شخص کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً پھول کہ وہ بجائے خود جوہر ہے لیکن ہم اس کا تشخص نہیں کر سکتے جب تک اسکے اعراض (رنگ، پتیاں اور حجم وغیرہ) سامنے نہ ہوں۔

شعر کا مطلب یہ ہے کہ ہوائے چمن اس قدر شفاف و متجلی ہے کہ اس کے آئینہ میں خواص و عوارض بھی نفوس نظر بنکر سامنے آجاتے ہیں۔

۸۔ سیاہ چشموں کو مشکل نگاہِ وزدیدہ　　یہ اُس کے حفظ سے ہے ملک معدلت محروس

ممدوح کے عدل و انصاف کا یہ عالم ہے کہ چوری کے نام سے معشوقوں کو "نگاہ چرانا" بھی مشکل ہو گیا ہے۔

۹۔ طبیب وہ ہوں کہ ہو سوزِ سینۂ بلبل　　نظارۂ رخِ گلفام سے مجھے محسوس

میری طبی مہارت کا یہ حال ہے کہ میں معشوق کے پھول سے چہرہ کو دیکھ کر دلِ بلبل کی حرارت محسوس کر لیتا ہوں۔

۱۰۔ گواہِ عصمت مریم ہو کثرت اولاد　　عقیمہ مجھ سے سنے گر بیانِ شکلِ عروس

اقلیدس کی ایک شکل کا نام "شکلِ عروس" جس سے ریاضی کے بہت سے نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی بانجھ عورت مجھ سے شکل عروس کا بیان سن لے تو بانجھ پن دور ہو کر بہ کثرت اس کی اولاد پیدا ہو اور اس طرح عصمتِ مریم کی ایک اور گواہی مل جائے کیونکہ انھوں نے بھی بغیر شوہر کے مسیح کو جنم دیا تھا۔

یہ پورا قصیدہ ایسے ہی دقیق اشعار پر مشتمل ہے، جن کی تشریح و وضاحت کا موقع نہیں، لیکن اس میں جو مشکل و نامانوس ثقیل الفاظ استعمال کئے گئے ہیں ان کے معنی یہاں درج کئے دیتا ہوں تاکہ اشعار کے سمجھنے میں آسانی ہو۔

سدوس = سبز رنگ کی ریشمی چادر۔
منکوس = اُلٹا (سیدھے کا ضد)
ایلاؤس = ایک بیماری جس میں براز قے کے ذریعہ سے خارج ہونے لگتا ہے۔
آبنوس = سیاہ رنگ کا ایک پھل،
جُعل = گبریلا (ایک کیڑا جو گوبر میں رہتا ہے)
سُوس = ایک کیڑا جو ریشمی کپڑے کو چاٹ جاتا ہے۔
شاموس = سنگ جراحت
دختر طیموس = زلیخا
قربوس = زین کا اگلا حصّہ
جاموش = بھینسا
قاموس = سمندر
کیوس = کاسہ کی جمع
لبتوس = ایک اسرائیلی عورت کا نام
غموس = جھوٹی قسم
دبوس = گُرز
الکوس = شاہنامہ کا ایک پہلوان۔
دساوہ = مسند
مطموس = مٹا ہوا۔
مدروس = کہنہ۔ پُرانا
دعائے بدر لیطوس = ایک خاص دُعا جدائی پیدا کرنے کی۔

---

مومن نے ایک قصیدہ حضرت عثمان کی منقبت میں لکھا ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس میں بکثرت تلمیحات و اصطلاحات نجوم سے کام لیا ہے۔ چونکہ مومن ماہر علم نجوم تھا اور سیاروں کی گردش کے اثرات کا قایل ، اس لئے وہ ان اشعار میں اپنی بدبختی کا سبب گردشِ سیارگان ہی کو قرار دیتا ہے اور اس سلسلے میں اس نے نجوم کی بعض اصطلاحات استعمال کی ہیں۔ جن سے عام طور پر لوگ ناواقف ہیں۔

اس قصیدہ میں مومن اپنی زبوں طالعی کا بیان اس شعر سے کرتا ہے :۔

اے شہِ پایہ فزا مدح سرا گر تیرا    پستیٔ بخت نگوں سار سے ہو شکوہ گزار

اور پھر اصطلاحاتِ نجوم میں وہ شکوہ شروع کر دیتا ہے مثلاً :۔

طالع پست کی نسبت سے مرے وا ژدلِ چرخ    بختِ تیرہ سے مرے روز مہ انور تار

روز باحورٔ دن اور رات شب یلدا ہے — دونوں نقطوں پہ ہے یوں ہمسری لیل و نہار
میرے اقبال کا آجائے اگر دور قریب — تو ثوابت سے گراں رو ہوں نجوم و سیار

اس قصیدے کے مشکل اشعار یہ ہیں :-

۱- ذروۂ اوج سے برجیس کو رجعت ہو جائے — ثور میں زہرہ کرے مہ کے قِراں سے انکار

ذروہ (عروج ، بلندی) - برجیس (ستارہ مشتری جسے قاضی فلک بھی کہتے ہیں) - رجعت (واپس لوٹ آنا) ثور (ایک برج کا نام ہے) - قِران (دو سیاروں کا ایک برج میں اجتماع) -

مشتری کا انتہائی عروج پر پہنچ جانا اور برج ثور میں زہرہ اور قمر کا اجتماع یا قران ، بڑی فال نیک سمجھا جاتا ہے - لیکن مومن کہتا ہے کہ میری بدبختی کا یہ عالم ہے کہ میرے طالع کا مشتری انتہائی عروج پر پہنچ جانے کے بعد بھی فوراً لوٹ جاتا ہے اور برج ثور میں زہرہ اور قمر کا قراں ہوتا ہی نہیں -

۲- تاکہ ہو جائے ہر آزار کا مصدر ایک ایک — سخت نحسین کو ہے دفع طبیعت پہ قرار

نحسین (دو منحوس سیارے زحل اور مریخ) - دفعِ طبیعت (طبیعی یا فطری ترقی کو روکنا) -

لفظ سخت کا تعلق نحسین سے نہیں بلکہ قرار سے ہے یعنی ان دونوں نحس سیاروں نے آپس میں فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ مجھے ترقی نہ کرنے دیں گے اور ان میں سے ہر ایک علیحدہ علیحدہ مجھے آزار پہونچائے گا -

۳- بندے امید گر ایک خوشۂ گندم کی مجھے — مہر تحویل سے ہو برجِ شرف کے بیزار

مہر (آفتاب) - برجِ شرف (برج حمل - تحویل (لوٹنا)

جب سورج برج حمل کی طرف لوٹتا ہے تو گرمی کا زمانہ شروع ہوتا ہے اور اسی وقت گیہوں پکتا ہے -

مومن کہتا ہے کہ اگر مجھے کبھی ایک خوشۂ گندم کی امید پیدا ہوتی ہے تو برج حمل میں سورج کی تحویل بھی ختم ہوتی ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ میرا خوشۂ گندم ناپختہ رہ جاتا ہے -

۴- گر حصولِ زرِ مسکوک کی سمجھوں میں دلیل — ناخنِ شیر سے ہو سینۂ خورشید فگار

شیر سے مراد برج اسد ہے - اور زرِ مسکوک سے اشرفی - مطلب یہ ہے کہ میں ایسا بدبخت ہوں کہ اگر آفتاب کو دیکھ کر میں یہ خیال کروں کہ اس طرح کی اشرفی کبھی مجھے بھی مل سکتی ہے تو برج اسد ، خود آفتاب کا سینہ زخمی کر دے - تاکہ اسے دیکھ کر امید حصول زر کی امید مجھ میں پیدا نہ ہو سکے -

۵- خون کے میرے ارادے سے ہوا ذابح سعد — قتل پر میرے کمر باندھے ہے شکلِ جبّار

سعد ذابح اور جبار دونوں ستاروں کے اجتماع کی مختلف صورتیں ہیں - سعد ذابح ستاروں کی اس شکل کو کہتے ہیں جن سے ایک شمشیر بکف قاتل یا ذابح (ذبح کرنے والے) کی صورت متصور ہوتی ہے - اور جبار میں ایک مسلح سپاہی کی سی - مدعا یہ کہ سعد ذابح کو ذابح اس لئے کہتے ہیں کہ وہ میرے قتل پر آمادہ ہے اور جبار کو جبار اس لئے کہتے ہیں کہ وہ میرے قتل پر کمر بستہ ہے -

۶- زیست اپنی ہے تو تربیع و تقابل کے سوا — بھول جاویں گے منجم جو ہیں باقی انظار

تربیع (دو ستاروں کے درمیان تین برجوں کا فاصلہ) - تقابل (دو ستاروں کے درمیان چھ برجوں کا فاصلہ) ——

---

لہ انتہائی گرم مہینہ کے ابتدائی آٹھ دن

انظار (جمع ہے نظر کی۔ نجومیوں کی اصطلاح میں ستاروں کی رفتار کے رُخ کو نظر کہتے ہیں)۔ نجومیوں کے یہاں سیاروں کی وہ نظریں جنھیں تربیع و تقابل کہتے ہیں دونوں نحس ہیں۔ مومن کہتا ہے کہ میں ایسا ازلی بدنصیب ہوں کہ جب تک میری زندگی ہے نجومیوں کو تربیع و تقابل کی منحوس نظروں کے سوا سیاروں کی کوئی اور نظر سامنے آ ہی نہیں سکتی اور تمام دوسرے انظار محو ہو جائیں گے۔

اس میں شک نہیں کہ مومن کے تمام وہ اشعار جو اس قسم کی تلمیحات سے تعلق رکھتے ہیں، مشکل ضرور ہیں اور انھیں مشکل ہونا چاہئے، کیونکہ اس زمانے میں قصیدہ نگاری اور مشکل نگاری ایک ہی چیز تھی جس کا مقصود ذہنی قابلیت اور وسعت معلومات کا اظہار ہوتا تھا۔ لیکن مومن چونکہ طبعی طور پر غزل گو شاعر تھا اس لئے وہ اس مبالغہ آرائی سے گھبرا کر کبھی غزل سرائی تک بھی پہنچ جاتا تھا۔ چنانچہ اسی قصیدہ میں اس کے یہ اشعار (مطلع ثانی) کے ملاحظہ ہوں:-

نیک نامی نہ سہی مجھ کو ہے تم سے سروکار　　چھوڑ دوں آج وفا گر ہو وفا سے بیزار
آگیا لب پہ دم اور بات نہ پوچھی تم نے　　بوسہ دینے کا اسی منہ سے کیا تھا اقرار
گر تمھیں صحبت اغیار سے پرہیز نہیں　　ہم بھی کچھ چارۂ آزار کریں گے زنہار
وہ جلے محفلِ دشمن میں جو ہو شمع نما　　مجھ کو چھیڑا نہ کرو تم سے کہا ہے سو بار

---

# انتخابِ کلامِ مُومن

## غزلیات

غضب سے تیرے ڈرتا ہوں رضا کی تیری خواہش ہے
نہ میں بیزار دوزخ سے نہ میں مشتاق جنت کا

عنایت کر مجھے آشوب گاہِ حشرِ غم اک دل
کہ جس کا ہر نفس ہم نغمہ ہو شورِ قیامت کا

---

اس کوچے کی ہوا تھی کہ میری ہی آہ تھی
کوئی تو دل کی آگ پہ پنکھا سا جھل گیا

اس نقشِ پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل
میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

بت خانے سے نہ کعبہ کو تکلیف دے مجھے
مومن بس اب معاف! کہ یاں جی بہل گیا

---

نہ جاؤں گا کبھی جنت میں، میں نہ جاؤں گا
اگر نہ ہووے گا نقشہ تمہارے گھر کا سا

یہ جوشِ یاس تو دیکھو کہ اپنے قتل کے وقت
دعائے وصل نہ کی وقت تھا اثر کا سا

---

گر وہاں بھی یہ خموشی اثرِ افغاں ہوگا
حشر میں کون مرے حال کا پرساں ہوگا

ان سے بدخو کا کرم بھی ستمِ جاں ہوگا
میں تو میں غیر بھی دل دے کے پشیماں ہوگا

خواہشِ مرگ ہو اتنا نہ ستانا ورنہ
دل میں پھر تیرے سوا اور بھی ارماں ہوگا

---

آخر امید ہی سے چارۂ حرماں ہوگا
مرگ کی آس پہ جینا شبِ ہجراں ہوگا

درد ہے جاں کے عوض ہر رگ و پے میں ساری
چارہ گر ہم نہیں ہونیکے جو درماں ہوگا

کیا سناتے ہو کہ ہے ہجر میں جینا مشکل
تم سے بے رحم پہ مرنے سے تو آساں ہوگا

کیونکہ اُمیدِ وفا سے ہو تسلی دل کو
فکر ہے یہ کہ وہ وعدہ سے پشیماں ہوگا

دوستی اس صنمِ آفتِ ایماں سے کرے
مومنؔ ایسا بھی کوئی دشمنِ ایماں ہوگا

دیدۂ حیراں نے تماشا کیا　دیر تلک وہ مجھ دیکھا کیا
آنکھ نہ لگنے سے سب احباب نے　آنکھ کے لگ جانے کا چرچا کیا
غیر عیادت سے بُرا مانتے　قتل کیا آن کے اچھا کیا
زندگیٔ ہجر بھی اک موت تھی　مرگ نے کیا کارِ مسیحا کیا
جور کا شکوہ نہ کروں ظلم ہے　راز مرا صبر نے افشا کیا
رحم فلک اور مرے حال پہ　تو نے کرم اے ستم آرا کیا
سچ ہی سہی آپ کا پیماں ولے　مرگ نے کب وعدۂ فردا کیا
دشمن مومن ہی رہے بت سدا　مجھ سے مرے نام نے یہ کیا کیا

---

موئے نہ عشق میں جب تک، وہ مہرباں نہ ہوا
بلائے جاں ہے وہ دل جو بلائے جاں نہ ہوا
خدا کی یاد دلاتے تھے نزع میں اسباب
ہزار شکر کہ اس دم وہ بدگماں نہ ہوا
بٹھنے نہ غیر مجھے بزم سے اٹھانے پر
سبک ہے وہ کہ تری طبع پر گراں نہ ہوا
وہ آئے بہر عیادت تو تھا میں شادیٔ مرگ
کسی سے چارۂ بیدادِ آسماں نہ ہوا
لگی نہیں ہے یہ چپ لذت ستم سے کہیں
حریفِ کشمکش نالہ و فغاں نہ ہوا
امید وعدۂ دیدار حشر پر مومن
تو بے مزہ تھا کہ حسرت کشِ بتاں نہ ہوا

---

سب تا بہ فتنہ چونک پڑے تیرے عہد میں
اک میرا بخت تھا کہ وہ بیدار کم ہوا
کچھ قیس اور میں ہی نہیں سب کے سب موئے
اچھا تو درد عشق کا بیمار کم ہوا
ذکر بتاں سے پہلی سی نفرت نہیں رہی
کچھ اب تو کفر مومن دیندار کم ہوا

میں وہم سے مرتا ہوں وہاں رعب سے اس کے
قاصد کی زباں سے نہیں پیغام نکلتا
حوریں نہیں مومن کے نصیبوں میں جو ہوتیں
بت خانے ہی سے کیوں یہ بد انجام نکلتا

---

وصل کی شب شام سے میں سو گیا　جاگنا ہجراں کا بلا ہو گیا
آئینہ جلدی سے پٹک دو کہیں　دل ہی نہیں ہاتھ سے دیکھو گیا
صبر نہیں شام فراق آج کو　جس سے کہ بیزار تھے تم سو گیا
ہائے صنم ہائے صنم لب پہ کیوں　خیر ہے مومن تمہیں کیا ہو گیا

---

ڈر تو مجھے کس کا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
پر حال یہ افشا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
مت پوچھ یہ کس واسطے چپ لگ گئی ظالم
بس کیا کہوں میں کیا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
اے چارہ گرد قابلِ درماں نہیں یہ درد
ورنہ مجھے سودا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
ہر وقت ہے دشنام ہر ایک بات میں طعنہ
پھر اس پہ بھی کہتا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
کچھ سن کے جو میں چپ ہوں تو تم کہتے ہو بولو۔
سمجھو تو یہ تھوڑا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
مومن بخدا سحر بیانی کا جبھی تک
ہر ایک کو دعویٰ ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

---

تیرے پردے نے کی یہ پردہ دری　تیرے چھپتے ہی کچھ چھپا نہ رہا
غم مرا کس لیے کہ دنیا میں　نہ رہا میں مرا قصا نہ رہا
مدعا غیر سے کہا تا وہ　سمجھے اب کچھ بھی مدعا نہ رہا
دل لگانے کے تو اٹھائے مزے　جی بلا سے رہا رہا نہ رہا
تو فلک مرگ ہم سے سبقانل　اسکی کا بھی آسرا نہ رہا

بسکہ اک پردہ نشیں سے دل بیمار لگا   جو طبیبوں سے چھپاتے ہیں وہ آزار لگا
کعبہ سے جانب بتخانہ پھر آیا مومن   کیا کرے جی نہ کسی طرح سے زنہار لگا

---

شب غم فرقت ہمیں کیا کیا مزے دکھلائے تھا   دم رکے تھا سینے میں کمبخت جی گھبرائے تھا
یا تو دم دیتا تھا وہ یا نامہ بر بہکائے تھا   تھے غلط پیغام سارے کون یاں تک آئے تھا
ہات شب کو اُس کی منع بیقراری پر بڑھی   ہم تو سمجھے اور کچھ، وہ اور کچھ سمجھائے تھا
ناز و شوخی دیکھنا وقت تظلم دمبدم   مجھ سے وہ عذر جفا کرتا تھا اور جھنجھلائے تھا

. . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . .

ہو گئی دو روز کی الفت میں کیا حالت ابھی   مومن وحشی کو دیکھا اس طرف سے جائے تھا

---

عبث الفت بڑھی تم کو وہ کب دیتا تھا دم تم پر   یہ مجھ کو دیکھ کر دشمن کلیجا تھام لیتا تھا
سحر تک شام سے تجھ بن یہی حالت رکھی دل نے   نہ مجھ کو چین دیتا تھا نہ آپ آرام لیتا تھا
نہ مانوں گا نصیحت پر نہ سنتا میں تو کیا کرتا   کہ ہر ہر بات میں ناصح تمہارا نام لیتا تھا
اگر مومن ہی ہو مومن ولے میں تو نہ مانوں گا   جو عہد دوستی وہ دشمن اسلام لیتا تھا

---

میرے کوچہ میں عدو مضطر و ناشاد رہا   غضب خدا جانے کہاں وہ ستم ایجاد رہا
نقد جاں تھا نہ سزائے دیت عاشق حیف   خون فرہاد سر گردن فرہاد رہا
بے کسی نے نہ دیا ہائے نہ خاک بھی چین   تا قیامت الم گریۂ جلاد رہا
لذتِ جور سے دم چلنے کی فرصت نہ رہی   کیا اثر منتظر دعوت فرہاد رہا
یاد سہواً اسے اے غیر ہے نسیاں عمداً   یاد رکھ بھول گیا جس کو وہی یاد رہا
کرۂ خاک ہے گردش میں تپش سے میری   میں وہ مجنوں ہوں کہ زنداں میں بھی آزاد رہا

---

میں نے تم کو دل دیا تم نے مجھے رسوا کیا   میں نے تم سے کیا کیا اور تم نے مجھ سے کیا کیا
روز کہتا تھا کہیں مرتا نہیں ہم مر گئے   اب تو خوش ہو بے وفا تیرا ہی لے کہنا کیا
دلبر و شاہد میں بے وفا میری وفا کی دھوم ہے   بوالہوس سے کیوں کہا تھا راز جو افشا کیا
کیا خجل ہوں اب علاج بیقراری کیا کروں   دھر دیا ہاتھ اس نے دل پر تو بھی دل دھڑکا کیا
غرض ایماں سے خدا اس غارتگر دیں کو بڑھی   تجھ سے اے مومن خدا سمجھے یہ تو نے کیا کیا

کسی کا ہوا آج کل تھا کسی کا — نہ ہے تو کسی کا نہ ہوگا کسی کا
کیا تم نے قتل جہاں اک نظر میں — کسی نے نہ دیکھا تماشا کسی کا
دم الحذر اور عشق بتاں سے — مجھے ڈر ہے اے مومن ایسا کسی کا

---

دل کو قلق ہے ترک محبت کے بعد بھی — اب آسماں کو شکوۂ بیداد آ گیا

---

وعدۂ وصلت سے دل ہو شاد کیا — تم سے دشمن کی مبارکباد کیا
کچھ قفس میں ان دنوں لگتا ہے جی — آشیاں اپنا ہوا برباد کیا
ہیں اسیر اس کے جو ہے اپنا اسیر — ہم نہ سمجھے صید کیا صیاد کیا
نشۂ الفت سے بھولے یار کو — سچ ہے ایسی بیخودی میں یاد کیا
جب مجھے رنجِ دل آزاری نہ ہو — بے وفا پھر حاصلِ بیداد کیا
کیا کروں اللہ سب ہیں بے اثر — ولولہ کیا، نالہ کیا، فریاد کیا
ان نصیبوں پر کیا اختر شناس — آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا
گر بہائے خون عاشق ہے وصال — انتقام زحمتِ جلاد کیا

---

بتکدہ جنت ہے چلئے بے ہراس — لب پہ مومن ہرچہ بادا باد کیا

---

بہ عذر امتحانِ جذب دل کیسا نکل آیا — میں الزام اس کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا
خدنگِ یار کے ہمراہ نکلی جان سینے سے — یہی ارمان اک مدت سے جی میں تھا نکل آیا

---

روز جزا جو قاتل دلجو خطاب تھا — میرا سوال ہی مرے خوں کا جواب تھا
پھرنے سے شام وعدہ تھکے یہ کہ سوتے ہے — آرام شکوۂ ستم اضطراب تھا
کیا کیا شکن دیئے ہیں محل نار کو مگر — اس کے خیال میں ورق انتخاب تھا
عاشق ہوتے ہیں آپ کہیں کو ہی یہ ہوں — شب حال غیر مجھ سے زیادہ خراب تھا
وقت وداع بے سبب آزردہ کیوں ہوئے — یوں بھی تو ہجر میں مجھے رنج و عذاب تھا
ہوں کیوں نہ محو حیرت انیر نگہائے عشق — جو دل میں شعلہ تھا وہی آنکھوں میں آب تھا
کیا جی لگا ہے تذکرۂ یار میں عبث — ناصح سے مجھ کو آج تلک اجتناب تھا

---

مجھ کو تیرے عتاب نے مارا — یا مرے اضطراب نے مارا

کس پہ مرتے ہو آپ پوچھتے ہیں　　مجھے فکرِ جواب نے مارا

---

زانوئے بت پہ جان دی دیکھا　　مومن انجام و اختتام مرا
ق
بندگی کام آ رہی آخر　　میں نہ کہتا تھا کیوں سلام مرا

---

ناز بیجا سے سوا شرم کے حاصل نہوا　　غیر پر ظلم کئے میرے مقابل نہوا
کیا گلے ہوتے گر اوروں پہ بھی رحم آجاتا　　شکر صد شکر کہ میرا سا ترا دل نہوا
خون چھپانے کو مری لاش سے کہتا ہے وہ شوخ　　مجھ کو یہ غم ہے کہ میں کیوں ترا قاتل نہوا

---

جواب خون ناحق میرا ایسا کیا دیا تو نے　　کہ ظالم رہ گئے منہ لیکے سب احباب اپنا سا

---

کیا مرتے دم کے لطف میں پنہاں ستم نہ تھا　　وہ دیکھتے تھے سانس کو اور مجھ میں دم نہ تھا

---

درباں کو آنے دینے پہ میرے نہ کیجیے قتل　　ورنہ کہیں گے سب کہ یہ کوچہ حرم نہ تھا

---

صبح سے تعریف ہے صبر و سکونِ غیر کی　　کس نے شب مجھ کو تڑپتے پیش درد کھلا دیا
موت کے صدقے کہ وہ بے پردہ آئے لاش پر　　جو نہ دیکھا تھا تماشا عمر بھر دکھلا دیا

---

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا　　میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا
اڑتے ہی رنگ رخ مرا نظروں سے تھا نہاں　　اس مرغِ پر شکستہ کی پرواز دیکھنا
دشنام یار طبعِ حزیں پہ گراں نہیں　　اے ہم نفس نزاکتِ آواز دیکھنا
دیکھ اپنا حال زار منجّم ہوا رقیب　　تھا سازگار طالعِ ناساز دیکھنا
میری نگاہ خیرہ دکھاتے ہیں غیر کو　　بے طاقتی پہ سرزنش ناز دیکھنا

---

پند گو حال زلیخا یاد کر کچھ خیر ہے　　کام دل جس کو ملا یاں بعد رسوائی ملا
کہہ رہا ہے کون کس سے بے شکیبائی ملا　　مجھ کو قسمت سے نصیحت گر بھی سودائی ملا

---

جوں نکہت گل جنبش ہے جی کا نکل جانا　　اے باد صبا میری کروٹ تو بدل جانا

دم لینے کی طاقت ہے بیمارِ محبت ہے اتنا بھی غنیمت ہے مومن کا سنبھل جانا

---

محوِ جفا ستم کشِ الطاف کب ہوا رحم اس کو میرے حال پہ آیا غضب ہوا
کس دن تھی اس کے دل میں محبت جواب نہیں سچ ہے کہ تو عدو سے خفا بے سبب ہوا
بجلی گری فغاں سے مری آسمان پر جو حادثہ کبھی نہ ہوا تھا سو اب ہوا
ربطِ بتانِ دشمنِ دیں اتہام ہے ایسا گناہ حضرت مومن سے کب ہوا

---

دھویا اشکِ ندامت نے گناہوں کو مرے تر ہوا دامن تو بارے پاک دامن ہو گیا
ہو گیا سنکر نویدِ وصل شادی مرگ میں لب تلک یہ زمزمہ آیا کہ شیون ہو گیا
مومنِ دیندار نے کی بت پرستی اختیار ایک شیخِ وقت تھا سو بھی برہمن ہو گیا

---

تھے دشت میں ہمراہ مرے آبلۂ چند سو آپ ہی پامال کیا قافلہ اپنا
انصاف کے خواہاں ہیں نہیں طالبِ زر ہم تحسینِ سخن فہم ہے مومن صلہ اپنا

---

رازِ نہاں زبانِ اغیار تک نہ پہنچا کیا ایک بھی ہمارا خط یار تک نہ پہنچا
اللہ ری ناتوانی جب شدتِ قلق میں بالیں سے سر اٹھایا دیوار تک نہ پہنچا
روتے تو رحم آتا سو اس کے روبرو تو اک قطرہ خوں کا بھی چشمِ خونبار تک نہ پہنچا
مفت اولِ سخن میں عاشق نے جان دیدی قاصد ترا بیاں کیوں اقرار تک نہ پہنچا

---

یہ کسی سے ہو کہ ان لطفوں پہ گستاخی نہ ہو غیر ہم سا کب ہوا ہر چند ہم سا ہو گیا

---

کیا رشکِ غیر تھا کہ تحمل نہ ہو سکا میں جان کر حریفِ تغافل نہ ہو سکا
ہجرِ بتاں میں تجھکو ہے مومن تلاشِ زہر غم پر حرام خوار تو کل نہ ہو سکا

---

شوخ کہتا ہے بے حیا جانا دیکھو دشمن نے تم کو کیا جانا
شعلۂ دل کو ناز تابش ہے اپنا جلوہ ذرا دکھا جانا
اس کے اٹھتے ہی ہم جہاں سے اٹھے کیا قیامت ہے دل کا آجانا
پوچھنا حالِ یار ہے منظور میں نے ناصح کا مدعا جانا
شکوہ کرتا ہے بے نیازی کا تو نے مومن بتوں کو کیا جانا

اس وسعتِ کلام سے جی تنگ آگیا     ناصح تو میری جان نہ لے دل گیا گیا
کچھ آنکھ بند ہوتے ہی آنکھیں سی کھل گئیں     جی اک بلائے جان تھا اچھا ہوا گیا
آنکھیں جو ڈھونڈھتی تھیں نگہ ہائے التفات     گم ہونا دل کا وہ مری نظروں سے پاگیا

---

وہ ہنسے سن کے نالہ بلبل کا     مجھے رونا ہے خندۂ گل کا
دھیان ہے غیر کے تحمّل کا     ہوش دیکھا ترے تغافل کا

---

جلوہ افزائی رخ کے لئے مے نوش ہوا     میں کبھی آپ میں آیا تو وہ بیہوش ہوا
آفریں دل میں رہی خنجرِ دشمن کے سبب     اپنے قاتل سے خفا تھا کہ میں خاموش ہوا
تونے جو قہر خدا یاد دلایا مومن     شکوۂ جورِ بتاں دل سے فراموش ہوا

---

برق آہ کو جو میں نے کہا مسکرا دیا     دل گرمیوں نے اُس کی کلیجا جلا دیا
فرماتے ہیں وصال ہے انجامِ کارِ عشق     کیا ناصحِ شفیق نے مژدہ سنا دیا

---

بیکاریٔ امید سے فرصت ہے رات دن     وہ کاروبارِ حسرت و حرماں نہیں رہا
کرتے ہیں اپنے زخمِ جگر کو رفو ہم آپ     کچھ بھی خیالِ جنبشِ مژگاں نہیں رہا
ناکامیوں کا گاہ گلہ گاہ شکر ہے     شوقِ وصال و اندُہِ ہجراں نہیں رہا

---

کیا رم نہ کروگے اگر ابرام نہ ہوگا     الزام سے حاصل بجز الزام نہ ہوگا
ناکامیٔ امید پہ صبر آئے تو کیا آئے     ہر بات میں کہتے ہو کہ یہ کام نہ ہوگا
خو ہو گئی ہجراں میں تڑپنے کی شبِ وصل     گو چین ہوا ان کو مجھے آرام نہ ہوگا
وہ مشق رہی اور نہ وہ شوق ہے مومن     کیا شعر کہیں گے اگر الہام نہ ہوگا

---

آپ کی کونسی بڑھی عزت     میں اگر بزم میں ذلیل ہوا

---

بے وفا کہنے کی شکایت ہے     تو بھی وعدہ وفا نہیں ہوتا
تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے     ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا
تم مرے پاس ہوتے ہو گویا     جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
حالِ دل یار کو لکھوں کیونکر     ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا

دامن اس کا جو ہے دراز تو ہو دست عاشق رسا نہیں ہوتا
چارۂ دل سوائے صبر نہیں سو تمہارے سوا نہیں ہوتا
کیوں سنے عرضِ مضطرب مومن صنم آخر خدا نہیں ہوتا

---

کیا ہوا ہوا گر وہ بعد امتحاں اپنا بے گنہ سزا پائے اب وہ دل کہاں اپنا
خار و خس میں گلشن کے بوئے گل جو آئی تھی رشک سے کیا برباد آپ آشیاں اپنا
روز کا بگاڑ آخر جان پر بنا دے گا اُن کو شوق آرائش دل سے ہے بدگماں اپنا
بعد مدت اس کو سے یوں پھرے ہیں تنگ آ کر جائے جائے پھرتے ہیں پوچھتے مکاں اپنا
دشنہ چھین لیگا کیا ہمنشیں شب فرقت آپ جب نہیں اپنے کون میری جاں اپنا
صبر بعدِ آسائش اس قلق پہ مشکل تھا عیش جاوداں نکلا رنج جاوداں اپنا
عشق بت میں خواب تو در خور پرستش ہیں نام ہو گیا اتنا گم کیا نشاں اپنا
دل کی بیقراری سے ہر طپش زمیں فرسا بہر خرمنِ گردوں شعلہ ہر فغاں اپنا
دیکھئے پس مردن حال جسم و جاں کیا ہو مدعی زمیں اپنی دشمن آسماں اپنا
دیر و کعبہ یکساں ہے عاشقوں کو اے مومن ہو رہے وہیں کے ہم جی لگا جہاں اپنا

---

ہم جان فدا کرتے گر وعدہ وفا ہوتا مرنا ہی مقدر تھا وہ آتے تو کیا ہوتا
ایک ایک ادا سو سو دیتی ہے جواب اسکے کیونکر لب قاصد سے پیغام ادا ہوتا
اس بخت پہ کوشش سے تھکنے کے سوا حاصل گر چارۂ غم کرتا رنج اور سوا ہوتا
دیوانے کے ہاتھ آیا کب بندِ قبا اس کا ناخن جو نہ بڑھ جاتے تو عقدہ یہ وا ہوتا
ہم بندگیِ بت سے ہوتے نہ کبھی کافر ہر جا گر اے مومن موجود خدا ہوتا

---

عدم میں رہتے تو شاد رہتے اسے بھی فکر ستم نہ ہوتا جو ہم نہ ہوتے تو دل نہ ہوتا جو دل نہ ہوتا تو غم نہ ہوتا
پڑا ہے مرنا بس اب تو ہم کو جو اس نے خط پڑھ کے نامہ بر سے کہا کہ گر سچ یہ حال ہوتا تو دفتر اتنا رقم نہ ہوتا
جو آپ در سے اٹھا نہ دیتے کہیں نہ کرتا میں جبہ سائی اگرچہ یہ سرنوشت میں تھا تمہارے سر کی قسم نہ ہوتا
ہوا مسلماں میں اور ڈر سے نہ درسِ واعظ کو سنکے مومن بنی تھی دوزخ بلا سے بنتی عذاب ہجر صنم نہ ہوتا

---

اُس زود رنج سے خود بگڑتے گر عمر کا اعتبار ہوتا

---

ویراں ہے خانہ جلوۂ حیرت طراز کا آئینہ دیکھتا ہے منہ آئینہ ساز کا

تھے ہمیں مومن کی خودداری پہ کیا کیا اعتماد کیا خبر تھی یہ کہ یوں محو بتاں ہو جائے گا

---

قتلِ عدو میں عذرِ نزاکت گراں ہے اب مجھ میں ستم اٹھانے کی طاقت کہاں ہے اب
کہہ دیں رقیب نے تری بے التفاتیاں ناصح ہمارے حال پہ کچھ مہرباں ہے اب
چشمِ غضب سے مشورۂ قتل کھل گیا جو بات دل میں تھی سو نظر سے عیاں ہے اب

---

ہے یہ بندہ ہی بے وفا صاحب غیر اور تم بھلے بھلا صاحب
کیوں الجھتے ہو جنبشِ لب سے خیر ہے میں نے کیا کہا صاحب
ستم آزار ظلم و جور و جفا جو کیا سو بھلا کیا صاحب
کس سے بگڑے تھے کس پہ غصہ تھا رات تم کس پہ تھے خفا صاحب
کس کو دیتے تھے گالیاں لاکھوں کس کا شب ذکرِ خیر تھا صاحب
نام عشقِ بتاں نہ لو مومن کیجئے بس خدا خدا صاحب

---

سودا تھا بلائے جوش پر رات بستر پہ بچھاتے نیشتر رات
تارے آنکھیں جھپک رہے تھے تھا بام پہ کون جلوہ گر رات

---

حورانِ بہشتی کو بتوں کا سا نہ پایا مومن مجھے کیونکر نہ ہو ایماں کی شکایت

---

اظہار شوق شکوہ اثر اس سے تھا عبث یعنی کہا کہ مرتے ہیں تم پر کہا عبث
میں ایک سخت جان ہوں گردوں سے پوچھ لو تم کو خیال ہے مرے آزار کا عبث
امید وعدہ بھی تو نہیں روز ہجر میں ہم سے وفائے زندگیِ بے وفا عبث
اس ضعف میں تو سینے سے آتا ہے اب تلک کہتے ہیں اپنے نالے کو ہم نارسا عبث
اے روز حشر کچھ شب ہجراں بھی کم نہیں بدنام ہو جہان میں تیری بلا عبث
ہرگز نہ رام وہ صنم سنگدل ہوا مومن ہزار حیف کہ ایماں گیا عبث

---

خو رنج رشکِ غیر کی بھی ہم کو ہو گئی اب اور کچھ نکالئے آزار کی طرح
دل میں ہوائے بتکدہ ظاہر میں کیا حصول رہنا حرم میں مومن مکار کی طرح
رویا کریں گے آپ بھی پہروں اسی طرح اٹکا کہیں جو آپ کا دل بھی مری طرح
مر جائیں گے کہیں کہ تو غم ہجراں سے چھوٹ جائے کہتے تو ہیں بھلے کی و لیکن بری طرح

نے تاب ہجر میں ہے نہ آرام وصل میں　　کمبخت دل کو چین نہیں ہے کسی طرح
پامال ہم نہ ہوتے فقط جورِ چرخ سے　　آئی ہماری جان پہ آفت کئی طرح
نے جاتے واں بنی ہے نہ بن جاتے چین ہے　　کیا کیجیے ہمیں تو ہے مشکل سبھی طرح
ہوں جاں بلب بتانِ ستمگر کے ہاتھ سے　　کیا سب جہاں میں جیتے ہیں مومنؔ اسی طرح

* * *

ہم دامِ محبت سے ادھر چھوٹے ادھر بند　　پرواز بھی کی آہ تو جوں طائرِ پر بند
یہ مشتِ پرِ سوختہ پھونکیں گے قفس کو　　تو ساتھ کسی کے مجھے صیاد نہ کر بند
کیا حضرتِ مومنؔ کہیں کعبے کو سدھارے　　سنسان ہے در کس لئے کیوں آج ہے در بند

* * *

غربت میں گُل کھلاتی ہے کیا کیا وطن کی یاد　　جیسے قفس میں مرغِ چمن کو چمن کی یاد
تا شکوہ غیر کا نہ کروں مجھ سے کہتے ہیں　　کیوں سرگزشت تم کو بھی ہے کوہکن کی یاد
ایسے ہی روزگار ستم تو بنو رہے　　تم کو بھلا رہے گی سپہرِ کہن کی یاد

* * *

نہ کیونکر بس مرا جاؤں کہ یاد آتا ہے رہ رہ کر　　وہ تیرا مسکرانا کچھ مجھے ہونٹوں میں کہہ کہہ کر
لو یہ اے دل کہ رشکِ غیر سے چھوٹے، اسے ہم نے　　ستم کا کر دیا خوگر جفا و جور سہہ سہہ کر
لگی ہچکی ہے سر زانوئے غم پر ہے کہ یاد آیا　　کسی کا ہاتھ ہر دم مارنا زانو پہ قہ قہ کر
خدا کو مان اپنی راہ لے کعبے کو جا مومنؔ　　صنم خانے میں کیا لیوے گا اے گم گشتہ رہ رہ کر

* * *

جرّاح کیا سوچا بتا کیا رنگ دیکھا کیا ہوا　　کیوں کھول لی پٹی مرے زخمِ جگر سے باندھ کر
شوقِ وصال دیکھ کہ آیا عدو کے گھر　　سوجھا نہ کچھ مجھے شبِ مہتاب دیکھ کر
توبہ کہاں کدورتِ باطن کا ہوش تھا　　غش ہو گیا میں رنگِ مئے ناب دیکھ کر
ہے ہے تمیزِ عشق و ہوس آج تک نہیں　　وہ چھپتے پھرتے ہیں مجھے بے تاب دیکھ کر
مومنؔ یہ تاب کیا کہ تقاضائے جلوہ ہو　　کافر ہوا میں دین کے آداب دیکھ کر

* * *

امتیازِ دلدہی و دلبری میں فرق ہے　　تم کو بھاتی ہے خزاں اور ہم کو بھاتی ہے بہار

* * *

دشمنی دیکھو کہ تا الفت نہ آجائے کہیں　　لے لیا منہ پر دوپٹہ حال میرا دیکھ کر

* * *

سب ستم ہائے نہاں نظروں میں تھے ناصح نہ پوچھ　　کیا کہوں میں غش ہوا کیا سوچ کر کیا دیکھ کر

جو نقاب اٹھی مری آنکھوں پہ پردہ پڑگیا　　کچھ نہ سوجھا عالم اُس پردہ نشیں کا دیکھ کر
کردیا خاک آپ کو اُس بت کے در پر ہائے ہائے　　جل گیا جی لاش کو مومن کی جلتا دیکھ کر

---

عاشق تو جانتے ہیں وہ ایدل یہی سہی　　ہر چند بے اثر ہے یہ آہ و فغاں نہ چھوڑ
زخمی کیا عدو کو تو مرنا محال ہے　　قربان جاؤں تیرے مجھے نیم جاں نہ چھوڑ
جس کوچہ میں گزار صبا کا نہ ہو سکے　　اے عندلیب اسکے لئے گلستاں نہ چھوڑ

---

ہجراں کا شکوہ لب تلک آیا نہیں ہنوز　　لطف وصال غیر نے پایا نہیں ہنوز
باغ جہاں میں گو مہ خورداد آگیا　　یاں ہے اسی بہار پہ فصل خزاں ہنوز
ناصح رقیب سے ہے بدآموز تر کہیں　　پر میں نے تیرا حال سنایا نہیں ہنوز
یک چند اور کاہش غم چشم التفات　　ہیں یار کی نظر میں سمایا نہیں ہنوز
مومن تو مدتوں سے ہوئے پر بقول درد　　دل سے نہیں گیا ہے خیال بتاں ہنوز

---

چاک سراپردہ سے جھانکے تھے وہ ایک دن　　سجدۂ محراب در شغل جبیں ہے ہنوز
لیکے دل و عقل و دیں پھر پئے غارت ہے عشق　　اے اجل آچک کہیں جان حزیں ہے ہنوز
وصل بتاں کی دعا کرتے ہو شکر خدا　　حضرت مومن تمہیں دعوئ دیں ہے ہنوز

---

ڈوبا جو کوئی آہ کنارے پہ آگیا　　طغیان بحر عشق ہے ساحل کے آس پاس
کیا دعوئ آہ جب نہ رہا میں ہی کس لئے　　ہیں جمع اقربا مرے قاتل کے آس پاس
کافر ہے کون ہم میں سے مومن پھرے ہے تو　　کعبے کے آس پاس تو میں دل کے آس پاس

---

میرے مرنے سے بھی وہ خوش نہ ہوا　　جی گیا یوں ہی رائگاں افسوس
شکوہ آزار غیر کا جو کروں　　ہنس کے کہتا ہے وہ کہ ہاں افسوس
تھا عجب کوئی آدمی مومن　　مرگیا کیا ہی نوجواں افسوس

---

خبر تو مری تم کہاں تک رہے　　یہ حالت کہ غش پر چلا آئے غش

---

ہر غنچۂ لب سے عشق کا اظہار ہے غلط　　اس بحث صحیح کی تکرار ہے غلط
کرتے ہیں مجھ سے دعوئے الفت وہ کیا کریں　　کیونکر کہیں مقولۂ اغیار ہے غلط

کہتے ہو مجھ سے راز کی باتیں تم اس طرح گویا کہ قول محرم اسرار ہے غلط

---

آنکھ ہے بے کسوں پہ تو جلاد کو بھی رحم روتی ہے شمع آپ سرِ کشتگاں شمع
ہے تارِ گریہ تارِ نفس اہلِ سوز کو یعنی روانِ شمع ہے اشکِ روان شمع
سب گرمیٔ نفس کی ہیں اعضا گدازیاں دیکھو نہ زندگی ہے سراپا زبان شمع
لائیں نہ تاب حرفِ بتاں کا فرانِ عشق پروانے کو جحیم ہے مومن زبان شمع

---

مجلس میں تا نہ دیکھ سکوں یار کی طرف دیکھے ہے مجھ کو دیکھ کے اغیار کی طرف
شامِ فراق خواب عدم کا ہے انتظار آنکھیں لگی ہیں دولتِ بیدار کی طرف

---

شبِ ہجر روزِ وصال کی تری شوخیاں جو نظر میں تھیں کہوں کیا تغیرِ حالِ دل کبھی تھا سکوں کبھی تھا قلق
کہا جاں بلب ہوں، جو آئے تو مری زندگی ہو تو یوں کہا ترے جینے کی مجھے کیا خوشی ترے مرنے کا مجھے کیا قلق

---

قہر ہے موت ہے قضا ہے عشق سچ تو یوں ہے بُری بلا ہے عشق
وصل میں احتمالِ شادیٔ مرگ چارہ گر دردِ بے دوا ہے عشق
اثرِ غم ذرا بتا دینا وہ بہت پوچھتے ہیں کیا ہے عشق
آپ مجھ سے نباہیں گے سچ ہے باوفا حسن و بیوفا ہے عشق
سوجھے کیونکر فریبِ دلداری دشمنِ آشنا نما ہے عشق
قیس و فرہاد و وامق و مومن مر گئے سب ہی کیا وبا ہے عشق

---

امتحاں کے لیے جفا کب تک التفاتِ ستم نما کب تک
غیر ہے بے وفا پہ تم تو کہو ہے ارادہ نباہ کا کب تک
جرم معلوم ہے زلیخا کا طعنۂ دستِ نارسا کب تک
ہوش میں آ مجھ میں جاں نہیں غفلتِ جراءت آزما کب تک
لے شبِ وصلِ غیر بھی کاٹی تو مجھے آزمائے گا کب تک

---

وفورِ اشک و طغیانِ فغاں ہے کدھر جاؤں ادھر پانی اُدھر آگ

دھواں اٹھتا ہے دل سے وقتِ گریہ بجھادی تو نے کیا اے چشمِ تر آگ

---

داغِ جنون و سنگِ درِ یار ہو نصیب کرتا ہے رات دن ہوسِ تاج و تخت دل
الماس ریزہ تھے مرے آنسو کہ ضبط سے ہے پاش پاش سب جگر اور لخت لخت دل

---

مردِ عشقِ ستیزہ کار ہے دل ملک الموت سے دوچار ہے دل
وصل جاناں کہاں سوائے خیال ہم ہیں مایوس امیدوار ہے دل
بے دوا، دردِ بے وفا، وہ شوخ بے اثر آہ و بیقرار ہے دل

---

کیا کروں کیونکر رکوں ناصح رکا جاتا ہے دل پیش کیا چلتی ہے اُس سے جس پر آجاتا ہے دل
حیرتِ دیدار بس آئینہ رکھدے ہاتھ سے اپنی حالت دیکھ کر ظالم کٹا جاتا ہے دل
چاہتا ہوں میں تو مسجد میں رہوں مومن ولے کیا کروں بت خانے کی جانب کھنچا جاتا ہے دل

---

لو چھوڑ مجھے چلا گیا دل ہے اُس سے زیادہ بے وفا دل
یہ دشمنِ جاں تمہیں مبارک یعنی نہیں میرے کام کا دل
دیتا ہوں دم ایسے فتنہ گر پر انصاف سے دیکھنا مرا دل
اس چشم نے کردیا خراب آہ تھا ورنہ بہت ہی پارسا دل

---

شب رہے تجھ بن زبس بے چین و بے آرام ہم
صبح تک رویا کئے لے لے کے تیرا نام ہم
گر ترے کوچے کو دی کعبے سے نسبت کیا گناہ
مومن آخر تھے کبھی اے دشمنِ اسلام ہم

---

پاتے تھے چین کب غمِ دوری سے گھر میں ہم
راحت وطن کی یاد کریں کیا سفر میں ہم
اس طرح خاک چھانتے پھرتے نہ دشت دشت
ہوتے جو پائمال کسی رہگزر میں ہم

---

اگر نہ دیکھتے وہ پیاری پیاری صورت آہ تو ایک ایک کے منہ کو تکا نہ کرتے ہم

---

نہیں پاتے اثر اپنا یہ غیرت کا اثر دیکھا کہا کرتے تھے بے تابی کو بے تاثیر اکثر ہم

ہوئے تم کیوں خفا تاثیر سے آہ رسا کی اب کیا کرتے تھے یہ تو پہلے بھی تقصیر اکثر ہم

---

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم
ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم
منہ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بے کسی سے ہم
صاحب نے اس غلام کو آزاد کر دیا
لو بندگی کہ چھوٹ گئے بندگی سے ہم
کیا دل کو لے گیا کوئی بیگانہ آشنا
کیوں اپنے جی کو لگتے ہیں کچھ اجنبی سے ہم

---

جو پہلے دن ہی سے دل کا کہا نہ کرتے ہم
تو اب یہ لوگوں کی باتیں سنا نہ کرتے ہم
اگر نہ ہنسنا ہنسانا کسی کا بھاجاتا
تو بات بات پہ یوں رو دیا نہ کرتے ہم

---

ثابت ہے جرم شکوہ نہ ظاہر گناہِ رشک حیراں ہیں آپ اپنی پشیمانیوں میں ہم
مارے خوشی کے مر گئے صبح شبِ فراق کتنے سبک ہوئے ہیں گراں جانیوں میں ہم
پیش نظر ہے کس کا رخ آئینہ گداز روتے ہیں اپنے حال پہ حیرانیوں میں ہم

---

خنجر تو نہ توڑ سخت جانی پھر کس کو گلے لگائیں گے ہم
تو، بخت، عدو، اجل، فلک، دل کس کس کے ستم اٹھائیں گے ہم
ٹھہرو کوئی دم کہ جان ٹھہرے مت جاؤ کہ جی سے جائیں گے ہم
بت خانۂ چیں ہو جو ترا گھر مومن ہیں تو پھر نہ آئیں گے ہم

---

شام سے اپنے سو رہے وہ تو اور ہم ان کے کوچہ میں
ولولہ ہائے شوق سے کیا کیا پھرتے ہیں گھبراتے ہیں
کیا کسی بت کے دل میں جگہ کی کوئی ٹھکانا اور ملا
حضرت مومن اب تمہیں کچھ ہم مسجد میں کم پاتے ہیں

عشق نے یہ کیا خراب ہمیں — کہ ہے اپنے سے اجتناب ہمیں
غیر کے واسطے نہ ہو بیتاب — طعنہ دیتا ہے اضطراب ہمیں
کس کی زلفوں کی بو نسیم میں تھی — ہے بلا آج پیچ و تاب ہمیں
وہ جفاکش ہیں اے فلک کہ کیا — اس ستم گر نے انتخاب ہمیں
اب کوئی کیا کرے علاج افسوس — موت نے بھی دیا جواب ہمیں
اے تپ ہجر دیکھ مومن ہیں — ہے حرام آگ کا عذاب ہمیں

---

لذت جور کشی نے مجھے شرمندہ کیا — طعنے کیا کیا اُسے ارباب ستم دیتے ہیں
دم نہ لے لے اثرِ آہ کہ معلوم ہوا — جن پہ دم دیتے ہیں ہم وہ ہمیں دم دیتے ہیں
اہلِ بازار محبت کا بھی کیا سودا ہے — عشرت عمر ابد قیمتِ غم دیتے ہیں

---

ناصح ناداں یہ دانائی نہیں — دل کو سمجھاؤں میں سودائی نہیں
کس توقع پر امید وصل اب — طاقتِ صبر و شکیبائی نہیں

---

کہے ہے چھیڑنے کو میرے گر سب ہوں مرے بس میں
نہ دوں ملنے کبھی معشوق اور عاشق کو آپس میں
نہ میں اپنا نہ دل اپنا نہ تم میرے نہ جاں میری
اثر کس کس کو ہو ہوئے بھی گر فریاد بیکس میں
در بت خانہ و عشق بتاں اور آپ اے مومن
یہ حضرت آگئے اک بار کیا طبعِ مقدس میں

---

دمبدم رونا ہمیں چاروں طرف تکنا ہمیں
یا کہیں عاشق ہوئے یا ہو گیا سودا ہمیں
ہر ستم صیاد کا کیا التفات آمیز تھا
بند کرنے کو قفس میں دام سے چھوڑا ہمیں
کیا کہیں کیوں رہ گئے حیران تجھکو دیکھکر
آگیا دل یاد آئے آئینہ رو اپنا ہمیں
دست بوسی پر گرو ہاں قتل اپنے ہاتھ سے
سچ تو کہتے ہیں قبول انصاف غیروں کا ہمیں

مومن اُن کا تو نہ تھا ملنے میں آخر اختیار
یہ شکایت بھی خدا سے ہے بتوں سے کیا ہمیں

---

چین آتا ہی نہیں سوتے ہیں جس پہلو ہمیں ۔ ہوش کیوں جلتے رہے اور دم ہوا کیوں ہو چلا

---

اضطرابِ دل غرض جینے نہ دے گا تو ہمیں ۔ تجھ سے اے بادِ صبا آئی یہ کس کی بو ہمیں
گر یہی شوقِ شہادت ہے تو مومن جی چکے ۔ مار ڈالے کاش کوئی کافر دلجو ہمیں

---

ٹکٹکی لگائی ہے اب تو گو ہو رسوائی ۔ تا وہ گر ادھر دیکھیں مجھکو دیکھتا دیکھیں
کس نے ادر کو دیکھا کس کی آنکھ جھپکی ہے ۔ دیکھنا ادھر آؤ پھر نظر ملا دیکھیں

---

بزم میں اس کی بیانِ دردِ غم کیونکر کریں ۔ وہ خفا جس بات سے ہووے وہ ہم کیونکر کریں
مجھ پہ بعد امتحاں بھی جور کم کیونکر کریں ۔ وہ ستائیں غیر کو ایسا ستم کیونکر کریں
سب کو ہوتا ہے جہاں میں پاس اپنے نام کا ۔ ہم بھی تو مومن ہیں دل نذرِ صنم کیونکر کریں

---

ہے جلوہ ریز نورِ نظر گردِ راہ میں ۔ آنکھیں ہیں کس کی فرش تری جلوہ گاہ میں
کیا رحم کھا کے غیر نے دی تھی دعائے وصل ۔ ظالم کہاں وگرنہ اثر میری آہ میں
جانے دے چارہ گر شبِ ہجراں میں مت بلا ۔ وہ کیوں شریک ہو مرے حالِ تباہ میں
ہے دوستی تو جانبِ دشمن نہ دیکھنا ۔ جادو بھرا ہوا ہے تمہاری نگاہ میں
مومن کو سچ ہے دولتِ دنیا و دیں نصیب ۔ شب بتکدے میں گزری ہے دن خانقاہ میں

---

تا نہ پڑے خلل کہیں آپ کے خوابِ ناز میں ۔ ہم نہیں چاہتے کمی اپنی شبِ دراز میں
خسرو عیش وصلِ یار جانکنی اور کوہکن ۔ اپنا جگر تو خون ہوا عشق کے امتیاز میں
کیا سبھی سینے جل چکے کیا سبھی دل پگھل چکے ۔ بوئے کباب اب نہیں آہ جگر گداز میں

---

جیب درست لائقِ لطف و کرم نہیں ۔ ناصح کی دوستی بھی عداوت سے کم نہیں
منظور ہو تو وصل سے بہتر ستم نہیں ۔ انتا رہا ہوں نہ در کہ ہجراں کا غم نہیں
فریاد و نالہ ہائے عزا بار پر اٹھیں ۔ آیا ہے رحم کب کہ ذرا مجھ میں دم نہیں
بے التفاتیاں جو عدو سے سنی نہ تھیں ۔ ہم جانتے تھے وصل میں رنج و الم نہیں

بے جرم پائمال عدو کو کیا ، کیا
مجھ کو خیال بھی ترے سر کی قسم نہیں

ہوں آب آب انفعالی نگہ ہائے گرم گرم
اُس مہروش کے سامنے آنکھوں میں نم نہیں

نام وصال لینے سے ہوتا ہے مضطرب
کیونکر کہوں اسے مرے مرنے کا غم نہیں

ناصح کہاں تلک تری باتیں اٹھاسکوں
سچ ہے کہ مجھ میں طاقتِ جور و ستم نہیں

---

دن بھی دراز رات بھی، کیوں ہے فراق یار میں
کا ہے سے فرق آگیا گردشِ روزگار میں

پوچھا ہے اُس نے کیا مری بیخودی و قلق کا حال
ہوش نہیں حواس ہیں تاب نہیں قرار میں

مرگ ہے انتہائے عشق یاں رہی ابتدائے عشق
زندگی اپنی ہوگئی رنجش بار بار میں

خاک اڑائی گل نے یہ کس کے جنونِ عشق میں
آئی ہے کچھ اٹی ہوئی بادِ صبا غبار میں

دھیان میں مومن آگئے مبحث جبر و اختیار
قابوئے یار میں ہیں ہم وہ نہیں اختیار میں

---

مانے نہ مانے منع تپش ہائے دل کروں
میں غیر تو نہیں کہ تماشائے دل کروں

ہو جان بھی جو کچھ تو مداوائے دل کروں
کب تک میں، دل پہ ہاتھ دھرے ہائے دل کروں

---

نالہ ہی نکلے ہے گو ہم مدعا کہنے کو ہیں
لب نہیں کہنے میں اب کیا جانے کیا کہنے کو ہیں

دوست کرتے ہیں ملامت غیر کرتے ہیں گلہ
کیا قیامت ہے مجھی کو سب برا کہنے کو ہیں

شکوہ حرف تلخ کا یا شور بختی کا گلہ
ہم جو کچھ کہنے کو ہیں سو بے مزہ کہنے کو ہیں

میں گلہ کرتا ہوں اپنا تو نہ سن غیروں کی بات
ہیں یہی کہنے کو وہ بھی اور کیا کہنے کو ہیں

غیر سے سرگوشیاں کر لیجیے پھر ہم بھی کچھ
آرزو ہائے دل رشک آشنا کہنے کو ہیں

ترجمان التماس شوق ہے تغیر رنگ
جوں زبانِ شمع عاشق بے صدا کہنے کو ہیں

ہوگئے نام بتاں سنتے ہی مومن بے قرار
ہم نہ کہتے تھے کہ حضرت پارسا کہنے کو ہیں

---

وہ علی الرغم عدو مجھ پہ کرم کرتے ہیں
ہے ستم لطف کے پردے میں ستم کرتے ہیں

نیم بسمل ہیں نہ چھیڑ اے تپش دل کہ ابھی
روتے قاتل کا نظارہ کوئی دم کرتے ہیں

اے اجل کاش الٹ جائیں شب ہجراں ہیں — وہ دعائیں کہ تری جان کو ہم کرتے ہیں
کشتۂ یار ہوں اس رشک سے مرتا ہے جہاں — وہ بھی کیا ہیں جو مری موت کا غم کرتے ہیں
آبرو رہ گئی مرنے کی کہ روتے تو ہیں وہ — اشک شادی ہی سے گو چشم کو نم کرتے ہیں
جا کے کعبے میں بھی مومن نہ گئی دیر کی یاد — جائے لبیک صدا ہائے صنم کرتے ہیں

---

نیرنگ عشق سے نہ ہو غافل ہے ایک رنگ
اس دل کے جاگنے میں زلیخا کے خواب میں

---

دکھاتے آئینہ ہو اور مجھ میں جان نہیں — کہو گے پھر بھی کہ میں تجھ سا بدگمان نہیں
جو یار صلح پہ ہے اب تو آسمان نہیں — وہ مہربان ہوا تو یہ مہربان نہیں
ترے فراق میں آرام ایک آن نہیں — یہ ہم سمجھ چکے گر تو نہیں تو جان نہیں
نہ چاہوں روز جزا داد یہ ستم دیکھو — کب آزماتے ہیں جب وقت امتحان نہیں
نہ کیوں نثار ہو جاں فرط کین جاناں پر — کہ اس کو میرے سوا اور کا دھیان نہیں
نکل کے دیر سے مسجد میں جا رہ اے مومن — خدا کا گھر تو ہے تیرے اگر مکان نہیں

---

ہجراں میں بھی زیست کیوں نہ چاہوں — جان دادۂ شوخ بے وفا ہوں
کیا شکوہ جفائے آسماں کا — میں آپ کو دور کھینچتا ہوں
دشمن سے ہے چشم مہربانی — محروم نگاہ آشنا ہوں
خودبینی و بیخودی میں ہے فرق — میں تم سے زیادہ کم نما ہوں
مجھ رمز شناس سے یہ باتیں — کیا خوب میں غیر سے برا ہوں
اے کاش عدو کو غیرت آوے — میں منتظر اپنی موت کا ہوں
اس نام کے صدقے جس کی دولت — مومن رہوں اور بتوں کو چاہوں

---

ہر دم رہین کشمکش دست یار ہیں — چلوں کے بند کس کے گریباں کے تار ہیں
کیا کیجیے کہ طاقت نظارہ ہی نہیں — جتنے وہ بے حجاب ہیں ہم شرمسار ہیں
شبنم خراب مہر کتاں سینہ چاک ماہ — لو اور بھی ستم زدۂ روزگار ہیں
کیسے گلے رقیب کے کیا طعن اقربا — تیرا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں
ناصح سے تجھ کو کیونکہ نہوں بدگمانیاں — دشمن ہیں جو مرے وہ ترے دوستدار ہیں

آہ فلک فگن ترے غم سے کہاں نہیں
جو فتنہ خیز اب ہے زمیں آسماں نہیں

کہنا پڑا مجھے پئے الزام پسند گو
وہ ماجرا جو لائق شرح و بیاں نہیں

ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے
صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں

باتیں تری وہ ہوش ربا ہیں کہ کیا کہوں
جو کوئی رازداں ہے مرا رازداں نہیں

پیش عدو سمجھ کے ذرا حال پوچھنا
قابو میں دل نہیں مرے بس میں زباں نہیں

کرتے وفا امید وفا پر تمام عمر
پر کیا کریں کہ اس کو سر امتحاں نہیں

اس کو بھی جانتا ہوں فریب وصال غیر
تم کو عبث یقیں ہے کہ میں بدگماں نہیں

میں اپنی چشم شوق کو الزام خاک دوں
تیری نگاہ شرم سے کیا کچھ عیاں نہیں

اتنے سبک نظر میں ہیں اوضاع روزگار
دنیا کی حسرتیں مرے دل پر گراں نہیں

میں جانتا ہوں نعش پہ آنے کا مدعا
آسودگی پسند تری شوخیاں نہیں

---

تاثیر صبر میں نہ اثر اضطراب میں
بیچارگی سے جان پڑی کس عذاب میں

چرخ و زمیں میں توبہ کا ملتا نہیں سراغ
ہنگامۂ بہار و ہجوم سحاب میں

کھولا جو دفتر گلہ اپنا زیاں کیا
گزری شب وصال ستم کے حساب میں

اے حشر جلد کر تہ و بالا جہان کو
یوں کچھ نہ ہو امید تو ہے انقلاب میں

مومن یہ عالم اس صنم جاں فزا کا ہے
دل لگ گیا جہانِ سراسر خراب میں

---

کہتے ہیں تم کو ہوش نہیں اضطراب میں
سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں

چین جبیں کے دیکھ کر دل بستہ تر ہوا
کیسی کشود کار کشاد نقاب میں

رہتے ہیں جمع کوچۂ جاناں میں خاص و عام
آباد ایک گھر ہے جہانِ خراب میں

بدنام میرے گریۂ رسوا سے ہو چکے
اب عذر کیا رہا نگہ بے حجاب میں

مطلب کی جستجو نے یہ کیا حال کر دیا
حسرت بھی اب نہیں دل ناکامیاب میں

دونوں کا ایک حال ہے یہ مدعا ہو کاش
وہ ہی خط اس نے بھیج دیا کیوں جواب میں

کیا جلوے یاد آئے کہ اپنی خبر نہیں
بے بادہ مست ہوں میں شب ماہتاب میں

ہے منتوں کا وقت شکایت رہی رہی
آئے تو ہیں منانے کو وہ پر عتاب میں

تیری جفا نہ ہو تو ہے سب دشمنوں سے امن
بدمست غیر محو دل اور بخت خواب میں

پیہم سجود پائے صنم پر دم وداع
مومن خدا کو بھول گئے اضطراب میں

---

پیہم بیداد و ستم کچھ دل مضطر میں نہیں
یوں ہوں نالاں کہ وہ گویا صف محشر میں نہیں

مجھ سے میکش کی طرف محتسب آتا ہے تو آئے ایک قطرہ بھی سبو و خم و ساغر میں نہیں
قطع امید سے سر کاٹنے کو کیا نسبت مجھ میں وہ دم ہے ابھی جو ترے خنجر میں نہیں
کیا موثر ہو دعا وصل صنم کی مومن ہم طلب کرتے ہیں وہ شے جو مقدر میں نہیں

---

مجھ کو کیا کام کہ آئینے کی حیرت دیکھوں
دیکھ تو آئینہ اور میں تری صورت دیکھوں

---

جن سے منظور وفا ہی ہو جفا بھی اُن پر مجھ سے کچھ کام نہیں ہے تو ستاتے کیوں ہو
توڑنا جان کا ہو جائے گا دشوار آخر چارہ ساز و مری امید بندھاتے کیوں ہو
کھل گیا عشق صنم طرز سخن سے مومن اب چھپاتے ہو عبث بات بناتے کیوں ہو

---

کیسے مجھ سے بگڑے تم اللہ اکبر رات کو ذبح کرتے ہی جو ہوتا پاس خنجر رات کو
بزم دشمن میں نہ ہو وہ نغمہ گر آتی رہی ہر فغاں کے ساتھ لب پر جان مضطر رات کو
یاد دلوائی تپش نے تیری شوخی وصل کی مر گئے ہم دیکھ کر چین ہائے بستر رات کو
کیا اسی بت خانے کو فرماتے ہو ظلمت کدہ حضرت مومن جہاں جاتے ہو چھپ کر رات کو

---

آنکھوں سے حیا ٹپکے ہے انداز تو دیکھو ہے بوالہوسوں پر بھی ستم ناز تو دیکھو
چشمک مری وحشت پہ ہے کیا حضرت ناصح طرز نگہ چشم فسوں ساز تو دیکھو
ارباب ہوس ہار کے بھی جان پہ کھیلے کم طالعیٔ عاشق جاں باز تو دیکھو
مجلس میں مرے ذکر کے آتے ہی اٹھے وہ بدنامیٔ عشاق کا اعزاز تو دیکھو
اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک شعلہ سا چمک جائے ہے آواز تو دیکھو
دیں پاکیٔ دامن کی گواہی مرے آنسو اُس یوسف بیدرد کا اعجاز تو دیکھو
جنت میں بھی مومن نہ ملا ہائے بتوں سے جور اجل تفرقہ پرداز تو دیکھو

---

وفا سکھلا رہے گا دل ہمارا تمہاری خاطر نامہرباں کو
کہاں ہے تاب ناز برق اے کاش جلا دے آتش گل آشیاں کو
سمجھتا کیونکہ دیوانے کی باتیں نہ پایا محرم اپنے رازداں کو
ہمارا عشق تو کیا مر جائیں تو بھی نہ کھولے طرۂ عنبر فشاں کو
دل مضطر کی بے تابی نے مارا کہاں سے لاؤں اُس آرام جاں کو

سن اے مومن یہ ایماں ہے ہمارا　　نہ کہنا کفر پھر عشقِ بتاں کو

---

پروانہ وار گرمِ تپش سے قلق سے ہم　　تم شوخیوں سے شعلۂ بیتاب جستہ ہو
مومن نہ توڑ رشتۂ زنارِ برہمن　　مت کر وہ بات جس سے کوئی دل شکستہ ہو

---

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدۂ نباہ کا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ جو لطف مجھ پہ تھے بیشتر وہ کرم کہ تھا مرے حال پر
مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ نئے گلے وہ شکایتیں وہ مزے مزے کی حکایتیں
وہ ہر ایک بات پہ روٹھنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کبھی بیٹھے سب میں جو روبرو تو اشارتوں ہی سے گفتگو
وہ بیان شوق کا برملا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
ہوئے اتفاق سے گر بہم تو وفا جتانے کو دمبدم
گلۂ ملامت اقربا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کوئی بات ایسی اگر ہوئی کہ تمہارے جی کو بری لگی
تو بیاں سے پہلے ہی بھولنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی کبھی ہم میں تم میں بھی راہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
سنو ذکر ہے کئی سال کا کہ کیا اک آپ نے وعدہ تھا
سو نباہنے کا تو ذکر کیا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
جسے آپ گنتے تھے آشنا جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومنِ مبتلا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

---

بادِ بہار میں ہے کچھ اور عطر ریزی　　تم آج کل میں شاید سوئے چمن گئے ہو
ہے کچھ تو بات مومن جو چھا گئی خموشی　　کس بت کو دے دیا دل کیوں بت سے بن گئے ہو

---

اے ناصحو آ ہی گیا وہ فتنۂ ایام لو　　ہم کو تو کہتے تھے بھلا اب تم تو دل کو تھام لو
دلدادۂ فکر جور میں یوں رنج اٹھانا کب تلک　　میں بھی ذرا آرام لوں تم بھی ذرا آرام لو

مومن تم اور عشقِ بتاں اے پیر و مرشد خیر ہے
یہ ذکر اور منہ آپ کا صاحب خدا کا نام لو

---

وہ آئے یا نہ آئے زیست میری ہو نہ ہو لیکن
ذرا اے چارہ ساز و زحمت تدبیر تو کھینچو
دکھادوں گا تماشا بس نہ چھیڑو مجھ سے مجنوں کو
ہلادوں گا زمیں و آسماں زنجیر تو کھینچو

---

اعجاز جاں وہی ہے ہمارے کلام کو
زندہ کیا ہے ہم نے مسیحا کے نام کو

لکھو سلام غیر کے خط میں غلام کو
بندے کا بس سلام ہے ایسے سلام کو

اب شور ہے مثال جو دی اُس خرام کو
یوں کون جانتا تھا قیامت کے نام کو

گو آپ نے جواب بُرا ہی دیا ولے
مجھ سے بیاں نہ کیجے عدو کے پیام کو

مدت سے نام سنتے تھے مومن کا بارے آج
دیکھا بھی ہم نے اُس شعرا کے امام کو

---

ہم سمجھتے ہیں آزمانے کو
عذر کچھ چاہیئے ستانے کو

صبح عشرت ہے وہ نہ شام وصال
ہائے کیا ہو گیا زمانے کو

برق کا آسماں پر ہے دماغ
پھونک کر میرے آشیانے کو

شکوہ ہے غیر کی کدورت کا
سو مرے خاک میں ملانے کو

سن کے وصف اُس پہ مر گیا ہمدم
خوب آیا تھا غم اٹھانے کو

کوئی دن ہم جہاں میں بیٹھے ہیں
آسماں کے ستم اٹھانے کو

---

صد حیف سینہ سوز فغاں کارگر نہ ہو
یاں جان پر بنے ترے دل میں اثر نہ ہو

ایسے سے قدرِ مہر و وفا کی امید کیا
جس کو ہنوز اپنے ستم کی خبر نہ ہو

پائے طلب شکستہ نہ کوتاہ دستِ شوق
ہم بھی ستم کریں جو وہ نازک کمر نہ ہو

فرہاد بے گناہ کشی جا بجا کروں
گر و ہم جاں نثاریِ پیغام بر نہ ہو

عابد فریبِ شوخیِ و رغبت فزا نگاہ
میں کیا کسی سے صبر تجھے دیکھ کر نہ ہو

سودا ہے مجھ کو گرمیِ بازارِ عشق کا
اس کا کہاں خیال کہ اپنا ضرر نہ ہو

حزن و ملال میں ہے دل آزردگی کا وہم
کیسی بری بنے جو گلہ بے اثر نہ ہو

ہیں آرزوئے مرگ کی بے التفاتیاں
جینا مرا محال تو دشمن اگر نہ ہو

اب لیجے آہ تاب گسل ہر جفا کے ساتھ
جب جان سے گزر گئے پھر درگزر نہ ہو

سوتے سے اٹھکے آئے ہیں یارب نہ جائیں وہ　　شرمندہ آہ شب سے دعائے سحر نہ ہو

---

اعجاز سے زیادہ ہے سحر اس کے ناز کا　　آنکھیں وہ کہہ رہی ہیں جو لب سے بیاں نہ ہو
کرتی نہ تھیں بگاڑ کی باتیں گلہ میں ہائے　　کیسی بنے جو دل سے وہ نامہرباں نہ ہو
عزم سفر جہاں سے کروں کیا شب فراق　　میں جانتا ہوں جیتے کہاں تو جہاں نہ ہو
مومن بہشت وعشق حقیقی تمہیں نصیب　　ہم کو تو رنج ہو جو صنم جا وداں نہ ہو

---

کب تک سیون پارہ پارہ دل کو　　رخصت ہے شکیب جان گسل کو
تھا ضعف بھی طاقت آزما رات　　توڑا کئے جانِ مضمحل کو

---

اک لحظہ نہیں قرار جی کو　　موت آئے بس ایسی زندگی کو
اُس آفتِ جاں کو دل دیا ہائے　　جو عیب گنے ہے دل دہی کو
کوئی نہ رہا جو پونچھے آنسو　　کیا روؤں میں اپنی بیکسی کو

---

جلوہ اُس بت نے دکھایا مجھ کو　　کب قیامت میں غش آیا مجھ کو

---

چل پرے ہٹ مجھے نہ دکھلا منہ　　اے شب ہجر تیرا کالا منہ
آرزو ہے نظارہ تھی تو نے　　اتنی ہی بات پر چھپایا منہ
ہو گیا راز عشق بے پردہ　　اس نے پردے سے جو نکالا منہ

---

سمار ہے ہیں مگر ترے نو بنو جلوے　　کہ بن گیا ہے طلسم بہار آئینہ
شکست رنگ پہ مستی میں ہنستے ہیں ہم بھی　　دکھائیں گے انھیں وقتِ خمار آئینہ
مجھے تو کہتے ہو مت دیکھو میری جانب تو　　اور آپ دیکھتے ہو بار بار آئینہ

---

سیماب ہے پہلو میں مرے دل تو نہیں یہ　　اس دل نے ستایا مجھے غارت ہو کہیں یہ
حسرت سے کہا خضر نے دیکھ اُس کی گلی کو　　مرتا ہوں ابھی گر ملے مدفن کو زمیں یہ
اس رحم کے صدقے وہیں گھبرا کے کہا ہاں　　جا کر کوئی دیکھو کہیں مومن تو نہیں یہ

---

کب تک نبھائیے بت نا آشنا کے ساتھ　　کیجے وفا کہاں تلک اس بے وفا کے ساتھ

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجر یار کی
آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ

ہے کس کا انتظار کہ خواب عدم سے بھی
ہر بار چونک پڑتے ہیں آواز پا کے ساتھ

یارب وصال یار میں کیونکر ہو زندگی
نکلی ہی جان جاتی ہے ہر ہر ادا کے ساتھ

سو زندگی نثار کروں ایسی موت پر
یوں روئے زار زار تو اہل عزا کے ساتھ

ہر دم عرق عرق نگہ بے حجاب ہے
کس نے نگاہ گرم سے دیکھا حیا کے ساتھ

مرنے کے بعد بھی وہی آوارگی رہی
افسوس جاں گئی نفس نارسا کے ساتھ

دستِ جنوں نے میرا گریباں سمجھ لیا
اُلجھا ہے اُن سے شوخ کے بندِ قبا کے ساتھ

میں کینے سے بھی خوش ہوں کہ سب یہ تو کہتے ہیں
اُس فتنہ گر کو لاگ ہے اس مبتلا کے ساتھ

---

اللہ وہ شکوے کرتے ہیں اور کس ادا کے ساتھ
بے طاقتی کے طعنے ہیں عذر جفا کے ساتھ

آتی ہے بوئے داغ شب تار ہجر سے
سینہ بھی چاک ہو نہ گیا ہو قبا کے ساتھ

تھے وعدے سے پھر آنے کے خوش یہ خبر نہ تھی
ہے اپنی زندگانی اسی بے وفا کے ساتھ

اللہ ری گمرہی بت و بُت خانہ چھوڑ کر
مومن چلا ہے کعبہ کو اک پارسا کے ساتھ

---

گر ناز کی سے بار ہے دشنہ تو یک نگاہ
ہم نیم بسملوں کو تڑپتا نہ چھوڑ دیکھ

آئینہ خانہ بن گیا دل توڑنا نہ تھا
یعنی اب ایسے جلوہ نما ہیں کروڑ دیکھ

---

کھائی ہے قسم ہم نے کہ پرہیز کریں گے
گر درد سے بھر جائے طبیعت تو مزا ہے

تو یہ گنہِ عشق سے فرمائے ہے واعظ
یہ بھی کہیں دل دیکھے گنہگار ہوا ہے

تھا محو رخ یار میں کیا آئینہ دیکھوں
معلوم ہے یارو مجھے جو رنگ مرا ہے

مومن نہ سہی بوسۂ پا سجدہ کریں گے
وہ بت ہے جو اوروں کا تو اپنا بھی خدا ہے

---

خوشی نہ ہو مجھے کیونکر قضا کے آنے کی
خبر ہے لاش پہ اس بے وفا کے آنے کی

ہے ایک خلق کا خوں سر پہ اشک خوں کے مرے
سکھائی طرز اسے دامن اٹھا کے آنے کی

سمجھ کے اور ہی کچھ مر چلا میں اے ناصح
کہا جو تو نے نہیں جان جا کے آنے کی

مجھے یہ ڈر ہے کہ مومن کہیں نہ کہتا ہو    مری تسلی کو روز جزا کے آنے کی

---

میں اگر آپ سے جاؤں تو قرار آجائے    پھر یہ ڈرتا ہوں کہ ایسا نہ ہو یار آجائے
کلفت ہجر کو کیا روؤں ترے سامنے میں    دل جو خالی ہو تو آنکھوں میں غبار آجائے
محو دلدار ہوں کس طرح نہ ہوں دشمن جاں    مجھ پہ جب ناصح بیدرد کو پیار آجائے

---

دیتے ہو تسکیں مرے آزار سے    دوستی تم کو نہیں اغیار سے
مجھ سے وہ چھپتے پھریں اس کے سوا    اور حاصل عشق کے آزار سے
کر علاج وحشت دل چارہ گر    لا دے اک جنگل مجھے بازار سے
ذکر اشک غیر میں رنگینیاں    بوئے خوں آتی تری گفتار سے
گر دعا کرتا ہوں مومن وصل کی    ہاتھ باندھے ہے وہ بت زنار سے

---

ہے نگاہِ لطف دشمن پر تو بندہ جائے ہے    یہ ستم اے بے مروت کس سے دیکھا جائے ہے
سامنے سے جب وہ شوخ دلربا آجائے ہے    تھامتا ہوں پر یہ دل ہاتھوں سے نکلا جائے ہے
حالِ دل کیونکر کہوں میں کس سے بولا جائے ہے    سر اٹھے بالیں سے کیا کچھ جی ہی بیٹھا جائے ہے
جاں نہ کھا وصلِ عدو سچ ہی سہی پر کیا کروں    جب گلہ کرتا ہوں ہمدم وہ قسم کھا جائے ہے
غیر کے ہمراہ وہ آتا ہے میں حیران ہوں    کس کے استقبال کو جی تن سے میرا جائے ہے
تاب و طاقت صبر و راحت جاں و ایمان عقل و ہوش    ہائے کیا کہیئے کہ دل کے ساتھ کیا کیا جائے ہے
خاک میں مل جائے یارب بے کسی کی آبرو    غیر میری نعش کے ہمراہ روتا جائے ہے
دیکھیئے انجام کیا ہو مومن صورت پرست    شیخ صنعاں کی طرح سوئے کلیسا جائے ہے

---

ہوئی تاثیر آہ و زاری کی    رہ گئی بات بے قراری کی
شکوۂ دشمنی کریں کس سے    واں شکایت ہے دوستداری کی
یاس دیکھو کہ غیر سے کہدی    بات اپنی امیدواری کی

---

ناوک انداز جدھر دیدۂ جاناں ہوں گے    نیم بسمل کئی ہونگے، کئی بے جاں ہوں گے
تاب نظارہ نہیں آئینہ کیا دیکھنے دوں    اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہوں گے
تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے    ہم تو کل خواب عدم میں شبِ ہجراں ہوں گے
ناصحا دل میں تو اتنا تو سمجھ اپنے کہ ہم    لاکھ ناداں ہوئے کیا تجھ سے بھی ناداں ہوں گے

کرکے زخمی مجھے نادم ہوں یہ ممکن ہی نہیں
گر وہ ہوں گے بھی تو بے وقت پشیماں ہونگے

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیماں کہ بس
ایک وہ ہیں کہ جنھیں چاہ کے ارماں ہوں گے

ہم نکالیں گے سن اے موج ہوا بل تیرا
اس کی زلفوں کے اگر بال پریشاں ہوں گے

صبر یارب مری وحشت کا پڑے گا کہ نہیں
چارہ فرما بھی کبھی قیدیِ زنداں ہوں گے

منتِ حضرت عیسیٰ نہ اٹھائیں گے کبھی
زندگی کے لئے شرمندۂ احساں ہوں گے

چاک پردہ سے یہ غمزے ہیں تو اے پردہ نشیں
ایک میں کیا کہ سبھی چاک گریباں ہوں گے

پھر بہار آئی وہی دشت نوردی ہوگی
پھر وہی پاؤں وہی خارِ مغیلاں ہوں گے

عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

---

آج اس بزم میں طوفان اٹھاکے اٹھے
یاں تلک روئے کہ اس کو بھی رلاکے اٹھے

گریہ جو دل میں خیال نگہ خواب آلود
درد کیا کیا اثر خفتہ جگا کے اٹھے

گو کہ ہم صفحہ ہستی پہ تھے اک حرف غلط
لیک اٹھے بھی تو اک نقش بٹھا کے اٹھے

ہو عذاب شب یلدا سے رہائی یارب
زلف منہ سے کہیں اس مہر لقا کے اٹھے

اُف ری گرمیٔ محبت کہ ترے سوختہ جاں
جس جگہ بیٹھ گئے آگ لگا کے اٹھے

میں دکھاتا تمہیں تاثیر مگر ہاتھ مرے
ضعف کے ہاتھ سے کب وقت دُعا کے اٹھے

جی ہی مانند نشانِ کفِ پا بیٹھ گیا
پاؤں کیا کوچے سے اس ہوش رُبا کے اٹھے

شعر مومن کے پڑھے بیٹھ کے اُسکے آگے
خوب احوال دل زار سنا کے اٹھے

---

لازم تھا حذر مجھ سے ناچیز کے نالوں سے
پر تجھ کو کہاں غیرت اے بے اثری اتنی

بے پردہ پسِ چلون یکبار تم آ بیٹھے
ہے تاب نظر کس کو کیوں جلوہ گری آتی

تم اُٹھ گئے محفل سے ذکر آتے ہی مجنوں کا
سایہ سے مرے وحشت اے رشک پری اتنی

یہ کون کہے اس سے کی ترک وفا میں نے
کر تو ہی ذرا ناصح پیغام بری اتنی

کہتا ہے مرے آگے وہ مجھ پہ عدو غش ہے
ہے ہے مری الفت سے ہے بےخبری اتنی

سجدہ نہ کہیں کرنا مومن قدم بت پر
کعبہ ہی میں ہوتی ہے بیہودہ سری اتنی

---

منتظر کس کے یہ رہتے ہیں کہ ہم ہر شب کو
تا سحر شام سے اٹھ اٹھ کے ہیں گھر میں پھرتے

جنبش نرگس جنت نے رلایا مومن
چشم کافر کے اشارے ہیں نظر میں پھرتے

---

پامال اک نظر میں قرار و ثبات ہے
اُس کا نہ دیکھنا نگہ التفات ہے

چھٹ کر کہاں اسیرِ محبت کی زندگی ناصح یہ بندِ غم نہیں قیدِ حیات ہے

---

وہ سر جو کل ترے زانو پہ تھا سو آج اے ظالم کبھو رہتا ہے پتھر پر کبھو رہتا زمین پر ہے

---

دیا ظالم کو دل، جاں خنجر کو آرام وحشت کو کسی کا شکوہ کیا کیجئے یہ خوبی اپنی قسمت کی
ستم پیشہ ہے بدخو ہے ستمگر ہے جفا جو ہے کروں کیا کیا شکایت دوستو اس بے مروت کی
مبارک خفتگانِ خاک کو تصدیع بیداری کہ گورِ تیرہ سے یاد آئی مجھ کو رات فرقت کی
جفا کا شکوہ اب کیوں جو کیا اچھا کیا اس نے سزا ہے اے دلِ ناداں اس الفت اس محبت کی

---

مجھ کو مارا مرے حالِ متغیر نے کہ ہے کچھ گماں اور ہی دھڑکے سے دلِ مومن کے
بخت پروانہ سے قربان عدو ہو یعنی آگ بن جائے ہے وہ گرد پھروں میں جس کے

---

مجھ پہ طوفاں اٹھائے لوگوں نے مفت بیٹھے بٹھائے لوگوں نے
کر دیا مومن اس صنم کو خفا کیا کیا ہائے ہائے لوگوں نے

---

تمہیں تقصیر اس بت کی کہ ہے میری خطا لگتی مسلمانوں ذرا انصاف سے کہیو خدا لگتی
تڑپنے لوٹنے رونے کا باعث تجھ پہ بھی کھلتا ترے دل کو بھی میری سی اگر اے بے وفا لگتی

---

جب وہ حیرت زدہ چہرے پہ نظر کرتا ہے آئینہ صد گلہ آئینہ گر کرتا ہے
کیا کیا دل نے کہ آنکھوں سے کہا رازِ نہاں ایسے غماز کو بھی کوئی خبر کرتا ہے
عیش میں بھی تو نہ جاگے کبھی تم کیا جانو کہ شبِ غم کوئی کس طور سحر کرتا ہے
بخت بد نے یہ ڈرایا ہے کہ کانپ اٹھتا ہوں تو کبھی لطف کی باتیں بھی اگر کرتا ہے
ذکر کر بیٹھے برائی ہی سے شاید میرا اب وہ اغیار کی صحبت سے حذر کرتا ہے
اشکِ شادی نے دمِ وصل جلایا مجھ کو منعِ نظارہ مرا دیدۂ تر کرتا ہے
کیا رلاتی ہے مجھے فکرِ خیالِ دشمن وصل میں جب وہ ادھر بھی نظر کرتا ہے

---

فغاں کیا دم بھی لینا پارہ ہائے دل اڑاتا ہے کہوں کیا دردِ پنہاں کی کلیجا منہ کو آتا ہے
گراں خوابی وہی ہے بختِ خوابیدہ کی اے ظالم مرا شورِ فغاں کا ہیکو سوتوں کو جگاتا ہے
میں ایسا ہوں کہ دوں گا تجھ کو طعنہ بے وفائی کا بگڑنا گر نہیں دشمن سے کیوں باتیں بناتا ہے

خیال خواب راحت ہے علاج اس بدگمانی کا وہ کافر گور میں مومن مرا شانہ ہلاتا ہے

---

صبر وحشت اثر نہ ہو جائے کہیں صحرا بھی گھر نہ ہو جائے
دیکھو مت دیکھیو کہ آئینہ عشق تمہیں دیکھ کر نہ ہو جائے
کثرت سجدہ سے وہ نقشِ قدم کہیں پامال سر نہ ہو جائے
میرے تغیّر رنگ کو مت دیکھ تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے
بات ناصح سے کرتے ڈرتا ہوں کہ فغاں بے اثر نہ ہو جائے
مانعِ ظلم ہے تغافلِ یار بخت بد کو خبر نہ ہو جائے
غیر سے بے حجاب ملتے ہو شب عاشق سحر نہ ہو جائے
اے دل آہستہ آہ تاب شکن دیکھو ٹکڑے جگر نہ ہو جائے
مومن ایمان قبول دل سے مجھے وہ بت آزردہ گر نہ ہو جائے

---

جہاں سے شکل کو تیری ترس ترس گزرے جو تجھ پہ بس نہ چلا اپنے جی سے بس گزرے
نہ جاؤں کیونکہ سوئے دام آشیانے سے جب خیال حسرت مرغان ہم قفس گزرے
وفائے غیرت شکر جفا نے کام کیا کہ اب ہوس سے بھی اعدائے بوالہوس گزرے
یہ نیم جان دغم ہجر ہے وہی انصاف جو تیرے دھیان میں اے مرگ دادرس گزرے
کہاں وہ ربط بتاں اگلے اُس کو تو مومن ہزار سال ہوئے سیکڑوں برس گزرے

---

نہ انتظار میں یاں آنکھ ایک آن لگی نہ ہائے ہائے میں تالو سے شب زبان لگی
جفائے غیر کا شکوہ تھا تیرا تھا کیا ذکر عبث یہ بات بری تجھ کو بدگمان لگی
میں اور اُس کو بلاؤں گا روز وصل میں لو اجل بھی کرنے محبت کا امتحان لگی

---

کیا مرے قتل پہ حامی کوئی جلاد بھرے آہ جب دیکھ کے تجھ سا ستم ایجاد بھرے
کہیں ہو جائے وصال آہ بلا سے چھوٹوں ہجر کا دکھ کوئی کب تک دلِ ناشاد بھرے
ہوں میں وہ صید جگر خون ہوا سیری مشتاق جو پس ذبح بھی ہر دم دم صیاد بھرے
چارہ گر اس کی خطا کیا مرے تن میں نہ رہا خون اتنا کہ سر نشتر فصاد بھرے

---

کرتا ہے قتل عام وہ اغیار کے لئے دس بیس روز مرتے ہیں دو چار کے لئے
دل عشق تیرے نذر کیا جان کیونکہ دوں رکھا ہے اس کو حسرت دیدار کے لئے

چلنا تو دیکھنا کہ قیامت نے بھی قدم
طرز خرام و شوخیٔ رفتار کے لئے
جینا امید وصل پہ ہجراں میں سہل تھا
مرتا ہوں زندگانیٔ دشوار کے لئے

---

کہاں تک دم بخود رہیئے نہ ہوں کیجیے نہ ہاں کیجیے
کہاں تک کھائیے غم کب تلک ضبطِ فغاں کیجیے
عدو کے وہم سے تکتا ہوں بزم غیر میں ہر سو
نہیں ہے اور کچھ یوں آپ جو چاہیں گماں کیجیے
کہیں تو کیا کہیں اور بن کہے کیونکر دوا ہووے
بڑی مشکل پڑی کیسا چارۂ دردِ نہاں کیجیے
رکھے سے ہاتھ سینے پر بھلا کب مانتا ہے دل
نہ جب تک رویئے دو چار آہ خونچکاں کیجیے
کچھ آخر حد بھی ہے جور و جفا و ظلم کی کب تک
تحمل در گزر ہر لحظہ ہر دم ہر زماں کیجیے
گلا ہم کاٹ لیں گے آپ تیغ رشک سے اپنا
عدو کو قتل کیجیے پھر ہمارا امتحاں کیجیے
عذاب ایزدی جانکاہ ہے مانا بس اے مومن
خدا کے واسطے ذکر ستم ہائے بتاں کیجیے

---

اجل سے خوش ہوں کسی طرح ہو وصال تو ہے
نہ آئے نعش پہ وہ پر یہ احتمال تو ہے
ذرا تھم اے دل مضطر کہ فکر وصل کروں
شب قلق نہ سہی خواب بھی خیال تو ہے
کہاں تلک گلہ ہائے تغافل قاتل
ہم آپ کاٹ لیں آخر یہ سر وبال تو ہے
جفائے یار کو سونپا معاملہ اپنا
اب آگے ہو نہ ہو امید انفعال تو ہے
شب فراق میں بھی زندگی پہ مرتا ہوں
کہ گو خوشی نہیں ملنے کی پر ملال تو ہے
عبث ترقیٔ فن کی ہوس ہے مومن کو
زیادہ ہوئے گا کیا اس سے بے مثال تو ہے

---

تسلی دم واپسیں ہو چکی
ہمیں ہو چکے جب نہیں ہو چکی
قلق کشتۂ سخت جانی ہے پھر
امید اجل آفریں ہو چکی
بلا اس سیہ روز کو بزم میں
شب عیش اے مہ جبیں ہو چکی
خیال اجل سے تسلی کروں
وہ طاقت بھی جان حزیں ہو چکی

---

در بدر ناصیہ فرسائی سے کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو قسمت کا لکھا ہوتا ہے
ہو کے آزردہ پشیماں ہوں کہ میں جس سے کہوں
وہی کہوے کوئی ایسے سے خفا ہوتا ہے
ہو نہ بیتاب غم ہجر بتاں میں مومن
دیکھو دو دن میں بس اب فضل خدا ہوتا ہے

---

کیونکر یہ کہیں منت اعدا نہ کریں گے
کیا کیا نہ کیا عشق میں کیا کیا نہ کریں گے
ہنس ہنس کے وہ مجھ سے ہی مرے قتل کی باتیں
اس طرح سے کرتے ہیں کہ گویا نہ کریں گے

بیمار اجل چارہ کو گر حضرت عیسٰی ــ اچھا بھی کریں گے تو کچھ اچھا نہ کریں گے
دیوار کے گر پڑتے ہی اٹھنے لگے طوفاں ــ اب بیٹھ کے کونے میں بھی رویا نہ کریں گے
ناصح کف افسوس نہ مل چل تجھے کیا کام ــ پامال کریں گے وہ مجھے یا نہ کریں گے

---

گر ذکر وفا سے بھی غصہ ہے تو اب سے ــ گو قتل کا وعدہ ہو تقاضہ نہ کریں گے

---

توبہ ہے کہ ہم عشق بتوں کا نہ کریں گے ــ وہ کرتے ہیں اب جو نہ کیا تھا نہ کریں گے
اے حضرت مومن یہ مسلم جو ہے ارشاد ــ بھولے سے بھی اب ذکر بتوں کا نہ کریں گے

ق

لیکن جو بتوں نے ہی سکھلا آپ سے کی بات ــ پھر آپ ہی فرمائیں کہ کیا کیا نہ کریں گے

---

نہ کٹی ہم سے شب جدائی کی ــ کتنی ہی طاقت آزمائی کی
رشک دشمن بہانہ تھا سچ ہے ــ میں نے ہی تم سے بے وفائی کی
دام عاشق ہے دلدہی نہ ستم ــ دل کو چھینا تو دلربائی کی
گر نہ بگڑو تو کیا بگڑتا ہے ــ مجھ میں طاقت نہیں لڑائی کی
گھر تو اس ماہ وش کا دور نہ تھا ــ لیک طالع نے نارسائی کی
مر گئے پر ہے بے خبر صیاد ــ اب توقع نہیں رسائی کی
مومن آؤ تمہیں بھی دکھلادوں ــ سیر بت خانے میں خدائی کی

---

شب تم جو بزم غیر میں آنکھیں چرا گئے ــ کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے
پوچھا کسی پہ مرتے ہو اور دم نکل گیا ــ ہم جان سے عناں بہ عنان صدا گئے
اے آب اشک آتش عنصر ہے دیکھنا ــ جی ہی گیا اگر نفس شعلہ زا گئے
واعظ کے ذکر مہر قیامت کو کیا کہوں ــ عالم شب وصال کے آنکھوں میں چھا گئے
تابندہ و جوان تو بخت رقیب تھے ــ ہم تیرہ روز کیوں غم ہجراں کو بھا گئے
اے مومن آپ کب سے ہوئے بندۂ بتاں ــ بارے ہمارے دین میں حضرت بھی آ گئے

---

خود رفتگی میں چین وہ پایا کہ کیا کہوں ــ غربت جو مجھ سے پوچھو تو بہتر وطن سے ہے
کیا کیا جواب شکوہ میں باتیں بنا گیا ــ لو اب بھی دل درست اسی دل شکن سے ہے

بے وفائی کا عدو کی ہے گلہ　　　لطف میں بھی وہ ستاتے ہیں مجھے
حیرت حسن سے یہ شکل بنی　　　کہ وہ آئینہ دکھاتے ہیں مجھے
اب یہ صورت ہے کہ اے پردہ نشیں　　　تجھ سے احباب چھپاتے ہیں مجھے
پھونک دے آتش دل داغ مرے　　　اس کی خو یاد دلاتے ہیں مجھے
مومن اور دیر خدا خیر کرے　　　طور بے ڈھب نظر آتے ہیں مجھے

---

پھر دل ہے داغ مطلع خورشید دیکھکر　　　از بسکہ یاد جلوۂ بالائے بام ہے
اس آہوئے رمیدہ کو پھر ڈھونڈتا ہے دل　　　رم کردہ شوق وصل پھر اک صید رام ہے
پھر آگیا ہے کون سے بے باک کا خیال　　　یہ کیا ہوا کہ رخصت ناموس و نام ہے
پھر کس نے غیر کو نہ دیا ناز سے جواب　　　پھر خواہش پیام اجل کا پیام ہے
دیکھا نگاہ ناز سے کس شوخ چشم نے　　　پھر مضطرب نظر کو جہاں نیم گام ہے
پھر کس ستم شعار نے پوچھا ہے میرا حال　　　پھر ناصحوں کو کیوں خطر انتقام ہے
پھر کچھ صدائے پا سے دل مردہ جی اٹھا　　　پھر جلوہ ریز کون قیامت خرام ہے
بھر دور می بتاں میں نہیں خواب کا خیال　　　مومن مرے بھی دین میں سونا حرام ہے

---

مجھے چپ لگی مدعا کہتے کہتے　　　رکے ہیں وہ کیا جانے کیا کہتے کہتے
شب ہجر میں کیا ہجوم بلا ہے　　　زباں تھک گئی مرحبا کہتے کہتے
چلے تم کہاں میں نے تو دم لیا ہے　　　فسانہ دل زار کا کہتے کہتے

---

یوں بنا کر حال دل کہنا نہ تھا　　　بات بگڑی میری ہی تقریر سے
لے گئی جاں یاد رونق ہائے وصل　　　گھر مرا ویراں ہوا تعمیر سے
اے صنم مومن ہوں آخر کس طرح　　　مجھ کو تسکیں ہو تری تصویر سے

---

ہم حال کہے جائیں گے سنئے کہ نہ سنئے　　　اتنا ہی تو یاں صحبت ناصح کا اثر ہے
وہ ذبح کرے اور یہاں جان فدا ہو　　　ایسے سے نبھے یوں یہ ہمارا ہی جگر ہے
دل کھول کے مل لیجیے مومن صنموں سے　　　اس سال میں گر سوئے حرم عزم سفر ہے

---

دل میں اس شوخ کے جو راہ نہ کی　　　ہم نے بھی جان دی پر آہ نہ کی
کون ایسا کہ اس سے پوچھے کیوں　　　پرسش حال داد خواہ نہ کی

تھا بہت شوق وصل تو نے تو ۔۔۔ کمی اے حسن تاب گاہ نہ کی
تاب کم ظرف کو کہاں تم نے ۔۔۔ دشمنی کی عدو سے چاہ نہ کی
گریہ و آہ بے اثر دونوں ۔۔۔ کس نے کشتی مری تباہ نہ کی
تھا مقدر میں اس سے کب ملنا ۔۔۔ کیوں ملاقات گاہ گاہ نہ کی
دیکھ دشمن کو اٹھ گیا بے دید ۔۔۔ میرے احوال پر نگاہ نہ کی
مومن اس ذہن بے خطا پر حیف ۔۔۔ فکر آمرزش گناہ نہ کی

---

نہ آسمان کا رُخ پھیر دوں جدھر چاہوں ۔۔۔ دیا ہے کیا تپش دل نے اختیار مجھے
وہ شام وعدہ جو آئے تو ہو جو درست ۔۔۔ رہا وصال میں بھی وہ ہی انتظار مجھے
نہ ہو وہ بات کہ جس سے وفا میں آئے خلل ۔۔۔ کہیں نہ کیجیو ناصح سے شرمسار مجھے
بقدر جوش تڑپنے کو تھا دے پس قتل ۔۔۔ وہ بے قرار ہوئے آگیا قرار مجھے
امید مرگ پہ ہر فتنہ راحت جاں ہے ۔۔۔ شب فراق میں کیا بیم روزگار مجھے
اگر حساب وفا امتحاں کے بعد نہ ہو ۔۔۔ قبول عذر ستم ہائے بے شمار مجھے
رقیب کھائے قسم تو وفا کا آئے یقیں ۔۔۔ تو میری جان ہے کیا تیرا اعتبار مجھے
پس شکستن خم زجر محتسب معقول ۔۔۔ گناہگار نے سمجھا گناہگار مجھے
نہ کام زور سے نکلا نہ عجز کام آیا ۔۔۔ بس اب تو چین دے اے شوق ہرزہ کار مجھے
ہر آن آن دگر کا ہوا میں عاشق زار ۔۔۔ وہ سادہ ایسے کہ سمجھے وفا شعار مجھے
صواب ترک صنم سچ سہی ولے مومن ۔۔۔ یہ کیا سبب کہ سناتے ہو بار بار مجھے

---

دعا بلا تھی شب غم سکون جاں کے لئے ۔۔۔ سخن بہانہ ہوا مرگ ناگہاں کے لئے
خلاف وعدۂ فردا کی ہم کو تاب کہاں ۔۔۔ امید یک شبہ ہے یاس جاوداں کے لئے
سنیں نہ آپ تو ہم بوالہوس سے حال کہیں ۔۔۔ کہ سخت چاہئے دل اپنے رازداں کے لئے
حجاب چرخ بلا ہے ہوا کرے بے تاب ۔۔۔ فغاں اثر کے لئے اور اثر فغاں کے لئے
ہے اعتماد مرے بخت خفتہ پر کیا کیا ۔۔۔ دگرنہ خواب کہاں چشم پاسباں کے لئے
مزہ یہ شکوے میں آیا کہ بے مزہ ہوئے وہ ۔۔۔ ہیں تلخ کام رہا لذت زباں کے لئے
ملے رقیب سے وہ جب سنا وصال ہوا ۔۔۔ دریغ جان گئی ایسے بدگماں کے لئے
کہاں وہ عیش اسیری کہاں وہ امن قفس ۔۔۔ ہے بیم برق بلا روز آشیاں کے لئے
جنون عشق ازل کیوں نہ خاک اڑائیں کہ ہم ۔۔۔ جہاں میں آئے ہیں ویرانی جہاں کے لئے
بھلا ہوا کہ دغا آزما ستم سے ہوئے ۔۔۔ ہمیں بھی دی تھی جاں اس کے امتحاں کے لئے

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی　　تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی
موئے آغاز الفت ہیں ہم افسوس　　اُسے بھی رہ گئی حسرت جفا کی
جفا سے تھک گئے تو بھی نہ پوچھا　　کہ تو نے کس توقع پر وفا کی
وہ سوتے بے حجابانہ رہے اور　　نگاہ شوق کام اپنا کیا کی
کہا اس بت سے جب مرتا ہے مومنؔ　　کہا میں کیا کروں مرضی خدا کی

---

نہ ربط اس سے نہ یاری آسماں سے　　جفا بہر عدو لاؤں کہاں سے
یہ حالت ہے تو کیا حاصل بیاں سے　　کہوں کچھ اور کچھ نکلے زباں سے
شب وصل آپ کا عذر نزاکت　　بجا ہے پر نہ مجھ سے نیم جاں سے
مرے گھر آپ بس جاتے تھے کس دن　　اُٹھانا مدعا ہے آستاں سے
وہ آتے ہیں پشیماں لاش پر اب　　تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے
نہ بولوں گا نہ بولوں گا کہ میں ہوں　　زیادہ بدگماں اس بدگماں سے
نہ بجلی جلوہ فرما ہے نہ صیاد　　نکل کر کیا کریں ہم آشیاں سے
بُرا انجام ہے آغاز بد کا　　جفا کی ہو گئی خواہش تباں سے
خدا کی بے نیازی ہائے مومنؔ　　ہم ایماں لائے تھے ناز بتاں سے



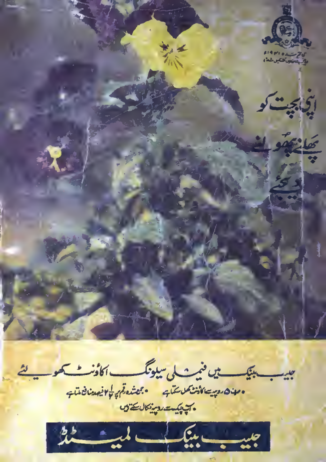



# یہ صاحب کدھر گئے؟

جی! وہ اس وقت اپنے گھر میں اطمینان سے بیٹھے ہیں
وہ کبھی دوسروں کی طرح تنخواہ لینے کیلئے قطار میں کھڑے نہ دیکھے
گئے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بلا تنخواہ کام کرتے ہیں تنخواہ انہیں
ملتی ہے لیکن وہ براہ راست اُن کے سیونگ بینک اکاؤنٹ میں
جمع ہو جاتی ہے جس میں سے وہ حسب ضرورت رقم نکال لیتے
ہیں اور اس طرح فضول خرچی کے امکانات بھی پیدا نہیں
ہوتے۔

بچت کی عادت اور بینک اکاؤنٹ میں بڑھتی ہوئی رقم
ان کے لئے باعث طمانیت ہے۔

## دی مسلم کمرشل بینک لمیٹڈ


اپنی بچت کو
پھلنے پھولنے
دیجئے
حبیب بینک میں فیملی سیونگ اکاؤنٹ کھولئے
• صرف ۵ روپیہ سے اکاؤنٹ کھل سکتا ہے
• جمع شدہ رقم پر ۲½ فیصد منافع ملتا ہے
• آپ چیک سے روپیہ نکال سکتے ہیں
حبیب بینک لمیٹڈ